خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ

# سسپنس ڈائجسٹ

جنوری 2026

قیمت 200 روپے

بانی

معراج رسول

سال نو مبارک







مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

اطہر حسین
نائب مدیرہ
شازیہ حمیر

مارکیٹنگ و
سرکولیشن منیجر
ثمر عباس
0301-2454188





جلد 55 • شمارہ 01 جنوری 2026 • زرِ سالانہ 3000 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 200 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com




دورِ جدید کی عکاسی کرتی
ایک انوکھی تحریر




آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ



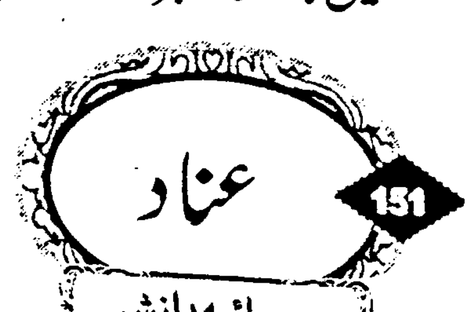

بیوی کی دھوکا دہی پر نفسیاتی عارضے
میں مبتلا شوہر کا احوال




معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور
زخموں سے چور ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان




دولت کے لالچ میں جرم
کرنے والی نابینا لڑکی کی مایوسی



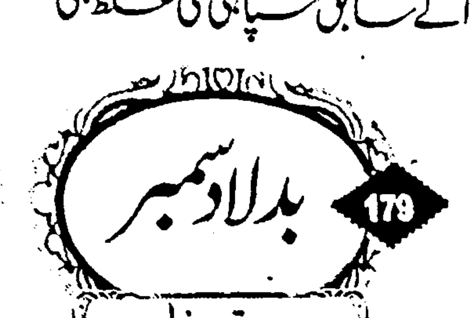

اپنے ساتھی سے انتقام لینے
والے سابق سپاہی کی غلط فہمی



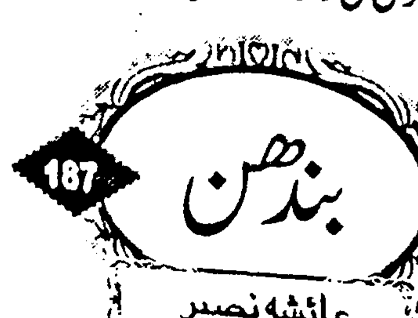

خوشیوں سے محروم ایک
لڑکی کی دکھ بھری داستان




عظمت کے مینار جن کی روشنی
سے ایک جہان منور ہوا




رشتوں کی اہمیت کو اجاگر
کرتی ایک دلگداز تحریر




ناگہانی مشکل میں پھنسے
ایک شخص کی پریشانی




دلوں میں امنگ آنکھوں میں سہانے خواب
پردیس میں قسمت آزمانے والوں کی داستان


پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

# ہمہ رُخ

ازل سے زمانے پر ایک ابدی استغراق مسلط ہے۔ لمحے اس ابدی استغراق میں گزر رہے ہیں، ساعتیں تمام ہو رہی ہیں اور وقت ہے کہ بہہ رہا ہے۔ زندگی نے دنوں اور راتوں کی ایک اور میعاد پوری کر لی۔

ہاں، ایک سال اور تاریخ کے وجود نے نگل لیا ہے۔

قوموں نے تجربات و مشاہدات کا کچھ زہر اور اکٹھا کر لیا ہے۔

لمحوں کے بے زنہار ریلے میں وجود کے کھوے چھل گئے ہیں مگر حیات کی تیز گامی برقرار ہے۔

میں ماضی کے راہ جو کرسٹوفر کولمبس کی دریافت عظیم امریکا میں نئے سال کے حاشیے پر کھڑا ہوں، منفعت اور خسارے کی فردِ حساب لیے۔ دنوں اور راتوں سے میری اب تک جو معاملت رہی ہے، اس میں منافع کم اور خسارہ زیادہ ہے بلکہ خسارہ ہی خسارہ ہے۔ کیا میں اس خوش گمانی میں رہوں کہ یہ آنے والا سال تلافی کی کوئی صورت مجھے دکھائے گا؟ کیا میں اس سے کچھ امیدیں وابستہ کر لوں؟ لگتا یوں ہے کہ آنے والے دن بھی بہت واقعے انگیز ہوں گے۔ یہ واقعات مہربان ہوں گے یا نامہربان؟ میں خود ہی جواب طلب ہوں اور خود ہی جواب [illegible]۔

سوچنا چاہیے کہ ایسا کیوں ہے۔ [illegible] قدم پر یقین اور اعتماد کو ٹھیس کیوں لگتی ہے؟ اس قحط الرجال اور بے یقینی کی اس گرم بازاری کا کوئی تو سبب ہوگا۔ کیا انسان فطرتاً اچھے اور فطرتاً برے ہوتے ہیں؟

ہاں، انسان فطرتاً اچھے اور فطرتاً برے ہوتے ہیں۔ تاریخ کی درس گاہ نے جو علم ارزاں کیا ہے، اس کی روشنی میں سماجی قدروں اور رشتوں کا مسئلہ کچھ یوں ہی ہے۔

میں جس سماج میں ہوں، خودغرضی اور خود مرکزیت [illegible] دستور اور حق تلفی وہاں کا رواج ہے۔ ایک شخص اپنی خوشی کے لیے دوسروں کا دل چیر دیتا ہے، اپنے فائدے کے لیے دوسروں کو [illegible] فریب کرتا ہے اور ایک شخص پر ہی کیا موقوف، یہاں تو گروہ کے گروہ ایسے افعال میں ہمہ وقت و ہمہ رخ مصروف ہیں۔ شاید یہ میدان تیار ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ اس میں دوڑنے والے دوسروں کو پیچھے دھکیلتے، پاؤں تلے روندتے آگے بڑھیں۔ اب کون سلامت روی اختیار کرے۔ نہیں، اب کوئی سلامت روی اختیار نہیں کرے گا، کوئی اپنا حقیقی کردار ادا نہیں کرے گا۔

یہاں جو برا نہیں، بے وقوف ہے۔ "برے ہشیار" کا بھی کچھ زیادہ قصور نہیں [illegible] اپنی برائی میں ایک تہائی کا ہی ذمے دار ہے۔ باقی ذمے داری اس سماج کی ٹھہری جس کی بنیاد ہی شر پر رکھی گئی ہے۔ اب یہاں [illegible] تھا۔

برف و باراں کی شام کو اگر کوئی خستہ حال مسافر کپکپاتا، کھانستا تمہارے مسکن کے پاس سے گزرے تو اسے پناہ دو، اپنا کمبل اسے اوڑھا دو، اس کی مدارات کرو اور میری جان! اس کے لیے بھی تیار رہو کہ جب وہ واپس ہوگا تو تمہارے سینے میں چاقو اتار کے کل اسباب میزبان ہی کمبل میں لپیٹ کر اپنے ساتھ لے جائے گا۔

اسے آنے والی زمہریری شام کا خوف ستا رہا ہے اور آج شام جس کمبل نے اسے سردی سے پناہ دی ہے وہ تمہارا ہے۔ اب اگر چلتے وقت وہ کچھ زادِ راہ اور یہ کمبل تم سے مانگتا ہے یا تم خود ہی یہ چیزیں اسے بخش دیتے ہو تو یہ احسان ہوگا۔

ایک مغربی دانشور کا کہنا ہے کہ انسانوں میں ابھی اتنی اہلیت پیدا نہیں ہوئی کہ وہ احسان کا بوجھ سہار سکیں۔ وہ جو بولنا نہیں جانتا اسے بولنا سکھاؤ، پر اس توقع کے ساتھ کہ جب وہ پہلی بار روانی سے بولے گا تو تمہیں گالی دے گا۔ جسے لکھنا نہیں آتا، اسے لکھنے کی مشق کراؤ مگر کی اس آمادگی کے ساتھ کہ جب وہ اپنا نام لکھنا سیکھ لے گا تو سب سے پہلے تمہارے قتل کے محضر پر دستخط کرے گا۔

مگر یہ بددل ہونے کی بات نہیں۔ ایک انسان دوسرے انسان سے مایوس ہو سکتا ہے لیکن انسانیت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ انسان صرف زمانے میں سانس لیتے ہیں اور انسانیت زمانوں میں زندہ ہے...... تو اب کہ جب ہم نئے سال کے حاشیوں پر کھڑے ہیں اور منفعت اور خسارے کی فردِ حساب ہمارے ہاتھوں میں ہے تو ہم انسانیت کے بارے میں سوچیں جو زمانوں میں زندہ تھی اور زندہ رہے گی۔

٭٭٭.......................................

# آپ کے خط

قارئین کرام!

السلام علیکم!

جنوری 2026ء کا شمارہ اپنی آب و تاب کے ساتھ حاضرِ خدمت ہے۔ سال 2025ء گزر گیا مگر اپنے دامن میں بہت سی تلخ و شیریں یادیں چھوڑ گیا۔ اس سال میں کئی حادثات و سانحات بھی ہوئے اور بہت سے لوگ اپنے پیاروں سے بچھڑ گئے۔ اسی طرح یہ سال کسی کے لیے خوشیوں بھرا پیغام بھی لایا، بس اسی گہما گہمی میں اس سال کا انجام اور نئے سال کا آغاز ہوا۔ ملک کی موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ سیاسی حوالے سے دیکھا جائے تو ایک غیر یقینی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ یوں تو حکومت چل رہی ہے مگر اقتدار کی رسا کشی جوں کی توں جاری ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی جنگ جاری ہو۔ مہنگائی ایسی زوروں پر ہے کہ الامان الحفیظ۔ غربت کی چکی میں ہمیشہ غریب عوام ہی پستے ہیں۔ اشرافیہ ہر دور میں صرف مزے ہی لوٹتے ہیں۔ ایسے میں اربابِ اقتدار چین کی بانسری بجا رہے ہیں اور سب ٹھیک ہے کا راگ الاپ رہے ہیں۔ 31 دسمبر کو ہر کوئی اپنے اپنے انداز میں نئے سال کی خوشی مناتا ہے۔ کہیں آتش بازی ہوتی ہے تو کہیں ہوائی فائرنگ کی جاتی ہے جس میں ہر سال کئی لوگ اپنی جان سے چلے جاتے ہیں لہٰذا ہمیں چاہیے کہ اس عمل سے گریز کریں بلکہ سال کے آخری دن سجدہ ریز ہو کر اپنے اہل و عیال سمیت تمام امتِ مسلمہ بالخصوص طور پر فلسطین کے مسلمانوں کے لیے خیر کی دعا کریں کہ اللہ پاک سب کو اپنی امان میں رکھے اور جہاں جہاں مسلمان ہیں ان کی مشکلات کو دور فرمائے (آمین)۔ یہی نئے سال کی آمد پر خوشی منانے کا بہترین عمل ہے۔ اب چلتے ہیں اپنی محفل کی جانب جہاں قارئین کے تبصرے آپ کی بارگاہ کے منتظر ہیں۔

✠ روبینہ اشعر، کراچی سے رقم طراز ہیں۔ ”خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ سسپنس ڈائجسٹ ماہ دسمبر کا حسبِ معمول جلد ہی مل گیا۔ معصوم اور سادہ سی ٹائٹل گرل کو سراہتے ہوئے فہرست پر نظر ڈالی اور پھر جون ایلیا کے انشائیہ ”ایک طور“ سے مستفید ہوئے۔ بلاشبہ ہمارے شہر کراچی کا کوئی پُرسانِ حال نہیں، اللہ پاک اس شہر کا نظم چلانے والوں کو عقلِ سلیم عطا فرمائے۔ خطوط کی محفل میں ایڈیٹر صاحب عالمی منظرنامے پر تبصرے کے ساتھ ساتھ ملک میں مہنگائی سے دلبرداشتہ نظر آئے۔ محفل میں دانیال حسن چغتائی اپنے دلچسپ اور بھرپور تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر براجمان نظر آئے، مبارک باد قبول کیجیے۔ سیدہ روبینہ شاہین روبی کی حاضری دیکھ کر خوشی ہوئی، تبصرہ بھی خوب کیا۔ سید محی الدین اشفاق کی حاضری بھی خوب رہی۔ اس بار ان کا تبصرہ مختصر رہا۔ رفعت مقصود کی خوشی میں ہم بھی شامل ہیں۔ ان کی حاضری خوشگوار رہی، تبصرہ پسند آیا۔ سیتا شاہ اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ موجود رہیں۔ تبصرہ اچھا لگا۔ دیگر احباب میں عون احمد، ملک وحید اور قیدی مبشر امیرہ کا تبصرہ بھی پسند آیا۔ قیدی مبشر امیرہ کو محفل میں خوش آمدید، امید ہے اب یہ حاضری مستقل رہے گی۔ ناہید یوسف کا نام محفل میں شامل نہ ہونے والوں کی فہرست میں دیکھ کر دلی افسوس ہوا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے زویا اعجاز کی ”ظالم مظلوم“ کا پانچواں حصہ پڑھا۔ پھولن دیوی نے بالآخر ظلم کرنے والوں کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے ہیں، دوسری جانب وکرم زخمی ہو گیا ہے۔ آگے دیکھتے ہیں حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ ناہید سلطانہ اختر کے قلم کا جادو ”دیس پردیس“ میں سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ کہانی کا دوسرا حصہ بھی شاندار رہا۔ رجب علی انگلینڈ میں کمانے کے قابل ہو گیا اور اب اس کی شادی اونچے گھرانے میں ہو گئی۔ رجب علی اپنی بیوی نشاط کے ساتھ واپس انگلینڈ پہنچ گیا۔ آگے کے واقعات بھی یقیناً دلچسپ ہوں گے۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ عائشہ نصیر کی ”دوسرا موقع“ اچھی کہانی تھی۔ نادیہ کامران کاشف کی تحریر ”رمز شناس“ کی دسویں قسط بھی شاندار رہی۔ سنسنی خیز واقعات کا تسلسل قارئین کی توجہ کہانی سے ہٹنے نہیں دیتا مگر آخر میں ”جاری ہے“ دیکھ کر تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ کرن نعمان کی مختصر کہانی ”فراڈیا“ متاثر کن تحریر رہی۔ شہلا کی ناگہانی اور اذیت ناک موت کا بدلہ عرفان تایا سے اچھے طریقے سے لیا گیا۔ جرائم کی دنیا سے مرزا امجد بیگ کی تحریر ”ختم شد“ اچھی رہی۔ سادہ لوح لوگوں کو بیرونِ ملک بھیجنے کا جھانسا دے کر لوٹنے والا فراڈیا فراست علی بالآخر مرزا امجد بیگ کی کڑی جرح کے نتیجے میں اپنے انجام کو پہنچا۔ عیوق بخاری کی تحریر ”کند ذہن“ شاندار رہی۔ بے وقوف سمجھے جانے والے جمی نے انتہائی ذہانت سے اپنے باپ کو معذور کرنے والے ہڈسن کی سازش کو بے نقاب کیا اور اسے قانون کے شکنجے میں لا کھڑا کیا۔ ماضی میں برے تجربات سے گزرے ایک شخص کی کہانی اے آر راجپوت کی تحریر ”راز“ میں پڑھنے کو ملی۔ کہانی نے کچھ خاص متاثر نہ کیا۔ دیا خان بلوچ کی کہانی ”مصور“ زبردست رہی۔ محمد فاروق انجم کی ”بازی“ اچھی تحریر تھی مگر صابر بھائی جیسے مضبوط کردار کو انتہائی آسانی سے انجام تک پہنچا دیا گیا۔ لبنیٰ خان کی ”فراموش“ زبردست کہانی رہی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی ”شاہ شجاع کرمانی“ کا دوسرا اور آخری حصہ بھی شاندار رہا۔ ایک دکھیاری ماں کے نوجوان بیٹے کی نشے میں مبتلا



ہونے کی داستان صبا مغل کی تحریر ''گمشدہ'' میں پڑھی، متاثر کن تحریر تھی۔ صائمہ دانش کی کہانی ''بے زبان'' اچھی رہی۔ محفل شعرو سخن میں تمام اشعار ہی اچھے تھے۔ کترنوں کا انتخاب بھی خوب رہا۔''

✠ سبینا شاہ کا ڈیرہ غازی خان سے تبصرہ۔ ''ماہ دسمبر کا شمارہ قدرے جلدی مل گیا اس لیے پورا پڑھ کر تبصرہ لکھنے کا ٹائم مل گیا۔ ٹائٹل ہمیشہ کی طرح سرسری نظر سے دیکھا اور جون ایلیا کے زبردست انشائیے کی طرف بڑھے، استفادہ حاصل کر کے خطوط کی محفل کا رخ کیا جہاں دانیال حسن چغتائی کرسی صدارت پر اپنے جاندار تبصرے کے ساتھ موجود تھے، مبارک باد۔ سیدہ روبینہ شاہین روبی اور سید محی الدین اشفاق کی حاضری خوب رہی۔ عون احمد، بلیر سے وقت پر رسالہ مل جانے کے باعث بہترین تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ روبینہ اشعر نے بھی خوب لکھا۔ رفعت مقصود اپنا خط شائع ہونے کی خوشی مناتی نظر آئیں۔ محفل کے سبھی ساتھیوں کا ذکر کرتے ملک وحید بھی اپنے مخصوص مختصر انداز میں محفل کی رونق بڑھا رہے تھے۔ مبشر امیرہ کو خط شائع ہونے کی مبارک باد، تبصرہ اچھا تھا۔ آپ آتے رہیے گا محفل میں۔ اب کہانیوں کی بات ہو جائے۔ نازیہ کامران کی ''چہرہ شناس'' پوری دلچسپی سے جاری ہے۔ دلچسپ سلسلے کی اگلی کڑی کا انتظار رہے گا۔ زویا صفوان کی ''ظالم مظلوم'' میں پھولن دیوی اور ور... ایک چل رہا ہے۔ وکرم، پھولن کی زندگی میں آنے والا وہ پہلا شخص تھا جس نے واقعی پھولن سے سچی محبت کی تھی۔ کرن نعمان کی مختصر تحریر ''فراڈیا'' میں ... شہلا کا انتقام لیا جانا اچھا لگا۔ مرزا امجد بیگ کا کیس ''ختم شد'' ہمیشہ کی طرح دلچسپ تھا۔ عیوق بخاری کی ''کند ذہن'' میں باپ کی ... ذہن جمی کو بھی سوچنے سمجھنے پر مجبور کر دیا اور پھر اس کند ذہن نے وہ کر دکھایا کہ سب حیران رہ گئے۔ زبردست تحریر تھی۔ اے آر راجپوت ... میں ماضی کے تلخ تجربے سے دوچار ہو کر معاشرے کی سب عورتوں کو ایک ہی نظریے سے پرکھنے والے اجمل کی تلخی آخر کار کم ہو ہی گئی اور عالیہ کی ... اور پارسائی اجمل کو ماننا پڑی۔ دیا خان یوسف زئی کی ''مصور'' میں آندرے کی مونیکا سے تخیلاتی محبت اور اس محبت کا انجام دکھایا ... اچھی تحریر تھی۔ محمد فاروق انجم کی تحریر ''بازی'' بہت پسند آئی۔ اگرچہ شانی اور نومی نے فراڈ سے پیسا حاصل کیا مگر صابر جیسے برے انسان ... لڑکی کو بچانا اور خود پیچھا چھڑانا اور پھر صابر کا انجام سب دلچسپ لگے۔ تبتی خان کی ''فراموش'' بھی اچھی تھی۔ صبا مغل کی ''گمشدہ'' میں ... کا بیٹے دلاور کو ''کھو دینا'' اداس کر گیا۔ نشہ ہے ہی ایسی لعنت جو رشتوں تک کو بھلا دینے کی طاقت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے معاشرے ... سے بچائے، آمین۔ صائمہ دانش کی ''بے زبان'' میں بسٹر کی وفاداری کمال تھی۔ ''دیس پردیس'' کے اگلے حصے کا انتظار رہے گا، ... کترنیں اور محفل شعروسخن میں بھی انتخاب اچھے تھے۔ سسپنس اور اس کی پوری ٹیم کے لیے دعا گو۔''

✠ سید محی الدین اشفاق کی امید فتح پور لیہ سے۔ ''جو پچھلے برس پوری نہ ہو سکیں ان توقعات کے اگلے برس پورا ہونے کی امید لے کر 2025ء کا دسمبر رخصت ہوا۔ امید کا چراغ لے کر چلتے رہیں گے تو منزل اک دن نظر آ ہی جائے گی، ان شاء اللہ۔ ویسے ایک بات ہے، سال چند مہینوں میں گزرتا محسوس ہوتا ہے۔ یوں آیا اور یوں گیا۔ واقعی پلک جھپکتے میں ... رہا ہے۔ ہمیں بھی اپنے آپ کو وقت کی تیز رفتاری کے ساتھ چلتے ہوئے اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ آپ کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتے ہیں اس بات کا جائزہ لیں کہ گزشتہ برس اپنے شعبے، ادارے، خاندان اور ملک کے لیے کیا خدمات سرانجام دیں؟ اگر ''ہاں'' میں جواب ہے تو الحمدللہ ... آگے بڑھیں اور اگر ''نہ'' نظر آئے تو نئے سال میں اپنی ذات میں مثبت تبدیلیاں لائیں۔ قارئین، رائٹرز، ادارہ، پوری قوم کو نیا سال بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ پاک ارض پاک اور ہم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، آمین۔ 22 نومبر کو مل جانے والا شمارہ بڑے مزے سے پڑھا۔ انتظار کے بغیر رسالہ مل جانا کتنی خوشی کی بات ہے، اس سے مجھ جیسے سارے جنونی واقف ہوں گے۔ دانیال حسن چغتائی غیر حاضری کے بعد حاضر ہوتے ہی صدارت کے عہدے پر فائز ہو گئے، مبارک ہو۔ کبھی غیر حاضر نہ ہوا کریں، جتنے بھی مصروف ہوں، اپنوں کی محفل کے لیے وقت ضرور نکالا کریں۔ سیدہ روبینہ شاہین روبی صاحبہ! واقعی وقت جلدی گزر رہا ہے۔ کراچی والی روبینہ یعنی روبینہ اشعر نے بھی اچھا تبصرہ لکھا۔ رفعت مقصود کو ''جاری ہے'' پڑھ کر افسوس ہوا۔ رفعت صاحبہ! دراصل یہ ایک خوبصورت ''سازش'' ہے آپ کے خلاف کہ آپ ''جاری ہے'' کے آگے جانے کے لیے رسالے سے جڑی رہیں اور کتاب و رسالے کے شیدائیوں اور ادارے سے آپ کا قابل احترام رشتہ ''سازش کی کڑیوں'' میں ''جکڑا'' رہے، سمجھیں؟ ملک وحید شاہ نے مختصر لیکن تجزیاتی تبصرہ لکھا۔ پشاور سینٹرل جیل سے قیدی مبشر امیرہ کا تبصرہ پڑھنے کو ملا۔ گڈ! مطالعہ کرنا انسان کو مثبت راستوں پر لے جاتا ہے۔ ضرور مطالعہ کریں اور اس پر تبصرہ بھی کریں۔ عون احمد کو زیادہ انتظار کے بغیر شمارہ مل گیا، کیا بات...... بہت خوشی کی بات ہے۔ مخصوص انداز میں محفل کی شان بڑھاتے نظر آئے۔ ناہید سلطانہ اختر کی ''دیس پردیس'' کا دوسرا حصہ پڑھا۔ رجب علی کی غربت کے بارے میں پڑھنے کے بعد اس کی حالت میں تبدیلی اچھی لگی۔ خصوصاً بھابیوں اور سگے بھائیوں کے رویے میں بہتری اور رجب کو عزت دینا بڑا دلچسپ لگا۔ واقعی پیسا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اب رجب علی کے بارے میں مزید جاننے کے لیے اگلی قسط کا انتظار ہے کہ بیگم صاحبہ (مغرور و بدتمیز نشاط) کے آنے کے بعد وہ کیا کرتا ہے۔ کرن نعمان کی مختصر تحریر ''فراڈیا'' دکھی کر دینے والی کہانی تھی لیکن عرفان تایا سے لیا گیا انتقام سکون دے گیا۔

محمد فاروق انجم نے "بازی" کھیلی اور خوب کھیلی۔ اچھی کہانی تھی۔ عیوق بخاری نے "کند ذہن" بچے کی ذہانت بڑے اچھے انداز میں بیان کی۔ باپ سے محبت میں کند ذہن جمی اتنا ذہین ہوا کہ مشکل ترین کیس حل کر ڈالا۔ زبردست تحریر تھی۔ صبا مغل نے "گمشدہ" میں ایک معاشرتی ناسور کی طرف توجہ کروائی ہے۔ نشہ ایک لعنت ہے جس نے کئی گھر اجاڑے۔ بس خدا ہر کسی کی اولاد کو اس سے بچائے، آمین۔ باقی کہانیاں بھی دلچسپ ہیں۔ خالد حبیب خوشاب والے نے کیا خوب شعر بھجوایا۔ ان کے شعر کی تشریح اکثر اردگرد ملتی رہتی ہے۔ شازیہ حمیر نے کراچی اور فاروق سیال نے مری سے بہترین کترنیں بھیجیں۔ ایک بار پھر اپنے اور اپنوں کے لیے نئے برس کی مبارک باد بہت سی نیک خواہشات کے ساتھ۔"

سیدہ روبینہ شاہین روبی کی مبارک باد تھل ساؤتھ پنجاب سے۔ "2025ء رخصت ہوا۔ سب کو 2026ء کی بہت بہت مبارک ہو۔ دعا ہے کہ آنے والے سال میں وطن و اہلِ وطن کے لیے خوشی، ترقی، رزق میں فراوانی، کاروبار میں برکت، رشتوں میں مضبوطی و محبت و سیاسی حالات میں استحکام ہو۔ بے چینی، بے یقینی، بدامنی کا خاتمہ ہو اور پوری قوم کو کسی بھی ارضی و سماوی آفت کا سامنا نہ کرنا پڑے، آمین۔ یاد رکھیں، گزشتہ برس کی ناکامیوں کے بارے میں بالکل نہیں سوچنا۔ اداس یادوں کو دہرانے، دکھی ہونے کے بجائے آئندہ کامیابیاں حاصل کرنے کا عزم کرنے سے زندگی پرسکون و خوبصورت ہوتی ہے۔ بس سب یہی کریں۔ اللہ ہم پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے، آمین۔ خطوط کی محفل میں اقبال حسن چغتائی کرسی صدارت پر نظر آئے، مبارک ہو۔ بڑا اچھا تبصرہ لکھا۔ اپنی ہم نام روبینہ اشعر کا تبصرہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ سید محی الدین کی محفل کی حاضری بھی خوب رہی۔ خصوصاً ان کی دعا اچھی لگی جو انہوں نے کتاب سے محبت اور کتاب کے عروج کے لیے کی۔ دل کی گہرائیوں سے اس پر آمین۔ رفعت مقصود کی خوشی بھی دیکھنے کو ملی۔ بھئی لکھتی رہیں۔ یہ خوشی ان شاء اللہ ملتی رہے گی۔ عون احمد حقیقی تبدیلی کے منتظر ہیں اور اس کا انتظار ختم ہونے کی دعا کرتے ہیں کیونکہ اس طرح پوری قوم پر مثبت اثرات پڑیں گے۔ سیتا شاہ کی وطن کے لیے دعا پر آمین۔ فاروق انجم صاحب کی تحریر کا انتظار ادارے والوں نے ختم کر دیا ہے۔ قیدی مبشر امیرہ کا خط پڑھا، پڑھ کر احساس ہوا کہ کتاب دوست اور تبصرہ لکھنے میں دلچسپی رکھنے والے کہیں بھی ہوں، اپنی صلاحیت دکھا دیتے ہیں۔ ملک وحید حسبِ روایت مختصر انداز میں تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ چلو ہے تو اچھی بات ہے۔ صبا مغل کی "گمشدہ" اداس کر دینے والی تحریر تھی۔ نشے کے جال میں پھنس جانے والے بیٹے کی ماں کا حال دکھی کر گیا۔ اسلامی انداز میں تربیت اور بچوں پر نظر رکھنے سے ایسے المیوں سے بچا جا سکتا ہے۔ عیوق بخاری کی "کند ذہن" عمدہ تحریر تھی۔ جمی نے ایک مووی میں دیکھی گئی ایک بات کا جس طرح استعمال کیا، لاجواب تھا اور اپنے آپ کو ذہین ثابت کر دیا۔ کرن نعمان کی "فراڈیا" میں انتقام لینا بہت اچھا لگا۔ انسان کو ہمیشہ اپنے اردگرد کے ماحول، برے لوگوں، برے رشتے داروں سے چوکنا رہنا چاہیے۔ جس ماں کو لگے کہ کوئی قریبی رشتے دار اسے بری نظر سے دیکھتا ہے، اسے اپنی اولاد کو اس کی موجودگی میں کھڑے تک نہیں ہونے دینا چاہیے۔ عائشہ نصیر کی "دوسرا موقع" اور لبنیٰ خان کی "فراموش" اچھی تحاریر تھیں۔ ناہید سلطانہ اختر "دیس پردیس" کو خوب بیان کر رہی ہیں۔ رجب علی پیسوں اور بیوی والا ہو کر دیکھیں آگے کیا کرتا ہے۔ اس کہانی میں مصنفہ "روپے کو سلام" کی حقیقت کو بڑے اچھے طریقے سے بتا رہی ہیں۔ خانپور سے بھجوایا گیا مصباح علی کا شعر بہت پسند آیا۔ کترنیں ساری ہی خوبصورت تھیں۔ نئے برس کی نئی امیدوں، دعاؤں کے ساتھ ایک بار پھر نیا سال مبارک۔"

عون احمد، ملیر کراچی سے خط لکھ رہے ہیں۔ "سسپنس دسمبر کا شمارہ حسبِ معمول وقت پر موصول ہوا۔ سرورق پر خوبصورت آویزے پہنے خوش شکل سی حسینہ پوری آنکھیں کھول کر ہمیں دیکھ رہی ہے یا پھر تصویر کھنچنے کے انتظار میں ہے۔ ہم تو جون ایلیا کے انشائیے کی طرف بڑھ گئے جو کہ جون ایلیا صاحب کی دانشمندی اور علم و فراست کا آئینہ دار نظر آتا ہے۔ سسپنس کی سب سے پسندیدہ کہانی ہمارے لیے تو "رمز شناس" ہی ہے، لہٰذا آغاز اسی سے کیا۔ بہت بہترین انداز سے نازیہ کامران اس کہانی کو لے کر چل رہی ہیں۔ مختلف ادوار پر مشتمل واقعات بہت دلچسپ ہیں۔ آگے بڑھے تو سیدھے آخری صفحات پر موجود "دیس پردیس" نے راستہ روک لیا۔ ظاہر ہے پڑھے بغیر کیسے آگے جا سکتے تھے۔ ناہید سلطانہ اختر کی ہر کہانی بھرپور ہوتی ہے۔ اس میں بھی رجب کے آگے بڑھنے اور زندگی کی جدوجہد میں اپنے آپ کو منوانے کو خوبصورتی سے بیان کر رہی ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔ "دیس پردیس" کے بعد باری آئی "جنگ باز" کی تو کیا کہنے ہیں عبدالرب بھٹی کے، سہراب کے ساتھ ساتھ ہم بھی اس کے جنگ و جدل میں برابر شریک رہتے ہیں۔ آخر میں آپ نے نگہت کو زخمی کروا دیا ہے، دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے، بچت ہوتی ہے یا نہیں۔ "ظالم مظلوم" ظلم کی ایسی داستان جو کہ حقیقت پر مبنی ہے۔ اب لگتا ہے کہ پھولن پر لگے زخموں کے حساب کا وقت آ پہنچا ہے۔ وکرم اور پھولن مل کر اپنے اوپر کیے گئے ظلم کا جواب لیں گے۔ مزید یہ کہ چھوٹی کہانیاں بھی کچھ کم نہ تھیں۔ عیوق بخاری کی "کند ذہن" پڑھ کر اچھا لگا۔ بیٹے کی باپ سے محبت لاجواب رہی۔ مرزا امجد بیگ صاحب نے ایک مرتبہ پھر بڑے اچھے انداز میں کیس کو حل کیا اور رانی اور دیگر لوگوں کے پیسے واپس کروائے۔ کیس کو "ختم شد" کر کے ہی دم لیا۔ ضیا تسلیم بلگرامی روحانی کہانیاں

بہت اچھی طرح لکھتے ہیں۔ ”شاہ شجاع کرمانی“ کے بارے میں دوسرا حصہ پڑھ کر اچھا لگا۔ ایمان افروز واقعات پڑھ کر روحانی تازگی محسوس ہوئی۔ محمد فاروق انجم ”بازی“ لے کر آئے، بہترین کہانی۔ صابر بھائی کا انجام کچھ زیادہ ہی بھیانک دکھا دیا۔ خیر ان کی مرضی۔ شاعری والا حصہ ہم بہت دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کبھی اس میں حصہ بھی لے لیں۔ باقی کترنیں بھی خوب رہیں۔ اب آئندہ شمارے پر تبصرے کے ساتھ حاضری ہوگی، ان شاء اللہ۔“

✠ ملک وحید کا مختصر نامہ، کراچی سے۔ ”دسمبر کا سسپنس ڈائجسٹ جلد ہی مل گیا۔ ٹائٹل پسند آیا۔ فہرست پر نظر ڈالتے ہوئے جون ایلیا کا انشائیہ ”ایک طور“ پڑھا۔ خطوط کی محفل میں دانیال حسن چغتائی کو کرسی صدارت کی مبارک باد۔ دیگر احباب میں سیدہ روبینہ شاہین روبی، روبینہ اشعر، سید محی الدین اشفاق، رفعت مقصود، سیتا شاہ، عون احمد اور قیدی مبشرا میرہ کی حاضری اچھی رہی۔ کہانیوں میں زویا مفوان کی ”ظالم مظلوم“ کا پانچواں حصہ زبردست رہا۔ عائشہ نصیر کی ”دوسرا موقع“ پسند آئی۔ کرن نعمان کی تحریر ”فراڈیا“ اچھی رہی۔ ناہید سلطانہ اختر کی ”دیس پردیس“ زبردست جا رہی ہے۔ نازیہ کامران کاشف کی تحریر ”رمز شناس“ دلچسپ اور سنسنی خیز ہوگئی ہے، زبردست۔ مرزا امجد بیگ کی تحریر ”ختم شد“ زبردست رہی۔ عیوق بخاری کی کہانی ”کند ذہن“ متاثر کن تحریر تھی۔ اے آر راجپوت کی تحریر ”راز“ اچھی رہی۔ دیا خان یوسفزئی کی کہانی ”مصور“ بھی خوب رہی۔ محمد فاروق انجم کی ”بازی“ شاندار کہانی تھی۔ لبنیٰ خان کی ”فراموش“ پسند آئی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی ”شاہ شجاع کرمانی“ کا [illegible] اور آخری حصہ اچھا رہا۔ صبا مغل کی تحریر ”گمشدہ“ زبردست تحریر تھی۔ صائمہ دانش کی کہانی ”بے زبان“ پسند آئی۔ اس کے علاوہ محفلِ شعر و سخن میں [illegible] اشعار اور کترنوں کا انتخاب بھی خوب رہا۔ مجموعی طور پر رسالہ زبردست رہا۔“

✠ انجم فاروق [illegible] کا پچھلے شمارے پر تبصرہ، لاہور سے۔ ”امید ہے آپ اور ادارے کے دیگر احباب بخیر و عافیت ہوں گے۔ نومبر کا سسپنس خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ منظرِ عام پر آیا۔ اداریہ گفتگو روح عصر کی عکاسی کرتی ہوئی جامع اور بھرپور تھی۔ آپ کو مدیر کا عہدہ سنبھالنے پر مبارک باد، امید ہے [illegible] اپنے معیار کے ساتھ کامیابی سے آگے بڑھتا ہوا دکھائی دے گا۔ خطوط کی محفل خوب ہری بھری تھی۔ خط شائع کرنے کا شکریہ۔ ناضی کے آ[illegible] ”ظالم مظلوم“ خوب ہے۔ علاوہ ازیں رمز شناس، چیرہ دست، جنگ باز، دیس پردیس اچھی تحریریں ہیں۔ ”تلاش“ بھی خوب ہے۔ ”شاہ شجاع کرمانی“ ایمانی ولولہ گرما دینے والی تحریر تھی۔ باقی مختصر کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔ سسپنس کے آتے ہی بک اسٹالوں پر پرچہ سجا دیا جاتا ہے۔ ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ اپنے اصول و اقدار کے لحاظ سے منفرد ہے۔ مختصر کہانیاں جلد ہی بھیج دی جائیں گی (آپ کی کہانیاں مل گئی ہیں، اچھی [illegible] شاملِ اشاعت ہوں گی)۔“

✠ رفعت مقصود سیالکوٹ کینٹ سے خط لکھ رہی ہیں۔ ”دسمبر کا سسپنس ڈائجسٹ ملا۔ سرورق کی لڑکی دودھ ملائی پر پلی ہوئی لگ رہی تھی۔ جون ایلیا کا انشائیہ ”ایک طور“ کراچی کی موجودہ بری حالت کی منظر کشی کر رہا تھا۔ شہر میں مہنگائی اور بیروزگاری سے جرائم کی شرح بڑھ گئی ہے۔ اداریہ سال کے اختتام، پر امیدی، فلسطین پر اسرائیل کی فرعونیت اور مہنگائی [illegible] متعلق تھا۔ خوش امیدی بہت بڑی رحمت ہے۔ زویا مفوان کی ”ظالم مظلوم“ پڑھی۔ پھولن دیوی نے بہت ہمت سے سب کا مقابلہ کیا، وکرم نے اس کا بہت ساتھ دیا۔ اگلی قسط میں پتا چلے گا کہ وکرم کے مرنے کی خبر صحیح ہے یا غلط۔ ناہید سلطانہ اختر کی آخری صفحات کی کہانی ”دیس پردیس“ کا دوسرا حصہ پڑھا۔ رجب تو کچھ دن میں ہی گھر والوں کو بھول کر بیوی اور سسرال والوں کا ہوگیا۔ اب اگلی قسط میں دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔ عائشہ نصیر کی ”دوسرا موقع“ میں قسمت نے ایلانور کو اپنی غلطی کی سدھارنے کا موقع دیا اور اس نے بطور پیشہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ نازیہ کامران کاشف کی ”رمز شناس“ کی دسویں قسط بھی اچھی تھی۔ کرن نعمان کی کہانی ”فراڈیا“ اچھی تھی۔ مرزا امجد بیگ کی کہانی ”ختم شد“ دلچسپ ہے۔ اس میں [illegible] کو مرزا صاحب نے انصاف دلوا دیا۔ عیوق بخاری کی کہانی ”کند ذہن“ میں توجی بہت ذہین اور جاسوس نکلا۔ محفلِ شعر و سخن میں سب شعر اچھے تھے۔ اے آر راجپوت کی کہانی ”راز“ ایسے لوگوں کے متعلق تھی جن کے اپنے کسی برائی میں پھنسیں تو وہ دوسروں کو بھی برا سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر [illegible] کی ”جنگ باز“ کی چھیالیسویں قسط بھی ایکشن سے بھرپور اور سنسنی خیز تھی۔ دیا خان یوسفزئی کی کہانی ”مصور“ تنہائی میں شخصیت سازی کی کیفیت بیان کر رہی تھی۔ شدید تنہائی میں انسان خیالی پیکر تراش لیتا ہے۔ محمد فاروق انجم کی کہانی ”بازی“ نے تو صابر بھائی جیسے برے آدمی کی بازی پلٹ دی اور اس سے جان چھوٹی۔ لبنیٰ خان کی کہانی ”فراموش“ بڑھاپے میں یادداشت اور تنہائی کے متعلق اچھی تھی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کے ”شاہ شجاع کرمانی“ کے واقعات اچھے لگے۔ صبا مغل کی کہانی ”گمشدہ“ نے دکھی کر دیا۔ صائمہ دانش کی کہانی ”بے زبان“ پالتو جانوروں کی وفاداری پہ اچھی لگی۔“

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

محمد حسین، کراچی۔ ریاض احمد، پھالیہ۔ پرویز محمود، لیہ۔ صاحبزادہ نورالسلام، ملتان۔ سید خورشید احمد، راجن پور۔ ناہید یوسف، اسلام آباد۔ راحیل علی، کراچی۔ امتیاز احمد، پھالیہ۔ اعجاز احمد، گجرات۔ احسان اللہ، بھکر۔ فہم شوکت، میانوالی۔



ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

# ظالم مظلوم

زویا صفوان

چھٹا حصہ

تاریخ نے ثابت کیا ہے کہ جب ظلم حد سے بڑھ جاتا ہے تو مظلوم بھی ظالم بن جاتا ہے لیکن... اس کی شخصیت کے کئی روپ بھی سامنے آتے ہیں... جسے دنیا دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے... وہ معصوم بچی جسے اپنے بھگوان سے چھوٹا سا شکوہ تھا کہ اسے حُسن کی ذرا سی خیرات سے بھی ترسادیا... معمولی شکل وصورت کی حامل یہ بچی آگے چل کر کیا قیامت برپا کرسکتی ہے کسی کو خبر نہ تھی... تاریخ میں اس ہستی کا نام پھولن دیوی کے نام سے رقم ہے جسے زمانے کے ظلم وستم نے اس راہ کا مسافر بنادیا جہاں بچے اپنے بچپن کو بہت پہلے خیرباد کہہ دیتے ہیں... اس نے بھی بہت چھوٹی عمر سے گرم سرد موسموں کا مقابلہ کیا اور ساتھ ہی آنکھوں میں بسنے والے خوابوں کی بھی حفاظت کرتی رہی... اور جب ظلم حد سے سوا ہوا تو اس بچی نے پھولن دیوی کا روپ دھارلیا۔

پھولن کی بدحواسی اعصابی انتشار میں تبدیل ہونے لگی تھی۔ وکرم کا خیال رگ وپے میں حشر برپا کررہا تھا۔ وہ متوحش نگاہوں سے وارے لال کی جانب دیکھنے لگی جو خلافِ توقع نہایت پرسکون دکھائی دے رہا تھا۔

"چاچا! یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں...... وکرم......! یہ سب کیا ہوگیا؟" وہ ہیجان زدہ تھی۔

"جھوٹ بول رہے ہیں۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"لیکن...... وکرم...... کہیں اس ڈاکٹر نے تو...... مخبری......" پھولن اپنی بات مکمل کرنے سے قاصر تھی۔

وارے لال کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ رینگ گئی۔

"ہمارے رفیق ہی رام پال اسے وہاں سے کسی سرکھشت ٹھکانے پر لے گیا تھا۔ وہ وہاں بالکل ٹھیک ہوگا۔"

"مجھے کیوں نہیں بتایا؟" وہ ٹھٹک گئی۔

"وکرم نے ہی منع کیا تھا۔ تمہیں بتاتے تو تم اس کے ساتھ جانے کی ضد کرتیں۔" اس نے انکشاف کیا۔

"تو اس میں غلط ہی کیا تھا؟ وہ اکیلا ہے، گھائل بھی ہے۔ اس کا خیال کون رکھے گا؟" پھولن مضطرب تھی۔

وارے لال نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور سنجیدگی سے کہنے لگا۔ "ایک ڈکیت اپنے زخموں اور تکلیفوں کا علاج خود کرنا جانتا ہے۔ عورت کا ساتھ اور عادت اسے کمزور بنا دیتے ہیں۔ کیا تم اسے کمزور کرنا چاہتی ہو؟"

پھولن نے بلاتامل نفی میں سر ہلا دیا۔

"تم ابھی ناسمجھ ہو۔" وارے لال نے ایک توقف کے بعد کہا۔ "جیون میں کبھی کٹھن فیصلے لینے پڑتے ہیں۔ اس سمے وکرم اور تمہارا الگ رہنا ہی ضروری ہے۔ پولیس ایسے کسی جوڑے کی تلاش میں ہوگی جو وکرم ملاح اور پھولن دیوی جیسا لگتا ہو۔ وہ کئی بے گناہوں کو بھی پکڑیں گے۔"

پھولن کے فہم میں یہ بات سما گئی۔ اس نے پرسوچ انداز میں استفسار کیا۔

"پھر تو تمہیں یہ بھی جانکاری ہوگی کہ وہ لوگ کہاں چھپے ہیں؟"

"ہاں، میں جانتا ہوں۔" اس نے اعتراف کیا اور ملائمت سے کہنے لگا۔ "تم بہت بہادر ہو پھولن! تم نے اپنے جیون میں بہت کشٹ اٹھائے ہیں۔ ہمارے ساتھ بھی بہت دلیری سے رہ رہی ہو لیکن یہ پولیس کی اپنی ہی ایک راج نیتی ہوتی ہے۔ اسے سمجھنے میں ابھی سمے لگے گا۔ دھیرج سے کام لینا سیکھو۔"

پھولن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ گوہانی گاؤں کے اس حصے میں پہنچ گئے تھے جہاں ایک پنگھٹ کے پاس پولیس خیمہ زن تھی۔ نصف درجن کے قریب سپاہی نہایت مستعدی سے ہر آنے جانے والے کا جائزہ لے رہے تھے۔

"یہ ابھی کون گزرا ہے سامنے سے؟" خیمے میں نیم دراز ایک اہلکار نے تان لگائی۔ وہ ایک مرد وعورت کی جھلک دیکھ کر چونک گیا تھا۔

"ایک چھوٹے سے قد کی عورت ہے۔ کسی ٹھاکر کے ساتھ جارہی ہے۔" سپاہی نے بتایا۔

وارے لال کے ہونٹوں پر تمسخرانہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ وہ لمبے ڈگ بھرتے وکرم کے چچا کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے جہاں ایک حیرت وصدمہ ان کا منتظر تھا۔ اس شخص نے وکرم کی جانب سے سونپی گئی کسی بھی امانت سے انکار کردیا تھا۔

"مجھے وکرم نے خود بتایا تھا کہ اس نے تمہارے پاس پچاس ہزار روپے رکھوائے تھے۔" پھولن چیخ گئی۔

"تم نے کوئی سپنا دیکھا ہوگا۔ میرے پاس کوئی پیسا نہیں ہے۔" اس نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

وارے لال کی جہاندیدہ نگاہوں نے اس کی بدنیتی جانچ لی تھی۔ اس جیسے شخص سے کوئی بعید نہ تھا کہ وہ پہرے پر تعینات پولیس اہلکاروں کو ان کے بارے میں کوئی سُن گُن دے دیتا۔ اس کی آنکھوں کے خفیف اشارے سے پھولن کو روانگی کا عندیہ ملا اور چند ہی گلیوں کے فاصلے پر موجود وکرم کے آبائی گھر کی سمت بڑھ گئے۔ شومئ قسمت اس گلی کے باہر تعینات سپاہی دیوار سے ٹیک لگا کر اپنی رائفل تھامے اونگھ رہا تھا۔ وارے لال اور پھولن کے لیے اسے چکمادے کر نکلنا بالکل مشکل ثابت نہ ہوا۔

وکرم کے والدین کو ان کی آمد اور بیٹے کے بخیریت ہونے کی خبر نے شادیٔ مرگ میں مبتلا کردیا۔

"پولیس والوں نے ہمیں اس کی تصویریں دکھائی تھیں۔ ہم وشواس کرنے پر مجبور ہوگئے۔" وکرم کے والد کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

پھولن اس کی کیفیت پر افسردہ ہوگئی اور ایک توقف سے کہنے لگی۔ "سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابھی کس کی بات پر وشواس ہے؟ میری یا ان پولیس والوں کی؟"

"وہ ٹھیک تو ہیں نا؟" وکرم کی پہلی بیوی نے مضطرب ہوکر دریافت کیا۔

"چنتا کی بات نہیں ہے۔" وارے لال نے جواب دیا۔ "خون بہت بہہ گیا تھا۔ کوئی بھی ڈاکٹر علاج کے لیے تیار نہیں تھا۔ گولیاں نکالنے میں بہت پیسے لگے۔ اب بھی پولیس سے چھپنے اور اپنی سرکھشا کے لیے روپے چاہیے ہیں۔ گھر میں جو بھی جمع پونجی ہے، ہمیں دے دو۔"

وارے لال کی اس فرمائش پر وکرم کے والدین کی رنگت متغیر ہوگئی۔

"روپے تو نہیں ہیں۔" والدہ نے بدقت کہا۔

پھولن کے اعصاب جھنجھنا کر رہ گئے تاہم وارے لال کی جہاندیدگی اس بات سے آگاہ تھی کہ وہ دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہی۔ وکرم کا خاندان کثیر الافراد تھا۔ اس کی تین بڑی بہنیں شادی شدہ تھیں۔ وکرم کے بعد رام پال ایک معمولی استاد کی ملازمت کرتا تھا۔ ان کے علاوہ مزید دو بھائیوں اور تین بہنوں کی کفالت کا ذمہ بھی شامل تھا۔ درجن بھر سے زائد ان افراد کے کنبے میں بچت ایک ناممکن امر تھی۔

مایوسی اور شکستگی کے زیر اثر ان کی اگلی منزل ایک قریبی گاؤں تھا جہاں وکرم کی پھوپی رہائش پذیر تھی۔ وہ بھی بھتیجے کی موت کی خبر پر یقین کر چکی تھی تاہم بھتیجے کو سامنے آتے ہی اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو رواں ہو گئے۔

"ہمیں اس سمے پچاس ہزار روپے کی سخت ضرورت ہے۔" وارے لال نے مدعا بیان کیا۔

"لیکن وکرم تو یہاں کبھی آیا ہی نہیں۔" اس نے فوراً پینترا بدل لیا۔

"اس نے مجھے خود بتایا تھا کہ وہ تمہیں پانچ لاکھ روپے دے کر گیا تھا۔" پھولن نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"درگا میا کی قسم! میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔" وہ اپنے مؤقف پر قائم تھی۔

پھولن اور وارے لال شدید بے بسی محسوس کرنے لگے۔ پھولن کی نگاہوں میں طیش دیکھ کر اس نے اپنے بدن سے طلائی ہار، بندے اور چوڑیاں اتار کر اسے تھما دیں۔

"میرے پاس بس یہی کچھ ہے۔"

وارے لال نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا اور زیورات تھام لیے۔ پھولن نے گھر سے نکلتے ہی پژمردگی سے کہا۔ "ہمیں اس سے یہ گہنے نہیں لینے چاہیے تھے۔"

وارے لال تلخی سے مسکرایا اور سر جھٹکتے ہوئے کہنے لگا۔ "گہنے عورت کی جان ہوتے ہیں۔ وہ اسے اتنی آسانی سے اپنے شریر سے الگ نہیں کرتی۔ اس نے یہ گہنے ہمیں دیے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ وہ کسی بڑے نقصان سے بچنے کے لیے چھوٹا نقصان کر رہی ہے۔"

پھولن رشتوں کی اس بے قدری اور مادیت پرستی پر افسردہ ہوگئی۔ اسی لمحے اس کے ذہن میں برق کی طرح ایک خیال کوندا۔ اس نے آن ہی آن میں ایک فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

وارے لال اور پھولن ایک گھاٹ پر موجود تھے۔ وہ ایک طویل سفر کے بعد یہاں پہنچے تھے۔ وارے لال نے گاؤں کی حدود میں قدم رکھنے سے پہلے پھولن کی جانب دیکھا اور سنجیدگی سے مستفسر ہوا۔

"ایک بار پھر سوچ لے پھولن!"

"سوچنے سمجھنے کا سمے نہیں ہے۔ اب تو کرنا ہے یا مرنا ہے۔" وہ پُرعزم تھی۔

"بہت بڑا خطرہ اٹھانے جا رہی ہے۔"

"جانتی ہوں۔" اس نے اپنے ہونٹ کچلے۔ "لیکن وکرم کے جیون اور سرکھشا کے لیے سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

وارے لال لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوگیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ میادین اور پردھان سے رقم حاصل کرنے کا خیال ابتدا میں تو بچکانہ محسوس ہوا تھا تاہم پھولن نے اسے کسی نہ کسی طور قائل کر ہی لیا تھا۔

"ہمارے پاس ہتھیار ہیں نہ ہی ساتھی۔ وہ کس طرح پیسے دیں گے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ پولیس کو خبر کر دیں۔" وارے لال نے اس کا منصوبہ سنتے ہی کہا تھا۔

"ہمارے پاس ایک بہت بڑا ہتھیار موجود تو ہے۔" وہ معنی خیزی سے مسکرائی۔ "ڈر کا ہتھیار...... ہمیں پیسے مل جائیں گے۔"

وارے لال نیم رضامند دکھائی دینے لگا۔ وہ دونوں ایک بار پھر طویل مسافت طے کرتے ہوئے "گوڑھا" نامی علاقے میں پہنچ گئے جو پھولن کے گاؤں سے چند میل کے فاصلے پر ہی واقع تھا۔ وارے لال نے ایک آدمی کے توسط سے سرپنچ کو یہ پیغام پہنچا دیا کہ پھولن دیوی واپس آ گئی ہے۔

یہ قدم اٹھانے کے بعد دونوں ہی ہزار ہا خدشات میں مبتلا تھے۔ میادین کی کینہ پروری اور منتقم مزاجی سے بعید نہ تھا کہ وہ پولیس کو ان کی گوڑھا میں موجودگی سے مطلع کر دیتے تاہم یہ حربہ کارگر ہی ثابت ہوا۔ میادین، سرپنچ اور پردھان، پھولن کے طے شدہ مقام پر ملاقات کے لیے پہنچ گئے۔

پھولن نے گندم کے اس کھیت میں نہایت اعتماد اور دبدبے سے ان سب کا استقبال کیا۔ وہ انہیں یہ تاثر دینے

میں بھی مکمل کامیاب رہی تھی کہ گروہ کے دیگر ساتھی کھیت کے آس پاس ہی مورچا زن ہیں۔ میادین کی دید نے اس کے سابقہ تمام تر زخم ہرے کردیے تھے تاہم اس نے وکرم کی ہدایات کے مطابق ضبط کا دامن تھامے رکھا۔ میادین اس کے قدموں میں بیٹھ کر فدویانہ انداز میں کہنے لگا۔

"مجھے پورا وشواس تھا کہ وکرم کو کچھ نہیں ہوا ہوگا۔ میری بھگوان سے یہی پرارتھنا تھی کہ وکرم کی صحت اچھی ہو جائے۔"

"پیسے لائے ہو یا نہیں؟" اس نے میادین کو ایک ٹھوکر سے پیچھے دھکیلا۔

"بالکل... لے آیا ہوں۔" وہ اپنے لباس سے ایک پوٹلی برآمد کرنے لگا۔

سرپنچ اور پردھان نے بھی پھولن کے سامنے جھکتے ہوئے رقم تھمادی۔

وارے لال کے چہرے پر [illegible]، آسودگی اور مرعوبیت جھلکنے لگی۔ وہ ان تینوں افراد سے تیس ہزار روپے حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ ایک پھولن کی فیصلہ سازی اور اپنے مقابل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر محض خوف کی بنا پر قائل کرلینے کی صلاحیت نے بھی متاثر کیا تھا۔ وہ حقیقتاً وکرم کی وفادار اور مخلص ثابت ہوئی تھی۔

میادین، سرپنچ اور پردھان کی واپسی کے بعد گوڑھا گاؤں کا سرپنچ ان کے پاس چلا آیا۔

"ہمارے گاؤں کے لوگوں نے بھی وکرم کے لیے تھوڑے پیسے جمع کیے ہیں۔" وہ رسان سے کہنے لگا۔ "ان سیٹھ لوگوں کی طرح بہت زیادہ تو نہیں ہیں، ہر گھر سے سو، دو سو روپے اکٹھے ہوئے ہیں۔"

"اس کی ضرورت نہیں تھی۔" وارے لال نے خلوص سے جواب دیا۔

"ان سب نے اپنی خوشی سے یہ سب کیا ہے۔ وکرم نے ہم لوگوں کی بہت سہائتا کی ہے۔ اسی کے ڈر سے ٹھاکروں نے ہماری لڑکیوں پر میلی نظریں ڈالنا بند کی تھیں۔ وہ نہ ہوتا تو آج ہماری بہن، بیٹیوں کی عزت بھی محفوظ نہ ہوتی۔"

سرپنچ کی اس بات پر پھولن کا دل گداز ہوگیا۔ ٹھاکروں کی اجارہ داری اور بدنیتی کے متعلق اس سے زیادہ بھلا کسے واقفیت ہوسکتی ہے۔ وہ وکرم کے لیے مزید محبت اور خودسپردگی محسوس کرنے لگی۔

☆☆☆

رقم کا بہترین انتظام ہوتے ہی وارے لال اور پھولن اپنے ساتھیوں سے ملاقات کے لیے روانہ ہوگئے۔ گروہ کے وہ بھی افراد انہیں اپنے سامنے دیکھ کر شادیٔ مرگ کی کیفیت میں مبتلا دکھائی دینے لگے۔

"کیا تم سچ کہہ رہے ہو پھول سنگھ؟" رگھو نے استفسار کیا۔ "کیا وکرم جیوت ہے؟"

پھولن نے انہیں بلاکم وکاست تمام تر صورتِ حال سے آگاہ کردیا۔

"ہم نے اخبار میں پڑھا تھا کہ پولیس نے پہاڑوں میں ہی وکرم کا کریا کرم کردیا۔ انہوں نے کسی پکے سرکاری کاغذ پر اس کے ماتا پتا سے انگوٹھے کے نشان بھی لگوائے ہیں۔ پھر خبر آئی کہ سری رام اور لالہ رام کے حملے کا ڈر ہے۔ اس لیے وکرم کے گاؤں میں پولیس کا پہرا بٹھادیا گیا ہے۔" کمار نے تفصیل بتائی۔

"پولیس جھوٹ بول رہی ہے۔ تم سب حوصلہ رکھنا۔ ہم نے کافی پیسا اکٹھا کرلیا ہے۔ اب وکرم کے پاس جانا ضروری ہے۔" وارے لال نے کہا۔

"اپنے ساتھ کوئی رائفل بھی لے جاؤ۔ خالی ہاتھ سفر کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ پولیس کتوں کی طرح تم لوگوں کی بو سونگھتی پھر رہی ہے۔" رگھو نے تجویز دی۔

"ان حالات میں رائفل لے کر سفر کیسے کریں گے؟"

[illegible]

کچھ لوگوں کی بحث وتمحیص کے بعد وارے لال کو بالآخر قائل کرلیا گیا۔ اس مختصر ملاقات کے بعد وہ ایک بار پھر سفر پر روانہ ہوگئے۔ انہیں جلد از جلد اس گاؤں میں پہنچنا تھا جہاں وکرم اور رام اپنے ایک دکاندار کے ہاں روپوش تھے۔

اس مسافت کا آغاز ہی ہولناک ثابت ہوا۔ وارے لال اور پھولن نے کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ انہیں کچھ ملاّح محوِ گفتگو دکھائی دیے۔ وہ بے نیازی سے آگے بڑھنے لگے تھے کہ وکرم اور پھولن دیوی کے ناموں کی بازگشت نے انہیں چونکا دیا۔ وارے لال نے غیر اختیاری طور پر اپنی رفتار میں کمی کردی۔

"وشواس نہیں ہوتا۔ کیا یہ بات سچ ہے؟" ایک ملاّح نے حیرت سے کہا۔

"سو پرتیشت سچ ہے۔" دوسرے شخص نے اعتماد سے جواب دیا۔ "پولیس نے وکرم ملاّح کے بھائی سکھ پال کو گرفتار کرلیا ہے۔ پھولن دیوی بھی جلد قابو میں آجائے گی۔ یہیں کہیں چھپی ہوئی ہے۔"

"مجھے وکرم ملاّح کے مرنے کا بہت دکھ ہے۔ وہ اپنی

''جاتی'' کے لوگوں کی رکھشا کرتا تھا۔ اس کے ڈر سے ٹھاکر ہماری بہو بیٹیوں کو میلی آنکھ سے نہیں دیکھتے تھے۔'' ایک اور ملاح نے آزردگی سے کہا۔

''سکھ پال کیسے گرفتار ہوگیا؟ وہ تو نردوش ہے۔ پولیس اس پر اتیاچار کرے گی تو اس سے وکرم واپس کہاں آئے گا؟'' پہلے ملاح نے تاسف جتایا۔

''انہیں پھولن دیوی کی تلاش ہے۔ سنا ہے وہ کسی اور ڈکیت کے ساتھ اسی علاقے میں دیکھی گئی ہے۔ اس نے نیلے رنگ کی ساڑی پہنی ہوئی ہے۔'' دوسرے ملاح نے مزید بتایا۔

''یہ بات پولیس کو کیسے پتا چلی بھلا؟'' تیسرا ملاح الجھ گیا۔

''صاف سی بات ہے۔ ان کے اپنے ہی کسی بندے نے مخبری کی ہے۔ پولیس نے پھولن دیوی کی اطلاع دینے والے کو دس ہزار اور اس کے ساتھی پر پانچ ہزار روپے کا انعام رکھا ہے۔'' باخبر ملاح نے گہری سانس لی۔

''اتنے پیسوں کے لیے تو کوئی بھی ان کا مرم بیچ دے گا۔'' دیگر ساتھی بھی اسی کیفیت میں مبتلا تھے۔

وارے لال اور پھولن مضطرب ہوگئے۔ وارے لال نے محتاط نگاہوں سے قرب وجوار کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''آگے بڑھنے میں سخت خطرہ ہے۔ ہمیں کچھ اور سوچنا ہوگا۔''

''وکرم ہمارا انتظار کررہا ہوگا۔'' پھولن اس سے ملاقات کے لیے بے تاب تھی۔

''ہمیں اس کے پاس جیوت پہنچنا ہے۔ دھیرج سے کام لو اور جیسا میں کہتا ہوں، ویسا ہی کرو۔'' وارے لال نے سختی سے کہا۔

پھولن نے چاروناچار اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

مادھو ایک درخت کے ساتھ پشت لگائے خالی الذہنی کے عالم میں بیٹھا تھا۔ اس کی کیفیت دیکھ کر بھرت نے ملائمت سے کہا۔ ''کس وچار میں کھویا ہے؟''

''جیون میں وچاروں کے سوا اور باقی ہی کیا ہے؟'' اس نے بوجھل سانس لی۔

''سچ کہہ رہا ہے۔'' بھرت نے تائید کی۔ ''میں نے بھی ایسے جیون کی کبھی کلپنا نہیں کی تھی۔''

''کاش وہ سمے پھر سے لوٹ آئے۔ ماں کا پیار، باپو کی ڈانٹ، بہن بھائیوں کے جھگڑے، مذاق مستی اور......'' مادھو نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''اور کیا؟'' بھرت نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ اس کی ذہنی کیفیت بھانپ گیا تھا۔

''کسوما کا پیار۔'' اس نے حسب توقع جواب دیا۔

''دیکھ مادھو! وہ سب بھول جا، یہی بہتر ہے۔'' بھرت مضطرب ہوا۔

''کیا تو اپنا پچھلا جیون بھول سکتا ہے؟'' وہ جز بز ہوا۔

''نہیں...... لیکن کسوما کا معاملہ اور ہے۔'' اس نے سمجھانا چاہا۔

''مجھے تجھ سے یہ آشا نہیں تھی۔'' مادھو نے شکوہ کناں نگاہوں سے اسے دیکھا۔

بھرت اس کی کیفیت پر مزید مضطرب ہوگیا۔ مادھو کی زندگی بے حد تلاطم خیز رہی تھی۔ وہ ایک ذہین اور ہونہار لڑکا تھا۔ اسے اوائل عمری سے ہی پڑھائی لکھائی اور اعلیٰ ملازمت حاصل کرنے کا شوق تھا۔ اس کے اساتذہ کی نگاہوں میں بھی یہی خواب بسیرا کیے ہوئے تھے۔ وہ اس کی ذہانت اور لیاقت کے قائل تھے۔ زندگی بے حد پرسکون اور ہموار تھی کہ یکا یک ایک ہولناک آندھی نے ان سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اس تبدیلی کا آغاز مادھو کی قلبی کیفیت میں پیدا ہونے والے تلاطم سے ہوا۔ اسے کسوما نامی ایک ایسی لڑکی سے محبت ہوگئی تھی جس کا تعلق غیر اور اعلیٰ برادری سے تھا۔ ان دونوں کی محبت طشت ازبام ہوتے ہی وہی ہوا جو ازل سے ہوتا آیا ہے۔ کسوما کے والدین نے اس کی فی الفور شادی کردی تاہم وہ مادھو کو فراموش کردینے میں ناکام رہی۔ ان دونوں کی چوری چھپے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا اور نتیجتاً وہ بہتر مستقبل کی تلاش میں شادی کرلینے کی نیت سے فرار ہوگئے۔

کسوما کے اہلِ خانہ اپنی برتری و طاقت کے زعم میں یہ ''گناہ'' معاف کردینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انہوں نے مادھو پر اپنی بیٹی کے اغوا کا مقدمہ درج کروایا اور اس کے ایک چچا کو اغوا کرکے خاندان کی دیگر لڑکیوں کو بھی جنسی استحصال کا نشانہ بنایا۔ ان خواتین میں وکرم کی بہنیں بھی شامل تھیں۔ اس وقت ان دونوں کی عمر سولہ برس تھی۔ انہوں نے اپنے چچا کے غیاب، خاندان پر ڈھائے جانے والے مظالم کا انتقام لینے کے لیے ہتھیار اٹھالیے۔ ان کی پہلی ہی کارروائی میں مخالف گروہ کے تین افراد ہلاک ہوگئے۔ انتقام در انتقام کا یہ سلسلہ بالآخر انہیں ڈاکا زنی کی راہ پر لے آیا تھا۔

بھرت اس کے ماضی کی ان پُرپیچ راہوں سے بخوبی آگاہ تھا۔ وہ اس کی ذہنی وقلبی کیفیات سے بھی آشنا تھا۔ پھولن اور وکرم کی باہمی رفاقت، محبت اور احترام دیکھتے ہوئے ان سبھی کے دلوں میں ایک شریکِ حیات کی تمنا مچلتی تھی۔ وہ بھی اپنی بے کیف زندگی سے فرحت وسرور حاصل کرنا چاہتے تھے تاہم اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ ایسی کوئی بھی کوشش ان کے لیے کس قدر مہلک ثابت ہوسکتی ہے۔

اس حقیقت سے قطع نظر بھرت، کسوما کے متعلق چند خدشات کا شکار تھا۔ وہ پھولن کی آمد سے قبل کچھ عرصہ ان کے ساتھ مقیم رہی تھی۔ اسی قیام کے دوران اسے کسوما کی آنکھوں میں بے باکی دکھائی دی تھی۔ اس کے علاوہ بھرت ذاتی طور پر بھی یہی سوچتا تھا کہ شادی جیسے مقدس بندھن میں منسلک ہوجانے کے بعد کسوما کو اپنے شوہر سے وفادار رہنا چاہیے تھا۔ اس کی کمزوری اور عاقبت نااندیشی نے کئی ایک زندگیاں برباد کردی تھیں۔

بھرت نے کچھ لمحوں کے لیے توقف کیا اور سنجیدگی سے کہنے لگا۔ ”میں تیرے بھلے کے لیے ہی کہہ رہا تھا۔ مستانہ کے بعد حالات یوں بھی بہت تبدیل ہوگئے ہیں۔“

”مجھے تیری نیت پر شک نہیں ہے یار!“ وہ جھلایا۔ ”لیکن اس سمے کسوما سے ملنا بہت ضروری ہے۔ اس نے سندیس بھجوایا ہے کہ ہمارے پریم کی نشانی دنیا میں آنے والی ہے۔“

بھرت اس انکشاف پر ساکت رہ گیا۔

”کیا تو سچ کہہ رہا ہے؟ کہیں اس خبر میں پولیس کی کوئی چال نہ ہو۔“

”نہیں۔ کوئی چال نہیں ہے۔ یہ خبر بالکل سچی ہے۔ میں کچھ سے پہلے چوری چھپے کسوما سے ملنے گیا تھا۔“ اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑتے ہوئے ہونٹ بھینچ لیے۔

بھرت لمحہ بھر کے لیے کچھ بھی کہنے سے قاصر رہا۔

”میں کسوما سے ملنے دہلی جاؤں گا۔“ مادھو نے اسے خاموش دیکھ کر اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔

”بہت خطرہ ہے۔“ بھرت نے سمجھانا چاہا۔ ”پولیس نے ہم سب کے سر پر انعام رکھا ہوا ہے۔“

”مجھے پروا نہیں۔ اس سمے کسوما کو میری ضرورت ہے۔“ وہ مصر رہا۔

”ٹھیک ہے، پھر تو اکیلا نہیں جائے گا۔ میں بھی تیرے ساتھ جاؤں گا۔“ بھرت نے لمحاتی توقف کے بعد دو ٹوک کہا۔

مادھو نے کچھ سوچ بچار کے بعد اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ دونوں اسی شام دہلی کے لیے عازمِ سفر ہوگئے۔ بس میں سوار ہوتے ہی بھرت کے تمام تر خدشات مجسم روپ اختیار کرگئے۔ انہیں پولیس اہلکاروں کی بھاری نفری نے گھیرنے کے بعد عدم روانہ کردیا۔

☆☆☆

وکرم کی بے چینی دھیرے دھیرے وحشت کا روپ اختیار کرنے لگی تھی۔ وہ اپنی صحت یابی میں تاخیر کے علاوہ پھولن اور وارے لال کے تاحال غیاب پر بھی تشویش مند تھا۔ پھولن کی روانگی کو تین دن بیت چکے تھے۔ ان کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ اس کے علاوہ وکرم اپنی حالت کے متعلق بھی سخت بیزار تھا۔ گولیاں لگنے کے بعد جراحی کے مرحلے تک اس کے بدن سے اس قدر خون کا اخراج ہوا تھا کہ نقاہت نے تاحال غلبہ پایا ہوا تھا۔ کمر میں گولی کا ذرہ رہ جانے کے باعث زخم بگڑ جانے کا اندیشہ بھی ایک آزار بنا ہوا تھا۔ وکرم کو دن رات یہی فکر کھائے جارہی تھی کہ وہ ماضی کی طرح آزادانہ نقل وحرکت کرنے اور جنگل در جنگل گھومنے کے ساتھ ڈاکا زنی کے مراحل میں کامیاب ہو پائے گا یا نہیں؟

سری رام پال بھی اس کی حالت پر بہت مضطرب تھا۔ وہ فطری طور پر ایک بزدل اور کم ہمت شخص تھا۔ اس کا اپنے بھائی کے لیے یہاں تک چلے آنا اور تعاون کرنا ہی بہت غنیمت تھا۔ اس پر مستزاد ان کے میزبان کا شمار بھی اسی فہرست میں ہوتا تھا۔ اس نے سابقہ مراسم کے باعث پناہ تو دے دی تھی لیکن وکرم کے لیے ضروریات ڈھونڈنے کا کام کرنے میں حواس باختہ ہوجاتا تھا۔

بیرونی دنیا سے رابطے میں تعطل، پھولن کے غیاب، سری رام کی اس حرکت اور اپنی طبیعت میں تغیرات وکرم کے مزاج میں تلخی پیدا کررہے تھے۔ اس آزار وکوفت کا خاتمہ پھولن اور وارے لال کی چوتھے روز آمد پر ہوا۔ وکرم انہیں دیکھتے ہی بے تابی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”کہاں رہ گئے تھے تم لوگ؟“ وہ ہیجان زدہ ہونے لگا۔

”اپنا بیاہ رچانے گیا تھا۔ میری لگائی آنے ہی نہیں دے رہی تھی۔“ وارے لال نے نرم انداز میں چوٹ کی۔

وکرم اس جواب پر کھسیا کر رہ گیا۔

”مجھے تم لوگوں کی چنتا ہو رہی تھی۔“

وارے لال نے گہری سانس لی اور اپنی پیشانی مسلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”حالات بہت خراب ہوچکے ہیں مستانہ!

سب کچھ بکھر گیا ہے۔''

''ہم بہت مشکل سے یہاں پہنچے ہیں۔'' پھولن نے گفتگو میں حصہ لیا۔ ''ہر ایک موڑ پر یہی لگتا تھا کہ انتم سمے آ گیا ہے۔''

''پولیس نے کسی چرواہے کو تمہاری لاش بنا کر انتم سنسکار کر دیا۔'' وارے لال نے بتایا۔ ''تمہارے ماتا پتا، بہن بھائیوں کو اس خبر نے بہت دکھ دیا۔ وہ تو اسے سچ سمجھے بیٹھے تھے۔ اب بھی ہر جگہ پولیس نے ناکے لگا رکھے ہیں۔ ہمیں آنے میں دیر بھی اسی لیے ہوئی کہ ''کوٹھی شالہ'' میں ہم دونوں کو الگ ہونا پڑا۔ وہاں کے پردھان نے ہماری بہت مدد کی، پھر ہمیں کپڑوں کا دوسرا جوڑا دیا۔ سنا تھا کہ پولیس کے چھ ایس پی ہمارے باقی ساتھیوں کو بھی سورگ باش کرنے کے لیے پولیس والے ... میں اپنے سپاہی لے کر آئے ہیں۔ کیا کیا بتاؤں اب ...''

''ہمارے سب ساتھی ٹھیک تو ہیں نا؟'' وہ مضطرب ہوا۔

''میں نے کہا نا مستانہ! کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ جب برا سمے آتا ہے تو بھاگیہ ہر طرف سے ٹھوکر لگنے لگتا ہے۔ سب سے پہلے تو تمہارے چاچا اور پھوپا نے پیسے دینے سے انکار کر دیا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ تم ان سے ملتے بھی نہیں۔ اس کے بعد پولیس نے سکھ پال کو گرفتار کر لیا۔ ہمارے ساتھیوں میں سے ''راکیش'' کی ہمت بھی ٹوٹ گئی۔ اس نے پولیس کے ہاتھ چڑھتے ہی اپنا منہ کھول دیا اور......'' وہ آزردگی سے خاموش ہوا اور بوجھل دل سے ایک اخبار اس کے سامنے کر دیا۔

وکرم کی متوحش نگاہیں بھرت اور مادھو کی لہولہان لاشوں کی تصویر پر گڑی تھیں۔ اسے اپنا دل کسی بھاری چٹان تلے دبا محسوس ہونے لگا۔

''یہ...... سب...... کیسے...... ہوا؟'' اس کی آواز مرتعش تھی۔

''تمہیں مادھو کی کمزوری کا پتا نہیں کیا؟'' وارے لال نے تاسف سے کہا۔

''کسوما؟'' وکرم کے لبوں نے بے آواز جنبش کی۔

اگلے کچھ لمحے ان کے درمیان سکوت حائل ہو گیا۔ وکرم ان انکشافات کا بوجھ برداشت ہی نہیں کر پا رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر آبدیدہ نگاہوں سے بھرت اور مادھو کی لاشوں کو دیکھا اور چٹانی لہجے میں کہنے لگا۔

''پولیس والوں کو اس کی قیمت چکانا ہوگی۔ ان دونوں کا بدلہ میں لوں گا۔''

''ہم سب یہ بدلہ لیں گے۔'' پھولن پرعزم تھی۔ ''لیکن پہلے اپنا خیال رکھو، ایسی حالت میں باہر نکلنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔''

وکرم نے بے بسی سے وہ اخبار ایک جانب پھینک دیا اور کسی زخم خوردہ شیر کی طرح کمرے میں ٹہلنے لگا۔

☆☆☆

وہ رات بے حد بوجھل تھی۔ وکرم کے دل و دماغ ہزار ہا سوچوں اور خدشات کے زیر اثر تھے۔

''اس طرح خود کو کیوں تکلیف دے رہے ہو؟'' پھولن نے نرمی سے کہا۔

وکرم نے ایک گہری سانس لی اور اپنا سر پھولن کے زانو پر رکھتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ پھولن آہستگی سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے اور اس کے چہرے کے نقوش سہلانے لگی۔ اس کی آنکھوں میں نمی در آنے لگی تھی۔ دل و دماغ ایک ہی نکتے پر مرکوز تھے۔

''تم نے مجھے پریم کرنا سکھایا ہے۔ میں تو مرد جاتی سے نفرت کرتی تھی۔ تم نے مجھے بتایا ہے کہ مرد رکھشک بھی ہوتا ہے۔ اس کا پریم اتنا سکون بھی دیتا ہے۔ تم گھائل ہوئے تھے تو مجھے ایسا لگا میری جان ہی نکل جائے گی۔ تمہیں کچھ بھی ہوا تو میں کیا کروں گی؟ میرا تمہارے سوا کوئی بھی تو نہیں ہے۔''

''اب تم کیا سوچ رہی ہو؟'' وکرم نے آنکھیں موندے موندے ہی سوال کیا۔

''سوچ رہی ہوں کہ تم نے مجھے کتنا یاد کیا بھلا؟'' اس نے سر جھٹکتے ہوئے سوال کیا۔

''بہت زیادہ۔ مجھے تمہاری چنتا کھائے جا رہی تھی۔'' وہ مضطرب ہونے لگا۔

''اچھا، تو اسی لیے مجھ سے چھپ کر یہاں چلے آئے؟'' پھولن نے شکوہ کیا۔

''ایسا ہونا ہی بہتر تھا ورنہ میرا پریوار پولیس کے جھوٹ کو ہی سچ سمجھتا رہتا۔'' وکرم نے ہونٹ چبائے۔

پھولن مزید نرمی سے اسے سہلانے لگی۔ وکرم ایک توقف سے کہنے لگا۔ ''میں تمہارا اپرادھی ہوں پھولن! میں نے تمہارا جیون برباد کر دیا۔ تم میرے کارن ہی اس مشکل میں پھنسی ہو۔''

پھولن کی متحرک انگلیاں یکدم ساکت ہو گئیں۔ وہ آزردگی سے اسے دیکھتے ہوئے گویا ہوئی۔ ''تم سچ میں ایسا سمجھتے ہو کیا؟''

"یہ سچ ہی تو ہے۔" وہ مضطرب تھا۔

"نہیں وکرم! سچ یہ ہے کہ تم نے میرا جیون بچایا ہے۔" پھولن ہیجان میں مبتلا ہونے لگی۔ "تم نے مجھے اتنی شکتی دی ہے کہ اپنے اصل اپرادھیوں سے بدلہ لے سکوں۔ تم نے مجھے پریم کرنا سکھایا ہے۔ مجھے نرک سے نکال کر سر اٹھا کر جینے کا مطلب بتایا ہے۔"

"تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ حالات کتنے خراب ہونے والے ہیں۔" وکرم نے اسے متنبہ کیا۔

"میں ہر موڑ پر تمہارے ساتھ رہوں گی۔" وہ پُرعزم تھی۔

"پولیس اتنی آسانی سے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔" اس نے ایک اور حقیقت سے آگاہ کیا۔

"اس کا اپائے بھی سوچ لیا ہے۔" پھولن نے کہا۔

"میرے گاؤں کے دو لڑکے لکھنؤ میں پڑھتے ہیں۔ سنا تھا کہ وکیل بن گئے ہیں۔ کیوں نہ ان سے بات کریں؟"

وکرم کو اس تجویز میں دم لگا اور وہ چند روز بعد اپنے حلیوں میں تبدیلی پیدا کر کے لکھنؤ پہنچ گئے۔ وکیل نے انہیں یہی مشورہ دیا کہ پولیس کی تلاش سرد ہونے تک منظرِ عام سے غائب رہنا ہی بہتر ہے۔ اس کی مشاورت کے بعد وکرم نے کچھ عرصے کے لیے نیپال میں روپوشی کا فیصلہ کرلیا۔

☆☆☆

نیپال روانگی کے لیے بھی وکیل سے دیرینہ شناسائی ہی شاملِ حال رہی۔ اس نے ایک گاڑی میں وارے لال، وکرم اور پھولن کو بحفاظت وہاں پہنچا دیا۔ شہری زندگی کی گہما گہمی اور اطوار پھولن کو حیرت و سراسیمگی میں مبتلا کرنے لگے۔

وکرم نے سب سے پہلے ایک مستند ڈاکٹر سے ملاقات کی۔ پھولن بھی اس کے ہمراہ ہی تھی۔ ڈاکٹر نے الٹرا ساؤنڈ مشین کے ذریعے معائنے کے بعد طنزیہ انداز میں کہا۔

"کس اناڑی سے علاج کروایا تھا بھئی؟"

"اس سمے اتنا ہوش ہی کہاں تھا؟" وکرم مسکرایا۔

"تمہارا آپریشن کرنے میں جو دیر ہوئی، سو ہوئی۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے بھی بس اپنی جان ہی چھڑوائی تھی۔" اس نے صاف گوئی سے بتایا۔ "کمر میں گولی کے ذرّے زہر بن کر پھیل گئے ہیں۔ انہیں نکالنے کی کوشش میں تمہارا جسم مفلوج ہوسکتا ہے۔"

"لیکن اسے شریر میں بھی تو نہیں رہنے دیا جاسکتا نا؟" پھولن متوحش ہوئی۔

"اس کے علاوہ کوئی اور اُپائے نہیں۔" ڈاکٹر نے ایک بار پھر صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ "اسے اب سادھانی سے رہنا ہوگا۔ کوئی بھی اچھل کود یا بے احتیاطی سمسیا کھڑی کردے گی۔"

وکرم کی پیشانی پر شکن دکھائی دینے لگی۔ دل و دماغ میں بہت سے ادھورے کاموں کی فہرست جگمگانے لگی تھی۔ وہ اس طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھے زندگی بسر نہیں کرسکتا تھا۔ اس شب پھولن بہت بے کل تھی۔

"ہم واپس نہیں جائیں گے۔" اس نے حتمی انداز میں کہا۔

"واپس تو جانا ہی ہے پھولن!" وکرم نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"وہاں اب ہمارے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہا۔" وہ آزردہ تھی۔

"سب کچھ تو باقی ہے۔" اس نے بلا تامل کہا۔ "مجھے اپنے پیسے واپس لینے ہیں۔ سری رام سے بھی تو دو ہاتھ کرنے ہیں۔ پولیس والوں کو ان کے کیے اتیاچاروں کا سبق سکھانا ہے۔ انہوں نے کسی غریب چرواہے کو گولی مار کر مجھ جیسے کپڑے پہنا دیے۔ سینے پر رائفل سجا کر اسے وکرم ملاح گھوشت کردیا۔ اور تو اور، اس کا کریا کرم بھی خود ہی کردیا۔"

"دیکھو وکرم! واپسی کے سفر میں اب کچھ بھی نہیں رکھا۔ ہم یہیں اسی شہر میں رہ لیں گے۔" پھولن مصر رہی۔ "تم پڑھے لکھے ہو، انگریزی بولنا بھی جانتے ہو۔ تمہیں تو کہیں بھی نوکری مل جائے گی۔ اس کے بعد تم مجھے بھی شہر میں رہنے کے طریقے سکھا دینا۔ ہم ان جنگلوں، دن رات کی بھاگ دوڑ اور ہر سمے موت کے ڈر سے بہت دور نکل آئے ہیں۔ واپس جانے کا خیال دل سے نکال دو۔"

وکرم نے سلگتی نظروں سے اسے دیکھا اور قطعیت سے گویا ہوا۔ "ٹھیک ہے۔ میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ میری پتنی ہر فیصلے میں میرا ساتھ دے گی لیکن میں غلط تھا۔ میرے ساتھی بھی کتنے نادان تھے کہ ایک کمزور عورت کو "پھول سنگھ" کہنے اور ماننے لگے تھے۔ ہمیں لگتا تھا کہ تم بھی اندر سے ایک کمزور اور کائر ناری ہی ہو۔"

"پھولن ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے۔" وارے لال نے سمجھانے کی کوشش کی۔ "تم سارا جیون بھی یہاں چھپے رہو تو کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔ وہ خون خرابا اور لوٹ مار چھوڑ دو۔ بھگوان نے بڑا اچھا موقع دیا ہے۔"

"تم دونوں کو اگر شہری ہوا نے وہ سب کچھ بھلا دیا ہے تو شوق سے رہ لو۔ میں واپس ضرور جاؤں گا۔" وکرم کی

ہٹ دھرمی برقرار تھی۔

وکرم کے اس رویے پر پھولن کا دل دکھ سے بھر گیا۔ اس کا ذہن تیزی سے اس صورتِ حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ اس اجنبی سرزمین اور شہری ماحول سے بالکل مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ اسے شہری آداب اور رسوم ورواج سے بھی بالکل شناسائی نہ تھی۔ اس پر مستزاد وکرم سے جذباتی وابستگی بھی لمحہ بھر کی دوری برداشت کرنے سے قاصر تھی۔ اس نے اپنی گرہستی بسانے، شریفانہ زندگی بسر کرتے ہوئے بچوں کی تعلیم وتربیت کی تمام تر خواہشات دفن کرتے ہوئے وکرم کے ساتھ روانگی کا فیصلہ کرلیا۔

☆☆☆

ننھیال سے واپسی کے بعد وکرم کا پہلا پڑاؤ ''گوہانی'' تھا۔ اس دوران پولیس نے تھک ہار کر اپنی تلاش ترک کی ہوئی تھی۔ وکرم نے اپنے والدین سے ملاقات کی اور خائن چچا کے خوب لتے لیے۔

''مجھے تم سے ایسے کی آشا نہیں تھی۔ تم میرے ساتھ یہ سب کیسے کرسکتے ہو؟'' وہ چلایا۔

''میں نردوش ہوں۔ یہ لڑکی تو میرے پاس کبھی آئی ہی نہیں۔'' اس نے فوراً وضاحت کی۔

وکرم کا دماغ مزید سلگنے لگا۔ اس نے چچا کا گریبان پکڑا اور پھنکارتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میری پتنی کے بارے میں کوئی بھی الٹی سیدھی بات کی تو اچھا نہیں ہوگا۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ یہ جانے کہاں اور کس کے ساتھ منہ کالا کرتی رہی ہے۔'' وہ تنفر سے پھولن کو دیکھ کر رہ گیا۔

وکرم نے طیش میں اس پر بندوق تان لی۔ پھولن صورتِ حال کی نزاکت دیکھتے ہوئے فوراً اس کے آڑے آگئی۔

''تم ایسا نہیں کرسکتے۔ ڈکیت کے نیم کیسے بھول سکتے ہو؟ یہ تمہارے پریوار سے تعلق رکھتا ہے، اسے نقصان پہنچا کر اپنے لیے ہی سمسیا کھڑی کرو گے۔''

وکرم اس کی بات کا محرک سمجھ گیا۔ وہ کچھ عرصہ پہلے میادین کی ہلاکت میں آڑے آیا تھا۔ اس نے پھولن کو غصے سے دیکھا اور اپنی صورتِ حال کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے چچا کو دونوں ہاتھوں سے اٹھائے گلی میں پٹخ دیا۔

وارے لال نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے رسان سے کہا۔ ''اپنا یہ کرودھ سنبھال کر رکھ متانا! آگے چل کر یہی کام آئے گا۔''

''میرا ایک کام کردو چاچا!'' اس نے ایک توقف کے بعد جواب دیا۔ ''میں ربر کی ایک مہر بنوانا چاہتا ہوں۔''

''کیا لکھوانا ہے؟'' وارے لال نے استفسار کیا۔

''وکرم ملاح اور پھولن دیوی آکاش سے واپس آگئے ہیں۔''

اس جملے نے وارے لال اور پھولن کی آنکھوں میں چمک پیدا کردی۔

☆☆☆

وکرم کے وجود میں ایک آتش فشاں موجزن ہوچکا تھا۔ اسی اثنا میں رگھوناتھ کو اس کی واپسی کا علم ہوا تو وہ اپنی روپوشی ترک کیے تقریباً نصف درجن ساتھیوں سمیت ان تینوں سے آملا۔ دھیرے دھیرے یہ تعداد درجن بھر سے بھی تجاوز کرگئی۔ وکرم نے مختصر عرصے میں ہی ڈاکا زنی کی تین کامیاب وارداتیں کرکے صوبائی سطح پر شدید ہلچل پیدا کردی۔ وہ ٹھاکروں کی رہائش گاہوں کے باہر اپنی خصوصی مہر ثبت کرآتا تھا۔ وکرم ملاح اور پھولن دیوی کا نام ایک بار پھر دہشت کی علامت بن گیا۔

اسی دوران پھولن نے اپنے اہلِ خانہ سے بھی ایک ملاقات کی۔ دیوی دین اور مولہ اسے دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

''یہ سب کیا ہے پھولن؟ کیا اس کا کوئی انت بھی ہے؟'' مولہ نے کہا۔

''یہ بات تجھے میادین اور سرپنچ سے پوچھنی چاہیے تھی۔ جب ان کے اتیاچاروں کا کوئی انت نہیں تھا، تو اب اس سب کا کیا ہے؟'' پھولن نے تلخی سے جواب دیا۔

وکرم کے بشرے سے اضطراب جھلکنے لگا۔ وہ دیوی دین کے پاس بیٹھا اور سر جھکائے کہنے لگا۔ ''تم لوگوں کا دوشی میں ہوں۔ میرے کارن پھولن کا جیون برباد ہوگیا۔''

پھولن کا دماغ یکلخت ہی سلگ گیا۔ وہ دانت پیستے ہوئے گویا ہوئی۔ ''میرا جیون اس روز برباد ہوا تھا جب انہوں نے میرا بیاہ اس راکھشس پتی لال سے کیا تھا۔ تباہی کا یہ کھیل تب ہی تو شروع ہوا تھا۔ تم مجھے یہاں سے نہ لے جاتے تو بھگوان جانے یہ ٹھاکر لوگ مجھے اور کتنا نوچتے۔''

مولہ اور دیوی دین نے اذیت سے آنکھیں میچ لیں۔ وہ فرطِ غم سے گنگ ہوچکے تھے۔

''دیدی! تمہیں پتا ہے، ہمارے گاؤں میں ایک عورت تمہیں ڈھونڈنے آئی تھی۔ وہ کہتی ہے تم سے ملے بغیر یہاں سے نہیں جائے گی۔'' بھوری نے انکشاف کیا۔

پھولن کی نگاہوں میں الجھن تیرنے لگی۔

''کہیں پولیس کی کوئی مخبر نہ ہو۔'' وکرم مزید مضطرب ہوا۔

''اپنا نام کسوما بتاتی ہے۔'' دیوی دین نے آگاہ کیا۔

پھولن یکدم ہی ہیجان زدہ ہوگئی۔ اس نے بھوری سے اس کے عارضی ٹھکانے کی بابت دریافت کیا اور عجلت میں وہاں پہنچ گئی۔ کسوما ان دونوں کو دیکھتے ہی متشکر دکھائی دینے لگی۔

''بہت سمے سے تم لوگوں کا یہاں انتظار کر رہی ہوں۔ مجھے پتا تھا تم یہاں ضرور آؤ گے۔''

''کیا چاہتی ہو تم؟'' وکرم نے سپاٹ لہجے میں استفسار کیا۔ ''دہلی جیسے شہر کو چھوڑ کر یہاں کس لیے رہ رہی ہو؟''

''مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو، میں دہلی میں نہیں رہ سکتی۔ پولیس نے میرا جینا دوبھر کر رکھا ہے۔'' وہ رونے لگی۔

پھولن کا دل تاسف سے بھر گیا۔ اسے کسوما کے روپ میں مادھو کی ادھوری و تشنہ محبت ہی دکھائی دے رہی تھی۔ پل بھر کے لیے ایسا محسوس ہوا کہ مادھو، کسوما کی حفاظت کے لیے ملتجی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا ہے۔

''اسے اپنے ساتھ لے چلتے ہیں وکرم۔'' پھولن نے سنجیدگی سے کہا۔

''بچوں جیسی باتیں نہ کرو۔ تم اسے جانتی نہیں ہو۔'' وکرم نے دانت پیسے۔

''میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ یہ مادھو کی محبت ہے۔ ہمیں اپنے ساتھی کی انتم اِچھا کا خیال کرنا چاہیے۔ آج اگر وہ جیوت ہوتا تو پولیس سے اس کی رکھشا کے لیے کچھ بھی کرنے کے لیے تیار ہو جاتا۔''

پھولن کے افسردہ لہجے نے وکرم کا دل بھی بوجھل کر دیا۔ مادھو کے ساتھ بسر کیے گئے بچپن کے ایام آنکھوں میں نمی پیدا کرنے لگے تھے۔ اس نے اپنے ہتھیار پر گرفت مضبوط کی اور آتشیں انداز میں کہنے لگا۔

''میں پولیس سے مادھو اور بھرت کی موت کا بدلہ ضرور لوں گا۔ انہیں اپنے دھوکے کا مزہ تو چکھنا ہی ہوگا۔''

پھولن کے رگ و پے میں بھی جوش ہلکورے لینے لگا۔

☆☆☆

محکمۂ پولیس میں ایک بھونچال پیدا ہو چکا تھا۔ انہیں وکرم ملاح کی جانب سے ایک خط موصول ہوا تھا جس میں اپنی اگلی واردات کا ہدف بتاتے ہوئے پولیس کے لیے نازیبا ترین القابات بھی استعمال کیے گئے تھے۔ اعلیٰ افسران نے فوری طور پر ملاقات کرتے ہوئے اسے گھیرنے کا منصوبہ بنایا اور طے شدہ وقت پر بھاری ترین نفری کے ساتھ مطلوبہ مقام پر پہنچ گئے۔

وکرم اسی لمحے کا منتظر تھا۔ اس نے نہایت عرق ریزی سے یہ منصوبہ تیار کیا تھا۔ پولیس کی دھوکا دہی اور مکاری کے پیشِ نظر طے شدہ ہدف کو پہلے ہی لوٹ لیا گیا۔ اس کے بعد وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مشاقی سے مورچا زن ہوگیا۔ پولیس کی نفری دکھائی دیتے ہی وہ ایک بلند چٹان پر آ کھڑا ہوا اور میگا فون میں چلاتے ہوئے کہنے لگا۔

''تم سب...... کا سواگت ہے۔'' اس نے فحش القابات استعمال کیے۔

''وکرم ملاح! ہتھیار پھینک دو۔ تمہیں چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔ تم یہاں سے بچ کر نہیں نکل سکتے۔'' ایک اعلیٰ افسر نے اسے تندی سے مخاطب کیا۔

وکرم نے ایک زوردار قہقہہ بلند کیا اور تمسخرانہ انداز میں گویا ہوا۔ ''تمہیں کیا لگتا ہے کہ میں نے کوئی اندھی بازی کھیلی ہے؟ اس سمے میں نہیں، بلکہ تم لوگ گھرے ہوئے ہو۔''

وکرم کی بات مکمل ہوتے ہی پھولن، وارے لال اور رگھوناتھ نے ان کی گاڑیوں کو نشانہ بنایا اور پل بھر میں ہی انہیں ناقابلِ استعمال بنا دیا۔ ٹائر پھٹنے کی دھماکا خیز آوازوں نے فضا بے طرح مرتعش کر دی۔

''اب بتاؤ، کس کا بچ کر نکلنا مشکل ہے؟'' وہ ہنسا۔

پولیس کے اہلکاروں میں بے چینی موجزن ہوگئی۔ چند ایک اہلکاروں نے بلندی پر کھڑے وکرم کا نشانہ لینے کی کوشش کی، لیکن اس کے مخصوص مقامات پر مورچا زن ساتھیوں نے نہایت ماہرانہ انداز میں یہ سبھی کوششیں ناکام بنا دیں۔ وہ وکرم کے ایما پر اہلکاروں کا اس طرح نشانہ لیتے تھے کہ گولی ہاتھوں سے گزرتی ہوئی دوسری جانب نکل جاتی۔ اس آتشیں لمس نے متعدد افراد کے ہاتھوں کو ناقابلِ استعمال بنا دیا۔

اس کے بعد گولیوں کی ایک تیز ترین بوچھاڑ ان سبھی اہلکاروں کی ''قدم بوسی'' کرنے لگی۔ آن ہی آن میں وہاں حالات مکمل تبدیل ہوگئے تھے۔ وکرم انہیں یہ تاثر دینے میں کامیاب رہا تھا کہ وہ یقینی موت کے نشانے پر ہیں۔ نتیجتاً وہ دھیرے دھیرے پسپائی اختیار کرنے لگے۔

''انہیں اس طرح مت جانے دو وکرم!'' پھولن مضطرب ہوئی۔

اس لمحے اس کے کئی دیرینہ زخم بھی ہرے ہوگئے تھے۔

''ہم نے جو طے کیا تھا، وہی کرنا ہے۔'' وکرم نے متنبہ کیا۔

''اس سے اگر ہم گھرے ہوتے تو کیا یہ ہمیں یونہی جانے دیتے؟'' وہ مصر رہی۔

''میں نے تمہیں پہلے بھی یہی سمجھایا تھا پھولن!'' اس نے رسان سے کہا۔ ''ایک سپاہی اور ڈاکو کی ''شان'' میں فرق ہوتا ہے۔ ہم نے ان کی سب گاڑیاں تباہ کردی ہیں۔ یہ ہمیں ایک بار بھی نشانہ بنانے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ اس طرح میدان چھوڑ کر بھاگنے کے بعد برسوں تک اپنے زخم چاٹنے پر مجبور رہیں گے۔''

''وکرم ٹھیک کہہ رہا ہے پھولن!'' وارے لال نے تائید [illegible]۔ ''من تو میرا بھی یہی چاہ رہا ہے کہ ان سب کو بھون کر رکھ دوں لیکن ذرا سوچو، یہ اس طرح خالی ہاتھ پیدل چلتے ذ[illegible] گے تو کتنی تھوتھو ہوگی۔ انہوں نے ایسا انتقام تو کبھی سوچا [illegible] ہوگا۔''

پھولن نے [illegible] میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

وکرم ملاح اور پھولن [illegible] کی [illegible] واردات نے محکمۂ پولیس پر ایک نفسیاتی برتری حا[illegible] کرلی۔ ان دونوں کا نام ایک نئی شہرت حاصل کرچکا تھا۔ زندہ [illegible] مردہ گرفتاری پر انعامی رقم میں بھی اضافہ کردیا گیا۔

پولیس کی اس یادگار پسپائی سے لطف اندوز [illegible] ہوئے وکرم نے جمنا کے کناروں پر محیط جنگل میں روپوشی اختیار کرلی۔ وہ کچھ عرصہ اپنی اسی روپوشی سے مخالفین کو نفسیاتی دباؤ میں مبتلا رکھنا چاہتے تھے۔ اس دوران اگلی وارداتوں کی منصوبہ بندی بھی تیار کرلی جاتی۔ تمام تر ساتھی، پولیس اہلکاروں کی درگت یاد کرتے ہوئے خوب لطف اندوز ہوتے۔ وکرم پر نشانہ لینے کے عمل سے ہڑبونگ میں بھاگ دوڑ کے مراحل کی اداکاری کی جاتی۔ پھولن کو یاد ہی نہیں پڑتا تھا کہ وہ قبل ازیں اس قدر قہقہہ بار کب ہوئی تھی۔ غالباً بچپن میں، میادین کی عمر رسیدہ والدہ کو دہشت زدہ کرتے ہوئے ایسی خوشی ولطف نصیب ہوا تھا۔

وکرم بھی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ تمام تر سرگرمیوں میں دل کھول کر حصہ لیتا۔ وارے لال البتہ قدرے الجھا ہوا دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کی خاموشی اور بیزاری تاحال کوئی محسوس نہیں کرپایا تھا۔

کچھ روز بعد گروہ کے کچھ افراد نے جمنا میں غسل کا منصوبہ بنالیا۔ وارے لال کو درختوں کی آڑ میں ہلکی سی سرسراہٹ نے چونکا دیا۔ اس کی چھٹی حس نے وہاں کسی کی موجودگی بھانپ لی تھی۔ وہ اپنی لنگی زیب تن کرکے محتاط انداز میں وہاں پہنچا ہی تھا کہ عقب سے ریشمی لمس نے اسے بے طرح بدکنے پر مجبور کردیا۔

''ارے......تم تو ڈر گئے۔ میں نے تو سنا تھا کہ وارے لال بہت دلیر ہے۔'' اسے کسوما کی آواز سنائی دی۔

''تم......!'' وہ ٹھٹک گیا۔ ''یہاں کیا کررہی ہو؟''

کسوما نے ایک ہیجان انگیز سانس بھری اور اس کے چہرے کے نقوش سہلانے لگی۔ ''تمہیں دیکھ رہی تھی۔ سو جوانوں سے بھی زیادہ مضبوط اور دلیر دکھتے ہو۔''

وارے لال نے اس کا ہاتھ جھٹکا اور سختی سے کہنے لگا۔

''میں تمہارے پتا کی عمر کا ہوں کسوما!''

''لیکن پتا تو نہیں ہونا۔'' اس نے بے باکی سے جواب دیا۔ متحرک انگلیاں اب سینے پر رینگنے لگی تھیں۔

''یہاں سے چلی جاؤ ورنہ بہت برا ہوگا۔'' وارے لال نے متنبہ کیا۔ اسے کسوما کی نگاہوں میں عیاں دعوت سے وحشت محسوس ہورہی تھی۔

کسوما اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے ہم آغوش ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کا تنفس دھونکنی کی حیثیت اختیار کرچکا تھا۔ وارے لال نے اسے سختی سے پیچھے دھکیل دیا۔

''تم اپنے ہوش میں نہیں ہو۔''

''اس میں بھی تمہارا ہی دوش ہے۔ جب سے تمہیں دیکھا ہے، سب کچھ بھول گئی ہوں۔ مجھے اپنا بنالو۔'' وہ ایک بار پھر اس سے لپٹنے کی کوشش کرنے لگی۔

''کاش آج مادھو جیوت ہوتا۔'' وارے لال نے تاسف [illegible] ''تمہارا چرترا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا۔''

کسوما نے اس کی بات ان سنی کردی۔ خود سپردگی مزید وحشت انگیز ہو[illegible]۔

''کیا میں اس کے [illegible] ''دستی'' ہوجاتی؟'' اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''ایک بار [illegible] مجھے دیکھو تو سہی۔ کس چیز کی کمی ہے مجھ میں؟''

''تم ناری نہیں ایک ڈائن ہو کسوما! مجھے افسوس ہے مادھو نے تم جیسی عورت کے لیے اپنا جیون ضائع کردیا۔'' وارے لال نے اسے جھٹکے سے پیچھے دھکیلا اور [illegible] سے چلتا ہوا درختوں کے جھنڈ سے باہر نکل گیا۔

کسوما پُرتپش نگاہوں سے اس کی پشت گھورتی رہی۔

☆☆☆

''کیا بات ہے چاچا؟ بہت غصے میں دکھائی دے رہے ہو۔'' رگھوناتھ نے وارے لال کو بغور دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

’’کچھ نہیں، تیرا وہم ہے۔‘‘ اس نے ٹالا۔
’’کوئی سمسیا ہے تو مجھ سے بانٹ لے چاچا!‘‘ وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔
وارے لال چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔
’’درختوں کی طرف جاتے ہوئے تو بالکل ٹھیک تھا۔ ابھی چہرے پر کیوں بارہ بجے ہیں؟‘‘ اس نے چٹکی بھری۔
’’جب یہ پتا ہے تو کارن بھی پتا ہی ہوگا۔‘‘ وارے [illegible] تیکھے انداز میں جواب دیا۔
’’ہاں [illegible] پتا ہے۔‘‘ رگھوناتھ نے اعتراف کیا۔
’’پھر [illegible]، کوئی ٹکراؤ تو نہیں ہوا تم دونوں میں؟‘‘
وہ مزید چونکا۔
’’کس دنیا میں رہتے ہو چاچا!‘‘ رگھو ہنسا۔ ’’یہاں ایسا کوئی بھی نہیں ہوگا جس نے اس بہتی گنگا میں ہاتھ نہ دھوئے ہوں۔‘‘
’’چھی!‘‘ وارے لال نے [illegible] سے منہ پھیرلیا۔
رگھو نے بے ساختہ قہقہہ لگایا اور [illegible]۔ ’’وہ ناری نہیں، چلتا پھرتا بارود ہے۔ بھگوان جانے [illegible] اندر ایک ہی مرد سے وفادار رہنے کا مادہ کیوں نہیں ہے۔‘‘
’’میں اسے یہاں لانے کے حق میں ہی نہیں تھا۔‘‘ اس نے دانت پیسے۔ ’’لیکن اس پھولن کو ہی ہمدردی کا بخار چڑھا تھا۔‘‘
’’ہمارا پھول سنگھ بہت بھولا بھالا ہے۔‘‘ رگھو ہنسا، تاہم اس ہنسی میں تمسخر کے بجائے محبت و عقیدت کا رنگ تھا۔
’’آج مجھے مادھو کے متعلق سوچ کر بہت دکھ ہو رہا ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اس کی ارتھی ابھی ہی اٹھی ہے۔‘‘ وارے لال کی آنکھوں میں نمی در آئی۔
’’یہ بات تو میں بھی کئی روز سے سوچ رہا ہوں۔‘‘ اس نے اعتراف کیا۔
’’مادھو پڑھائی لکھائی میں بہت ہوشیار تھا۔‘‘ وہ خوابناک انداز میں بتانے لگا۔ ’’اس کے بھی گرو کہتے تھے، یہ بہت آگے جائے گا۔ شہر کے کسی بھی کالج میں پڑھ کر بڑا بابو بن جائے گا لیکن وہ اس کے پریم جال میں پھنس کر ایسا باؤلا ہوا کہ اپنے ساتھ مستانہ کو بھی اسی آگ میں گھسیٹ لیا۔‘‘
’’میرے ذہن میں بہت دنوں سے ایک اور بات کھٹک رہی ہے۔‘‘ رگھو نے اپنی پیشانی مسلی۔ ’’کسوما، وکرم کو بھی پر بھاوت کرنے کی کوشش کرے گی اور پھولن جانے کیوں اس سے کچھ دور رہنے لگی ہے۔‘‘
رگھو کی اس بات پر وارے لال جز بز ہونے لگا۔ وہ اسے وکرم کی موجودہ کیفیت سے آگاہ نہیں کر سکتا تھا۔ پھولن نے اپنی محدود عقل وفہم کے مطابق وکرم کے اندرونی زخم کی صحت یابی کے لیے یہ دوری اختیار کی ہوئی تھی۔ وارے لال نے پھولن سے حتمی گفتگو کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

☆☆☆

’’وکرم سے کوئی ناراضگی ہے تیری؟‘‘ وارے لال نے اسی شام پھولن کو گھیرلیا۔ ’’کیا میادین والی بات کو اب تک دل سے لگائے بیٹھی ہے؟‘‘
’’نہیں تو۔‘‘ اس نے بلا تامل تردید کی۔ ’’ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔‘‘
’’دیکھ پھولن!‘‘ وہ سنجیدگی سے کہنے لگا۔ ’’پتی پتنی میں صرف شریر کا سمبندھ ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ انہیں ہر سے ایک دوسرے کے ساتھ اور پریم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ان دونوں میں ذرا بھی دراڑ نظر آجائے تو کوئی نہ کوئی تیسرا شخص فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کرتا ہے۔‘‘
پھولن نا سمجھی اور الجھن سے اسے دیکھنے لگی۔
’’پہیلیوں میں باتیں کیوں کر رہے ہو؟‘‘
’’سیدھی بات صرف یہ ہے کہ ہر سمے وکرم کے آس پاس ہی رہا کر۔‘‘ اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ’’وہ ایک ہیرا ہے اور یہاں لٹیرے بھی گھات لگائے بیٹھے ہیں۔‘‘
پھولن کی مخصوص نسوانی حس اس کا مدعا بھانپ گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور تیز قدموں سے چلتے ہوئے وکرم کے عارضی خیمے کی جانب بڑھ گئی۔ اندرونی سمت سے آنے والی آوازوں نے اس کے قدم ساکت کردیے۔
’’تمہیں صرف پھولن کی اِچھا پر یہاں لایا گیا ہے۔ اپنے لچھن درست کرلو ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔‘‘ وکرم نے سختی سے کہا۔
’’ارے چھوڑو بھی۔‘‘ کسوما [illegible]۔ ’’میں جانتی ہوں، اس میں تمہاری اپنی اِچھا بھی تھی۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ تم مجھے کیسے چھپ چھپ کر دیکھا کرتے تھے۔‘‘
’’تم میرے لیے صرف مادھو کی پسند تھیں اور کچھ نہیں۔‘‘ اس نے دوٹوک بتایا۔
’’تم جھوٹ بول رہے ہو۔‘‘ کسوما کی خوش فہمی برقرار تھی۔
’’یہاں سے چلی جاؤ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ میں تمہیں صرف پھولن کی وجہ سے برداشت کر رہا ہوں۔‘‘ وکرم جھلانے لگا۔
’’بہت خیال ہے تمہیں پھولن کا؟‘‘ وہ آتشیں لہجے میں کہنے لگی۔

"ہاں، میں اس سے بہت پریم کرتا ہوں۔" اس نے اعتراف کیا۔

"تم اتنے بے وقوف لگتے تو نہیں۔" کسوما استہزائیہ ہنسی۔ "ایک ایسی لڑکی سے پریم کرتے ہو جس کا شریر جانے کتنے مردوں کا کھلونا رہ چکا ہے۔ تمہیں اس سے گھن نہیں آتی کیا؟"

کسوما کی اس بات نے پھولن کو سلگا دیا تاہم وہ خود پر ضبط کیے وہاں کھڑی رہی۔

"مجھے اس سے ہر نئے دن کے بعد پہلے سے بھی زیادہ پریم ہو جاتا ہے۔" وکرم نے جذب کے عالم میں کہا۔

"میں اس سے کہیں زیادہ سندر ہوں۔ تمہیں اپنا بنا کر ہی دم لوں گی۔" وہ پرعزم تھی۔

"کوشش [illegible] کے دیکھ لو۔ کبھی سپھل نہیں ہو سکو گی۔" وکرم ہنسا۔

کسوما کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ وحشیانہ انداز میں اس سے لپٹتے ہوئے [illegible] پھولن کو چھوڑ دو وکرم! وہ تمہارے لائق نہیں ہے، مجھ سے بیاہ کر لو۔ میں تمہیں بہت خوش رکھوں گی۔"

وکرم نے تاسف سے اس کی جانب دیکھا۔ اسے اپنے مرحوم دوست کی یاد خلش بن کر ڈنک مارنے لگی تھی۔

"تم سات جنموں تک بھی پھولن جیسی نہیں بن سکتیں۔ اگر دوبارہ کبھی مجھ سے ایسی کوئی بات کہی تو تمہیں یہاں سے چلتا کر دوں گا۔" اس نے متنبہ کیا۔

"میں تمہیں اپنا بنا کر ہی رہوں گی۔" کسوما کی ہٹ دھرمی برقرار تھی۔

وکرم نے اسے یکسر نظر انداز کر دیا۔ وہ طیش سے بل کھاتی باہر نکلی ہی تھی کہ پھولن نے اپنی ٹانگ آگے کر دی۔ کسوما لڑکھڑاتے ہوئے منہ کے بل زمین بوس ہو گئی۔ اس کے ہاتھوں اور چہرے پر خراشیں دکھائی دینے لگیں۔

پھولن نے سلگتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا اور دھمکاتے ہوئے کہنے لگی۔ "وکرم سے دور رہنا ورنہ تمہاری اس سندرتا کا وہ حال کروں گی کہ کوئی انسان تو کیا، جانور بھی دوسری بار دیکھنے سے پہلے منہ پھیر لے گا۔"

کسوما نے اسے تنفر سے گھورا اور ایک توقف کے بعد گویا ہوئی۔ "میں وکرم کو تم سے چھین کر ہی رہوں گی۔ تمہارا وہ حشر کروں گی کہ دنیا دیکھے گی۔"

پھولن نے بے نیازی سے منہ پھیر لیا۔ اسے اندازہ ہی کہاں تھا کہ کسوما کے یہ الفاظ مجسم روپ اختیار کرنے والے ہیں۔

☆☆☆

جمنا کے کنارے ان جنگلوں میں زندگی اپنی مخصوص ڈگر پر رواں تھی۔ گاہے بہ گاہے ڈاکا زنی کی وارداتیں اور فوری روپوشی کا معمول بھی جاری تھا۔ وکرم ملاح اور پھولن دیوی محکمۂ پولیس کے لیے ایک دردِ سر بن چکے تھے۔

کچھ ہی عرصے بعد ایک قریبی گاؤں کے چند معززین وکرم سے ملاقات کے لیے چلے آئے۔ پھولن انہیں دیکھتے ہی تشویش زدہ ہو گئی۔ اس کی چھٹی حس کسی خطرے کا بگل بجانے لگی تھی۔ اس کے خدشات بالکل درست ثابت ہوئے۔ وہ وفد ایک خصوصی مہم کے لیے وہاں آیا تھا۔ معززین ان دونوں گروہوں کی باہمی رنجش کا خاتمہ اور سابقہ تعلقات بحال کرنا چاہتے تھے۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ آپ یہ سمجھاؤ لائے ہی کیوں ہیں؟" وہ جھلا گیا۔

"ایسا ہو جانا ہی بہتر ہے۔" وفد کے سربراہ نے رسان سے کہا۔

"میں ایک ایسے شخص سے دوبارہ سمبندھ کیسے بنا لوں جو مجھے جان سے مارنے کی کوشش کر چکا ہے؟" وکرم تلخ ہوا۔

"سری رام بڑی سے بڑی قسم اٹھا کر کہتا ہے کہ اس نے تم پر گولی نہیں چلائی تھی۔"

وکرم اس بات پر سر جھٹک کر رہ گیا۔

"گولی اسی نے چلائی تھی۔ وہ انسان نہیں ایک ناگ ہے۔" پھولن خاموش نہ رہ سکی۔

سربراہ نے ناپسندیدگی سے اسے دیکھا اور ہونٹ بھینچ کر کہنے لگا۔ "مردوں کی باتوں میں عورتیں کب سے بولنے لگی ہیں؟"

"دیکھو وکرم ملاح، ہمارا ابھی تم پر کوئی ادھیکار ہے۔ ہم تمہارے دشمن ہیں نہ ہی بے وقوف۔ سری رام بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تم اس کی کوئی بھی بات سنے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر سکتے ہو؟" دوسرے شخص نے کہا۔

"عدالت بھی ملزم کو مجرم گھوشت کرنے سے پہلے صفائی کا ایک موقع ضرور دیتی ہے۔ تمہیں اس سے بات کرنا ہو گی۔"

سربراہ کی قطعیت نے اسے جزبز کر دیا۔ اسے خاموش دیکھ کر سربراہ نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "شبھ کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ ہم سری رام کو کل ہی یہاں لے آئیں گے۔"

ان کی روانگی کے بعد پھولن، وکرم کے درپے ہوگئی۔ وہ اس کی کم ہمتی اور دلائل میں ناکامی پر چیں بہ جبیں تھی۔

”تو کیا میں انہیں گولی سے اڑا دیتا؟“ وکرم زچ ہوا۔ ”ایسا نہیں ہوتا پھولن! ہمارے کچھ نیم ہیں، ہمیں کچھ ریتی رواج پورے کرنے ہوتے ہیں۔“

پھولن اس دلیل سے قائل نہ ہوئی۔ اس کے وجود میں وحشت برپا تھی۔ سری رام کا تصور ہی رگ و پے میں انگارے برپا کررہا تھا۔ اگلے روز سری رام کی آمد کے وقت وہ وکرم کے ساتھ ہی موجود رہی۔ سری رام نے مسکراتے ہوئے ان دونوں سے علیک سلیک کی اور اعتماد سے ایک جانب بیٹھ گیا۔

”ہمیں تمہارے ساتھ ہونے والی اس دُرگھٹنا کا بہت افسوس ہے وکرم بابو۔“ سری رام نے گفتگو کا آغاز کیا۔ ”لیکن ہمارا وشواس کرو، اس میں ہمارا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔“

”ہاتھ ہونے یا کسی دوسرے کے ہاتھ کو مضبوط کرنے میں بھی تو کوئی فرق نہیں ہے نا۔“ پھولن نے تیزی سے کہا۔

”ہم دونوں بھائی درگا میا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہم پر گولیاں چلانے والا کوئی اور تھا۔“ سری رام کہنے لگا۔

”اچھا...... وہ کوئی اور کون تھا؟“ پھولن خاموش نہ رہ سکی۔ ”اب یہ مت کہنا کہ اس تربوز والے نے یہ سب کیا تھا۔“

”تمہارا غصہ بھی اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہے پھول سنگھ!“ سری رام نے اسے مخاطب کیا۔

پھولن نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

”اپنے دل صاف کرو اور بہترین سمبندھ کی شروعات کرو۔“ وفد کے سربراہ نے دوٹوک کہا۔

پھولن بے اختیار وکرم کی جانب دیکھنے لگی۔ اس کی نگاہوں میں انکار کرنے اور اس پر ڈٹ جانے کی التجا تھی۔ وہ شب اسی بحث اور دلائل میں بیت گئی۔ سری رام اپنی جہاندیدگی اور وکرم کے ساتھ بیتے وقت کے دوران اس کی کمزوریوں سے آگاہی کے باعث اسے قائل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ وفد کے سبھی اراکین بے حد خوش اور مطمئن تھے۔

”بہت بڑی غلطی کررہے ہو مستانہ!“ وارے لال نے وفد کی روانگی کے بعد کہا۔ ”سانپ کا پھن کچلنے کے بجائے اسے پھر دودھ پلانے کے لیے تیار ہوگئے ہو۔“

”میں نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہے چاچا!“ وہ بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے گویا ہوا۔

”تیرے اس فیصلے کا باقی لوگوں پر جو اثر پڑے گا، اس کا تجھے اندازہ ہی نہیں ہے۔“ وارے لال نے دانت پیسے۔

”میں خود ہی سب کو سنبھال لوں گا۔“ وہ پُراعتماد تھا۔

پھولن نے سلگتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا اور منہ پھیر کر باہر چلی گئی۔ وکرم اس کی ناراضگی پر گہری سانس بھر کے رہ گیا۔

☆☆☆

کسوما کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اس کی کیفیت ”بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا“ کی عملی تفسیر بن گئی تھی۔ وہ سری رام کو اپنے ناز و انداز سے لبھانے لگی تھی۔ نتیجتاً پھولن کی نفرت و طیش سوا تر ہونے لگے۔ اس نے کسوما کو بازو سے گھسیٹا اور ایک جانب لے جاتے ہوئے سختی سے کہنے لگی۔

”یہ کیا کررہی ہو تم؟“

”کیا کررہی ہوں؟“ اس نے معصومیت سے جوابی سوال کیا۔

”کیسی عورت ہو تم کسوما! تمہیں تھوڑی سی بھی لاج نہیں ہے کیا؟“ پھولن غرائی۔ ”آج ایک مرد کے پیچھے، کل دوسرے مرد کے پیچھے۔“

”میں تو ایسی ہی ہوں بہن جی!“ اس نے بے نیازی سے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

”ہر کسی کا بستر گرم کرتے رہنے کے بجائے تم کسی ایک سے بیاہ کیوں نہیں کرلیتیں؟“ پھولن نے تنفر سے اسے دیکھا۔

”تو تم واقعی یہ چاہتی ہو کہ میں کسی ایک سے بیاہ کرلوں؟“ اس نے پھولن کی آنکھوں میں جھانکا۔

”تمہارے لیے یہی بہتر ہوگا۔“ پھولن نے متنبہ کیا۔

”ٹھیک ہے۔ میں وکرم سے بیاہ کرنا چاہتی ہوں۔ تم راستے سے ہٹ جاؤ بلکہ ایسا کرو، تم سری رام لے لو اور وکرم مجھے دے دو۔“

کسوما کی اس بات پر پھولن کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وجود میں انگارے بھرنے لگے تھے۔ اس نے بے اختیار کسوما کو ایک طمانچہ رسید کردیا۔

”میں وکرم سے کہہ کر تمہیں واپس بھیجنے کا بندوبست کرتی ہوں۔ میرا ہی دماغ خراب تھا جو تم پر دیا کھا کر یہاں لے آئی۔“ پھولن نے اسے گھورا۔

”اب یہاں وکرم ملاح کا حکم نہیں چلے گا۔“ کسوما کی نگاہوں میں بھی نفرت تھی۔ ”اس سے سردار سری رام ہے۔“

پھولن اس حقیقت پر اضطراب محسوس کرنے لگی۔ اسے وکرم کے اس فیصلے پر از سر نو غصہ محسوس ہورہا تھا۔ گروہ کے دیگر اراکین بھی مختلف خدشات کا شکار تھے۔ اسی شب

رگھوناتھ اس کے پاس آیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بوجھل انداز میں کہنے لگا۔

''اچھا پھول سنگھ! کہا سنا معاف کرنا۔''

''کیا مطلب...... کہاں جا رہے ہو تم؟'' وہ چونکی۔

''اس سرخ بالوں والے راکھشس کے آنے کے بعد یہاں رہنے کا کوئی کارن ہی نہیں ہے۔'' اس کی افسردگی بہت دبیز تھی۔

''تم ہمیں چھوڑ کر جا رہے ہو؟'' پھولن آزردہ ہوئی۔

''ڈوبتے ہوئے جہاز کے ساتھ خود بھی ڈوبنے کا انتظار نہیں کیا جاتا پھول سنگھ! ان لوگوں کا آنا کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔ پتا نہیں مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ یہ یہاں آئے نہیں بلکہ بھیجے گئے ہیں۔''

رگھوناتھ کے گمبھیر انداز نے پھولن کو مزید مضطرب کر دیا۔

رگھو نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''وکرم کا بہت خیال رکھنا۔ بھگوان تم دونوں کی رکھشا کرے۔''

پھولن گنگ ہو چکی تھی۔ رگھوناتھ نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور تیز قدموں سے چلتا تاریکی کا حصہ بن گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح سری رام کا مزاج بے حد خوشگوار تھا۔ کسوما بھی اس کے ہمراہ شب بسری پر اتراتی پھر رہی تھی۔ لالہ رام نے کوفت سے اپنے بھائی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس مصیبت کو گلے ڈالنے کی کیا ضرورت تھی تمہیں؟''

''یہی مصیبت ہمارے کام آئے گی۔'' اس نے معنی خیزی سے جواب دیا۔

''اس بات کا دھیان رکھنا کہ وہ ایک نیچ ذات کی عورت ہے۔ وکرم کی طرح بھاوناؤں میں بہہ کر بیاہ نہ کر لینا۔'' لالہ رام نے منہ بنایا۔

''کیا تم مجھے اتنا ہی بے وقوف سمجھتے ہو؟'' وہ ہنسا۔ ''میں نے اسے کسی کارن سے ہی اپنایا ہے۔ تم خود دیکھنا، یہ ہمارے کتنے کام آئے گی۔''

''جو بھی کرنا ہے، ساودھانی سے اور جلدی کرو۔'' اس نے جھلا کر کہا۔

اسی اثنا میں وکرم بھی ان کے پاس چلا آیا۔ سری رام اسے دیکھتے ہی اپنائیت سے کہنے لگا۔ ''کیسے ہو مستانہ! تمہارے زخموں کا کیا حال ہے اب؟''

''میرے زخم بالکل ٹھیک ہیں۔'' اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

''میں تمہارے لیے بہت پرارتھنا کرتا تھا۔ مجھے بس یہی چنتا تھی کہ تمہارا علاج اچھی طرح ہو جائے۔ آج کل اسپتالوں میں ایسے مریضوں سے پہلے پولیس رپورٹ مانگی جاتی ہے۔ ویسے تم نے اپنا علاج کس سے کروایا تھا؟'' وہ ملائمت سے مستفسر تھا۔

''کسی سے بھی نہیں۔ میرے زخم خود ہی ٹھیک ہو گئے تھے۔'' وکرم نے بے نیازی سے بتایا۔

''یہ تو کوئی چمتکار ہی ہو گیا۔'' سری رام کی نگاہوں میں بے یقینی تھی۔ ''تم نے شرن کہاں لی تھی ویسے؟''

''مجھے یہ بھی یاد نہیں۔'' اس نے ٹالا اور اپنے ہاتھ میں تھاما ایک کھاتہ کھولتے ہوئے کہنے لگا۔ ''ہمیں پیسوں کا حساب کتاب کر لینا چاہیے۔ تمہاری طرف نکلنے والے بھی پیسوں کا کھاتہ مادھو نے اس میں لکھ رکھا ہے۔ ضمانت کے پیسے بھی ابھی باقی ہیں۔''

سری رام کی نگاہوں میں طیش جھلکنے لگا تاہم وہ خود کو پرسکون رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''مجھے دو دن کا سمے دو۔ میں سارے پیسے لوٹا دوں گا۔''

وکرم نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ سری رام نے ایک توقف کے بعد کہا۔ ''میں کسوما سے بیاہ کرنے والا ہوں۔''

''بدھائی ہو۔ مجھے سن کر خوشی ہوئی، اب وہ جگہ جگہ نہیں رلے گی۔'' وکرم نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

لالہ رام عصیلی نگاہوں سے بھائی کی جانب دیکھنے لگا۔ سری رام نے اسے پرسکون رہنے کا خفیف اشارہ کیا اور ملائمت سے گویا ہوا۔

''بیاہ کے لیے کچھ تیاریاں بھی تو ہونی چاہئیں، ہیں نا؟ میں آج اسے گاؤں لے جاؤں گا۔ تم ساتھ چلنا چاہو گے؟''

وکرم لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس کے پردۂ تصور پر کچھ ہی مسافت پر واقع گاؤں ''[illegible]'' کا تصور رقصاں تھا جہاں اس کی پہلی بیوی کا آبائی گھر واقع تھا۔ [illegible] کی معلومات کے مطابق وہ بیٹے کی پیدائش کے بعد [illegible] میں ہی مقیم تھی۔ اس کے دل میں یکلخت ہی ایک تڑپ اجاگر ہو گئی۔ وہ تا حال بیٹے کی صورت نہیں دیکھ پایا تھا۔ اس کے علاوہ بیٹی کو گود میں اٹھا کر پیار کرنے کی خواہش بھی چٹکیاں بھرنے لگی تھی۔

''ہاں، پھولن اور میں بھی ساتھ ہی چلیں گے۔'' وہ اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کے جاتے ہی لالہ رام نے طیش سے کہا۔ ''یہ کیا

بے وقوفی ہے؟ وہ عورت ہم ٹھاکروں کے شریر دبانے، مالش کرنے، ہمارے آدمیوں کے سروں سے جوئیں صاف کرنے اور بستر گرم کرنے کے لائق ہے۔ تم اس سے بیاہ کی تیاریاں کرتے پھر رہے ہو؟''

''یہاں سے نکلنے کا کوئی اور راستہ ہے کیا؟'' وہ بھی بھائی پر الٹ پڑا۔ ''اسے شک بھی ہوسکتا تھا۔''

لالہ رام تذبذب میں مبتلا ہوگیا۔

''ہمت تو دیکھو اس کی۔'' سری رام نے بے دریغ دشنام طرازی کی۔ ''ہم سے پیسوں کا حساب کرنے چلا آیا ہے۔ اب ایسا بھی کلیوگ نہیں ہے کہ ٹھاکر ان نیچ ملاحوں کو پیسے واپس کریں گے۔''

''میں تم سے یہی کہوں گا کہ جو بھی کرنا ہے، بہت ساودھانی سے اور جلدی کرنا۔'' لالہ رام نے حتمی انداز میں کہا۔

''تم بس دیکھتے رہو کہ اب سب کا کیا حال ہوگا۔'' وہ زمین پر تھوکتے ہوئے اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

وکرم کی اہلیہ راجیشوری، پھولن سے نہایت تپاک سے ملی۔ اس کی گود میں پرکشش اور معصوم صورت بچے کو دیکھتے ہی پھولن کے دل میں ایک خلش بیدار ہوئی۔

''بہت پیارا ہے۔ بھگوان اسے ہمیشہ خوش رکھے۔'' اس نے خلوص سے کہا۔

وکرم نے بھی بیٹی کو آغوش میں بھر لیا تھا۔ اس کی صحت وقامت میں واضح فرق محسوس ہو رہا تھا۔

''میرے دونوں بچے ہی مجھ جیسے نہیں ہیں۔'' وکرم مسکرایا۔

''اور میری اِچھا تھی کہ آپ جیسے ہی ہوتے۔'' وہ آزردگی سے کہنے لگی۔ ''کم از کم ان کی صورت میں ہی آپ کو ہر سے اپنی نظروں کے سامنے دیکھ لیا کرتی۔''

راجیشوری کی اس معصومانہ خواہش پر وکرم کا دل بوجھل ہوگیا۔ پھولن بھی متضاد کیفیات میں گھر گئی تھی۔ وہ خالی نظروں سے ان بچوں اور وکرم کے باہمی پیار وجذبات کو دیکھتی رہی۔ راجیشوری نے کھانا تیار کیا اور نہایت جذبے سے برتن سجانے لگی۔ پھولن کے دل ودماغ ان لمحات کو محسوس کر رہے تھے جب رکمنی کے بیاہ کے بعد وہ بھی اپنے اہلِ خانہ کے لیے کھانا تیار کیا کرتی تھی۔ اس پل وہ عجیب کیفیات میں گھری ہوئی تھی۔ چند لمحے بعد وہ راجیشوری سے مخاطب ہوکر کہنے لگی۔

''ایک بات پوچھوں راجیشوری؟''

''ضرور پوچھو۔'' وہ مسکرائی۔

''تمہیں مجھ سے جلن محسوس نہیں ہوتی کیا؟ میں تمہارے پتی کے ساتھ ہر پل رہتی ہوں، تم یہاں اکیلی سب کچھ سنبھالتی ہو۔ تھوڑی سی جلن تو ہوتی ہوگی؟'' پھولن نے دریافت کیا۔

''ہوتی ہے نا۔'' اس نے شگفتگی سے اعتراف کیا۔

''برہا کی راتوں میں جب میں اکیلی ہوتی ہوں تو اپنی تقدیر پر رونا آتا ہے۔ کلپنا تم دونوں کو ایک دوسرے کی بانہوں میں گم دکھا کر مجھے بہت تڑپاتی ہے۔ پھر میں خود کو سمجھا لیتی ہوں۔ وکرم کی رکھشا کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔ اس کے لیے پھولن دیوی جیسا جگرا چاہیے۔''

راجیشوری کی اس بات نے پھولن کو آزردہ کر دیا۔ وہ اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''مجھے باپو نے بتایا کہ تم نے وکرم کی جان بچانے کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ بس اسے اسی طرح سنبھالے رکھنا۔ میں اپنے برہا کی جلن سنبھال لوں گی۔''

پھولن کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ قسمت کی کیسی ستم ظریفی تھی کہ وہ راجیشوری کی حیثیت، بچوں اور بھرپور خاندان کی متمنی تھی جبکہ وہ اس کی جگہ سنبھالنا چاہتی تھی۔ اسی لمحے وکرم بھی وہیں چلا آیا۔ کھانے سے فراغت کے بعد اس نے کڑے دل سے کہا۔

''چلتا ہوں، گھر واپس جاؤ تو ماں اور باپو سے کہنا مجھے شما کر دیں۔ میں اس دن جانے کیوں اتنے غصے میں آگیا تھا۔ ان سے بھی بہت بدتمیزی کر بیٹھا۔''

''کچھ دیر تو اور رک جاتے۔'' راجیشوری مضطرب ہوئی۔

''نہیں رک سکتا، ابھی جانا ضروری ہے۔'' وکرم نے بوجھل سانس لی۔

''پھر کب آئیں گے؟'' اس کی نگاہوں میں نمی پھیل گئی۔

''بہت جلد۔ تم اپنا اور بچوں کا خیال رکھنا۔ ان کی شکشا میں کوئی کمی نہ چھوڑنا۔'' وکرم نے حسرت سے جواب دیا۔

پھولن کے دل میں بے چینی چٹکیاں بھرنے لگی۔ اس نے وکرم کو اتنا آزردہ اور شکستہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ خدشات کسی بدہیئت بھوت کی طرح اسے ستانے لگے۔

☆☆☆

واپسی کا سفر بے حد بوجھل تھا۔ سری رام طے شدہ مقام پر پہنچ چکا تھا۔ پھولن کو کسوما کی اٹکھیلیوں سے بیزاری ہو رہی تھی۔ اس کی زبان اپنی متوقع شادی کے تذکرے کرتے ہوئے فراٹے بھر رہی تھی۔

''کیا بات ہے پھول سنگھ! ہمارے بیاہ سے خوش نہیں

ہوگیا؟'' سری رام نے چٹکی بھری۔

''بہت خوش ہوں۔ اب یہ ہر کسی کو اپنا شریر دان نہیں کرتی پھرے گی۔'' پھولن نے بھی ملائمت سے طنز کیا۔

سری رام کے ہونٹوں پر ایک سلگتی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی دھیمی گنگناہٹ اعصاب میں جھنجھناہٹ پیدا کر رہی تھی۔ اگلا روز سست روی سے بیتتا محسوس ہو رہا تھا۔ وکرم کی بے چینی سواتر ہونے لگی تھی۔ پھولن کے لیے بھی اپنی کیفیات ناقابلِ فہم تھیں۔ ایسے فضا میں کسی نادیدہ گدھ کی پھڑپھڑاہٹ بے کل کر رہی تھی۔ اس روز سہ پہر کے بعد ہونے والی بارش نے جمنا میں قدرے طغیانی پیدا کر دی۔

پھولن خالی الذہنی کے عالم میں کنارے پر پاؤں لٹکائے بیٹھ گئی۔ کچھ ہی لمحوں بعد وکرم بھی اس کے قریب آ بیٹھا۔ اس کے چہرے پر دبیز افسردگی طاری تھی۔

کچھ دیر اسی خاموشی میں بیت گئی۔ اس کے بعد پھولن نے بوجھل انداز میں کہا۔

''اپنا درد اور تکلیف مجھ سے مت چھپایا کرو۔''

''ایسا کیوں لگتا ہے تمہیں؟'' وہ چونکا۔

''تمہاری کمر میں پھنسا گولی کا وہ ذرہ بہت تکلیف دیتا ہے۔ اس کے باوجود تم آرام نہیں کر رہے۔''

''یہ آرام کا سمے نہیں ہے پھولن!'' اس نے اپنے ہونٹ کچلے۔ ''پتا نہیں کیوں مجھے ایک عجیب سا ڈر محسوس ہو رہا ہے۔''

''ہم سب تمہارے ساتھ ہیں وکرم!'' پھولن نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''میں نے تمہارے ساتھ بہت غلط کیا پھولن! مجھے شما کر دینا۔ میرے کارن تمہارا جیون برباد ہو گیا۔'' وہ ملول تھا۔

''مجھے اتنی شکتی بھی تو تم ہی نے دی ہے۔ میں نے تمہارے سنگ رہ کر بہت کچھ سیکھا ہے۔'' اس نے صدقِ دل سے کہا۔

''سوچتا ہوں، اگر میں مر گیا تو تمہارا کیا ہوگا؟'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ اپنے گھٹنوں میں سر دیے رونے لگا۔

پھولن کا دل دکھ سے بوجھل ہو گیا۔ اس نے وکرم کی یہ شکستہ کیفیت تو اس وقت بھی نہ دیکھی تھی جب وہ زخم و نقاہت سے بے حال تھا۔

''تمہیں کچھ نہیں ہوگا مستانہ! بھگوان تمہیں میری عمر بھی لگا دے۔'' اس نے تڑپ کر وکرم کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے مس کیا۔

''مجھے کچھ ہو گیا تو وارثے لال کے ساتھ ہی رہنا۔ صرف وہی تمہاری رکھشا کر سکتا ہے۔'' وکرم نے اس کی بات ان سنی کر دی۔

پھولن نے تڑپ کر اسے اپنی آغوش میں بھر لیا۔

''میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہی رہوں گی۔ تمہیں کچھ بھی نہیں ہونے دوں گی۔''

وکرم محبت سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

''تم نے مجھے شما کر دیا ہے نا؟''

اس لمحے پھولن اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دینا چاہتی تھی۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ بدترین حیوانیت اور وحشت سہنے کے بعد کسی مرد نے پہلی بار اس کے دل میں گھر کیا تھا۔ وہ وکرم سے اپنی شدید محبت کے اظہار کے لیے پر تول ہی رہی تھی کہ عقب سے ایک ناپسندیدہ آواز نے اعصاب منتشر کر دیے۔

''تم یہاں بیٹھے ہو؟ ہم تمہیں کب سے تلاش کر رہے ہیں۔'' سری رام نے کہا۔ ''پیسوں کا کچھ حساب کتاب کرنا ہے۔''

وکرم خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھولن اپنا دل مسوس

کر افق پر پھیلی سرخی دیکھنے لگی۔ اسے وکرم کے آنسو ہنوز مضطرب کیے ہوئے تھے۔

☆☆☆

اس شب وکرم اپنی رائفل سینے پر رکھے معمول سے بہت جلد سو گیا۔ سری رام اور لالہ رام بھی دریا کے کنارے اپنے مخصوص مقام پر محوِ نیند تھے۔ گزشتہ دو روز سے وہ اپنی نیند اور خوراک کے معاملے میں کوئی کوتاہی نہیں برت رہے تھے۔ پھولن کی جلتی آنکھوں سے نیند آج بھی کوسوں دور تھی۔ اس نے محتاط انداز میں قرب و جوار کا جائزہ لیا اور مشرا کو بیدار کرتے ہوئے سرگوشی میں کہنے لگی۔

''میرے ساتھ چلو، بہت ضروری کام ہے۔''

''کیا [illegible] ہے پھول سنگھ! اس سمے..... سب خیر تو ہے نا؟'' وہ [illegible] میں [illegible]۔

''ہمیں سری [illegible] رام کی ہتھیا کرنی ہے۔ ہم دونوں ایک ساتھ ان کے ہتھیار [illegible] پانی میں پھینکیں گے اور ترنت گولیاں چلا دیں گے۔'' اس نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔

مشرا تاسف و حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''ایسا نہیں ہوتا پھول سنگھ! یہ نیموں کے خلاف ہے۔ ہم کسی سوئے ہوئے انسان پر گولی نہیں چلا سکتے۔''

''تم ان راکھشسوں کو جانتے نہیں ہو۔ یہ ایک بار وکرم کی جان لینے کی کوشش کر چکے ہیں۔ میرا من کہتا ہے، یہ اب بھی کوئی نہ کوئی حرکت ضرور کریں گے۔'' پھولن نے زور دیا۔

''مستانہ اس بات کو بالکل پسند نہیں کرے گا۔'' مشرا نے سمجھایا۔

''تم نے اس کی حالت نہیں دیکھی مورکھ!'' پھولن نے دانت پیسے۔ ''آج وہ پہلی بار استا رو دیا ہے۔ میرا دل بیٹھ رہا ہے مشرا! بھگوان کے لیے میرا ساتھ دو۔ اس سے بہتر موقع دوبارہ نہیں ملے گا۔''

مشرا متذبذب دکھائی دینے لگا۔ اسے پھولن کی بات غیر منطقی محسوس ہو رہی تھی۔ رام برادران پر کسی بھی حملے کی صورت میں ان کا گروہ ہتھیار سونت کر ان کے سامنے آ کھڑا ہوتا۔ معاملات انتہائی حد تک بگاڑ کا شکار ہو سکتے تھے۔

اسے گومگو کیفیت میں دیکھ کر پھولن نے سرد مہری سے کہا۔ ''اگر رگھوناتھ یہاں ہوتا تو وہ کوئی بھی دوسری بات کیے بغیر میرے ساتھ چل دیتا۔ میں نے غلطی کی جو تم سے مدد مانگ لی۔ وکرم کے سُکھ شانت جیون کے لیے میں خود ہی ان راکھشسوں کو مار دوں گی۔''

''ایسا مت کرو پھول سنگھ!'' مشرا نے روکنا چاہا، تاہم پھولن بے خوفی سے ان دونوں کی جانب بڑھ گئی۔

ان لمحات میں اس کا دل خدشات سے لبریز تھا۔ وکرم کے آنسو اور بے چینی رگ و پے میں حشر برپا کیے ہوئے تھی۔ بدن کے ہر ایک روئیں میں صرف ایک ہی صدا موجزن تھی کہ سری رام اور لالہ رام کا قصہ ہی تمام کر دے۔

''رک جاؤ پھول سنگھ!'' مشرا کی آواز بے اختیار بلند ہو گئی۔

اسی پل سری رام کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے ناگواری سے حسبِ عادت دشنام طرازی کی اور فحش ترین القابات استعمال کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''ان...... ملاحوں کو رات میں بھی چین نہیں ہے۔ ہر وقت بھونکتے ہی رہتے ہیں۔''

پھولن کے قدم بے بسی سے ساکت ہو گئے۔ وہ شکوہ کناں نظروں سے مشرا کو دیکھنے لگی۔ اس نے چار و ناچار اپنے دل و دماغ سے برآمد ہوتی صدائیں نظر انداز کیں اور درخت کے تنے سے پشت ٹکائے یک ٹک خوابیدہ وکرم کی جانب دیکھتی رہی۔

☆☆☆

اگلا روز بھی بے حد بوجھل اور تناؤ زدہ تھا۔ فضا میں ایک عجیب اداسی رچی تھی۔ ہر ایک میکانکی انداز میں اپنے معمولات سرانجام دے رہا تھا۔ رات کی سیاہی غالب آتے ہی وکرم نے [illegible] کہا۔

''آج میرے پاس لیٹ جاؤ۔''

پھولن نے محبت [illegible] کی جانب دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تم کتنے دنوں سے نہیں سوئی ہو؟'' اس نے استفسار کیا۔

''جب سے یہ دونوں آئے ہیں، نہ جانے کہاں جا سوئی ہے؟'' پھولن نے گہری سانس لی۔

''انہیں صبح ہی چلتا کر دوں گا۔ اگر انہوں نے [illegible] سے انکار کیا تو ہم اپنے راستے الگ کر لیں گے۔'' وہ [illegible] انداز میں کہنے لگا۔

''یہ کام تمہیں بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا وکرم!'' اس کی آواز بوجھل ہونے لگی۔

وکرم کے پہلو میں لیٹتے ہی اس کے وجود کی حدت، احساسِ تحفظ اور محبت کی غیر مرئی شعاعوں نے پھولن کے اعصاب ہلکے پھلکے کر دیے۔ وہ کچھ ہی لمحوں میں نیند سے ہم آغوش ہو گئی۔ وکرم بھی اضمحلال محسوس کر رہا تھا۔ اس نے

رائفل اپنے بدن کے قریب تر کی اور آنکھیں موندتے ہی ہوش وحواس سے بیگانہ ہوگیا۔

سری رام اسی لمحے کی تاک میں تھا۔ رات کے کھانے میں ملائی گئی مخصوص دوا نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ برق رفتاری سے ایک کپڑے کو کلوروفارم میں بھگوتے وارے لال، مشرا اور دیگر افراد کی سمت بڑھ گئے۔ مخصوص دوا کے اثرات ان پر غالب آچکے تھے۔ اگلے ہی لمحے فضا گولیوں کی ہولناک تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔

پھولن کے بدن کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ اس کے حواس بارود کی ناگوار بدبو محسوس کر رہے تھے جو بابو گجر سنگھ کے قتل سے منسوب تھی۔ اسی پل اسے وکرم کی بھنچی ہوئی آواز سنائی دی۔

"پھولن...... اس...... نے...... مجھے...... گولیاں......"

پھولن تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ وکرم کا بدن لہو اگل رہا تھا۔ وہ ہذیانی انداز میں اسے ٹٹولنے لگی۔ سری رام نے ایک وحشیانہ قہقہہ لگایا اور چند گولیاں مزید داغ دیں۔ پھولن پر دیوانگی طاری ہوگئی۔ وہ چلاتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو آوازیں دینے لگی۔ کچھ ہی لمحوں میں اس کی بصارت نے مشرا اور وارے لال کے بے جان وجود بھی دیکھ لیے تھے۔ اس کے ہذیان میں مزید اضافہ ہوگیا۔

"ماردو...... مجھے بھی ماردو...... مجھے کیوں جیوت رکھا ہے؟" اس کی چیخوں سے جنگل گونج اٹھا۔

اسی لمحے کسوما اس کی جانب بڑھی اور سرد مہری سے اسے دیکھتے ہوئے لباس تار تار کر دیا۔ پھولن اس حرکت پر تھرا کر رہ گئی۔

"یہ کیا کر رہی ہو تم؟" وہ اپنے بازو اور پاؤں سمیٹتے ہوئے برہنگی چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

کسوما نے تنفر سے اسے دیکھتے ہوئے گردن سے سونے کا ہار، کلائی سے چوڑیاں اور ہاتھ سے دُرگا کی شبیہہ والی انگوٹھی بھی نوچ لی۔ پھولن دیوانہ وار یہ اشیا لینے کے لیے مچل گئی۔ یہ تمام تر تحائف وکرم نے اسے دیے تھے۔ اس کی مزاحمت کو محظوظ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سری رام نے اپنے اہلکاروں کو مخصوص اشارہ کیا۔ انہوں نے اسے گھسیٹتے ہوئے ایک کشتی میں لے جا کر باندھ دیا۔ وہ وکرم کو پکارتی ہوئی اپنی زندگی ختم کر دینے کی دہائیاں دینے لگی۔

"شش...... خاموش......!" سری رام نے پچکارا۔ "تمہیں کیوں ماردیں؟ تم سے تو ابھی بہت سے کام لینے ہیں۔ ذرا دھیرج تو رکھو۔"

پھولن کو اپنے اعصاب منجمد ہوتے محسوس ہونے لگے۔ بصارت میں وکرم کے لہورنگ بدن کا منظر ثبت ہوگیا تھا۔

"وکرم کو کچھ نہیں ہوگا۔ وہ میرے پیچھے ضرور آئے گا۔ وہ اس راکھشس کو ضرور مارے گا۔" کشتی کی مسافت کا آغاز ہوتے ہی پھولن خود کو تسلی دینے لگی۔

☆☆☆

اگلی صبح سورج طلوع ہونے تک وہ ایک گاؤں میں پہنچ چکے تھے۔ سری رام کے اہلکاروں نے اسے ایک چوراہے پر لے جا کر پٹخ دیا۔ ایک برہنہ عورت کی دید پر وہاں جم غفیر دکھائی دینے لگا۔

"اس عورت کو جانتے ہی ہو گے تم سب؟" سری رام بھیگے لہجے میں چلایا۔ "یہ پھولن دیوی ہے۔ اس نے وکرم ملاح کا خون کر دیا ہے۔"

اس انکشاف پر اہلِ گاؤں دنگ رہ گئے۔ ان کے وجود میں غم و غصے کے جذبات ابلنے لگے تھے۔ سری رام نے اگلا وار کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں، میرے بھائیو! اس...... نے ہم سب کے پیارے وکرم کو اپنے ایک عاشق کے ساتھ مل کر ماردیا ہے۔" اس نے بے دریغ گالیاں دیں۔ "کیا تم اسے یونہی چھوڑ دو گے؟"

"نہیں......"

"اسے سزا ملنی چاہیے۔"

"وکرم تو ایشور کا ایک روپ تھا...... ہمارے لیے بہت بڑا سہارا تھا۔"

"اسے تو موت سے بھی بدتر سزا ملنی چاہیے۔"

مجمعے سے ابھرتی آوازیں بے حد ہولناک تھیں۔ اس نے تڑپ کر سری رام کی سازش کا انکشاف کرنا چاہا لیکن وہ اسے کوئی بھی موقع دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"میں بتاتا ہوں، اسے کیا سزا دینی چاہیے۔" وہ خباثت سے مسکرایا اور اسی چوراہے پر اسے بے آبرو کر دیا۔

پھولن کی حیرت و کرب میں ڈوبی آنکھوں میں آسمان کی وسعتیں دھندلا رہی تھیں۔

"تم میں سے جو بھی وکرم ملاح کی موت کا بدلہ چاہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس نے کبھی تم پر کوئی اپکار کیا تھا تو اس نیچ عورت سے اسی طرح انتقام لو۔" سری رام چلایا۔

اس اعلان نے مجمعے کے جذبات برانگیختہ کر دیے۔ پھولن کی مزاحمت اور تڑپ انہیں مزید ہیجان زدہ کر رہی

تھی۔ اگلے ایک گھنٹے میں اس نے موت کی دہائی اور مزاحمت ترک کردی۔ وہ کسی زندہ لاش کی طرح گاؤں بھر کے مردوں کو اپنی آبروریزی کرتے دیکھتی رہی۔

”مجھے ماردو...... بھگوان! تو ہی میری سن لے...... مجھے موت دے دے۔“ اس کے لب بے آواز جنبش کرنے لگے۔

☆☆☆

پھولن کے لیے زمان ومکان بے معنی ہوچکے تھے۔ سری رام اسے رسی سے باندھے گاؤں در گاؤں مسافت طے کر رہا تھا۔ ہر گاؤں میں اس کے برہنہ وجود کو گلیوں میں گھمایا جاتا اور اس کے بعد ایک بار پھر اسی کھیل کا آغاز ہوجاتا۔ پھولن کو اب یاد ہی نہ رہا تھا کہ اسے کتنے مردوں نے بے آبرو کیا۔ وہ اسے نوچتے، کھسوٹتے، بھنبھوڑتے اور وکرم کی یاد میں ”[illegible]زاری“ کرنے لگتے۔ پھولن کا بدن زخموں سے چور ہوچکا تھا۔ اسے رسی سے گھسیٹتے ہوئے ہی مختلف مقامات پر لے جایا جاتا تھا۔

”اب یہ سلسلہ ختم کردینا چاہیے۔“ لالہ رام نے بھائی کو مخاطب کیا۔

”ابھی تو اس کھیل کا مزہ آنے لگا ہے۔ تم کہتے ہو ختم کردوں؟“ سری رام ہنسا۔

”کم از کم اسے اس طرح گلیوں میں گھمانا چھوڑ دے۔“ وہ زچ ہوا۔

”نہیں...... ابھی میرا من نہیں بھرا۔“ اس نے ہٹ دھرمی سے جواب دیا۔

”اس کی حالت دیکھ ذرا۔“ لالہ رام نے تحمل سے کہا۔

”کیا ہوا ہے؟ اچھی بھلی تو ہے۔“ وہ خباثت سے مسکرایا۔

”تم نے اسے پولیس کے حوالے بھی کرنا ہے۔ اس کے شریر پر گھاؤ دیکھ کر پولیس کا منصوبہ بھی چوپٹ ہوجائے گا۔ وہ اسے کس طرح سرکار اور اخبار والوں کے سامنے لے جائیں گے۔ اس طرح تو اخبار والے یہ آروپ لگائیں گے کہ پولیس نے اس پر اتیاچار کیا ہے۔“ وہ اسے معاملے کے دوسرے پہلو سے آگاہ کرنے لگا۔

”نیچ عورت......!“ سری رام نے پھولن کا تصور کرتے ہوئے دانت پیسے۔ ”میرا بس چلے تو اس پورے دیش کے ٹھاکر اس پر چھوڑ دوں۔“

لالہ رام اس گفتگو پر لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا اور رسان سے گویا ہوا۔

”اس سے یہاں کوئی ٹھاکر ایسا نہیں ہے جس نے اس سے انتقام نہ لیا ہو۔ اسے اب پولیس کے حوالے کردینا چاہیے۔ انعام کے پیسے لے کر کہیں دور نکل جائیں گے۔“

سری رام اس تجویز پر قائل محسوس ہونے لگا۔ اس نے ایک توقف کے بعد کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ ایک آخری بازی کے بعد اسے اور وکرم کے جیوت ساتھیوں کو پولیس کے حوالے کردیں گے۔“

لالہ رام ہونٹ بھینچ کر خاموش ہوگیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا بھائی پھولن کو ہر اس گاؤں اور علاقے میں بے آبرو کروائے گا جہاں وہ وکرم ملاح کے ہمراہ ٹھاکروں کے راج کو للکار چکی تھی۔

سری رام متوقع لمحات کا تصور کرتے ہوئے ایک نئے خمار میں مبتلا ہونے لگا۔

☆☆☆

پھولن کے متورم چہرے پر سورج کی تیز کرنیں پڑیں تو وہ بے اختیار کسمسا کر رہ گئی۔ وہ اس وقت ایک کھاٹ پر موجود تھی۔

”یہ اب کہاں لے آیا ہے مجھے؟“ اس کے ڈوبتے ذہن میں سوچ اُبھری۔

”کیا تماشا ہے یہ؟ اسے یہاں سے ہٹاؤ۔“ کچھ لمحوں بعد ایک نسوانی آواز سماعت میں پڑی۔

پھولن کے ذہن میں بے اختیار کسوما کا خیال گردش کرنے لگا۔ وہ گزشتہ رات بھی نہایت کر و فر سے اس کے پاس آئی تھی۔

”کیسی ہو بہن جی؟“ کسوما نے آتے ہی طنزاً دریافت کیا۔

”تم تو میرے ساتھ ایسا نہ کرو کسوما!“ اس نے بمشکل کہا۔ ”میری یہ [illegible] آسان کردو۔ مجھے ماردو۔“

”اپنے پتی کو کیوں نہیں بلاتیں؟“ کسوما نے اسے ٹھوکر رسید کی۔ ”بہت گھمنڈ تھا نا [illegible] پر۔“

پھولن کی کمر میں ببول کے کانٹے سے پیدا ہونے والے زخم سے ایک بار پھر ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ اس میں اب کراہنے کی بھی ہمت نہ تھی۔

”بس تھوڑا دھیرج کر۔ اس کے بعد تیرے [illegible] کا علاج ہوجائے گا۔“ وہ معنی خیزی سے کہتی باہر چلی گئی تھی۔

”کیا تماشا ہے یہ؟“ پھولن کی سماعت میں ایک بار پھر وہی آواز آئی۔

اس کے ساتھ بدن پر حدت اور فرحت کا احساس ہوا۔ نامعلوم عورت نے اسے ایک کمبل اوڑھا دیا تھا۔ یہ احساس بھی دیر پا نہ رہا۔ سری رام تنتناتا ہوا آیا اور ایک

جھٹکے سے کمبل نوچ لیا۔

"تم مردوں کے معاملے میں مت پڑو۔ یہاں سے چلی جاؤ۔" وہ غرایا۔

"واہ رے۔" پردھان کی اہلیہ نے دوبدو کہا۔ "میں تم مردوں کے معاملے اچھی طرح جانتی ہوں۔ اپنے دشمنوں کو گولی مار دیتے ہو اور ان کی عورتوں کے شریر سے کھیلنا بہادری سمجھتے ہو۔ لعنت ہے ایسی مردانگی پر۔"

"اسے یہاں سے لے جاؤ ورنہ میں اسے یہیں گاڑ دوں گا۔" وہ چلایا۔

پردھان دانت کچکچاتا ہوا اسے واپس لے گیا۔ سری رام کے اشارے پر پھولن کو بالوں سے گھسیٹ کر کھاٹ سے نیچے پھینک دیا گیا۔ پھولن نے کرب سے آنکھیں موند لیں۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ [illegible] میں ایک بار پھر اسی کھیل کا آغاز ہونے والا ہے۔ اس گاؤں کے مرد بھی اسے اپنی وحشت کا نشانہ بناتے ہوئے نت نئی اذیتیں پہنچا کر مسرور ہوں گے لیکن اس روز معاملات خلاف توقع تھے۔ چند ثانیوں کے بعد برہمن کا بیٹا ایک [illegible] شرٹ، پتلون اور جوتے لے آیا۔ سری رام کے ایک ساتھی نے اسے رسیوں کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے کسی نہ کسی طور لباس تو پہن لیا تاہم متورم اور لہولہان پاؤں میں جوتے پہننا بہت دشوار ہو رہا تھا۔

"ارے واہ۔ اس دن تو بہت بول رہی تھی، آج تیری زبان کہاں گئی؟" پھولن کو کسی مرد نے مخاطب کیا۔

وہ اپنی دھندلائی بصارت سے مقابل کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ ذہن پر زور ڈالنے سے اسے یاد آ گیا کہ یہ وہی زمیندار تھا جو ایک وفد کے ہمراہ وکرم کے پاس مصالحت کی تجویز لے کر آیا تھا۔

"اسے کسی کے سامنے بولنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا میں نے۔" سری رام نے حقارت سے پھولن کو دیکھا۔

"یہ تو بہت پنے کا کام کیا ہے تم نے۔" وہ مسکرایا۔

سری رام نے پھولن کے زخموں سے چور بدن پر ایک وحشیانہ ٹھوکر رسید کی اور تنفر سے فحش گوئی کے بعد کہنے لگا۔

"نیچ عورت! تیری یہی اوقات تھی۔ تجھے کیا لگتا تھا کہ پھولن سنگھ بن کر ہم ٹھاکروں کو للکارے گی۔ ہم تم ملاحوں کا حکم مانیں گے؟ تو ایک نیچ ذات ہے۔ ٹھاکروں کا بستر گرم کرنے کے لیے ہی پیدا ہوئی ہے۔"

پھولن کو اپنی سماعت میں سیسہ پگھلتا محسوس ہونے لگا۔

"اس کے باقی ساتھی کہاں ہیں؟" زمیندار نے استفسار کیا۔

"نیم کے درخت سے بندھے پڑے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"اس کے زخم دھلوا دو۔ کم از کم چہرہ صاف کروا دیتے۔" وہ کسی سوچ کے تحت کہنے لگا۔

کچھ ہی لمحوں بعد پھولن کو تازہ دم کرنے کے بعد نیم کے درخت تلے پہنچا دیا گیا۔ وہ اپنے ان ساتھیوں کی ٹوٹی ہوئی کلائیوں، زخموں سے چور لہولہان بدن اور متورم چہروں کو بے بسی سے دیکھ کر رہ گئی۔

"پھول سنگھ...... تم......؟" ان کی ویران آنکھوں میں ایک ہی صدا تھی۔

"وکرم کیسا ہے؟ وہ بچ گیا تھا نا؟ اس کا علاج ہو رہا ہوگا ابھی تو؟" پھولن نے ایک موہوم سی آس کے تحت دریافت کیا۔

نریندر نے کرب سے سر ہلایا اور شکستگی سے کہنے لگا۔

"وکرم اسی سے مر گیا تھا۔ ان راکھشسوں کے ساتھیوں نے وہاں بہت تباہی مچائی۔"

پھولن کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ دھاڑیں مارتے ہوئے وکرم کو پکارنے لگی۔ دیگر ساتھیوں کی آنکھوں سے بھی اشک رواں ہو گئے۔ اسی اثنا میں سری رام ایک برہمن کے ہمراہ وہاں چلا آیا۔ پھولن اس برہمن سے آشنا تھی۔ وہ وکرم کے ہمراہ کئی بار اس سے ملاقات کر چکی تھی۔

"تم نے بہت اچھا کام کیا ہے سری رام!" برہمن نے تنقیدی نگاہوں سے [illegible] کا جائزہ لیا۔ "وکرم سے جان چھوٹنے پر ہم سب بہت خوش ہیں۔"

سری رام کے سیاہ ہونٹوں پر ایک کریہہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ برہمن کچھ لمحوں کے لیے پھولن کو دیکھتا رہا اور اپنا سر کھجاتے ہوئے معنی خیزی سے کہنے لگا۔

"اسے کچھ دیر کے لیے میرے پاس بھیج دو۔"

برہمن کی فرمائش پر سری رام نے فلک شگاف قہقہہ لگایا اور فراخدلی سے اجازت دے دی۔ پھولن کا بدن بے طرح اینٹھنے لگا۔ وہ اس شخص کو از راہ تکریم "بوبا" کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ اس نے کبھی بھی رشتے کا خیال نہ کیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں اسے گھسیٹتے ہوئے برہمن کے پختہ مکان میں پہنچا دیا گیا۔ سری رام کی لغو گوئی میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ برہمن کو اپنے سامنے دیکھ کر پھولن کے لیے سانس لینا دشوار ہونے لگا۔ اس نے بے بسی سے آنکھیں موندیں اور منت ریز ہوئی۔

"تم تو ایسے نہ کرو بوپا! تم وکرم سے کتنا پریم کرتے تھے۔ آج اس کے لیے من میں اتنی نفرت کہاں سے آ گئی؟ مجھے بیٹی کہتے تھے نا، آج بیٹی کو ہی نوچنے چلے آئے ہو؟"

برہمن نے ایک گہری سانس لی اور اس کے پاس ہی فرش پر بیٹھ گیا۔ "چنتا نہ کر۔ میں ایسا کچھ نہیں کرنے آیا۔"

پھولن نے بے یقینی سے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ منظر بالکل تبدیل ہو چکا تھا۔ برہمن کے چہرے پر دکھ، تاسف، شفقت اور دلاسا سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے پھولن کو رسیوں کی گرفت سے آزاد کیا اور کمرے کے ایک کونے سے ساختہ بارہ بور کی رائفل برآمد کر کے اسے تھما دی۔

"تجھے اب تھوڑی ہمت کرنا ہوگی۔ یہاں سے بھاگ جا۔"

"لیکن میرے ساتھی؟" وہ مضطرب ہوئی۔

"میں ان کے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا بیٹی!" اس نے بے بسی سے کہا اور پانی کا ایک کٹورا اسے تھما دیا۔

پانی کے گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد اسے اپنے اعصاب سنبھلتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ پھولن اپنے شکستہ وجود کو بمشکل گھسیٹتی ہوئی برہمن کی راہنمائی میں مکان کی عقبی سمت چلی آئی۔ اسے اپنے سامنے ایک دیوار دکھائی دے رہی تھی۔ عمومی حالات میں یہ دیوار پھاندنا بالکل مشکل نہ ہوتا لیکن اس وقت بدن میں توانائی عنقا تھی۔

برہمن نے اس کی مشکل بھانپ لی۔ اس نے دیوار کی جڑ سے چند اینٹیں سرکاتے ہوئے اتنا راستہ بنا دیا کہ پھولن پیٹ کے بل وہاں سے بہ آسانی نکل سکتی تھی۔

"میرے دو آدمی تجھے آگے لے جائیں گے۔ ان پر وشواس رکھنا۔" اس نے کہا۔

"تم بھی ساتھ چلو بوپا!" وہ متوحش تھی۔ "یہ سرخ بالوں والا راکھشس تمہیں نہیں چھوڑے گا۔"

"چنتا کیوں کرتی ہے؟" برہمن نے دلاسا دیا۔ "میں ایک بوڑھا آدمی ہوں، وہ میرا لحاظ کرے گا۔ تو بس ترنت نکل جا۔"

پھولن کے باہر نکلتے ہی دو قدرے کم عمر لڑکوں نے اس کے دھان پان سے وجود کو اٹھایا اور حتی الامکان تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ آزادی کا احساس پھولن کے اعصاب سے شکستگی جذب کرنے لگا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ گاؤں کے مکئی کے ایک کھیت میں پہنچ گئے۔

"اس جگہ سے ہلنا مت۔ ہم تمہیں رات میں یہاں سے نکال لیں گے۔" کالی نے ہدایت کی۔

"لیکن اس کے آدمی ڈھونڈنے آ گئے تو کیا ہوگا؟" وہ بے کل ہوئی۔

"ان لوگوں سے ہم نمٹ لیں گے۔ کھیت کے اس حصے میں کوئی نہیں آئے گا۔" چرن پُراعتماد تھا۔

پھولن نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ دونوں لڑکوں کی روانگی کے بعد اسے ایک ایک لمحہ صدیوں سا طویل محسوس ہونے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد زوردار دھماکوں کی آواز سنائی دی۔ اس کا دل لرز کر رہ گیا۔ بوڑھے برہمن کے تصور نے مزید آزردہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد فضا میں دھوئیں کے بادل بھی اٹھتے دکھائی دیے۔ پھولن اپنی بے چینی بمشکل ضبط کیے ہوئے تھی۔

رات کا اندھیرا پھیلتے ہی دونوں لڑکے دبے قدموں وہاں چلے آئے۔

"جلدی کرو دیدی! سمے بہت کم ہے۔" کالی نے عجلت میں کہا۔

"بوپا ٹھیک تو ہے نا؟" اس نے خوفزدہ ہو کر دریافت کیا۔

لالی نے دکھ سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"اس سرخ بالوں والے نے گولیاں مار دیں۔"

"اور...... میرے...... ساتھی؟" پھولن کی آواز ڈوبنے لگی۔

"انہیں زندہ جلا دیا ہے۔" چرن کی آواز لرز رہی تھی۔

"اتنے بڑے گاؤں کے کسی ایک شخص میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ اسے روک لیتے؟" وہ پھٹ پڑی۔

"بوپا اور وکرم کا حال دیکھنے کے بعد یہ ہمت اب کسی میں بھی نہیں رہے گی۔" کالی نے تلخی سے بتایا۔

پھولن نے اپنا ناتواں بدن بمشکل اٹھایا اور ان کے ہمراہ چل دی۔ گاؤں کی حدود سے نکلتے ہی اس نے بے اختیار عقبی سمت دیکھا تو چند لمحوں کے لیے ساکت ہو گئی۔

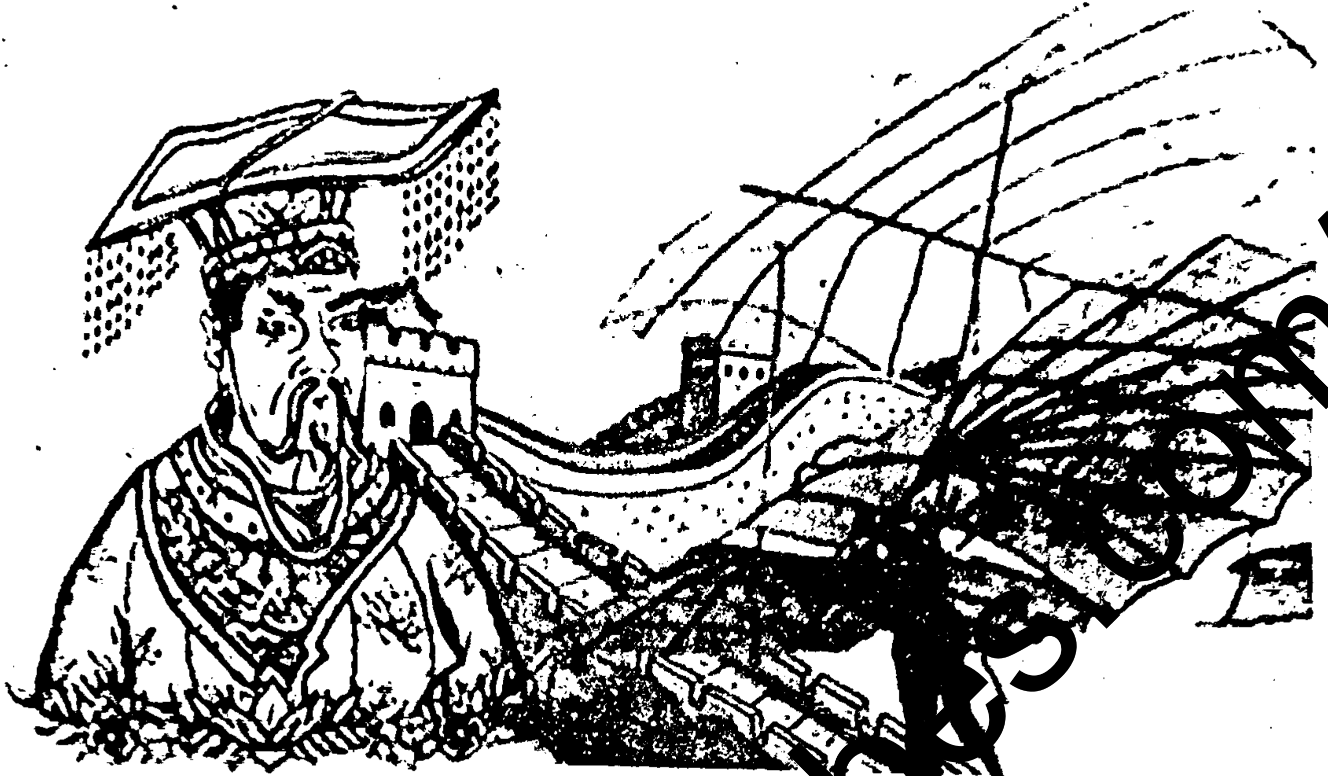
"میں واپس آؤں گی...... ضرور آؤں گی...... پھولن دیوی اب وکرم کا انتقام لینے کے لیے زندہ رہے گی۔ اس دھرتی کا ہر ایک ٹھاکر، پھولن کے نام سے کانپے گا۔" اس کے لبوں نے بے آواز سرگوشی کی۔

کچھ ہی لمحوں میں وہ تاریکی کا حصہ بن کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔

(جاری ہے)

**ماخذات**

میں ہوں پھولن دیوی، از: پھولن دیوی



# جرمِ پرواز

محمد عثمان ذوالفقار

انسان ہمیشہ سے تجسس پسند رہا ہے اور نت نئی ایجادات اسے مسلسل کوشش کرنے پر مجبور کرتی رہی ہیں۔ موجودہ دور ہو... یا کئی سال پرانا... اس نے اپنی ذہانت کے بل پر کچھ نہ کچھ تخلیق کیا ہے جس نے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا... مگر بعض دفعہ اس کی تخلیق دوسرے کی دانست میں نقصان کا سبب بن سکتی ہے اور یہی اس کا جرم ٹھہرتا ہے۔

**اپنی ایجاد کے جرم میں جان سے جانے والے [illegible] کا قصہ**

سن 400ء عیسوی میں جب شہنشاہ یوآن دیوارِ چین کے قریب اپنے تخت پر جلوہ افروز ہوا تو اس کی سرزمین بارشوں کی بدولت سرسبز و شاداب ہو چکی تھی اور اس میں اُگی ہوئی فصل اپنی کٹائی کے موسم کی منتظر تھی۔ ویسے تو سلطنت میں ہر طرف امن و امان کا دور دورہ تھا لیکن رعایا نہ تو بہت زیادہ خوش تھی اور نہ ہی بہت زیادہ غمگین۔

نئے سال کے دوسرے ماہ کے پہلے ہفتے کی ابتدائی صبح بادشاہ یوآن چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور خادم انہیں پنکھا جھل رہے تھے۔ اچانک ایک دوسرا خادم بدحواسی میں باغیچے کے سرخ و نیلے فرش پر دوڑتا ہوا بادشاہ کی طرف آیا

اور اونچی آواز میں کہنے لگا۔
"عالی جاہ...... عالی جاہ! ایک معجزہ ہوگیا۔"
"آج صبح کی ہوا پہلے سے زیادہ خوشگوار لگ رہی ہے۔" شہنشاہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
"نہیں، نہیں عالی جاہ، یہ نہیں۔" خدمت گار نے فوراً جھک کر مؤدبانہ انداز میں شہنشاہ کی بات کی تردید کی۔
"آج چائے پہلے سے زیادہ اچھی بنی ہے اور یہ بھی ایک قسم کا معجزہ ہی ہے۔" اس بار بادشاہ نے ہنس کر جواب دیا۔
"نہیں شہنشاہِ معظم! بات اس سے بہت بڑھ کر ہے۔"
"تو پھر بتاؤ کہ کیا سورج آج دوسری طرف سے نکل آیا ہے یا سلطنت میں کوئی بھونچال آ گیا ہے؟" بادشاہ نے مسکراتے ہوئے خادم سے استفسار کیا۔
"عالی جاہ! میں نے ایک انسان کو اڑتے ہوئے دیکھا ہے۔"
"کیا کہا تم نے؟" شہنشاہ یوآن نے اس بار کھنکار کر اپنی حیرت کا اظہار کیا۔
"میں کہیں جا رہا تھا کہ اچانک آسمان سے ایک انسانی آواز آئی۔ میں نے اوپر کی جانب دیکھا تو ایک انسان کاغذ اور بانس کی بنی ہوئی کسی رنگ برنگی چیز میں پھنسا اڑ رہا تھا یوں جیسے کوئی پرندہ ہوا میں پرواز کر رہا ہو۔" خادم نے اس بار ٹھہر ٹھہر کر وضاحت سے سارا واقعہ بیان کیا۔
بادشاہ مسکرا کر کہنے لگا۔ "مجھے لگتا ہے کہ تم ابھی ابھی نیند میں کوئی خواب دیکھ کر آئے ہو۔"
"ابھی صبح کا آغاز ضرور ہے لیکن میں نے جو دیکھا وہ خواب نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ مزید ثبوت کے لیے عالی جاہ میرے ساتھ چل کر دیکھ سکتے ہیں۔" غلام نے بادشاہ کو قائل کرنے کی کوشش کی۔
"بیٹھ کر چائے پیو۔ جو بات تم نے بتائی ہے اگر یہ واقعی حقیقت ہے تو پھر ایک انسان کو ہوا میں اڑتے ہوئے دیکھنا واقعی ایک حیرت انگیز اور انوکھا تجربہ ہے۔" بادشاہ نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔
جب چائے ختم ہوگئی تو خادم بے تابی سے بولا۔
"جلدی چلیے عالی جاہ! کہیں وہ غائب نہ ہو جائے۔"
"ٹھیک ہے چل کر دیکھتے ہیں کہ تم کیا دکھانا چاہ رہے ہو۔" بادشاہ نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔
پھر وہ دونوں گھاس کے میدان، چھوٹے پل اور گھنے درختوں کی چھاؤں سے گزرتے ہوئے ایک چھوٹے سے ٹیلے کے پاس پہنچے تو خادم آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "وہ رہا بادشاہ معظم۔"
بادشاہ نے آسمان کی طرف اپنی نظریں دوڑائیں تو اسے بلندی پر ایک انسان نظر آیا جو ہنس رہا تھا۔ اس کے کپڑے روشن اور سرکنڈوں سے بنے ہوئے اور وہ جس چیز میں پھنسا بیٹھا تھا، اس کی پیلی دم ہوا میں لہراتی نظر آ رہی تھی۔ وہ اس طرح ہوا میں آزاد گھوم رہا تھا جیسے کوئی بہت بڑا پرندہ یا قدیم زمانے کا کوئی نئی قسم کا ڈریگن ہوا میں اپنے پنکھ پھیلائے پرواز کر رہا ہو۔ اچانک صبح کی ٹھنڈی اور خوشگوار ہوا میں اس آدمی کی آواز گونجی۔ "میں اُڑ رہا ہوں...... میں اُڑ رہا ہوں۔"
خادم نے ہاتھ ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں ہاں تم اُڑ رہے ہو۔"
شہنشاہ یوآن نے عظیم دیوارِ چین کی طرف دیکھا جو دور سرسبز پہاڑوں میں دھند سے اُبھر رہی تھی۔ یہ وہ عظیم دیوار تھی جو ان کی سرزمین کو دشمن لشکروں سے تحفظ دیتی تھی اور اسی وجہ سے صدیوں سے اس سرزمین پر امن برقرار تھا۔ انہوں نے ایک نظر اپنے شہر پر ڈالی جو دریا اور پہاڑوں کے گرد بنے ہوئے راستوں میں واقع تھا اور ابھی نیند سے بیدار ہو رہا تھا۔
"کیا کسی اور نے بھی اس اڑتے ہوئے انسان کو دیکھا ہے؟" بادشاہ نے خادم سے پوچھا۔
"جی نہیں۔ میں ہی وہ واحد انسان ہوں جس نے اسے دیکھا ہے۔" خادم نے مؤدبانہ لہجے میں جواب دیا۔
بادشاہ نے لمحے بھر کے لیے آسمان کی طرف دیکھا اور بولا۔ "اسے بلاؤ میں بھی اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔"
خادم نے آسمان کی طرف منہ کیا اور پوری قوت سے چلّایا۔ "جلدی نیچے آؤ، بادشاہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔"
وہ انسان آہستہ آہستہ نیچے آنے لگا۔ بادشاہ نے چاروں طرف اپنی نظریں گھمائیں تو اسے دور کھیتوں میں ایک کسان نظر آیا جو آسمان کی طرف نظریں جمائے ساکت و جامد کھڑا تھا۔
اڑنے والا انسان کاغذ اور بانس کی بنی ہوئی اس انوکھی تخلیق کو سنبھالتا ہوا نیچے اترا اور بادشاہ کے سامنے جھک گیا۔
"یہ تم نے کیا کیا؟" بادشاہ نے سخت لہجے میں اسے مخاطب کیا۔
"میں نے آسمان میں پرواز کی ہے، بادشاہ سلامت۔" اس شخص نے فخریہ لہجے میں جواب دیا۔
بادشاہ نے اپنا سوال دہرایا۔ "یہ تم نے کیا کیا؟"

"میں نے ابھی تو آپ کو بتایا ہے بادشاہ سلامت۔"

اس بار آدمی نے اونچی آواز میں جواب دیا۔

"تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔" بادشاہ نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

آدمی نے اپنی اس انوکھی مگر نازک تخلیق کو چھوا جو صبح کی تازہ ہوا میں جیسے جھوم رہی تھی۔

"کیا یہ خوبصورت نہیں بادشاہ سلامت؟"

"ہاں خوبصورت تو ہے۔"

"یہ اس قسم کا دنیا کا واحد اور منفرد آلہ ہے اور میں نے ہی اسے ایجاد کیا ہے۔" آدمی نے فخریہ لہجے میں بتایا۔

"واقعی؟" بادشاہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

وہ آدمی مسکرا کر کہنے لگا۔ "جی بالکل بادشاہ سلامت۔ ابھی تک میں نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی، حتیٰ کہ اپنی بیوی کو بھی نہیں۔ وہ بیچاری تو شاید یہ سمجھتی رہی ہے کہ میں کوئی نئی قسم کی پتنگ بنا رہا ہوں۔ جب میری تخلیق مکمل ہوئی تو میں بنا اپنی بیوی کو بتائے رات کے اندھیرے میں چپکے سے دور چٹانوں کی طرف نکل آیا۔ جیسے ہی سورج نے آنکھ کھولی تو میں نے اپنی ساری ہمت مجتمع کی اور چٹان سے چھلانگ لگا دی کہ آر یا پار۔ خوش قسمتی سے میں اس تجربے میں کامیاب رہا اور جیسا کہ آپ نے دیکھا کہ میں کافی دیر ہوا میں اڑتا رہا ہوں۔"

"چلو اب واپس چلتے ہیں۔" بادشاہ نے کہا اور جانے کے لیے واپس مڑا۔ تھوڑی دیر میں وہ تینوں محل کے باغ کی ٹھنڈی فضا میں پہنچ چکے تھے۔

"محافظوں کو بلاؤ۔" بادشاہ نے کہا۔ محافظ دوڑتے ہوئے بادشاہ کی خدمت میں پہنچے۔

"اس انسان کو گرفتار کرلو۔" بادشاہ نے اڑان بھرنے والے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ دو محافظوں نے تیزی کے ساتھ اس آدمی کو اپنی حراست میں لے لیا۔

"جلاد کو بلاؤ۔" بادشاہ نے دوسرا حکم صادر کیا۔

"بادشاہ سلامت! میں نے کیا کیا ہے؟" اس آدمی نے رو دینے والے لہجے میں پوچھا۔

"یہ وہ انسان ہے۔" بادشاہ نے اس آدمی کی طرف اشارہ کر کے کہنا شروع کیا۔ "جس نے ایک انوکھی چیز بنائی ہے اور پھر بھی ہم سے پوچھ رہا ہے کہ اس نے کیا کیا ہے۔ اسے یہ تک معلوم نہیں کہ اس نے جو چیز بنائی اس کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔"

تھوڑی دیر میں جلاد حاضر ہوگیا جس نے اپنے چہرے کو سفید نقاب سے ڈھانپا ہوا تھا۔ اس کے مضبوط بازوؤں میں پکڑی ہوئی کلہاڑی کا پھل چمک رہا تھا۔ وہ مجرم کی طرف بڑھا۔

"ابھی ٹھہرو۔" بادشاہ نے اسے کہا اور پاس ہی موجود میز کی طرف مڑا جہاں ایک ایسی مشین رکھی ہوئی تھی جو خود بادشاہ نے بنائی تھی۔ بادشاہ نے اپنی گردن میں لٹکی زنجیر سے سنہری چابی اتاری اور اسے احتیاط کے ساتھ میز پر پڑی ہوئی مشین میں لگا کر گھمایا تو وہ مشین حرکت میں آگئی۔

یہ مشین درحقیقت دھات اور ہیرے جواہرات پر مشتمل ایک جادوئی باغ تھا۔ جیسے ہی مشین کے دھاتی باغ میں حرکت شروع ہوئی تو درختوں پر موجود زمرد سے بنے ہوئے پرندے گانے لگے، بھیڑ بکریوں نے ننھے جنگل میں قدم رکھے اور بونے لوگ دھوپ چھاؤں میں اِدھر اُدھر

## تائید

سیٹھ صاحب لندن کی سیر کو گئے ہوئے تھے۔ ان کی فرمائش تھی کہ انہیں پرانی تاریخی چیزیں اور مقامات بھی دکھائے جائیں۔ گائیڈ ایک روز انہیں تاریخی جنگی جہاز "وکٹری" دکھانے لے گیا۔ لارڈ نیلسن نے اس جنگی جہاز کے ذریعے کئی بحری جنگیں جیتی تھیں۔ بحری جہاز کی سیر کراتے ہوئے گائیڈ عرشے پر نصب پیتل کی ایک میز کے پاس رکا اور قدرے غمزدہ لہجے میں بولا۔ "......اور سر......! یہ ہے وہ جگہ جہاں گر کر لارڈ نیلسن نے جان دی تھی۔"

"واقعی...... یہ میز بڑے خطرناک اور بے ہودہ انداز میں بیچ راستے میں لگائی گئی ہے۔" سیٹھ صاحب میز سے دور ہٹتے ہوئے بولے۔ "میں خود اس سے ٹکرا کر گرنے لگا تھا۔"

(مرسلہ: نازش خان، کوئٹہ)

## ترجیح

ٹریول ایجنٹ ایک صاحب کو سیر کے لیے یونان جانے کا مشورہ دیتے ہوئے بولا۔ "سر! وہاں آپ کو پرانے کھنڈرات دیکھنے کو ملیں گے۔"

وہ صاحب نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

"میں نئے کھنڈرات دیکھنے کے لیے فرانس جانا پسند کروں گا۔"

(مرسلہ: عنبر خان، سوات)

دوڑتے ہوئے فواروں کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔

"کیا یہ خوبصورت نہیں ہے؟" بادشاہ نے اپنے تخلیق کردہ باغ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سامنے موجود آدمی سے پوچھا۔ "اگر تم پوچھو گے کہ میں نے کیا کیا ہے تو میں جواب دوں گا کہ میں نے پرندوں کو گیت گانے پر لگایا ہے۔ جنگل کو سرگوشیوں پر مجبور کیا ہے اور اس میں موجود لوگوں کو گھمایا پھرایا ہے تاکہ وہ جنگل، اس کی خوبصورتی اور پرندوں کے گیت سے لطف اندوز ہو سکیں۔"

پرواز کرنے کا مجرم بادشاہ کے سامنے گھٹنوں پر جھک گیا اور آنسوؤں سے لبریز لہجے میں کہنے لگا۔ "بادشاہ سلامت! میں نے بھی ایسی ہی ایک کوشش کی ہے۔ میں نے جب خوشگوار ہوا میں پرواز کی تو اسے اپنے لیے فرحت بخش پایا۔ جب میں نے زمین پر موجود باغات اور گھروں کا اونچائی سے نظارہ کیا تو مجھے یوں لگا جیسے میں کوئی پرندہ ہوں جو آسمان کی کھلی فضاؤں میں اڑتا پھر رہا ہو۔ بادشاہ سلامت! میں الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں کہ یہ سب کچھ کرنا میرے لیے کتنا خوبصورت اور لطف اندوز رہا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم نے جو کہا وہ سچ ہے۔ اتنی اونچائی سے زمین پر رہنے والوں کو دیکھنا یقیناً ایک دلفریب منظر ہوگا۔ میرا یہ محل اور اس میں پھرنے والے خادم تو بالکل چیونٹیوں کے مانند محسوس ہو رہے ہوں گے نا۔" بادشاہ نے کہا تو اس کے لہجے میں اداسی تھی۔

"تو پھر مجھے بخش دیجیے نا۔" وہ آدمی گڑگڑایا۔

"بعض اوقات......" بادشاہ نے افسوس بھرے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "ہمیں اپنے آس پاس موجود خوبصورتی کو بچانے کے لیے کچھ قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود میں تم سے نہیں بلکہ ایک اور آدمی سے ڈرتا ہوں۔"

"کس سے بادشاہ سلامت؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہو سکتا ہے کہ تمہیں دیکھ کر کوئی اور آدمی بھی کاغذوں اور بانس سے ایسی ہی ایک اڑنے والی چیز بنا لے اور پھر اسے بری نیت سے استعمال کرنے کی کوشش کرے۔ میں اسی آدمی سے ڈرتا ہوں۔ جہاں برائی ہوتی ہے وہاں خوبصورتی آہستہ آہستہ اپنا وجود ختم کرنا شروع کر دیتی ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"ہو سکتا ہے کہ آنے والے دنوں میں کوئی انسان آسمان میں پرواز کر کے دیوار چین پر بڑے بڑے پتھر پھینکنا شروع کر دے تو ہم کیا کر سکیں گے؟" بادشاہ سلامت نے اپنے اردگرد کھڑے لوگوں سے استفسار کیا مگر کوئی نہ بولا۔ بادشاہ نے جلاد کو اپنا کام کرنے کا اشارہ کیا۔ جلاد نے تیزی سے اپنے ہاتھوں کو حرکت دی اور اگلے ہی لمحے میں بادشاہ کے حکم کی تعمیل ہو چکی تھی۔

"پتنگ اور اس کے موجد دونوں کو جلا دو اور پھر ان کی راکھ کو اکٹھا دفن کر دو۔" یہ کہہ کر بادشاہ اپنے اس خادم کی طرف مڑا جس نے سب سے پہلے اس آدمی کو پرواز کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ "تم بھی اپنی زبان کو قابو میں رکھنا۔ یہ سب ایک خواب تھا...... ایک حسین مگر دردناک خواب...... اور جو کسان دور ایک کھیت میں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا اسے بھی سمجھا دینا کہ یہ سب اس کا ایک وہم تھا اور کچھ نہیں۔ اگر کبھی یہ بات باہر نکلی تو خود کو موت کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر لینا۔" بادشاہ نے سخت لہجے میں اپنی بات ختم کی۔

"آپ بہت رحم دل ہیں۔"

"نہیں، میں رحم دل نہیں ہوں۔"

بادشاہ نے باغ کی دیوار سے باہر دیکھا تو محافظ کاغذ اور بانس کی بنی اس پتنگ نما چیز کو جلا رہے تھے۔ اسے سیاہ دھواں آسمان کی طرف پرواز کرتا ہوا نظر آیا۔ پھر محافظوں نے راکھ دفن کرنے کے لیے گڑھا کھودنا شروع کیا۔ یہ سب دیکھ کر بادشاہ کا دل اچانک بہت اداس ہو گیا۔ اس خوبصورت اور شاندار ایجاد اور انسان کے بارے میں فیصلہ صادر کرتے ہوئے اسے افسوس تو بہت ہوا تھا مگر پھر اس کے دماغ نے سوال کیا۔ "کیا لاکھوں زندگیاں بچانے کے لیے ایک جان کی قربانی غلط ہے؟"

اس نے اپنی گردن سے لٹکی زنجیر سے سنہری چابی نکالی اور اپنے اس ننھے منے باغ کی مشین میں ایک بار پھر چابی بھر دی۔

بادشاہ نے ایک نگاہ دور نظر آنے والی عظیم دیوار چین پر ڈالی اور ایک آہ بھری۔ بادشاہ کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کہہ رہی ہو۔ "تم کب تک مجھے بچا سکو گے؟ آخر ایک دن پھر کوئی نہ کوئی انسان ایسی ہی ایجاد کرے گا اور تم اسے روکنے کے لیے موجود نہیں ہو گے۔"

بادشاہ نے ایک نظر اپنے حرکت کرتے ہوئے باغ کی طرف ڈالی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پرندوں کا گیت سننے لگا۔

✖✖✖

میاں بیوی ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں... اگر ان کے درمیان کوئی اَن بن ہو جائے یا رشتے میں دوری پیدا ہونے لگے تو یہ خوبصورت رشتہ انجان لگنے لگتا ہے... ان کے درمیان بھی دوریاں پیدا ہونے لگی تھیں... دونوں اسے بچانے کی کوششیں کر رہے تھے... مگر ایک کی نیت میں فتور تھا... اور اس نے اپنی رفیق حیات کو دوسری دنیا میں پہنچادیا... مگر آگے کیا وقوع پذیر ہونے والا تھا... وہ اس سے بے خبر تھا۔

---

**بیوی کو مار کر سرخرو ہونے والے شوہر کا عبرتناک انجام**

---

# جامِ اجل

**لبنیٰ خان**



رک نے بار کے پیچھے رکھی ایبر فیلڈی کی اٹھارہ سال پرانی سنگل مالٹ وہسکی کی بوتل نکالی۔

جب اس نے اپنی ٹائی ڈھیلی کی اور کالر کے بٹن کھولے تو اپنے ناخنوں سے بوتل کے پتلے ڈھکن پر لگے ٹیپ کو کھولنے لگا۔ یہ وہسکی اس کی بیوی نے دی تھی۔ میگن نے تحفے کے طور پر دی گئی بوتل پر فیتہ باندھ رکھا تھا۔

رک مسکرایا۔ اسے لگا جیسے آج اس بوتل کو کھولنے کا وقت آگیا ہو۔

اس نے مہر توڑی اور ایک گھونٹ بھرا، پھر بوتل اٹھایا اور غور سے دیکھا۔ لیبل پر درج تھا کہ یہ 570 نایاب بوتلوں میں سے ایک ہے۔ میگن نے اس کے لیے خاصی رقم خرچ کی تھی۔ اس نے آہستگی سے کارک نکالا اور ٹمبلر میں دو انگلیوں جتنی وسکی انڈیلی۔

رک نے گلاس کو بیڈروم کی سمت اٹھایا اور پھر ایک ہی

گھونٹ میں پی گیا۔ گرم احساس اس کے حلق میں پھیل گیا، پھر ایک عجیب سا ذائقہ آیا جو وہ پہچان نہ سکا۔

یہی تو چیلنج تھا...... ایک انجان وہسکی کے ذائقے کو سمجھنا۔ یہ اس کے لیے ایک بہترین اور قیمتی تحفہ تھا۔ یہ اب تک کی سب سے مہنگی بوتل تھی جو میگن نے اس کے لیے خریدی تھی۔ میگن ہمیشہ تحفوں پر ذرا زیادہ خرچ کر دیتی تھی۔ شاید وہ اس رشتے کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ یہ تحفہ کچھ مدد کر جائے۔

رک نے ایک اور گلاس بھرا۔ ٹائی کو کرسی کی پشت پر پھینکا اور کچن میں آ گیا۔ پہلا گلاس یادگار کے طور پر تھا، دوسرا [illegible] اس کے لیے۔ اس نے ایک برف کا ٹکڑا ڈالا۔ اسے [illegible] پگھلتی برف اسکاچ کے ذائقے کو نیا رنگ دیتی ہے۔ [illegible] نئی خوشبو۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس بار کیا مختلف محسوس ہوگا۔ کافی عرصے بعد یہ وقت آیا تھا جب رک اپنی پسند کی شراب خود چن سکتا تھا۔

عام طور پر وہ شام میں ایک گھنٹے کے لیے خود کو ایک ڈرنک کی اجازت دیتا تھا۔

گلاس بھر کر وہ عموماً ڈیک پر بیٹھتا، [illegible] اور سوچتا کہ زندگی اگر ذرا مختلف ہوتی تو کیسی ہوتی۔

اسے میگن سے ایک فاصلہ محسوس ہوتا تھا اور وہ جانتا تھا کہ میگن بھی یہ فاصلے محسوس کرتی تھی۔ جب ان کے درمیان کی دوری اتنی بڑھ گئی کہ بات چیت سے مٹائی نہ جاسکے تو رک نے تجویز دی کہ وہ اس کے ساتھ ”کاک ٹیل آور“ میں شامل ہو جائے۔ شروع میں میگن نے انکار کر دیا لیکن رک نے اصرار کیا۔

اس نے وہسکی پینا چھوڑ دی اور وہ برفیلی ٹراپیکل ڈرنکس بنانا شروع کیں جو میگن کو پسند تھیں۔ کبھی اپنے لیے مارگریٹا بناتا، کبھی میگن کے لیے کوئی نیا مشروب تیار کرتا جو نام سے ہی غیر معمولی لگتا۔ پھر وہ بلینڈر دھو کر مشروبات کو باغیچے میں لے جاتا۔ وہ کبھی کبھی سوچتا کہ اسے تو کسی بحری جہاز پر بارٹینڈر ہونا چاہیے تھا۔

میگن مسکراتی، گلاس پکڑتی اور دونوں مل کر شام ڈھلتے دیکھتے۔ ہمیشہ باتیں نہیں ہوتیں لیکن ماحول میں سکون ہوتا۔ رک جانتا تھا کہ ایک گلاس کاک ٹیل ان کے درمیان کی خلیج ختم نہیں کر سکتا لیکن وہ چاہتا تھا کہ کم از کم کچھ وقت وہ اکٹھے گزاریں۔

رک نے اپنے گلاس کی طرف دیکھا۔ برف کا ٹکڑا آدھا پگھل چکا تھا۔ اس نے گلاس ہلایا، برف کی کھنک سنی اور ایک گھونٹ بھرا۔

شراب نے اس کی زبان پر حرارت چھوڑ دی، پھر نرم ہو گئی۔ پانی نے اسکاچ کو ڈھیلا کر دیا تھا، ذائقے کھلنے لگے۔ اسے مرچ جیسا تیز ذائقہ محسوس ہوا، شاید کوئی مسالا۔ وہ خالص وہسکی پینے کی وجہ سے اسے شناخت نہیں کر پایا۔ اب بھی ہلکی سی جلن باقی تھی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ کافی عرصے بعد پی رہا تھا۔

رک نے آتی باران برفیلے مشروبات کے لیے برف پیسی کہ بلینڈر جلا ڈالا لیکن اب شاید اسے نئے بلینڈر کی ضرورت نہ ہو۔ اب یہی اس کا شام کا مشروب بننے والا تھا۔

ایک دن دوپہر میں میگن نے اسے اسکاچ دی تھی۔ میگن جانتی تھی کہ اسے وہ سخت مشروبات پسند نہیں جنہیں وہ خود ”زہریلے پاسیکل“ کہا کرتا تھا۔ اس نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ میگن اس کی خاموش شاموں میں مداخلت کرے لیکن پھر بھی اس نے اسے شامل ہونے پر مجبور کیا۔ ہر شام وہ میگن کے لیے کوئی میٹھا، رنگین مشروب بناتا۔ کبھی بلیو ہوائین، کبھی سفیئر پنچ۔ وہ جانتا تھا کہ میگن کو یہ سب پسند ہیں۔ ان میٹھے ذائقوں اور نیلے رنگ نے اس زہریلے اینٹی فریز کا ذائقہ چھپا دیا تھا جو وہ اس کے مشروب میں گھولتا تھا۔

کف کے بٹن کھول کر رک نے آستینیں چڑھائیں اور برآمدے میں جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک گھونٹ بھرا اور مسکرا دیا۔ یہ کرسی اب اس کی مستقل نشست بن سکتی تھی اور میگن کی انشورنس کی رقم اچھی وہسکی کے لیے کافی ہوتی۔

وہ بیٹھا رہتا، سورج کو پیچھے جاتی باڑ کے پار غائب ہوتے دیکھتا جہاں اس کی پڑوسن کیلی ہیکوڈ کا گھر تھا۔

رنگ مدھم ہونے لگے اور اس کی بینائی بھی دھندلا گئی۔

اس نے اپنے اور میگن کے لیے منجمد مارگریٹا بنانا شروع کر دیا تھا۔ فرق یہ تھا کہ میگن کے گلاس میں وہ نیند کی گولیاں پیس کر ڈال دیتا تھا۔ رک اس بات کا خاص خیال رکھتا کہ مشروب کو اچھی طرح مکس کیا جائے لیکن اسے امید تھی کہ اگر گلاس کے کنارے پر کچھ ذرات باقی رہ بھی گئے تو میگن اسے صرف نمک سمجھے گی، دوا نہیں۔ میگن نے [illegible] کے صرف ایک دو گھونٹ لیے اور باقی چھوڑ دیا۔ اس نے یہ کہہ کر معذرت کی کہ اسے ذائقہ پسند نہیں آیا۔ ”کچھ [illegible] ہے۔“ پھر میگن نے پیٹ درد اور کمزوری کی شکایت کی لیکن بات وہیں ختم ہو گئی۔

رک نے اپنے لیے مارگریٹا بنانا جاری رکھا۔ نیلے رنگ کا مشروب پھر سے میگن کے لیے تیار ہوا۔

میگن کو شک نہیں ہوا۔

پہلی بار کے بعد وہ دوبارہ بیمار ہوئی تھی۔ کمزوری، چکر اور سردرد سے پریشان رہی مگر رک نے اسے یقین دلایا کہ یہ سب ذہنی دباؤ کی وجہ سے ہے، لیکن درحقیقت رک کو دوا کی مقدار کا درست اندازہ لگانا تھا۔ وہ اتنا ہوشیار تو تھا کہ انٹرنیٹ پر مختلف زہر کے بارے میں سرچ نہ کرے تاکہ کوئی ماہر بعد میں اس کے ''الیکٹرانک نشان'' نہ ڈھونڈ سکے۔ اس کے بجائے اس نے اندازے سے مقدار ڈالی۔

پہلے ایک چھینٹا، پھر دوسرا۔

رک مسکرایا۔

اگر وہ پوچھ سکتا تو میگن خود بتا دیتی۔ نرسیں تو دوا کی مقدار کے بارے میں خوب جانتی ہیں۔

☆☆☆

تدفین کے فوراً بعد تفتیشی افسر اس کے کام کی جگہ پر آگئے۔ انہوں نے نرمی سے پوچھا۔

''کیا آپ ہمارے ساتھ چل سکتے ہیں؟''

ظاہر ہے رک کو برا لگا مگر وہ کیا کر سکتا تھا۔ وہ گاڑی میں ان کے پیچھے اسٹیشن چلا گیا۔ انہوں نے یقین دلایا کہ چند سوالات کے بعد وہ واپس جا سکتا ہے۔ میگن نے اپنی پڑوسن کیلی کو ایک خط لکھا تھا۔ پولیس نے رک کو اس کی ایک کاپی دکھائی۔ کمزور ہاتھوں سے لکھی تحریر میں میگن نے لکھا تھا۔

''مجھے لگتا ہے میرا شوہر مجھے مارنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ وہ کبھی خودکشی نہیں کرے گی۔ خط میں اس نے اپنی بگڑتی ہوئی ازدواجی زندگی کا ذکر کیا اور آخر میں کیلی سے کہا کہ اگر اس کے ساتھ کچھ غیر معمولی ہو جائے تو یہ خط پولیس کو دے دے۔

رک نے سب کچھ جھٹلا دیا۔ وہ ایک ''مظلوم شوہر'' کا کردار ادا کر رہا تھا۔ وہ کہتا رہا کہ شادی میں مسائل تھے لیکن کون سی شادی میں نہیں ہوتے؟ وہ انہیں سلجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب پولیس نے دباؤ ڈالا تو اس نے اپنے وکیل کو بلا لیا۔

وکیل نے اسے سختی سے کہا تھا کہ شراب پینا بند کر دے کیونکہ اگر وہ مقدمے کے دوران کمزور ہوا تو پولیس اس کے خلاف ثبوت جمع کر لے گی۔ رک نے اس کا مشورہ مان لیا تھا۔

لیکن اب، اس نے ایک گھونٹ لیا۔ اسکاچ کا ذائقہ ایک بار پھر اس کے منہ میں پھیل گیا۔ وہ اور اسکاچ کافی عرصے بعد دوبارہ مل رہے تھے۔

☆☆☆

## چھکا

ایک ٹیسٹ میچ کے دوران ایک کھلاڑی نے اتنا زوردار چھکا لگایا کہ گیند نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ کچھ دیر کے بعد ایک پولیس انسپکٹر کھلاڑی کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ ''جناب! آپ کی گیند سڑک پر گزرتے ہوئے ایک موٹر سائیکل سوار کے سر پر لگی اور وہ زمین پر گر گیا۔ اس کی موٹر سائیکل ایک کار میں جا گھسی، کار اسی میل فی گھنٹا کی رفتار سے جا رہی تھی۔ وہ ایک منی بس سے جا ٹکرائی۔ منی بس بے قابو ہو کر ایک ڈبل ڈیکر بس کے الٹنے کا سبب بنی اور ڈبل ڈیکر بس سڑک پر اس طرح گری کہ پوری سڑک بند ہو گئی اور پھر یکے بعد دیگرے کئی کاریں اس بس سے آ ٹکرائیں۔''

کھلاڑی نے گھبراتے ہوئے کہا۔ ''تو کیا آپ مجھے گرفتار کرنے کے لیے آئے ہیں؟''

پولیس انسپکٹر بولا۔ ''جی نہیں۔ میں تو اپنے بچے کے لیے آپ کا آٹوگراف لینے آیا ہوں۔''

## حسن ظن

ایک خاتون نے شادی کے بعد اپنی ایک سہیلی کو بتایا۔ ''میرے شوہر حسین سے حسین عورت کو بھی نہیں دیکھتے۔ وہ ہیں ہی اتنے شریف، نیک اور اندھے۔''

(مرسلہ: عمران علی، فیصل آباد)

پولیس نے اسے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ حالانکہ ان کے پاس کوئی اعتراف نہیں تھا، صرف ایک ثبوت تھا۔ انہیں اس کے گیراج میں اینٹی فریز تو مل گئی تھی مگر وہ گاڑی کے ساتھ شیلف پر رکھی ہوئی تھی۔ اس کی کوئی محبوبہ نہیں تھی...... کم از کم ابھی تک تو نہیں۔

لیکن پولیس کے پاس کیلی ہیکوڈ اور اس کی وہ کہانی تھی جس میں اس نے بتایا کہ میگن ایک دن پریشان، کانپتی ہوئی، بکھری حالت میں اس کے دروازے پر آئی تھی اور اسے وہ خط دیا۔ یہی خط اور پوسٹ مارٹم کی وہ رپورٹ جس میں زہر دینے کا پتا چلا، یہ سب اسے ایک مقدمے کا سامنا کروانے کے لیے کافی تھا۔

☆☆☆

رک نے ایک گھونٹ لیا اور پچھلے دو دنوں کو یاد کیا۔ حالانکہ مقدمہ مختصر رہا مگر قتل کے الزام میں مقدمے کا سامنا کرنے والا شخص کس طرح پرسکون رہ سکتا تھا؟ اسے اپنے

اندراب بھی بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی۔ کیلی...... اس کی فضول باتوں والی پڑوسن نے گواہی دی کہ میگن اس کے پاس آئی تھی۔ وہ بہت پریشان نظر آ رہی تھی اور اس نے اسے وہ خط دیا۔لیکن...... جیوری تک وہ بات کبھی نہیں پہنچی۔

جب استغاثہ نے وہ خط بطور ثبوت عدالت میں پیش کرنے کی کوشش کی تو رک کی وکیل نے فوراً اعتراض کیا۔ جیوری کو عدالت سے باہر بھیج دیا گیا اور دونوں وکیلوں کے درمیان دلائل کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ رک کی وکیل نے پراسیکیوٹر کے ہر نکتے کو منظم طریقے سے رد کر دیا۔ وہ مہنگی ضرور تھی لیکن اس لمحے رک کو یقین ہو گیا کہ اس پر خرچ کیا گیا پیسہ بے جا نہیں تھا۔

رک کے ذہن میں جج کے الفاظ آج بھی میٹھے نغمے کی طرح گونج رہے تھے۔

''اعتراض منظور ہے۔''

پبلک پراسیکیوٹر اپنی کرسی میں دھنسا جا رہا تھا۔ کندھے جھکے ہوئے تھے، نگاہیں زمین پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پر شکست کے آثار بالکل واضح تھے۔ رک کی وکیل نے جرح میں کوئی نرمی نہیں دکھائی۔ اس کے سوالات نے یہ بات واضح کر دی کہ میگن ذہنی طور پر غیر مستحکم اور الجھی ہوئی تھی۔

کیلی کو یہ ماننا پڑا کہ وہ میگن پر اتنا بھی اعتماد نہیں کرتی تھی کہ اسے گاڑی چلانے دے یا اپنے بچوں کی دیکھ بھال اس کے سپرد کرے۔ میگن کمزور قوتِ ارادی کی مالک لگتی تھی۔ شاید وہ دماغی طور پر غیر متوازن تھی۔ یہ بات بھی کیلی نے تسلیم کر لی۔

وکیل نے یہ بھی منوالیا کہ کیلی نے کبھی میگن اور رک کو جھگڑتے نہیں دیکھا، نہ ہی ان کی اونچی آوازیں سنی تھیں۔ درحقیقت کیلی نے خود اعتراف کیا کہ وہ اور اس کا شوہر بھی اپنے برآمدے پر اتنا وقت نہیں گزارتے جتنا رک اور میگن گزارتے تھے۔

اب وہ ڈرامائی خط...... جس میں میگن کی آواز قبر کے پار سے بول رہی تھی، عدالت میں ناقابلِ قبول قرار دے دیا گیا تھا۔ اس کے بغیر پراسیکیوٹر کا پورا مقدمہ کمزور ہو گیا۔ ڈاکٹر نے مانا کہ اگرچہ اینٹی فریز سے زہر خورانی کے واقعات نایاب ہیں لیکن طبی کتب میں ایسے کیسز موجود ہیں اور پوسٹ مارٹم کرنے والے ماہر نے خودکشی کے امکان کو بھی مسترد نہیں کیا تھا۔ رک کو عدالت میں بیان دینے کی بھی ضرورت نہیں پڑی۔ آج صبح جیوری نے جلدی فیصلہ سنا دیا۔

''ملزم بے قصور ہے۔''

زیادہ تر جیوری ممبران فیصلہ سنانے کے بعد فوراً عدالت سے چلے گئے لیکن ایک آدمی رک کے قریب آیا۔ وہ شرمندہ سا معذرت کرتے ہوئے بولا کہ وہ لوگ فیصلہ دیتے ہوئے اسے ''معصوم'' قرار نہیں دے سکے کیونکہ قانون میں ایسا کوئی فیصلہ ہوتا ہی نہیں۔ وہ صرف ''قصوروار نہیں'' کہہ سکتے تھے، جو انہوں نے کہا۔ اس نے کہا کہ حکومت کو ویسے بھی یہ کیس لانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ پھر اس نے رک کو اپنا فون نمبر دیا اور کہا کہ کبھی بیٹھ کر بات کریں گے۔

رک نے بے ساختہ اپنی قمیص کی جیب میں پڑا وہ کارڈ محسوس کیا۔

''کون سوچ سکتا تھا کہ قتل کے الزام میں پھنسا ہونا بھی نیٹ ورکنگ موقع بن سکتا ہے؟''

رک نے کھانے کے بارے میں سوچا مگر بھوک نہیں تھی۔ بریت کے باوجود اس کے پیٹ میں مروڑ سا اٹھ رہا تھا۔ شاید اسکاچ کا ایک اور گھونٹ اعصاب کو پرسکون کر دے۔ اس نے گلاس میں برف ڈالی، تھوڑا سا اسکاچ کا چھینٹا ڈالا کہ اچانک دروازے کی گھنٹی بجی۔

رک نے کچھ لڑکھڑاتے ہوئے دروازے تک قدم بڑھائے اور دروازہ کھولا۔

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے گلاس لبوں سے لگایا اور کہا۔

''ہیلو، کیلی ہیکوڈ!''

کیلی ایک قدم پیچھے ہٹی پھر نظریں جھکا لیں۔ وہ خاموش رہی لیکن اس کی پریشانی واضح تھی۔

رک مسکرایا۔ ''میں نے تمہیں یہاں دیکھنے کی توقع نہیں کی تھی۔''

کیلی نے ایک گہرا سانس لیا پھر رک کی آنکھوں میں دیکھا۔

''میں بس یہ کہنا چاہتی تھی کہ میں نے وہی کیا جو مجھے درست لگا۔ جب تمہاری بیوی...... جب میگن نے وہ خط دیا تھا تو میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے کچھ کہنا ہی تھا۔''

اس نے کیلی کی پریشانی کو ہاتھ کے اشارے سے ہوا میں اڑا دیا۔ اس کے ہاتھ کی جنبش سے گلاس میں ہلکورے لیتے برف کے ٹکڑے ہلکے سے بجنے لگے۔

''پولیس نے مجھے عمر قید دلوانے کی پوری کوشش کی۔'' وہ ہنسا۔ ''لیکن میں پھر بھی بچ گیا، کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اب بھول جاؤ سب کچھ۔''

کیلی کے چہرے کے تاثرات سختی میں بدل گئے۔

دروازہ بند کر کے وہ ڈیک پر آ گیا۔ لفافہ ہاتھ میں تھا۔ اس نے وہسکی کی بوتل کی طرف دیکھا۔ گلاس میں کچھ اور ڈالنے ہی والا تھا کہ رک گیا۔ شاید کافی زیادہ پی لی تھی۔ شراب کے اثر سے اس کا سر چکراتا محسوس ہو رہا تھا، ماتھا بوجھل لگنے لگا تھا۔ اس نے گلاس ہلایا۔

"واپسی کے پہلے دن ہی زیادہ نہ پی لوں۔"

کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے لفافہ پلٹا۔ تحریر کو پہچاننے میں اسے لمحہ لگا۔ یہ میگن کی لکھی ہوئی تھی، اس کے آخری دنوں کی کمزور، کانپتی ہوئی لکھائی۔ لفافے کے پچھلے حصے پر میگن نے اپنا نام لکھا ہوا تھا، یوں جیسے یہ صرف "رک" کے لیے ہو۔ اس نے سانس کھینچی اور لفافہ پھاڑ دیا۔ گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر پھر رک گیا۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ اندر ایک ہی صفحہ تھا۔ وہ نکال کر پڑھنے لگا۔

"رک! اگر تم یہ خط پڑھ رہے ہو، تو اس کا مطلب ہے کہ میں مر چکی ہوں اور اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ پولیس نے وہ دوسرا خط جو میں نے کیلی کو دیا تھا، اس پر کوئی عملدرآمد نہیں کیا۔ امید ہے کہ تم یہ خط ڈیک پر بیٹھے ہوئے پڑھ رہے ہو۔ میں ہر شام وہاں تم سے ملنے آتی تھی، اس امید میں کہ شاید ہم اپنی شادی کی سمت بدل سکیں، لیکن میں بہت دیر سے سمجھ پائی کہ تمہارے لیے "سمت بدلنا" اور میرے لیے "سمت بدلنا" دو الگ باتیں تھیں۔

جب مجھے احساس ہوا کہ تم نے کیا کیا ہے تو میں نے شراب میں ملائے جانے والے زہروں پر تحقیق کی۔ میں نے اپنی سرچ ہسٹری کمپیوٹر پر ہی چھوڑ دی تھی تاکہ پولیس دیکھے اور سمجھے کہ تم زہر کے بارے میں معلومات حاصل کر رہے تھے۔ لیکن لگتا ہے کہ پولیس نے میرا کمپیوٹر چیک ہی نہیں کیا اور تم نے بھی نہیں کیا۔ اگر تم نے کیا ہوتا تو تمہیں معلوم ہو جاتا کہ میں نے وہ وہسکی زہر سے بھر دی تھی جو میں نے تمہارے لیے خریدی تھی۔ ایک سولہ گیج جیکل سوئی کارک کے ڈھکن سے آسانی سے گزر جاتی ہے۔ نرسیں یہ بات جانتی ہیں۔

"امید ہے تمہیں ذائقہ محسوس نہیں ہوا ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ گلے کی جھلیوں پر ہلکی سی جلن ہوتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم...... میں نے کبھی وہسکی نہیں پی۔ یہ ان چند چیزوں میں سے ایک ہے جنہیں میں مر کر بھی یاد نہیں کروں گی۔ دوسری چیز تم ہو۔

"تمہاری مرحومہ بیوی...... میگن۔"

×××

رک کو اس کی جھجک میں مزہ آنے لگا۔

"کیا تم اندر آ کر ایک ڈرنک لو گی؟ اسے صلح کی پیشکش سمجھ لو۔ ہم ڈیک پر بیٹھ سکتے ہیں۔"

اس نے خود سے سوال کیا۔ کیا یہ محض ایک خوش اخلاقی تھی یا اعتراف؟ پھر اس نے سوچا، فرق نہیں پڑتا۔ وہ اب چاہے جتنا اقرار کرے، قانون اسے چھو بھی نہیں سکتا تھا۔

کیلی خاموش رہی۔

کیا وہ سوچ رہی تھی؟ رک نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔ وہ بری نہیں لگ رہی تھی۔ پورچ کی ہلکی روشنی میں وہ پُرکشش نظر آ رہی تھی۔ کیلی نے جینز اور ایک سادہ بلاؤز پہن رکھا تھا۔ یہ لباس عدالت والے سوٹ سے کہیں بہتر لگ رہا تھا۔ وہاں وہ ایک اخلاقیات پسند ہمسائی لگ رہی تھی لیکن آج...... کچھ اور ہی تھی۔ جینز نے اس کے جسم کے نشیب و فراز کو نمایاں کر رکھا تھا۔ رک کے ذہن میں خیال آیا کہ بیوی کے مرنے کے بعد اسے اب دوبارہ ان چیزوں پر توجہ دینی چاہیے۔

اس نے کیلی کو ہونٹ چباتے دیکھا۔

"آؤ نا، ایک ڈرنک ہی تو ہے۔ ماضی کو بیچ میں نہ آنے دیں؟ ہاں ٹھیک ہے، تم نے مجھ پر قتل کا الزام لگایا تھا مگر وہ سب اب گزر گیا۔ ہم تو ہمسائے ہیں۔ اگلے ہفتے شاید میں تمہارے دروازے پر آ جاؤں...... بیلچہ مانگنے، تاکہ پچھواڑے میں ایک گڑھا کھود سکوں۔"

کیلی اسے گھورتی رہی۔ رک نے ہلکا سا مسکرا کر کہا۔

"سوچ رہا تھا اس جگہ درخت لگاؤں، جہاں میگن اور میں وقت گزارا کرتے تھے۔"

اس نے زبان سے ہونٹ تر کیے۔ "آؤ، تمہیں دکھاتا ہوں۔"

کیلی ایک قدم پیچھے ہٹی۔ "نہیں...... نہیں۔ میں کچھ نہیں چاہتی۔ نہ ڈرنک، نہ کچھ اور۔"

اس نے پچھلی جیب سے ایک سادہ سا لفافہ نکالا اور اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

رک نے نیچے دیکھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"میں نے وعدہ کیا تھا کہ یہ تمہیں دے دوں گی۔"

رک نے طنزیہ انداز میں اس کی جینز کی طرف دیکھا۔ "اور پیچھے کچھ اور بھی ہے میرے لیے؟"

کیلی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ تیزی سے مڑی اور چلی گئی۔

"دعوت اب بھی کھلی ہے۔" رک نے پیچھے سے پکارا۔

کیلی نے جواب نہیں دیا۔

# رمز شناس

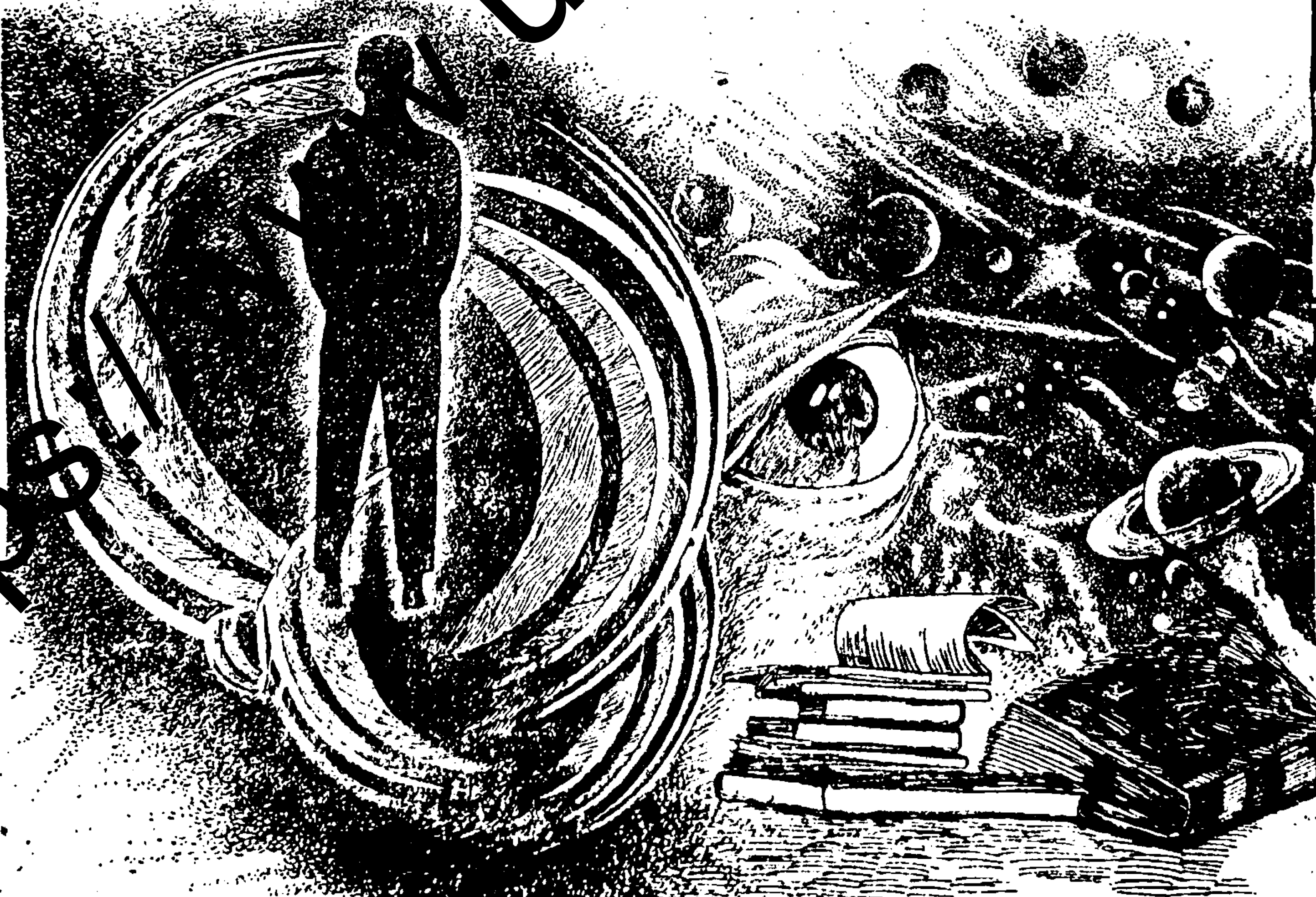
نازیہ کامران کاشف

قسط نمبر: 11

وہ صدیوں پر محیط ایک ایسا گہرا راز تھا جس کی جڑیں ہندوستان کی سرزمین سے لے کر مصر اور انگلستان تک پھیلی ہوئی تھیں اور ان جڑوں میں علم کا ایسا خزانہ دفن تھا جسے صدیوں کوئی تلاش نہ کرسکا... مگر کوئی ایسا بھی تھا جسے اس خزانے کی تلاش تھی۔ یہ بھی کائنات کے پوشیدہ رازوں سے پردہ اٹھانے کی اس رمز شناس کی ایسی کوشش تھی جس نے ان سوئی ہوئی شیطانی قوتوں کو گہری نیند سے جگادیا تھا، جن پر قابو پانا کسی عام انسان کے لیے ناممکن تھا مگر علم کی معراج پر پہنچ کر اس نے ان پُراسرار علوم کو عام کرنے کی ناقابلِ فراموش داستان رقم کردی اور اس نے تاریخ کے اوراق پر انہیں عبرت کا نشان بنادیا... صدیاں گزرتی رہیں اور ایک بار پھر اٹھارویں صدی کے اوائل میں ان قوتوں نے سر اٹھایا... مگر کیا مصر کے عیاد طبیب، انگلستان کے آرتھر اور ہندوستان کے کاویہ سے... مقابلہ کرنا آسان تھا...؟ ہاں عشق اور فرض کے درمیان اسے ہی کامیابی حاصل ہوئی جو سارے بھید جان گیا تھا۔

خوف [illegible] پوشیدہ رازوں کی کڑیاں ملانے والے

ایک رمز شناس کی سنسنی خیز داستان



## Year 1773

راج گڑھ۔ہندوستان

رتناوتی کے لیے وہ دن جہاں خوشیاں ساتھ لایا تھا وہیں فانوس کے اچانک ٹوٹ کر گرنے کی گھٹنا نے اس کے دل میں بہت سارے اندیشوں کو جنم دیا تھا۔ وہ قلعے کے آسیب زدہ ہونے کی بہت ساری داستانیں سن چکی تھی مگر ان کہانیوں پر یقین نہیں رکھتی تھی۔ بھوت پریت سب قصے کہانیوں کا حصہ تھے۔ اس کے مطابق ان کا حقیقت سے کوئی لینا دینا نہیں تھا مگر اژدہے کا نکلنا اور پھر فانوس کا گرنا اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر گیا تھا۔

اس کے پتا جی نے قلعے میں دوبارہ بسنے سے پہلے راج گرو سے اجازت لی تھی۔ گرو آدیش کے مطابق وہ راج گرو اس علاقے کو چھوڑ کر جا چکے تھے اور ان کی جگہ ایشور نے یہ ذمے داری سنگھیا راج کو سونپی تھی۔ اب وہی اس کٹیا میں گرو بالو ناتھ کی استھیوں کی رکھشا کر رہے تھے اور علاقے کی تمام بری شکتیوں کو اپنے وش میں کر چکے تھے۔

اگر واقعی ایسا تھا تو سنگھیا راج سے ملنے کے بعد اسے بے چینی نے کیوں گھیر لیا تھا؟ اسے وہ لمحہ یاد آیا جب وہ سنگھیا کے سینے سے لگی کھڑی تھی۔ کتنی وحشت تھی ان سانسوں میں اور اس کی وہ آنکھیں...... ان آنکھوں میں عجیب سا سحر تھا جو کسی کو بھی اپنے وش میں کرنے کی قوت رکھتی تھیں۔ اس کی چھٹی حس اسے مسلسل خبردار کر رہی تھی۔ اسے تو راج گرو سے ملنے کے بعد مطمئن ہونا چاہیے تھا مگر اس کی بے چینی عروج پر پہنچ چکی تھی۔ وہ جاتے جاتے جس طرح پلٹ کر اسے دیکھ رہا تھا، ایسا لگتا تھا جیسے کوئی چنوتی دے کر گیا ہو۔

اس کے کمرے میں گھٹن کا احساس اچانک بڑھ گیا تھا۔ وہ باہر نکل آئی۔ کنیزیں اس کے پیچھے باہر نکلیں مگر وہ انہیں کمرے میں رہنے کا اشارہ کر کے محل سے ملحقہ باغ میں چلی آئی۔ رات ہو چکی تھی اور سب اپنے کمروں میں آرام کر رہے تھے۔ فانوس کے گرنے کے بعد محل میں دوبارہ کوئی درگھٹنا نہیں ہوئی تھی۔ دوپہر کے کھانے پر شاہی پریوار کے قریبی افراد اور وزیر دمشیر اپنے پریوار کے ساتھ مدعو تھے اور سب نے ہی کاویہ اور رتناوتی کو قیمتی تحائف پیش کیے۔ رات کے کھانے کے بعد رقص وسرور کی محفل سجی تھی لہٰذا سب ہی تھک ہار کر اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ بس وہی تھی جسے نیند نہیں آرہی تھی۔ باغ میں بھی کوئی نہیں تھا مگر پہرے دار وقفے وقفے سے چکر لگا رہے تھے۔

اس نے ٹہلتے ہوئے آس پاس پھیلے پہاڑوں پر نظر ڈالی۔ دن میں تو ہرے بھرے جنگلات کی وجہ سے یہ منظر بھلا معلوم ہوتا تھا لیکن رات کے اس پہر بہت خوفناک لگ رہا تھا۔ گو کہ یہ پہاڑ قلعے کی چار دیواری سے کافی فاصلے پر تھے مگر محل کے باغ سے صاف نظر آتے تھے۔

اسے کبھی کسی چیز سے خوف محسوس نہیں ہوا تھا لیکن قلعے سے جڑی وہ کہانیاں اس وقت اس کے ذہن میں گھومنے لگیں۔ اچانک کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک کر تیزی سے پلٹی۔

''کیا ہوا، آپ ڈر گئیں؟'' کاویہ کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

''آپ اس وقت یہاں؟'' وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

''آپ کو باغ میں دیکھا تو چلا آیا۔'' وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا جو باغ میں ہی کھلتی تھی۔

''آپ کو آرام کرنا چاہیے۔ بہت مصروف دن گزرا ہے۔ مجھے نیند نہیں آرہی تھی اس لیے یہاں چلی آئی۔'' وہ گہری سانس لے کر بولی۔

''مجھے بھی نیند نہیں آرہی تھی۔ کوئی سمسیا ہے تو مجھے بتا سکتی ہیں آپ۔'' کاویہ اس کے چہرے پر پھیلی پریشانی دیکھ رہا تھا۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''آپ اس بندھن سے خوش تو ہیں نا؟'' کاویہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ مسلسل کسی سوچ میں گم ہے۔

''میں بہت خوش ہوں۔ آپ ایسا نہ سوچیں۔ وہ تو بس......'' وہ جلدی سے بولی اور اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''وہ کیا؟'' وہ سنجیدہ ہو چکا تھا۔

''میں بس ان درگھٹناؤں کو لے کر چنتت ہوں۔ پہلے وہ اژدہا اور پھر آج صبح جو ہوا۔'' اس نے سنگھیا والی بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

''آپ کو کیا لگتا ہے، ان درگھٹناؤں کا واسطہ قلعے کے اتیت سے ہے؟'' وہ شاید بات کی تہ تک پہنچ چکا تھا۔

رتناوتی نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''جس جگہ راج گرو تپسیا کریں وہ جگہ ہر سنکٹ سے سرکشت رہتی ہے۔ پرنتو......'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

''کہیے نا، خاموش کیوں ہو گئے؟'' وہ چونک پڑی۔

''رتناوتی! آپ ہماری دھرم پتنی بننے والی ہیں لہٰذا اہم

آپ سے کھل کر بات کرنا چاہیں گے کیونکہ کل ہم اپنی ریاست کی طرف کوچ کریں گے اور پھر دیواہ کے سمے ہی دوبارہ ملیں گے۔ بات یہ ہے کہ راج گرو سے مل کر ہمیں اچھا محسوس نہیں ہوا۔ کچھ ہے جو نظروں سے اوجھل ہے۔ ہم آپ کو یہی کہنا چاہیں گے کہ آپ ساودھان رہیے گا۔ وہ دھرم رکشک ہیں لہٰذا ہم انہیں کچھ کہہ کر ان کا شراپ نہیں لینا چاہتے۔ جو انوبھو کیا وہ آپ سے کہہ دیا۔" کادیہ سنجیدگی سے بولا۔

یعنی رتناوتی اکیلی نہیں تھی جو ایسا سوچ رہی تھی۔

رتناوتی نے بغیر کچھ کہے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اپنی رائے اپنے تک ہی رکھنا چاہتی تھی۔

"اب آپ آرام کریں۔ باہر ٹھنڈ بڑھ رہی ہے۔" کادیہ مسکرایا اور جانے کے لیے مڑا۔

"کادیہ...!" رتناوتی نے اسے پکارا۔ وہ پلٹ کر اسے دیکھنے لگا۔

"آپ بھی اپنا خیال رکھیے گا...... ہمارے لیے۔" رتناوتی نے اظہار کرنا ضروری سمجھا۔

کادیہ کے چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر بے اختیار ہی رتناوتی کا ماتھا چوما اور اسے حیران چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا۔

وہ بہت دیر تک سُن کھڑی رہی اور پھر اس کے ہونٹوں کے لمس کو محسوس کر کے مسکرا دی۔ اس پریشانی میں وہ ان حسین پلوں کو کیسے بھول گئی تھی جب اس نے اپنا تن من کادیہ کے نام کر دیا تھا۔

امرتا نے اپنے کمرے کی کھڑکی بند کر لی۔ وہ کافی دیر سے کھڑکی میں کھڑی ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ دور کھڑے تھے جس کی وجہ سے وہ ان کی باتیں سننے میں ناکام رہی تھی مگر کادیہ کی آخری جسارت نے اس کے تن بدن میں آگ بھڑکا دی۔

"بس دو دن اور رتناوتی...... پھر تم اس محل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وداع ہونے والی ہو۔" اس نے خود کو تسلی دی اور بستر پر لیٹ کر اپنی آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

آنکھیں تو سنکھیا راج نے بھی بند کی تھیں، تپسیا کرنے کے لیے، لیکن وہ اسے تپسیا کرنے ہی کہاں دے رہی تھی۔

اس کا وہ جادوئی سراپا بار بار سنکھیا کے خیالوں میں بجلی کی طرح کوندتا۔ وہ ان خیالوں کو جھٹک کر اپنا سارا دھیان تپسیا پر لگانے کی کوشش کرتا مگر وہ دیوی ضد کی پکی تھی۔

بالآخر اس نے اپنی آنکھیں کھول کر کٹیا کے سامنے جلتی اگنی پر مرکوز کر دیں۔

وہ آگ تو جیسے اس کے تن کا حصہ بن گئی تھی۔ آنکھوں سے ہوتی سیدھا من میں اور پھر سارے بدن میں سرایت کر گئی۔ اس نے اپنا تن من دھن اس مقام تک پہنچنے میں لگا دیا تھا۔ اسے بہت کچھ چاہیے تھا اور آج جب وہ اس مقام پر پہنچ چکا تھا تو اسے رتناوتی کی صورت میں اپنی تپسیا کا پھل نظر آیا تھا۔

دھن دولت تو مل ہی جاتی مگر ایسی کنیا شاید دوبارہ نہ ملتی۔

تو کیا وہ سمے آ چکا تھا جب وہ "اس" کے سامنے اپنی مانگیں رکھ سکتا تھا؟

اس نے فیصلہ کرنے کے بعد اپنی آنکھیں دوبارہ بند کر لیں اور پھر وہ عجیب و غریب منتروں کا جاپ کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد کٹیا میں لال رنگ کا دھواں بھرنا شروع ہوا۔ کٹیا میں تیز بدبو پھیل گئی۔ جب وہ دھواں آہستہ آہستہ چھٹنا شروع ہوا تو سنکھیا نے اپنی آنکھیں کھول لیں۔

"وہ" بالکل اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ سنکھیا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

اگر اس وقت کوئی اور کٹیا میں موجود ہوتا تو شاید اس کا بھیانک سراپا دیکھ کر بے ہوش ہو سکتا تھا۔ وہ تھا ہی اتنا خوفناک۔

اس کے جسم کی کھال گہرے سرخ رنگ کی تھی۔ آنکھوں کی پتلیاں سفید رنگ سے عاری تھیں اور ان میں سیاہ چمکدار سیال بھرا ہوا تھا۔ اس کے سر پر بال موجود نہیں تھے اور دو لمبے دانت ہاتھی کی طرح منہ کے دہانے سے باہر نکل رہے تھے۔

"کہو، کیا چاہتے ہو؟" اس کے منہ سے غراہٹ جیسی آواز برآمد ہوئی۔

"میں کچھ مانگنا چاہتا ہوں۔" سنکھیا اطمینان سے بولا۔

"بھول جاؤ اسے اور اپنے کام پر توجہ دو۔ تمہاری آتما اس کی امانت ہے، اسے کسی اور کے لیے ضائع مت ہونے دو۔" وہ اس کے مطالبات سنے بغیر اس کی سوچوں کو پڑھ چکا تھا۔

"میں اپنے کام پر پوری توجہ دے رہا ہوں۔ زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا مگر تم نے ہی مجھے کہا تھا کہ میری ہر مانگ پوری کی جائے گی۔" سنکھیا کو اس کی بات بری لگی۔

اس نے اپنی ساری عمر یہاں تک پہنچنے میں لگا دی تھی اور اس سے جن چیزوں کا وعدہ کیا گیا تھا اسے پورا کرنے کے بجائے پہلے ہی مطالبے پر اسے انکار کیا جا رہا تھا۔

"تمہیں دولت چاہیے، میں ابھی اس کٹیا میں ڈھیر لگا دیتا ہوں۔ کسی ریاست کا تخت چاہیے تو تمہیں وہاں بٹھا دیتے ہیں۔ عورت چاہیے تو لمحے میں بے شمار حاضر کر دی جائیں گی مگر یہ نہیں۔ یہ تمہارے میزان میں بھاری پڑے گی۔ اپنے مقصد کے اس قدر قریب پہنچ کر اسے ضائع مت کرو۔ چند دنوں میں تم وہ کام کرنے جا رہے ہو جس کا ہمیں برسوں سے انتظار تھا۔ اس نازک سے میں ایک عورت کی وجہ سے ہم اپنا برسوں کی محنت سے تیار کیا گیا رکشک ضائع نہیں کر سکتے۔" وہ غصے سے غرایا۔

سنگھیا خاموش ہو گیا۔

"یہ جنگل ہمارے پیروکاروں سے بھرا پڑا ہے۔ تم نے صرف اس رکشک کو [illegible] ہے، باقی کام وہ کر لیں گے۔ اس کے بعد تم جو چاہو [illegible] گا لیکن وہ عورت نہیں مل سکتی۔" اس نے بات ہی ختم کر دی تھی۔

"جب سب مل سکتا ہے تو کام ختم کرنے کے بعد بھی وہ کیوں نہیں مل سکتی؟" سنگھیا کو اس پر شدید غصہ آ گیا۔ اس کا لہجہ سخت ہو چکا تھا۔

"سنگھیا......! یہ مت بھولو کہ تم کس سے بات کر رہے ہو۔ ہم تمہیں برسوں سے تیار کر رہے ہیں۔ تم کہاں سے کہاں پہنچ چکے ہو۔ اگر تم نے اس اہم سے میں کوئی گڑبڑ کی تو یاد رکھنا تم کہیں کے نہیں رہو گے اور جہاں تک بات ہے عورت کی تو یہ لو......" وہ اس کی بات سن کر غصے سے دہاڑا اور پھر اس کے اشارہ کرنے پر کٹیا میں تین نیم عریاں لڑکیاں حاضر ہو گئیں۔

"پسند کر لو جو چاہیے اور مٹا لو اپنی بھوک...... مگر اس کے بعد تمہیں یہ تخت چھوڑنا ہوگا۔ تم نے اس ذمے داری کو اٹھانے سے پہلے وعدہ کیا تھا کہ تم کام پورا ہونے تک اپنی روح میں ملاوٹ نہیں کرو گے۔" اس نے سنگھیا کو اس کی اوقات یاد دلائی۔

"مجھے کسی کی خواہش نہیں، مجھے جسم کی بھوک نہیں۔ تم جانتے ہو میں خود پر قابو رکھنا جانتا ہوں۔ میں اپنی تپسیا ان کے لیے ضائع نہیں کروں گا۔" سنگھیا اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔

"تو پھر اپنے مقصد کو یاد کرو۔ چند دن اور...... پھر دنیا کا ہر عیش تمہارے قدموں کی دھول ہوگا۔ یاد رکھنا، ایک چھوٹی سی غلطی بھی بہت بھاری پڑ سکتی ہے۔ اس کا انجام تمہاری سوچ سے بھی زیادہ خوفناک ثابت ہوگا۔ میں چلتا ہوں۔" وہ اسے دھمکا کر وہاں سے غائب ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی وہ لڑکیاں بھی اس کی کٹیا سے غائب ہو گئیں۔

سنگھیا نے اپنے دانت بھینچ لیے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ مقصد ان کے لیے کتنا اہم تھا۔ اسی کی تو وہ برسوں سے تیاری کر رہا تھا۔ وہ سنگھیا راج تھا، شیطان کا سب سے بڑا پیروکار مگر یہ راز اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

گرو بالوناتھ کی موت کے بعد اس علاقے کو خالی کروا دیا گیا تھا مگر وہاں گرو بالوناتھ کے بعد نیکی کا کوئی پہرے دار دوبارہ اپنی جگہ نہ بنا سکا۔ ہندوستان کی سرزمین پر جادوٹونے کی بہتات نے وہاں شیطان کے پیروکاروں میں اضافہ کر دیا تھا۔ راج گرو کی جگہ جن لوگوں نے وہ کٹیا سنبھالی، وہ بھی نیکی کے پہرے دار بننے کی ان شرائط پر پورا نہیں اترتے تھے۔ جسے جگہ ملتی وہ سنبھال لیتا مگر ذمے داری سمجھ کر، پہرے داری سمجھ کر نہیں۔ شیطان کا پلڑا وہاں بھاری ہو رہا تھا۔ شیاطین جنات کی تعداد بھی زیادہ ہو رہی تھی۔ وہ راج گڑھ کے آس پاس بسیرا کر رہے تھے۔

انہیں صحیح وقت کا انتظار تھا اور اب جبکہ وہ وقت قریب آ چکا تھا تو انہوں نے اپنا سب سے شاطر رکشک تیار کر کے اس علاقے میں بھیج دیا تھا۔

سنگھیا راج...... پورے ہندوستان میں اس کی ٹکر کا کوئی نہیں تھا۔ اس نے ہر پڑاؤ پار کیا تھا اور اسے اس مقصد کے لیے چن لیا گیا تھا۔ جب کٹیا کے پہرے دار کو بدلنے کا [illegible] تو وہ اپنی جگہ سنبھالنے پہنچ گیا مگر یہاں پہنچ کر اسے وہ دیوی نظر آ گئی۔ وعدے تو اس سے بہت کیے گئے تھے اور وقتاً فوقتاً پورے بھی کیے جاتے رہے۔ دولت کے انبار اور عہدوں کے ڈھیر تھے جو اس کام کے بعد دیے جانے تھے مگر اس کا دل تو اس کٹیا پر اٹکا تھا اور وہ اسے اس کٹیا سے دور رہنے کا کہہ کر گیا تھا۔

یعنی سب مل جاتا مگر وہ نہ ملتی۔

اس کے مطابق سنگھیا کے میزان میں اس کٹیا کا پلڑا بھاری رہتا مگر کیوں؟ اسے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ سب مل رہا تھا تو وہ بھی چاہیے تھی اسے۔ اگر وہ نہیں دے سکتے تو وہ خود حاصل کر لے گا۔ اس نے مضبوط ارادہ کر کے اپنی آنکھیں موند لیں۔ اب اس کی ساری توجہ اس تپسیا پر تھی۔

اور وہ جو کٹیا کے باہر کھڑی اس کی سوچ کا پہرا دے رہی تھی، اس کی توجہ تپسیا پر مرکوز ہوتے ہی غائب ہو گئی تھی۔

سنگھیا کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اتنا طاقتور تو وہ تھا ہی کہ اپنی سوچ پر پہرا دینا جانتا تھا۔ یہ معمولی شیطان

کے چیلے اس کی سوچ تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ رتناوتی صرف اس کے لیے جنی گئی تھی اور وہ اپنے اندر دہکتی اس آگ کو صرف اسی کے وجود سے بجھانے والا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن راجپوتوں کی سواری اپنے راجیہ کی طرف روانہ ہوگئی۔

انہیں ویواہ کی تیاریاں شروع کرنا تھیں۔ سمے کم تھا اور کام زیادہ لہٰذا پرتاپ سنگھ، مان سنگھ کے بے حد اصرار پر بھی رکنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ ان کے روانہ ہونے کے بعد محل بہت سونا سونا لگ رہا تھا حالانکہ وہ زیادہ دن نہیں ٹھہرے تھے اور جتنے دن بھی ٹھہرے تھے، محل میں کسی نہ کسی دُرگھٹنا نے ہیجانی کیفیت کھڑی کر رکھی تھی۔

رتناوتی کو سارا دن اداسی نے گھیرے رکھا۔ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ کسی مہمان کے جانے پر وہ اس طرح اداس ہوتی مگر اب معاملہ مختلف تھا۔ کاویہ سے اس کے دل کا سمبندھ جڑ چکا تھا۔ جاتے سمے اس کی بولتی نگاہیں بہت سارے سندیشے دے گئی تھیں۔ وہ سارا دن اپنے کمرے میں بند اس کی باتوں اور اس آخری ملاقات کو یاد کر کے مسکراتی رہی۔

شام ڈھلی تو کمرے میں بند پڑے پڑے اس کا دل گھبرانے لگا لہٰذا وہ محل کے باغ میں چلی آئی۔ امرتا بھی اپنی کنیزوں کے ساتھ باغ میں چہل قدمی کر رہی تھی۔ اسے وہاں دیکھ کر وہ اس کے قریب چلی آئی۔

”کیسی ہیں راج کماری رتناوتی؟ آج تو آپ سارا دن کمرے میں بند رہیں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ وہ زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔

”میں کل کی تھکان اتار رہی تھی۔“ وہ جواباً مسکرائی۔

”آپ سنتشٹ تو ہیں نا؟ میرا مطلب ہے آپ نے اتنی جلدی کاویہ کے لیے سہمتی ظاہر کی کہ سب حیران رہ گئے۔“ گو کہ وہ عام سے لہجے میں بات کر رہی تھی مگر درحقیقت اس کے الفاظ اس کے اندر چھپے زہر کو اگل رہے تھے۔ رتناوتی اس کے انداز پر چونک پڑی۔ ہمیشہ کی طرح اس کی چھٹی حس نے اسے خبردار کرنا شروع کیا۔

رتناوتی نے اسے جواب دینے سے پہلے اس کے اور اپنے ساتھ کھڑی کنیزوں کو وہاں سے دور جانے کا اشارہ کیا۔ وہ سب ادب سے سر جھکائے ان سے دور ہٹ گئیں۔

”کاویہ نہیں، راج کمار کاویہ اور اب جبکہ وہ تمہاری دیدی راج کماری رتناوتی کے ہونے والے پتی ہیں تو تمہیں اپنے جیجا جی کا نام پورے سمان کے ساتھ لینا چاہیے۔“ وہ تنبیہی لہجے میں بولی۔

امرتا اس کے اس انداز پر چند لمحے وہیں کھڑی اسے گھورتی رہی اور پھر اس نے اپنی کنیزوں کو وہاں سے چلنے کا اشارہ کیا اور خود بھی پلٹ گئی۔

”امرتا! تمہارے دوسرے پرشن کا اتر تو میں نے دیا ہی نہیں۔ میں بہت خوش اور سنتشٹ ہوں۔“ رتناوتی نے مسکراتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

امرتا بغیر کوئی جواب دیے وہاں سے چلی گئی۔

رتناوتی مسکراتے ہوئے باغ میں چہل قدمی کرنے لگی۔ اسے محسوس ہو چکا تھا کہ امرتا اس سمبندھ سے خوش نہیں ہے۔ شاید شکنتلا دیوی، کاویہ کو امرتا کے لیے چن چکی تھیں مگر ایشور نے اس کا بھاگیہ کاویہ کے ساتھ لکھا تھا تو ہونی کو کون ٹال سکتا تھا۔

رات کے کھانے پر اس کا شک یقین میں بدل گیا جب اس نے واضح طور پر شکنتلا کے چہرے پر ناگواری اور غصے کے تاثرات دیکھے۔ کھانے کے دوران مان سنگھ، پاروتی سے رتناوتی اور کاویہ کے ویواہ کے ویاوستھا کے حوالے سے رائے لیتے رہے اور وہ شکنتلا اور امرتا کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لیتی رہی۔ رویندر البتہ مطمئن دکھائی دیتا تھا۔ رتناوتی وداع ہو جاتی تو انت میں راج گدی اسی کو سنبھالنی تھی اس لیے وہ اس رشتے پر فوراً ہی راضی ہو گیا تھا۔ مشکل سے ہی سہی مگر جب رتناوتی کسی رشتے کے لیے راضی ہی نہیں ہوئی تھی۔ مان سنگھ کے دیہانت سے پہلے اگر وہ وداع ہو جاتی تو اس میں رویندر کا ہی فائدہ تھا ورنہ دوسری صورت میں وہ راج گدی سنبھال لیتی اور جس شخص سے بھی اس کا ویواہ ہوتا، وہ ریاست میں حصے دار بن جاتا۔

وہ کھانا کھا کر اپنے کمرے میں پہنچی تو راگنی اس کی منتظر تھی۔ وہ ہمیشہ سونے سے پہلے اس سے کہانی سننے ضرور آتی تھی حالانکہ محل میں قصہ گو ہر وقت موجود رہتے تھے مگر اسے رتناوتی سے کہانی سننا ہی اچھا لگتا تھا۔ اس نے راگنی کو کہانی سنا کر کنیزوں کے ہمراہ اسے اس کے کمرے کی طرف روانہ کیا اور خود اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر کھڑی ہوگئی۔

آج اسے دور تک پھیلے اس جنگل سے وحشت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ کاویہ کے بارے میں سوچنا بھی اتنا خوبصورت احساس تھا کہ وہ دیر تک اسے سوچتی رہی۔ ایسا لگتا تھا کہ اب اس کی سوچوں پر صرف اور صرف کاویہ کا قبضہ ہے اور ان کے ویواہ میں جتنا سمے باقی ہے وہ اسی طرح

گزرنے والا ہے۔

وہ نہ جانے کتنی دیر اسی طرح کھڑی رہتی کہ اچانک پہاڑ سے قلعے کی طرف بڑھنے والے کچھ کالے سایوں نے اس کا دھیان اپنی طرف آکرشت کیا۔ قلعے کی فصیلوں پر نصب دیو قامت مشعلوں نے رات کے سمے بھی جنگل کو کافی حد تک واضح کر رکھا تھا لہٰذا اسے وہ سائے دور سے ہی نظر آ گئے۔

قلعے کی اونچی فصیلوں سے چند میل کی دوری پر، گھنے جنگل کے بیچوں بیچ وہ کالے سائے تیزی سے قلعے کے پائیں باغ کے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چاروں طرف پہرے دار اور سینک موجود تھے اس کے باوجود بھی وہ انہیں دیکھ نہیں پائے۔ ان سایوں کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

"سینکو! ہوشیار، حملہ ہونے والا ہے۔ پائیں باغ کے داخلی دروازے کو گھیرے میں لے لو۔" وہ اپنی کھڑکی سے چلائی اور اپنی تلوار تھام کر تیزی سے باہر کی طرف دوڑی۔ راستے میں جو نظر آتا گیا اسے خبردار کرتے ہوئے وہ پائیں باغ میں پہنچ گئی۔

اس کے چلانے پر محل میں ہلچل مچ گئی اور سبھی ہوشیار ہو کر پائیں باغ میں جمع ہونے لگے۔ مان سنگھ اور رویندر تک بھی یہ خبر پہنچ چکی تھی اور رویندر بھی اپنی تلوار تھامے باغ میں پہنچ چکا تھا۔

مان سنگھ نے رتناوتی کو اندر جانے کا اشارہ کیا مگر وہ اپنی تلوار تھامے وہیں کھڑی رہی۔

بھاری قدموں کی آوازیں تیزی سے قریب آتی جا رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے حملہ کرنے کے لیے دشمنوں کی پوری سینا ہی امڈ آئی ہو۔ آدیش شاہی پریوار کو حفاظت سے محل کے تہ خانے میں پہنچا کر پائیں باغ کی طرف دوڑا۔ سب کچھ اتنا اچانک ہو رہا تھا کہ کسی کو کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا۔

آخر یہ کس کی سینا تھی اور کیوں حملہ کرنا چاہتی تھی؟ ان کے دوڑتے بھاری قدموں کی آواز سے حملے کا ہی گمان ہو رہا تھا۔

ان سب کے کان باہر کی طرف لگے ہوئے تھے۔ اچانک پائیں باغ کے دروازے پر کوئی زوردار شے آ کر ٹکرائی۔ ایسا لگا جیسے کسی نے لوہے کا بہت بڑا تنا مار کر دروازے کو توڑنے کی کوشش کی ہو۔ وہ سب چوکنا ہو کر اپنی تلواریں تھام چکے تھے۔ ان پر یہ حملہ کون کر رہا تھا، یہ بعد میں بھی سوچا جا سکتا تھا۔ فی الحال مقابلے کا وقت تھا۔

اچانک دروازہ زوردار آواز سے ٹوٹ کر ایک طرف جا گرا اور بہت سارے کالے سائے ایک ساتھ قلعے کے اندر داخل ہوئے۔ سینکوں نے ان پر حملہ کر دیا تھا مگر کسی کو کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ حملہ کس پر کر رہے ہیں۔

وہ سائے تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے رتناوتی اور مان سنگھ تک جا پہنچے۔ وہ دونوں بھی اپنی تلواریں چلانے لگے۔ مقابلہ تو کرنا ہی تھا۔ تلوار کا وار کرنے سے وہ سائے دو حصوں میں تقسیم ہو جاتے مگر جڑ کر دوبارہ سے حملہ آور ہوتے تھے۔ ان کی بناوٹ انسانوں کی طرح تھی مگر ہیئت سائے جیسی تھی۔

چاروں طرف تلواروں کا شور تھا۔ قلعے میں چیخ و پکار بلند ہو چکی تھی۔ تلواریں چلاتے ہوئے کئی سینک ایک دوسرے کو بھی زخمی کر چکے تھے۔ تلوار سائے سے آر پار ہوتی تو انہی کے ساتھی کو جا لگتی۔ ایسا ہی رتناوتی کے ساتھ بھی ہوا۔

اس نے حملے سے بچنے کے لیے تیزی سے تلوار گھمائی اور تلوار رویندر کے کندھے سے جا ٹکرائی۔ خون کا ایک فوارہ بلند ہو کر اس کے چہرے کو بھگو گیا۔

"رتناوتی!" مان سنگھ چلائے۔ وہ اپنی جگہ سن ہو گئی۔

اس نے اپنے بھائی کو زخمی کر دیا تھا۔

وہ سائے بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے۔ رویندر اپنے کندھے کو تھامے ایک طرف گر گیا۔

"آدیش! رویندر کو فوراً اندر لے کر جاؤ۔" مان سنگھ چلائے۔

ایک ایک کر کے تمام سینک بری طرح زخمی ہو کر گرنے لگے۔ رتناوتی جو رویندر کے زخمی ہونے سے چند لمحوں کے لیے رک گئی تھی، ایک بار پھر سے اپنی تلوار تھامے ان کے مقابلے کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ اچانک ایک سایہ تیزی سے اس پر لپکا۔ وہ پیچھے کو گری، وہ سایہ اس پر سوار ہو چکا تھا۔ اسے ایسے محسوس ہوا جیسے وہ سایہ اس کا گلا دبانا چاہتا ہو۔

اس کی گردن کے گرد گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ مان سنگھ شاید اس کا نام لے کر پکار رہے تھے۔ قلعے میں چیخ و پکار مچ چکی تھی۔ قریب تھا کہ وہ سائے ان سب کو ختم کرنے کے بعد محل میں داخل ہو جاتے کہ اچانک انہیں ایک زوردار دہاڑ سنائی دی۔ اس دہاڑ کو سن کر رتناوتی پر سوار اس سائے نے اس کی گردن چھوڑ دی۔ وہ تیزی سے ایک طرف ہوئی اور اپنی تلوار کو تھام لیا۔ اس کا چہرہ خون میں رنگا ہوا تھا اور سانس بری طرح پھول رہی تھی۔ اس نے ہمت کر کے اپنی تلوار تھامی اور دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو کر اپنے حواس بحال کرنے کی کوشش کرنے لگی مگر حواس بحال ہوتے ہی اسے

حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ پائیں باغ کے دروازے پر راج گرو کھڑے تھے۔

شاید وہ کوئی جاپ کر رہے تھے۔ ان کی قہر برساتی نظریں ان سایوں پر ٹکی تھیں۔ انہوں نے اس جاپ کو زوردار آواز میں دہرانا شروع کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سائے چیخنے چلّانے لگے۔ ان کی آوازیں انتہائی منحوس تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت سارے جانور مل کر رو رہے ہوں۔

راج گرو نے اپنا منتر ختم کر کے اپنی ہتھیلی کھولی اور اس ہتھیلی پر پڑے سفوف کو ہونٹوں کے قریب کر کے قلعے کے اندر پھونک ماردی۔

وہ سائے دھواں بن کر تحلیل ہونا شروع ہو گئے۔ چاروں طرف عجیب سی بو پھیل گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سارے سائے اچانک ہی غائب ہو گئے۔

مان سنگھ حیرانی سے چاروں طرف دیکھنے لگے۔ ہر طرف زخمی سینک بکھرے پڑے تھے اور درد سے کراہ رہے تھے۔ ان میں سے چند موت کو گلے لگا چکے تھے۔ انہوں نے دوبارہ راج گرو کی طرف دیکھا جو آہستگی سے قدم بڑھاتے انہی کی طرف آ رہے تھے۔

"گرو جی......گرو جی!" مان سنگھ تیزی سے ان کی طرف بڑھے اور ان کے چرنوں میں گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے۔

"ہم آپ کا یہ اپکار جیون بھر نہیں بھولیں گے۔ آپ نہ ہوتے تو آج یہاں سب کچھ ختم ہو جاتا۔" وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے کہ وہ سائے کسی کے قابو میں ہی نہیں آ رہے تھے۔ اگر راج گرو بروقت وہاں نہ پہنچتے تو شاید وہ سائے محل کے اندر داخل ہو کر شاہی پریوار کا بھی خاتمہ کر دیتے۔

سنکھیا نے مان سنگھ کی طرف دیکھنے کے بجائے رتناوتی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر خون لگا ہوا تھا اور وہ خاموش کھڑی عجیب سی نظروں سے اسے تک رہی تھی۔

"اٹھ جاؤ مان سنگھ! اس ریاست کا راجا ہونے کے ناتے تمہیں یہ شوبھا نہیں دیتا کہ تم میرے چرنوں میں بیٹھو۔" وہ رتناوتی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

مان سنگھ اٹھ کر کھڑے ہو گئے مگر اپنے سینکوں کی حالت دیکھ کر بہت غمزدہ تھے۔

اسی لمحے آدیش بھی دوڑتا ہوا باغ میں پہنچا اور وہاں کے حالات دیکھ کر وہ بھی سُن کھڑا رہ گیا۔

"آدیش! رویندر ٹھیک تو ہے نا؟" وہ آدیش کو دیکھ کر تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔

"شاہی طبیب انہیں دیکھ رہے ہیں حضور! آپ بھی اندر چلیں۔ گرو جی......گرو جی! یہ سب کیا ہو گیا گرو جی؟" آدیش ہاتھ جوڑتے ہوئے رونے لگا۔

"اب چنتا کی کوئی بات نہیں۔ آپ سب اندر جائیں۔ جو سینک بچ گئے ہیں ان کا علاج کروائیں۔ میں چلتا ہوں۔" سنکھیا یہ کہہ کر پلٹنے لگا کہ اچانک مان سنگھ نے آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ جوڑ لیے۔

"گرو جی! ہم بنتی کرتے ہیں آپ سے کہ آپ نہ جائیں۔ آپ قلعے میں ہی قیام کریں۔ گرو جی! ہمیں بے سہارا مت چھوڑیں۔ یہ کالی شکتیاں ہمارا ناش کر دیں گی۔" وہ رو پڑے۔ ابھی تو انہیں اپنے سینکوں کی خبر بھی لینا تھی مگر اس سے پہلے وہ گرو جی کو یہیں روکنا چاہتے تھے تاکہ مزید نقصان سے بچ سکیں۔

"مان سنگھ! ہاتھ مت جوڑو۔ ٹھیک ہے، ہم یہیں ہیں آج رات۔" وہ رک گیا۔ قلعے کے اطراف میں موجود باقی سینک بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ انہیں جب تک خبر ملی، یہاں سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ وہ اپنے زخمی ساتھیوں کی مرہم پٹی کرنے اور انہیں سہارا دینے میں مصروف ہو چکے تھے۔

"حضور! آپ راج کماری کے ساتھ اندر جائیں۔ میں سب دیکھ لوں گا......آپ جائیں۔" آدیش نے مان سنگھ سے بنتی کی۔

مان سنگھ نے آگے بڑھ کر سُن کھڑی رتناوتی کو تھاما اور اسے اندر لیے محل میں داخل ہو گئے۔

رتناوتی نے جاتے جاتے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں رتناوتی کے جسم کے آر پار ہو گئی تھیں۔ اسے جیون میں پہلی بار کسی سے خوف محسوس ہوا تھا۔

شاہی پریوار تہ خانے سے باہر آ چکا تھا اور تمام طبیب زخمی سینکوں کے علاج معالجے میں مصروف ہو چکے تھے۔ جو اس دُرگھٹنا میں جان گنوا چکے تھے ان کی آخری رسومات کی تیاری کی جا رہی تھی۔

رویندر کی مرہم پٹی کی جا چکی تھی۔ شاہی طبیب کے مطابق زخم زیادہ گہرا نہیں تھا مگر وہ دوا کے اثر سے بے ہوش تھا۔

سب کی نیندیں اڑ چکی تھیں۔ آدیش نے آکر انہیں خبر دی کہ گرو جی محل کے پائیں باغ میں ہی تپسیا کے لیے بیٹھ چکے ہیں۔ مان سنگھ نے سکون کی سانس لی۔

"حضور! میں نے آپ سے کہا تھا نا......" آدیش

نے دوبارہ وہی بات شروع کی مگر مان سنگھ نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کروادیا۔

”یہ سب باتیں صبح کریں گے۔ راج گرُو کی سیوا میں کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔ قلعے کے آس پاس پہرا مزید سخت کروا دو۔ میں صبح راج گرُو سے مشورہ کروں گا۔ پاروتی! تم رتناوتی کو اس کے کمرے میں لے جاؤ۔ اسے آرام کی سخت ضرورت ہے۔“ وہ رتناوتی کی طرف دیکھ کر بولے جو مسلسل خاموش کھڑی تھی اور اس کے چہرے پر ابھی تک خون کے چھینٹے موجود تھے۔

پاروتی، رتناوتی کو لے کر اس کے کمرے میں چلی آئیں۔

”رتناوتی! کیا دیکھا تھا تم نے؟ کیا ہوا تھا؟“ وہ اسے خاموش دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

”ماتا شری! آپ آرام کریں۔ میں اس سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کرسکوں گی۔“ وہ اتنا کہہ کر چپ ہوگئی۔

پاروتی اس کی حالت سمجھ کر کمرے سے باہر چلی گئیں البتہ اس کی کنیزیں کمرے میں موجود تھیں۔ اس نے خاموشی سے غسل کیا اور لباس تبدیل کرکے اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ اس کا دماغ سُن ہوچکا تھا۔ اچانک اتنا سب کچھ ہوگیا تھا۔ اتنا خون بہہ گیا تھا۔ اس کے ہی ہاتھوں اس کا بھائی زخمی ہوگیا تھا۔ تلوار کا یہ وار اس کی گردن پر بھی تو لگ سکتا تھا۔ یہ سوچ کر ہی اسے جھرجھری آگئی۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے ایک پل سکون نہیں مل رہا تھا۔ وہ کچھ سوچ کر اٹھی اور اپنے کمرے کی کھڑکی کھول دی۔ اس کی نظر بے اختیار ہی باغ کی طرف گئی جہاں ایک قالین پر سنتھیا اپنی آنکھیں بند کیے بیٹھا تپسیا کررہا تھا۔

اس نے تپش محسوس کرکے اپنی آنکھیں کھولیں اور رتناوتی کو اس کی کھڑکی میں دیکھ کر اپنی نظریں اس پر جمادیں۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر اسے تک رہا تھا۔

رتناوتی کو اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ اس نے جلدی سے کھڑکی بند کردی۔

سنتھیا کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

وہ محل میں داخل ہونے میں کامیاب ہوچکا تھا۔ صبح مان سنگھ اسے خود محل میں قیام کرنے کی دعوت دینے والے تھے۔ وہ رتناوتی کے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔

☆☆☆

**Year 1773**

**اسکاٹ لینڈ**

تھامس کو ساری رات نیند نہیں آئی تھی۔ وہ بہت عرصے سے اس ذمے داری پر فائز تھا اور اسے بخوبی نبھا رہا تھا۔ اس سے پہلے آنے والے بھی یہی کرتے آئے تھے اور اب سکون سے اپنی قبروں میں سو رہے تھے۔ انہوں نے برسوں اس مقام کی حفاظت کی تھی۔ اس عرصے میں ان کی شیاطین جنات سے چھوٹی موٹی جھڑپیں تو ہوتی ہی رہتی تھیں مگر اب لگ رہا تھا کہ جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ انہیں برسوں سے جس جنگ کے لیے تیار کیا جارہا تھا شاید وہ تھامس کی قسمت میں لکھ دی گئی تھی۔

مگر کچھ تھا جس کی کمی تھی۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ جب بھی یہ جنگ شروع ہوگی، نیکی کا نیا پہرے دار ان کے ساتھ ہوگا۔ اگر اس کا شک صحیح تھا تو اب تک تو اسے نیکی کے نئے پہرے دار کو پہچان لینا چاہیے تھا۔

”میری مدد کیجیے...... مجھے راہنمائی کی ضرورت ہے۔“ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

اچانک ان بند آنکھوں کے پردے پر آرتھر کا خاکہ اُبھرا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

”میرے ساتھ بچپن سے ایسے واقعات ہوتے ہیں اور ان دنوں میں جس کتاب کا مطالعہ کررہا تھا اس میں موجود آسیب مجھے وقتاً فوقتاً اپنی جھلک دکھانے آتے رہے۔ شاید یہ میری ہی وجہ سے ہوا ہے۔“ تھامس کے کانوں میں آرتھر کے یہ الفاظ گونجے۔

’تو کیا وہ آرتھر ہوسکتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس نے مجھے اپنے بارے میں بتایا کیوں نہیں؟‘ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ’لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اسے اندازہ ہی نہ ہو کہ وہ نیکی کا پہرے دار ہے اور اسے بتانے کی ذمے داری میری ہو؟‘ اس نے ذہن پر زور دینے کی کوشش کی اور اچانک اپنے بستر سے اٹھ کر اپنے کمرے میں رکھی کتابوں کی الماری کی طرف چل دیا۔

اس نے الماری کا دروازہ کھول کر احتیاط سے چند کتابیں باہر نکالیں۔ اس خالی جگہ کے پیچھے ایک اور خفیہ خانہ بنا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر اس خفیہ خانے کو کھولا اور اس کے اندر رکھی ایک بوسیدہ سی کتاب نکال کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

”جب جنگ قریب ہوگی تو ماضی اور حال مل جائیں گے۔ حال، مستقبل کی حفاظت کرے گا۔ اس سے پہلے یہ ممکن نہیں ہوگا۔ ایک جائے گا تو دوسرا آئے گا۔“ اس نے ان الفاظ کو غور سے پڑھا اور سوچ میں پڑ گیا۔ تھامس کو یہ کتاب اس کی ذمے داریاں سونپتے ہوئے دی گئی تھی اور یہ

ہدایات اس صورت میں پڑھنے کی نصیحت کی گئی تھی جب جنگ شروع ہونے کا خدشہ ہو۔

اس تحریر سے تو صاف ظاہر تھا کہ ماضی کا پہرے دار حال کے پہرے دار کے ساتھ مل کر اس جنگ کو لڑے گا۔ دوسری صورت میں ان کا سامنا ہونا ناممکن تھا۔ ایک جاتا تھا اور دوسرا اس کی جگہ لیتا تھا۔ جانے والے کے ذہن سے پچھلی معلومات مٹادی جاتی تھیں مگر یہاں یہ تحریر نہیں تھا کہ مستقبل، ماضی سے خود آکر ملے گا یا ماضی کو اسے ڈھونڈنا ہوگا؟ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

عجیب کشمکش تھی۔ ایک طرف اسے الیگزینڈر پر شک تھا جو کہ [illegible] سزم کے بعد کسی حد تک یقین میں بدل چکا تھا مگر دوسری طرف [illegible] آرتھر کو خود کوئی ذمے داری نہیں سونپ سکتے تھے۔ [illegible] لیے تو انہیں خود آنا چاہیے تھا جو اسے یہ ذمے داری سونپ [illegible] تھے۔ بہرحال جو بھی تھا، وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے تو بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا۔

اسے الیگزینڈر کے بارے میں مکمل معلومات جمع کرنی چاہیے تھیں، باقی سب بعد کی [illegible] تھیں۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ اگلے دن انسٹی ٹیوٹ پہنچ کر الیگزینڈر سے اس کی اصلیت اگلوانے کی کوشش کرے گا مگر دوسرے دن جب وہ انسٹی ٹیوٹ پہنچا تو کسی پروفیسر کی غیر حاضری کی وجہ سے اسے ان کی جگہ لیکچر لینا پڑا۔ ابھی الیگزینڈر اور آرتھر کی جماعت کا لیکچر باقی تھا مگر جب وہ اپنے کمرے کی طرف آیا تو وہاں ایلینا کو بیٹھا دیکھ کر چونک پڑا۔

ڈیوڈ اس کی ہدایت کے مطابق ایلینا کو اس سے ملوانے لے آیا تھا۔ الیگزینڈر اور آرتھر بھی اس کے آفس میں ہی موجود تھے۔ اس نے ان دونوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور ایلینا کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ڈیوڈ نے اسے اس کے ساتھ پیش آنے والے کچھ پراسرار واقعات سے بھی آگاہ کیا مگر ایلینا سے بات چیت کرنے اور اس کا معائنہ کرنے کے بعد تھامس کو تسلی ہوگئی کہ وہ اب بالکل ٹھیک ہوچکی ہے اور ڈیوڈ کو صرف چند شیاطین جنات نے ڈرانے کی کوشش کی ہے جس میں وہ ناکام رہے ہیں۔

ڈیوڈ کو اس طرح خوفزدہ کرنے کے پیچھے انہیں صرف یہی وجہ سمجھ آئی تھی کہ وہ اس کے ساتھ قلعے میں چھپی اس چابی کا مقام دیکھ آیا تھا۔ حالانکہ دیکھ کر تو اس کے مددگار اور چرچ کے فادر ولیم بھی آئے تھے مگر قلعے سے باہر نکلنے سے لے کر چرچ پہنچنے تک تھامس کے کہنے کے مطابق ان تینوں کے ذہن سے وہ مقام اور معلومات مٹادی گئی تھیں۔

لیکن ڈیوڈ کو وہ ساری معلومات اچھی طرح یاد تھیں اور اس کے ذہن سے ان معلومات کو نہ مٹانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اس قلعے کے بہت قریب رہ رہا تھا اور اس قصبے میں رہنے والے لوگوں کو اس خطرے سے خبردار کرتا رہتا۔ تھامس وہاں ہر وقت موجود نہیں رہ سکتا تھا لہٰذا کسی ذمے دار اور بہادر انسان کو یہ ذمے داری سونپنا بھی ضروری تھی۔

ڈیوڈ چونکہ اعصابی اور روحانی طور پر ایک مضبوط انسان تھا لہٰذا اس کے ذہن میں یہ معلومات محفوظ کردی گئی تھیں اور کہیں نہ کہیں تھامس کو یہ شک بھی گزرتا تھا کہ کہیں ڈیوڈ ہی تو نیکی کا پہرے دار نہیں مگر آج اسے اپنے سامنے

بیٹا دیکھ کر وہ ایک بار پھر کشمکش کا شکار ہو گیا۔

آرتھر یا ڈیوڈ؟

وہ ان دو ناموں کے بیچ میں جھول رہا تھا۔

ایلینا کو روانہ کرنے کے بعد اس نے آرتھر اور الیگزینڈر کو بلوا بھیجا۔ شاید ان دونوں سے سوال جواب کے بعد ہی وہ کسی نتیجے پر پہنچ سکتا تھا کیونکہ وہ مسلسل مدد مانگ رہا تھا مگر اسے کوئی اشارہ نہیں مل رہا تھا۔

وہ انہی سوچوں میں گم تھا جب آرتھر کمرے میں اکیلا داخل ہوا۔

"جی فادر! آپ نے بلایا؟" وہ ادب سے کہہ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

"ہاں، الیگزینڈر کہاں ہے؟" وہ اسے اکیلا دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"جی فادر! وہ تو چلا گیا۔ اسے کچھ ضروری کام یاد آ گیا تھا۔" آرتھر بولا۔

"ضروری کام......؟ مگر ابھی تو وہ یہیں تھا اور لیکچر بھی رہتا ہے ابھی تم سب کا۔" وہ بولا۔ جواباً آرتھر نے کندھے اُچکا دیے۔ اسے کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ الیگزینڈر کو کیا کام ہے۔

"اچھا، تم ایک کام کرو۔ انتظامیہ سے کہہ کر میرا لیکچر ملتوی کروا دو اور اس کے بعد میرے کمرے میں آؤ۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"جی فادر!" آرتھر یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

ایک بار پھر وہ اندھیرے میں کھڑا تھا۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ بیٹھ کر الیگزینڈر کے آنے کا انتظار کرتا لہٰذا اس نے خود ہی الیگزینڈر کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

آرتھر ان کے کمرے میں لوٹا تو وہ اپنا ضروری سامان سمیٹ چکے تھے۔

"تمہیں الیگزینڈر کا گھر معلوم ہے؟" وہ اپنا کوٹ اٹھا کر پہنتے ہوئے بولا۔

"نہیں...... مگر کیا ہوا؟" آرتھر حیران ہو رہا تھا۔

"چلو میرے ساتھ۔ ہم اس وقت الیگزینڈر کے گھر چل رہے ہیں۔" تھامس نے اپنا ہیٹ پہنا اور تیزی سے آفس سے باہر نکل گیا۔ آرتھر اس کے پیچھے بھاگتا ہوا باہر نکلا۔

"لیکن کیوں......؟ اور فادر ہمیں تو اس کے گھر کا پتا معلوم ہی نہیں۔" آرتھر نے حیرانی سے پوچھا۔

"زیادہ سوال مت کرو۔ تمہیں سارے جواب وہیں مل جائیں گے اور اس کا پتا میں ڈھونڈ لوں گا۔" وہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے انسٹی ٹیوٹ سے باہر نکل آئے۔ چرچ کی بگھی تیار کھڑی تھی۔ وہ آرتھر کو اپنے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کر کے بگھی میں سوار ہو گئے۔

راستے بھر فادر تھامس خاموش بیٹھے رہے۔ ان کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی دیکھ کر آرتھر نے بھی ان سے کچھ پوچھنے سے گریز کیا۔ بالآخر بگھی اس راستے پر پہنچ کر رک گئی جہاں گزشتہ روز الیگزینڈر ان سب کے سامنے بگھی سے اترا تھا۔

"فادر! اس سے آگے بگھی نہیں جا سکتی۔" کوچوان، تھامس سے مخاطب ہوا۔

"ہم...... تم یہیں رکو، ہم ہو کر آتے ہیں۔" تھامس اسے یہ کہہ کر بگھی سے اتر گیا اور آرتھر نے بھی اس کی پیروی کی۔

وہ دونوں ایک ساتھ اس کچے پکے راستے پر پیدل چلنے لگے۔ تھامس نے الیگزینڈر کا پتا ذہن نشین تو کر لیا تھا مگر اس علاقے میں دور دور تک کوئی گھر نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہر طرف جھاڑیاں اور درخت تھے۔ تھامس نے اسی راستے پر چلنے کا فیصلہ کیا۔ آخر یہ راستہ کہیں نہ کہیں جا کر تو ختم ہو ہی جاتا۔ چند لمحوں بعد اس کا یہ فیصلہ صحیح ثابت ہوا۔ انہیں کچھ دوری پر ایک پرانا کیبن نما گھر نظر آنا شروع ہو گیا۔ یہ اس علاقے کا واحد گھر تھا۔ آرتھر بھی حیرانی سے آس پاس کے علاقے کا جائزہ لے رہا تھا۔

"فادر! کیا آپ کو یقین ہے کہ ہم صحیح جگہ پر آئے ہیں؟" وہ تھامس سے مخاطب ہوا۔

"تمہارے سامنے اس دن وہ یہیں اترا تھا۔ یہ کافی غیر معروف علاقہ ہے۔ جو پتا اس نے انسٹی ٹیوٹ میں لکھوایا ہے، اس کے مطابق اس کے گھر کا نمبر چار ہونا چاہیے مگر یہاں تو گھر نمبر ایک، دو، تین بھی نظر نہیں آ رہے۔ لہٰذا ہم اسی گھر کا دروازہ بجانے والے ہیں۔" تھامس نے یہ کہہ کر اپنے قدم تیز کر دیے۔

وہ لکڑی کے کیبن کے قریب پہنچ کر اس کا دروازہ کھٹکھٹانے لگے مگر اندر سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔

"الیگزینڈر...... الیگزینڈر......!" آرتھر نے الیگزینڈر کو پکارا مگر اندر سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔

"فادر! شاید وہ گھر پر نہیں ہے۔" آرتھر بولا۔

"لیکن وہ تو ہم سے پہلے روانہ ہوا تھا۔ اسے تو گھر پر ہی ہونا چاہیے۔" تھامس نے دروازے میں بنی جھریوں سے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔

"ہو سکتا ہے یہ الیگزینڈر کا گھر نہ ہو۔" آرتھر بولا۔

"ہمارے سامنے وہ اس دن یہیں اترا تھا اور اس

پورے علاقے میں صرف یہ ایک ہی گھر ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ اسی کا گھر ہے۔ دروازے کو کھولنے کی کوشش کرو، میں انتظار کررہا ہوں۔'' تھامس وہیں کھڑا ہوگیا۔

''مگر فادر......!'' آرتھر کشمکش میں پڑ گیا۔

''میں کہہ رہا ہوں نا...... کھولو، جو بھی ہوا اس کی تمام ذمے داری میں اپنے سر لے لوں گا۔ اب دروازہ کھولو، ہمیں دیر ہورہی ہے۔'' تھامس سنجیدگی سے بولا۔

آرتھر نے دروازے کو دھکا مارنا شروع کیا۔ دروازہ پہلے ہی کمزور تھا، دو تین دھکوں کے بعد دروازہ کھل گیا۔ تھامس گہری سانس لے کر اس لکڑی کے کیبن کے اندر داخل ہوگیا۔ مجبوراً آرتھر کو بھی اس کی پیروی کرنا پڑی۔

''دروازہ بند کردو۔'' تھامس نے اندر داخل ہوتے ہی آرتھر کو اشارہ کیا تو آرتھر نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ بند کردیا۔

تھامس نے کیبن پر تفصیلی نگاہ ڈالی۔ کیبن خالی پڑا تھا۔ ایک طرف الماری کھلی پڑی تھی جس میں بکھرے کپڑے اس بات کا ثبوت تھے کہ الیگزینڈر کچھ دیر پہلے ہی عجلت میں اپنے چند کپڑے اٹھا کر یہاں سے نکلا ہے۔

''یہ تو الیگزینڈر کا ہی گھر لگتا ہے۔ یہ دیکھیں...... اس کی نوٹ بک بھی پڑی ہے۔'' آرتھر نے آگے بڑھ کر میز پر پڑی اس کی نوٹ بک کی طرف اشارہ کیا۔

مگر تھامس میز پر رکھے دوسرے سامان کو دیکھ کر چونک پڑا۔ وہاں ایک کھوپڑی، عجیب و غریب ہڈیاں، کچھ پراسرار سفوف اور پگھلی ہوئی موم بتیوں کا ڈھیر لگا تھا۔

تھامس نے آرتھر کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ اس کھوپڑی کے نیچے چند پرانے کاغذات بھی رکھے نظر آرہے تھے۔ تھامس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کھوپڑی کو ہٹایا اور کاغذات اٹھا کر ہاتھ میں پکڑ لیے۔

''فادر! یہ دیکھیں، یہ آئینہ کچھ عجیب سا نہیں؟'' آرتھر بھی وہاں موجود سامان کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ تھامس نے آئینے پر نظر ڈالی۔

وہ ایک قدیم طرز کا آئینہ تھا۔ اس آئینے پر جو نقش و نگار بنے ہوئے تھے، وہ تھامس کے ہر شک پر یقین کی مہر ثبت کرگئے۔

الیگزینڈر اپنے ہمزاد کو قابو کرچکا تھا اور اسی آئینے کے ذریعے اس سے ہم کلام ہوتا تھا۔ تھامس نے ایک نظر آرتھر پر ڈالی جو وہاں رکھے دوسرے سامان کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔

''کسی چیز کو بھی ہاتھ مت لگانا۔'' تھامس نے اسے ہدایت دی اور ہاتھ میں پکڑے کاغذات کی طرف متوجہ ہوگیا مگر اگلے ہی لمحے وہ بری طرح چونکا۔ اسے چونکتا دیکھ کر آرتھر بھی اس کی طرف متوجہ ہوچکا تھا۔

''ایڈم وائس ہوپٹ......!'' اس نے یہ نام خود کو یقین دلانے کے لیے زیر لب دہرایا۔

''کیا ہوا فادر! کیا ہے ان کاغذات میں؟'' آرتھر اس کے چہرے پر پھیلی پریشانی دیکھ کر بولا۔

''تم جانتے ہو ایڈم وائس ہوپٹ کون ہے؟'' تھامس نے اس سے پوچھا۔

''نہیں، کون ہے؟'' آرتھر نے نفی میں سر ہلایا۔

''1717ء میں جب لندن کے چار لاجز نے مل کر انگلستان کا پہلا گرینڈ لاج بنایا تو اس وقت ایک ایسی تنظیم کی بنیاد رکھی گئی جس کے مقاصد شیطانیت کو فروغ دینا تھے۔ اس تنظیم کا نام فری میسن رکھا گیا اور یہ تیزی سے یورپ میں پھیلتے گئے۔ پروفیسر ایڈم وائس ہوپٹ بھی ایسا ہی ایک شخص ہے مگر یہ اپنی تنظیم ''الومیناٹی'' کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے اور آنے والے دو سے تین سالوں میں اس کی یہ تنظیم جو کہ ابھی خفیہ ہے، باقاعدہ کھل کر کام کرنا شروع ہوجائے گی۔ یہ وہ انسان ہے جس کی وجہ سے شیطانیت کو کھلم کھلا تسلیم کیا جانے لگے گا اور یہ بھی عبادت گھروں کی تعمیر شروع کرے گا مگر وہاں شیطان کی عبادت کی جائے گی۔'' فادر تھامس کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''فادر! اسے کوئی روک نہیں سکتا کیا؟'' آرتھر کو تو یہ باتیں ہی عجیب لگ رہی تھیں۔ یہ جادو ٹونے، شیطان کی عبادت، وہ سب کام تو خفیہ طور پر کیے جاتے تھے تاکہ لوگوں کو پتا نہ چلے مگر یہ ایڈم نامی شخص تو اسے عام کرنے کا منصوبہ بنائے بیٹھا تھا۔

''میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ دنیا میں نیکی اور بدی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ان کی جنگ خفیہ ہو یا کھلے عام، سب اپنی اپنی کوششیں جاری رکھتے ہیں۔ ہمارا کام ہے ہدایت مانگنا اور صحیح راستے کا انتخاب کرنا۔ ہار اور جیت کا معاملہ تو دنیا کے خاتمے تک چلتا رہے گا مگر یہ یاد رکھنا، اگر بدی کی اس دنیا میں جیت بھی جائے تو مایوس نہ ہونا کیونکہ جیسے یہ دنیا فانی ہے، وہ جیت بھی فانی ہے۔ خدا کا راستہ ہی کامیابی کا راستہ ہے۔'' ان کی آواز بھرّا گئی۔

''فادر! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ الیگزینڈر کے گھر میں یہ چیزیں کیا کررہی

ہیں اور اس کا اس سب سے کیا تعلق ہے؟'' آرتھر پریشانی سے بولا۔

''چلو، ہمیں نکلنا چاہیے۔ تعلق کیا ہے، میں آج رات تک معلوم کرلوں گا۔ تم نے اس بات کا ذکر کسی سے نہیں کرنا۔'' وہ ان کاغذات کو احتیاط سے اسی کھوپڑی کے نیچے رکھ چکے تھے۔

''آپ کہتے ہیں تو میں مزید تلاشی لیتا ہوں۔'' آرتھر بولا۔

''نہیں، اس گھر کی کسی چیز کو ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جو جاننا چاہتا تھا، جان چکا ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر کیبن سے باہر نکل گئے۔ آرتھر نے بھی ان کی پیروی کی اور کیبن کا دروازہ بند کرکے ان کے پیچھے چلا آیا۔ انہوں نے اسے ازابیلا کے گھر اتارا اور خود چرچ چلے آئے۔

وہ چرچ میں ہی رہائش پذیر تھے۔ یہاں ان کے لیے ایک کمرا مختص تھا۔ انہوں نے کمرے میں آکر دروازہ بند کیا اور الماری کے اس خفیہ خانے سے وہ کتاب نکال کر بیٹھ گئے۔ اب مدد لینا ضروری ہوگیا تھا۔ اس گتھی کو سلجھانے میں مزید دیر کی جاتی تو معاملات سنگین نوعیت اختیار کرجاتے۔ انہوں نے کتاب کا ایک صفحہ کھولا اور اس پر لکھی تحریر پڑھ کر اپنی آنکھیں موند لیں۔ ان کے ہونٹ اب اس تحریر کو روانی سے دہرا رہے تھے۔

اچانک کمرے میں سفید روشنی پھیلنا شروع ہوئی۔ انہیں بند آنکھوں سے بھی اس روشنی کی چمک کا احساس ہوا مگر انہوں نے اپنی آنکھیں نہیں کھولیں۔

''کہو تھامس! کیسے یاد کیا ہمیں؟'' گوکہ یہ آواز انہوں نے برسوں بعد سنی تھی مگر وہ اس آواز کو ہزاروں میں بھی پہچان سکتے تھے۔ تھامس نے بے اختیار ہی اپنی آنکھیں کھولیں اور انہیں اپنے سامنے پاکر اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ارامان! کیسے ہیں آپ؟'' وہ اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔

''ہم بالکل ٹھیک ہیں۔ تم کیسے ہو؟'' ان کے چہرے پر وہی پُرشفقت مسکراہٹ تھی۔ آج بھی ان کا چہرہ ویسے ہی دمک رہا تھا اور ان کی سفید ڈاڑھی مزید لمبی ہوچکی تھی۔

''آپ کو دیکھ لیا، اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' تھامس نے عقیدت سے کہا۔

''پریشان لگ رہے ہو؟'' وہ تھامس کا چہرہ پڑھ چکے تھے۔

''جی، کچھ معاملات تھے جن کی طرف آپ کی توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں۔'' تھامس بولے اور پھر انہوں نے الیگزینڈر کے حوالے سے ساری معلومات ان کے گوش گزار کردیں۔

''تمہارا شک بالکل ٹھیک ہے۔ الیگزینڈر نے شیطانیت کو قبول کرلیا ہے اور وہ ان کی طرف سے نمائندہ ہے۔ وہ صحیح وقت کا انتظار کررہا ہے۔'' ارامان بولے۔

''کیا وہ وقت قریب ہے؟ اگر ہے تو کتاب میں لکھی تحریر کے مطابق نیکی کا وہ پہرے دار کہاں ہے؟ کہاں ہے وہ حال جو ماضی سے آملے گا؟'' تھامس نے ارامان سے سوال کیا۔

''تم اسے اب تک نہیں پہچانے؟'' ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''میں نے کوشش کی تھی۔ مجھے محسوس ہوا تھا جیسے وہ ڈیوڈ ہے مگر اب نہ جانے مجھے کیوں ایسا لگنے لگا ہے کہ وہ آرتھر ہے۔ آپ میری مدد کیجیے۔'' شاید تھامس ان دونوں کے درمیان فیصلہ نہیں کرپارہا تھا۔

''وہ ڈیوڈ کیسے ہوسکتا ہے؟ ڈیوڈ بال بچوں والا شخص ہے۔ بے شک وہ ایک نیک روح ہے مگر وہ پہرے دار بننے کی شرائط پر پورا نہیں اترتا تھامس!'' ارامان سنجیدگی سے بولے تو تھامس یہ سن کر بری طرح چونک پڑا۔

''اوہ...... ہاں...... میرا دھیان اس طرف کیوں نہیں گیا؟ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس پر یہ حقیقت آشکار کرنے سے پہلے صحیح وقت کا انتظار کیا جارہا ہے۔ حیرت ہے کہ مجھے اتنا اہم اشارہ سمجھ کیوں نہ آیا۔ میں تو اسے اس چابی تک بھی لے گیا تھا ارامان!'' تھامس بولا۔

''تم نے اس کی جان خطرے میں ڈال دی ہے مگر وہ اپنی حفاظت کرنا جانتا ہے لیکن اسے تمہاری مدد کی ضرورت پڑے گی۔ حال کے پہرے دار اپنی اپنی جگہوں پر پہنچ چکے ہیں۔ انہیں ان کی ذمے داریاں سونپنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ مجھے ایسا لگنے لگا ہے جیسے وہ وقت بہت قریب ہے لہٰذا جو کرنا ہے، جلدی کرنا ہے۔ میں یہ فرض تمہیں سونپ رہا ہوں کہ تم آرتھر کو اس کی ذمے داریوں کے بارے میں آگاہ کردو اور اسے تیار کرو۔ آج کے بعد وہ ہر جگہ تمہارے ساتھ ساتھ رہے۔ تمہیں الیگزینڈر پر خصوصی نظر رکھنا ہوگی۔ اب مجھے اجازت دو۔'' ارامان یہ کہہ کر ہوا میں تحلیل ہوگئے۔

اس کا مطلب ہے وہ آرتھر ہی تھا۔ تو اب انہیں آرتھر کو تیار کرنا تھا۔

ارامان نے اس بات کی تصدیق کردی تھی کہ

الیگزینڈر ہی شیطان کا نمائندہ ہے اور الیگزینڈر کے گھر میں ان کاغذات کا ملنا اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ وہ لوگ جنگ کی تیاری کر چکے ہیں اور کافی عرصے سے اس کی منصوبہ بندی میں مصروف ہیں۔

یعنی وہ لوگ ان سے ایک قدم آگے چل رہے تھے۔

”مجھے فوراً آرتھر سے ملاقات کرنا ہوگی۔ اسے اس کی سچائی کے بارے میں آگاہ کرنا ہوگا تاکہ ہم اپنی تیاری مکمل کر سکیں۔“ تھامس نے خودکلامی کی۔

الیگزینڈر کو ڈھونڈنا اب ضروری ہوگیا تھا۔ وہ نہ جانے کہاں غائب ہوگیا تھا۔

تھامس ارادہ کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ چرچ کی بگھی آرتھر کے گھر کی طرف رواں دواں تھی۔ آرتھر کو اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی کا پتا چلنے والی تھی۔

☆☆☆

انہیں ایڈنبرا پہنچتے پہنچتے شام ہو چکی تھی۔ فادر تھامس کی طرف سے ایلینا کو بے گناہ ظاہر کرنا ان کے کاندھوں سے بہت بڑا بوجھ ہٹا گیا تھا۔ آج رچرڈ بھی بہت خوش تھا اور وہ رات کے کھانے پر خاص اہتمام کرنا چاہتا تھا۔

ڈیوڈ کو آج اپنی بیوی کے پاس دوسرے قصبے واپس جانا تھا مگر رچرڈ کے بہت زیادہ اصرار کرنے پر اسے رات کے کھانے کے لیے رکنا پڑا اور اب وہ دوسری صبح ہی سفر کر پاتا۔

ایلینا بھی اپنی ماں کے ساتھ کھانا بنانے میں اس کی مدد کروا رہی تھی اور وہ سب یہ مثبت تبدیلی دیکھ کر بہت خوش تھے۔ کھانا لگا دیا گیا تھا۔ رچرڈ نے خاص طور پر مرغ مسلم اور چاول تیار کروائے تھے۔ وہ لوگ کھانے سے لطف اندوز ہو ہی رہے تھے کہ دروازے پر ہونے والی دستک سے چونک پڑے۔

”میں دیکھتا ہوں۔“ رچرڈ اٹھنے لگا مگر ڈیوڈ نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا۔

”تم اس مرغ کے حصے کرو، میں دیکھ کر آتا ہوں۔“

ڈیوڈ یہ کہہ کر دروازے کی طرف چل پڑا۔

حسبِ معمول رات کا اندھیرا پھیلتے ہی دھند نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور ٹھنڈ بھی بہت بڑھ گئی تھی۔

”کون ہے؟“ ڈیوڈ نے دروازہ کھولنے سے پہلے پکارا۔

”جی، مجھے فادر تھامس نے بھیجا ہے۔“ آنے والے نے اپنا نام بتائے بغیر آنے کا مقصد بیان کیا اور ڈیوڈ، فادر تھامس کا نام سن کر چونک پڑا۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

دروازے پر ایک شخص موجود تھا جو لانگ کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے سر پر موجود ہیٹ نے اس کے آدھے چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس نے ہاتھ میں ایک چمڑے کا بستہ بھی تھاما ہوا تھا۔

”جی فرمائیے، کیا کام ہے آپ کو؟“ ڈیوڈ نے اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ وہ جانا پہچانا لگ رہا تھا۔

”میرا نام الیگزینڈر ہے۔ آج آپ کی مجھ سے فادر تھامس کے آفس میں ملاقات ہوئی تھی۔ آپ کے نکلنے کے بعد انہوں نے مجھے یہ خط دے کر فوراً آپ کے پیچھے روانہ کیا تھا۔“ الیگزینڈر نے کوٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکال کر ڈیوڈ کو تھما دیا۔

ڈیوڈ نے حیرت سے الیگزینڈر کی طرف دیکھا اور اس لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ لفافے کو موم سے سیل بند کیا گیا تھا اور اس موم پر چرچ کی مہر لگی ہوئی تھی۔

”آپ اندر آجائیں، باہر بہت سردی ہو رہی ہے۔ یہاں مناسب روشنی نہیں ہے کہ میں اس خط کو پڑھ سکوں۔“ ڈیوڈ نے اسے اندر آنے کی دعوت دی تو الیگزینڈر خاموشی سے اندر داخل ہوگیا۔ وہ پہلا پڑاؤ پار کر چکا تھا۔

ڈیوڈ اسے ساتھ لیے اس کمرے میں داخل ہوا جہاں وہ سب کھانے پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ڈیوڈ کے ساتھ داخل ہونے والے اجنبی شخص کو دیکھ کر وہ سب چونک پڑے۔

”رچرڈ! تمہیں یاد ہوگا آج ہماری چرچ میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ فادر تھامس نے انہیں یہ خط دے کر ہماری طرف روانہ کیا ہے۔“ ڈیوڈ نے فوراً ہی رچرڈ کو مطلع کیا۔

ایلینا اسے دیکھ کر بری طرح چونک پڑی۔ ایک بار پھر اسے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے تھے۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”اوہ...... جی...... سب خیریت تو ہے نا؟ آئیں، بیٹھیں۔ ہمارے ساتھ کھانا تناول کریں۔“ رچرڈ فوراً ہی اچھا میزبان ہونے کا فرض نبھانے لگا۔

”نہیں، میں راستے میں سرائے سے کھانا کھا چکا ہوں۔ بہتر یہی ہوگا کہ آپ پہلے فادر تھامس کا خط پڑھ لیں تاکہ میں واپس روانہ ہو سکوں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

ڈیوڈ نے سر ہلا کر اس لفافے کو کھول لیا۔

”محترم رچرڈ!

آپ کے جانے کے بعد میں نے چند اہم باتوں پر غور کیا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ فی الحال ایلینا کو

اور آپ کے گھر کو نگرانی کی ضرورت ہے لہٰذا میں چرچ کا نمائندہ اس خط کے ساتھ روانہ کر رہا ہوں۔ یہ چند دن آپ کے گھر میں قیام کرے گا اور گھر کے تمام کونوں کو شیطان کے اثرات سے پاک کرے گا اور آپ کے گھر کو شیطانی طاقتوں سے محفوظ رکھے گا۔

فادر تھامس

اسکاٹ لینڈ چرچ''

ان کے نام کے ساتھ ہی چرچ کی مہر بھی لگی ہوئی تھی۔ ڈیوڈ نے اس خط کو بند کرنے کے بعد گہری سانس لے کر سر کے اشارے سے الیگزینڈر کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''کیا ہوا، سب ٹھیک تو ہے نا؟ کیا لکھا ہے اس خط میں؟'' رچرڈ، ڈیوڈ سے پوچھنے لگا۔

''فادر تھامس نے انہیں تمہارے گھر کو پاک کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ شاید تم نے خود واقعات بتائے تھے اس کی وجہ سے انہوں نے یہ اقدام کرنا ضروری سمجھا ہے۔ یہ کچھ دن یہیں قیام کریں گے۔'' ڈیوڈ بولا۔

''یہ تو بہت اچھا ہوا۔ میں ابھی آپ کا کمرا تیار کروا دیتا ہوں۔ آپ کھانے سے لطف اندوز ہوں۔'' رچرڈ نے اپنی بیوی کو اشارہ کیا۔

''میں نے آپ کو بتایا نا کہ میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔ آپ کو اس سلسلے میں تکلیف اٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' الیگزینڈر مسکرایا۔

''رچرڈ! میں انہیں اپنے کمرے میں لے جاتا ہوں۔ وہاں کافی جگہ ہے، وہیں پر ایک بستر لگوا دیتے ہیں۔'' ڈیوڈ نے رچرڈ کو مشورہ دیا تو رچرڈ کو اس کا یہ مشورہ بہت پسند آیا۔ اس کے گھر میں کوئی خالی کمرا نہیں بچا تھا جہاں وہ آنے والے مہمان کو ٹھہراتا۔ ڈیوڈ خود ہی الیگزینڈر کے ساتھ ٹھہرنے کے لیے راضی ہو گیا تھا لہٰذا دونوں کو آسانی ہو گئی تھی۔

''نہیں، آپ کو بلاوجہ تکلیف ہوگی۔ میں اکیلے رہنے کا عادی ہوں۔'' الیگزینڈر بولا۔

''میں ویسے بھی صبح اپنے بیوی بچوں سے ملنے کے لیے روانہ ہو جاؤں گا اور کچھ دن بعد ہی واپس لوٹوں گا۔ وہ کمرا آپ اکیلے ہی استعمال کریں گے۔ بس آج کی رات آپ کو مجھے برداشت کرنا ہوگا۔'' ڈیوڈ مسکرایا۔

الیگزینڈر نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ڈیوڈ اسے اپنے کمرے میں چھوڑ کر واپس کھانے کی میز پر چلا آیا۔

''شکریہ ڈیوڈ! مجھے مہمان کے سامنے شرمندگی اٹھانا پڑتی۔'' رچرڈ ممنون لہجے میں بولا۔

''تم اب تک ہزار بار شکریہ تو بول ہی چکے ہو گے؟ اب جلدی سے مجھے کھانا دو، مجھے بھوک لگ رہی ہے۔'' ڈیوڈ نے ہنستے ہوئے اپنی پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر اگلے ہی لمحے وہ چونک پڑا۔

''کیا ہوا ایلینا! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' اس نے ایلینا کی طرف دیکھا جو پسینے میں شرابور بیٹھی تھی۔ ایلینا نے اس کی بات پر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت تھی۔ اچانک ہی وہ چکرا کر ایک طرف گر پڑی۔ اس کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔

''کیا ہوا ایلینا؟ ایلینا......! ابھی تو بالکل ٹھیک تھی۔'' ایوا اس کی یہ حالت دیکھ کر ڈر گئی اور اس کے ہاتھ پاؤں سہلاتے ہوئے رونا شروع ہو گئی۔

ڈیوڈ نے آگے بڑھ کر جلدی جلدی ایلینا کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کی کوششوں کے بعد ایلینا نے اپنی آنکھیں کھول لیں۔ وہ اپنا سر تھام کر بیٹھ گئی۔

''کیا ہوا ایلینا! کیسا محسوس کر رہی ہو تم؟'' رچرڈ پریشانی سے پوچھنے لگا۔

''پتا نہیں، اچانک مجھے چکر آیا تھا۔ شاید...... شاید کمزوری محسوس کر رہی ہوں۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''لیکن تم تو بالکل ٹھیک ہو چکی تھیں پھر یہ اچانک کیا ہوا؟'' ایلینا کی ماں بہت زیادہ فکرمند ہو گئی۔

''کچھ نہیں ہوا، آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ اس نے سارا دن سفر کیا ہے اور کمزوری کی وجہ سے بے ہوش ہوئی ہے۔ اسے فوراً ہی کچھ کھانے کے لیے دیں اور اس کے بعد اسے آرام کرنے کے لیے [illegible]'' ڈیوڈ نے رچرڈ کو اشارہ کیا تو وہ جلدی سے ایلینا کو سہارا دے کر کھانے کی میز کے ساتھ رکھی اس کی کرسی پر بٹھانے لگا۔

ایلینا کی ماں اپنے ہاتھ سے نوالے بنا کر ایلینا کو کھلانے لگی۔ کچھ دیر بعد اس کی طبیعت دوبارہ بحال ہو گئی۔ کھانے کی میز پر بیٹھے تمام لوگ مطمئن ہو چکے تھے سوائے ڈیوڈ کے۔ اسے شدید گڑبڑ کا احساس ہوا تھا۔

اچانک سے الیگزینڈر کا یہاں آنا، فادر تھامس کی طرف سے اس کے یہاں رکنے کا پیغام اور پھر ایلینا کی طبیعت اچانک خراب ہو جانا...... یقیناً اتنی عام بات نہیں تھی جسے نظرانداز کر دیا جاتا۔ اگر واقعی فادر تھامس کو ایسا محسوس ہوا تھا تو وہ انسٹی ٹیوٹ میں ہی انہیں اس خطرے سے آگاہ

کر سکتے تھے۔

وہ کھانا کھا کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ رچرڈ نے اس کے ساتھ مل کر وہاں ایک اور بستر لگا دیا تھا۔ اس نے باتوں باتوں میں الیگزینڈر سے پوچھ گچھ کرنے کی کوشش کی مگر وہ اپنی تمام توجہ ہاتھ میں پکڑی کتاب پر مرکوز کیے بیٹھا رہا۔ سوالوں کے جواب بھی "ہاں" یا "نہ" میں دیتا رہا۔

ڈیوڈ نے بھی آج سارا دن سفر میں گزارا تھا۔ اسے تھکن کے باعث جلد ہی نیند آ گئی اور ویسے بھی اسے صبح سویرے پھر سے سفر پر نکلنا تھا۔

اچانک اسے نیند میں ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا کندھا ہلایا ہو۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ اسے یہ سمجھنے میں وقت لگا کہ وہ کہاں پر ہے اور پھر اس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ کمرا اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ نہ جانے کتنی دیر سے [illegible] رہا تھا۔ اس نے اپنے بستر کے قریب رکھی میز پر پڑی موم بتی جلائی اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

'وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا تو پھر اس کا کندھا کس نے ہلایا تھا؟' وہ یہ سوچتے ہوئے دوبارہ لیٹنے ہی لگا تھا کہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

جب وہ سویا تھا تو وہ کمرے میں اکیلا نہیں تھا۔ چرچ سے آنے والا وہ لڑکا الیگزینڈر اس کے ساتھ تھا مگر اب وہ کمرے میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور کھڑکی کھول کر باہر جھانکنے لگا۔ باہر اندھیرا پھیلا ہوا تھا، یعنی رات کا وقت ہی تھا۔ صبح ہونے میں دیر تھی۔ آخر وہ لڑکا اتنی رات کو اٹھ کر کہاں جا سکتا تھا؟

ڈیوڈ نے جلدی سے اپنا کوٹ پہنا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ باہر حسبِ معمول سناٹا تھا۔ وہ اس لڑکے کو ڈھونڈتے ہوئے پچھلے صحن کی طرف چلا آیا۔ اس کی توقع کے عین مطابق وہ پچھلے صحن میں ہی موجود تھا۔

مگر یہ کیا؟

وہ تو ایلینا کے کمرے کی کھڑکی کی طرف منہ کیے کھڑا تھا۔ ایلینا کے کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ ڈیوڈ تیز قدموں سے چلتا ہوا اس تک پہنچا۔

"سنو لڑکے! رات کے اس پہر تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" ڈیوڈ سخت لہجے میں بولا۔

الیگزینڈر اس کی آواز سن کر چونک کر پلٹا۔ ڈیوڈ نے ایلینا کے کمرے میں جھانکنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے بستر پر پرسکون نیند سو رہی تھی۔

"میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ فادر تھامس نے مجھے اس گھر کو پاک کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ میں اپنا فرض نبھا رہا ہوں۔" الیگزینڈر کا لہجہ سخت ہو گیا۔ اس آدمی نے اس کا سارا کام بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔

"یہ کیسا فرض ہے جو تم ایلینا کی کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر نبھا رہے ہو؟" ڈیوڈ کو اس کا لہجہ پسند نہیں آیا۔

"محترم ڈیوڈ! شاید آپ یہ بھول رہے ہیں کہ مسئلہ ایلینا کے ساتھ ہی شروع ہوا تھا اور میں تو گھر کے ہر کونے کو پاک کرنے کے ارادے سے پچھلی طرف آیا تھا۔ اس کے کمرے کی کھڑکی پہلے سے کھلی ہوئی تھی لہٰذا میں یہاں کھڑے ہو کر جائزہ لینے لگا۔" الیگزینڈر بولا۔

"ٹھیک ہے، اگر تمہارا فرض پورا ہو گیا ہے تو اندر چلیں؟ بہتر یہی ہوگا کہ تم یہ فرائض دن میں انجام دو۔" ڈیوڈ یہاں سے اسے ساتھ لیے بغیر جانے والا نہیں تھا۔

"جی بالکل، چلیں۔" الیگزینڈر کندھے اچکا کر آگے چلنے لگا۔ اسے غصہ تو بہت آیا مگر یہ وقت تحمل سے کام لینے کا تھا۔

ڈیوڈ بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ اس رات جب تک الیگزینڈر سو نہیں گیا، ڈیوڈ اس کی نگرانی کرنے کے لیے جاگتا رہا۔ اس کی فکر مزید بڑھ گئی تھی۔ صبح وہ یہاں سے روانہ ہونے والا تھا اور نہ جانے اس کے جانے کے بعد یہ لڑکا یہاں کیا مصیبت کھڑی کر دیتا۔ اگر اس لڑکے کے پاس فادر کا وہ خط موجود نہ ہوتا تو شاید وہ اس لڑکے کو ابھی اسی وقت یہاں سے جانے کا کہہ دیتا مگر اب وہ فادر تھامس کی وجہ سے مجبور ہو چکا تھا۔

ڈیوڈ نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے پاس جانے سے پہلے [illegible] انسٹی ٹیوٹ کا چکر ضرور لگائے گا تا کہ فادر تھامس سے الیگزینڈر اور اس خط کے حوالے سے تسلی کر سکے۔

☆☆☆

**Year 1773**

قاہرہ۔ مصر

"و...... وعلیکم السلام بابا......! السلام علیکم! [illegible]" [illegible] نے گھبرا کر زبیر بن دمام کو جواب دیا اور ساتھ ہی ان کے پیچھے کھڑے یونس کو سلام کرنا ضروری سمجھا۔

"کیسی رہی آج کی جماعت؟" زبیر بن دمام اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولے۔

"جی...... جی، بہت اچھی رہی۔" وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

یونس کے سامنے زبیر بن دمام یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے

تھے کہ وہ ان سے چھپ کر کوئی مضمون سیکھنے کے لیے محل سے باہر جا رہی ہے اور شاید یونس کو اس سے فرق بھی نہ پڑتا مگر زبیر بن دمام کو پڑتا تھا۔

"تم کپڑے تبدیل کر کے نیچے آ جاؤ۔ ہم دوپہر کا کھانا ساتھ ہی کھائیں گے۔" وہ یہ کہہ کر واپس پلٹ گئے۔

المیرا افسوس سے سر ہلاتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ نہ جانے بابا اتنی جلدی کیوں واپس آ گئے تھے۔ ابھی ان کے واپس آنے میں کچھ وقت باقی تھا اور تب تک اس کا مضمون بھی مکمل ہو جاتا۔

وہ پریشانی سے صبورہ کے بارے میں سوچنے لگی۔ یقیناً اس کی وجہ سے انہیں بھی بابا کی ناراضگی کا سامنا کرنا پڑتا۔

"کوئی بات نہیں۔ میں کسی نہ کسی طرح بابا کو منا ہی لوں گی۔ یہ بھی شکر ہے کہ یونس ان کے ساتھ آیا ہے اور اس وقت محل میں موجود ہے تو وہ زیادہ دیر ناراض نہیں رہ سکیں گے۔" وہ یہ سوچ کر کپڑے تبدیل کر کے کھانے کے لیے نیچے آ گئی۔

کھانے کی میز لگ چکی تھی۔ کھانے کے دوران ہونے والی گفتگو سے اسے پتا چلا کہ زبیر بن دمام کا دورۂ تجارت جلدی ختم ہو گیا تھا اور اسی دوران یونس بھی تجارت کے سلسلے میں اسی علاقے میں زیرِ قیام تھا لہٰذا ان کے اصرار پر ان کے ساتھ محل چلا آیا تھا۔ اسے تو ویسے بھی المیرا کو دیکھنے کا ایک بہانہ چاہیے تھا۔

کھانے کے بعد زبیر بن دمام نے اسے اپنے کمرے میں بلوایا اور صبورہ کے سامنے سخت ناراضگی ظاہر کی۔ گو کہ اس نے ان کے غصے کو کسی حد تک ٹھنڈا تو کر دیا تھا مگر اب اس کے محل سے باہر جانے پر مکمل پابندی عائد ہو چکی تھی۔ وہ کسی طور اسے مضمون مکمل کرنے کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔

وہ مایوس ہو کر کمرے میں چلی آئی۔ حلیمہ بھی اس کے پیچھے چلی آئی۔ صاف ظاہر تھا کہ اب وہ بھی مدرسے نہیں جا پائے گی۔ المیرا کو اجازت نہیں تھی تو حلیمہ اکیلے کیسے جا سکتی تھی؟

"اب کیا کروں گی حلیمہ؟" وہ کمرے میں بے چینی سے ٹہلتے ہوئے حلیمہ سے مخاطب ہوئی۔

"مجھے تو خود کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔" وہ بھی پریشان تھی۔

"بابا کسی صورت راضی نہیں ہوں گے۔" المیرا روہانسی ہو گئی۔

"آپ انہیں کسی طرح یہ کہہ کر نہیں منا سکتیں کہ اب تو بہت کم دن رہ گئے ہیں۔ مضمون مکمل کیے بغیر اسے بیچ سے چھوڑ دینا کسی طور مناسب نہیں۔" حلیمہ بولی۔ اس کا تو خود دل رونے کا چاہ رہا تھا۔

"یہ بھی ابھی ہی ہونا تھا۔ اب جبکہ......!" المیرا بات مکمل کیے بغیر آنسو بہانے لگی۔

"آپ پریشان نہ ہوں بلکہ ایسا کریں کہ آپ محترم یونس سے بات کریں۔ ان کے ساتھ آپ کو باہر جانے کی اجازت بہ آسانی مل جایا کرتی تھی۔ جب تک وہ یہاں ہیں، ہم ان کے ساتھ باہر جا سکتے ہیں۔" اچانک حلیمہ کے ذہن میں یہ تدبیر آئی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو؟ ہم یونس کے ساتھ مدرسے کیسے جا سکتے ہیں؟ عیاد سے کیسے مل پاؤں گی اس کی موجودگی میں؟" المیرا اپنی انگلیاں مروڑتے ہوئے بولی۔

"مل تو آپ ویسے بھی نہیں پا رہیں نا۔ کم از کم ہمارا مضمون تو مکمل ہو جائے گا۔" حلیمہ کو اس کی منطق سن کر پھر سے غصہ آیا۔ جب المیرا اور عیاد کا کوئی رشتہ ہی نہیں تھا تو وہ کس بنا پر اس سے ملنے کی بات کر رہی تھی۔

"آج ہی تو انہوں نے اظہارِ محبت کیا ہے حلیمہ!" المیرا نے اسے اس راز میں شامل کر ہی لیا کیونکہ اب وہی تھی جسے وہ اپنے دل کا حال کہہ سناتی۔

حلیمہ کو اپنا وجود زلزلے کی زد میں محسوس ہوا۔

"کیا مطلب...... کیسا اظہار؟" اسے اپنی آواز کنوئیں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میرے جذبات یکطرفہ نہیں ہو سکتے۔ عیاد نے بھی مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کر دیا ہے۔ ان کے دل میں بھی میرے لیے وہی جذبات پنپ رہے ہیں۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔ تم میری حالت نہیں سمجھ سکتیں۔ مجھے اندازہ بھی نہیں ہے کہ کب سے ان کی محبت اس دل میں پروان چڑھنا شروع ہوئی تھی۔ آج مجھے بہت بڑی خوشی ملی ہے۔ میں بابا کی ضد کی بھینٹ اس خوشی کو قربان نہیں ہونے دوں گی۔ حلیمہ کچھ کرو۔" حلیمہ کے بازو تھام کر رونے لگی۔

حلیمہ کے آنسو بھی رواں ہو گئے مگر یہ آنسو اس کا دل ٹوٹنے پر بہے تھے۔ المیرا کو لگا کہ شاید وہ اس کے غم میں شریک ہو چکی ہے۔ حلیمہ نے اس کے بعد ایک لفظ نہیں کہا اور کچھ دیر بعد وہ اس کے کمرے سے اٹھ کر محل کے اس حصے میں چلی آئی جہاں ملازمین کے لیے کمرے مختص تھے۔ وہ اپنے کمرے میں بند ہو کر کافی دیر تک روتی رہی۔ ایک

ملازمہ نے آکر اسے صبورہ کا پیغام دیا۔ وہ اسے رات کے کھانے کے سلسلے میں مدد کے لیے بلوا رہی تھیں۔ وہ اپنا حلیہ درست کر کے محل کے باورچی خانے میں چلی آئی۔

''المیرا دوپہر سے اپنے کمرے میں بند ہے۔ اسے احساس ہونا چاہیے کہ یونس بھی محل میں موجود ہے۔ اس کی ضد کے آگے ہار مان کر میں نے اسے مکتب جانے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کی ضد پوری ہو چکی ہے، اب اس طرح خود کو کمرے میں بند کر لینے سے اگر اسے یہ لگتا ہے کہ اس کے بابا مان جائیں گے تو یہ اس کی بھول ہے۔ تم اسے سمجھاؤ کہ اس کی ضد اب پوری ہو چکی ہے لہٰذا اس طرح کا برتاؤ کرنے سے وہ اپنے بابا اور یونس کے سامنے اپنا مقام کھو دے گی۔ اس کی وجہ سے مجھے بھی سخت سننے کو ملی ہیں۔''

صبورہ نے حلیمہ کو دیکھے بغیر اسے مخاطب کیا اور وہ بغیر کچھ کہے میکانکی انداز میں چیزیں ادھر سے ادھر رکھ رہی تھی۔

''میں تم سے کہہ رہی ہوں کہ جا کر اسے سمجھاؤ۔'' وہ اس کا جواب نہ پا کر اس کی طرف پلٹیں مگر اس کی سوجی آنکھیں دیکھ کر ٹھٹک کر رک گئیں۔

''کیا ہوا تمہیں...... تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' وہ فکرمندی سے اس کی طرف بڑھیں۔ اس کا جسم بخار سے تپ رہا تھا۔

''حلیمہ! تمہیں تو بہت تیز بخار ہو رہا ہے۔ تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔ جاؤ تم آرام کرو، میں کسی اور کو مدد کے لیے بلوا لیتی ہوں۔'' وہ پریشانی سے بولیں۔

''میں ٹھیک ہوں خانم!'' وہ اتنا کہہ کر دوبارہ کام میں مصروف ہو گئی۔

''تم بالکل ٹھیک نہیں ہو۔ تم جاؤ آرام کرو۔ میں تمہارے لیے دوا بھجوا دیتی ہوں۔'' انہوں نے اس کے ہاتھ سے سبزیوں کی ٹوکری لے کر ایک طرف رکھی اور اس کے ساتھ کھڑی دوسری ملازمہ کو اشارہ کیا۔

''اسے اس کے کمرے میں چھوڑ کر آؤ اور کسی ملازم سے کہو جا کر طبیب سے حلیمہ کے لیے دوا لے آئے...... اور سلمیٰ کو یہاں بھیج دو۔'' وہ سنجیدگی سے بولیں تو ملازمہ ان کی ہدایت سن کر حلیمہ کو تھام کر وہاں سے باہر نکل گئی۔

ان کے جانے کے بعد صبورہ نے وہاں کھڑے باقی ملازمین کو کھانا تیار کرنے کی ہدایات دیں اور خود ہی المیرا کے کمرے کی طرف چل دیں۔ وہ اس کے کمرے کے باہر کھڑی ہو کر کافی دیر تک دستک دیتی رہیں مگر اس نے دروازہ نہیں کھولا۔

''نہ جانے یہ لڑکی اب مجھے مزید کتنی باتیں سنوائے گی۔'' وہ مایوس ہو کر خود ہی نیچے چلی آئیں۔

المیرا کی یہ کمرا بند کرنے اور بھوک ہڑتال کرنے والی ضد زبیر بن دمام کے آگے نہیں چلنے والی تھی۔ وہ ماں تھیں، اس کی حالت دیکھ کر ان کا دل پسیج گیا مگر اس کے بابا کسی صورت بھی مکتب جانے والی بات پر راضی نہ ہوتے۔ بس اب وہ یہی دعا کر رہی تھیں کہ المیرا رات کے کھانے پر خود ہی چلی آئے اور انہیں یونس کے سامنے شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔ وہ دو تین دفعہ اپنے کمرے سے نکل کر باہر کا چکر لگا چکا تھا اور شاید المیرا کو ہی تلاش کر رہا تھا۔

رات کا کھانا لگوانے سے پہلے وہ خود حلیمہ کی خیریت معلوم کرنے گئیں۔ وہ دوا کے زیرِ اثر سو رہی تھی لہٰذا انہوں نے اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ ان کی سب سے پرانی اور قریبی ملازمہ تھی اور انہیں المیرا کی طرح ہی عزیز تھی۔

کھانا لگا تو انہوں نے ملازمہ کو المیرا کو بلانے کے لیے بھیجا۔ شکر تھا کہ وہ کھانے کے لیے آ گئی مگر خاموش بیٹھی رہی۔ اس کے اس رویے کو یونس بھی محسوس کر رہا تھا۔ صبورہ کا دل تو چاہ رہا تھا کہ وہ المیرا کو سخت سنائیں مگر وہ یونس کی موجودگی میں ایسا کر کے المیرا کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

کھانے کے بعد وہ دوبارہ اپنے کمرے میں جانے لگی تو صبورہ نے فوراً ہی اسے آواز لگائی۔

''المیرا! یونس آئے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دیر ان کے ساتھ بیٹھو بلکہ آپ لوگ باغ میں چلیں، میں قہوہ وہیں بھجوا دیتی ہوں۔'' وہ المیرا کو جتاتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

وہ ان کی طرف دیکھ کر نہ چاہتے ہوئے بھی یونس کے ساتھ باغ میں چلی آئی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے ان کی بات نہ مانی تو شاید مکتب دوبارہ جانے کی رہی سہی امید بھی دم توڑ جائے گی۔

''کیا بات ہے المیرا! آپ ناراض ہیں مجھ سے؟''

وہ اس کے ساتھ باغ میں ٹہل تو رہی تھی مگر مسلسل خاموش تھی۔ بالآخر اس نے خود ہی بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

''جی...... نہیں...... نہیں تو...... بس میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''لیکن یہ وہ المیرا تو نہیں جس سے میں آخری دفعہ ملا تھا۔ آپ کے پاس تو بات کرنے کے لیے ہزاروں موضوع ہوا کرتے تھے۔'' کچھ تو تھا جو مخفی تھا اور یونس کو وہی پتا لگانا تھا۔

المیرا کا ضبط جواب دے گیا اور وہ یونس کے اس طرح ہمدردی کرنے پر اچانک ہی آنسو بہانے لگی۔ یونس

گھبرا گیا۔
"المیرا! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟ آپ روئیں مت، مجھے بتائیں۔ میں آپ کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کروں گا۔" وہ پریشانی سے بولا۔
"میرا مسئلہ کوئی حل نہیں کرسکتا۔" اس کے آنسو بہانے میں مزید تیزی آ گئی۔
"آپ ایک بار مجھے بتا کر تو دیکھیں اور رونا بند کیجیے۔" وہ اسے یقین دلاتے ہوئے بولا۔
"میں مکتب جانا چاہتی ہوں۔" وہ یہ کہہ کر پھر سے رونا شروع ہو گئی۔
"مکتب جانا چاہتی ہیں تو جائیں۔ کون روک رہا ہے آپ کو مکتب جانے سے اور اس میں رونے والی کیا بات ہے؟" اسے المیرا کا مسئلہ سمجھ نہیں آیا۔
"والد محترم منع کرتے ہیں اکیلے آنے جانے سے..... بلکہ محل سے باہر جانے ہی نہیں دیتے۔ جسے بھی مجھ سے ملنا ہو یا مجھے تعلیم دینی ہو، ہمیشہ سے خود ہی محل آتا رہا ہے۔ اب جبکہ وہ مجھے رخصت کرنے کی تیاری کر رہے ہیں تو میں یہ گنتی کے کچھ دن اپنی مرضی سے گزارنا چاہتی تھی۔ میں نے والدہ سے ضد کر کے یہاں کے ایک مکتب میں علم الاعداد کی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی تھی۔ مضمون مکمل ہونے میں چند ہی ہفتے رہ گئے تھے تو وہ واپس لوٹ آئے اور مجھے سختی سے باہر نکلنے سے منع کر دیا ہے۔" اس نے آنسوؤں کے درمیان ہی اپنی بات مکمل کی۔
"یہ تو کوئی ایسا مسئلہ نہیں۔ اچھا آپ اداس نہ ہوں، میں اجازت طلب کروں گا ان سے۔ وہ مان جائیں گے۔"
یونس حیران تھا کہ اتنی سی بات پر وہ اتنا کیوں رو رہی تھی اور آخر زبیر بن دمام اسے اجازت کیوں نہیں دیتے تھے۔
"کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" وہ سنجیدگی سے بولی مگر اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔
"ہوگا، بالکل ہوگا۔ میں آپ سے کہہ رہا ہوں نا کہ میں بات کروں گا ان سے۔ وہ آپ کو اجازت بھی دیں گے اور آپ اپنا مضمون مکمل بھی کریں گی۔" یونس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اسے یقین دلایا۔
"ٹھیک ہے، آپ بھی کوشش کر کے دیکھ لیجیے۔ مجھے امید نہیں ہے کہ وہ مانیں گے۔" اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔
وہ یونس کے ساتھ چہل قدمی کرنے کے بعد اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ یونس نے اس سے وعدہ تو کر لیا تھا مگر المیرا کو یقین تھا کہ زبیر بن دمام اسے بھی انکار کر دیں گے۔ اس نے ملازمہ سے کہہ کر حلیمہ کو بلوا بھیجا۔ نہ جانے وہ دوپہر سے کہاں غائب ہوگئی تھی۔ ملازمہ نے اسے بتایا کہ حلیمہ کی طبیعت شدید خراب ہے تو وہ اس کا حال معلوم کرنے اس کے کمرے میں چلی آئی مگر وہ سو رہی تھی۔
اب کیا کرتی اور کس سے دل کا حال کہتی؟ دن کی شروعات جس قدر خوبصورت تھی، رات ہونے تک وہی دن بوجھل اور اداس ترین ہو چکا تھا۔ وہ تو عیاد کے اظہار کی خوشی کو بھرپور طریقے سے محسوس بھی نہیں کر پائی تھی۔ یہاں تک کہ یونس کا آنا بھی اس کے لیے کسی خاص خوشی کا باعث نہیں بنا تھا۔ اسے احساس ہو چکا تھا کہ یونس اور اس کا رشتہ دوستی سے زیادہ کچھ نہیں ہوسکتا۔ وہ آج بھی اس سے اچھے دوستوں کی طرح ہی بات کر رہا تھا اور اس کے دل سے بس عیاد کے نام کی پکار جاری تھی۔
دوسری صبح ناشتے کی میز پر وہ بجھے دل کے ساتھ بیٹھی رہی۔ یونس نے اب تک زبیر بن دمام سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ شاید وہ رات گزرنے کا انتظار کر رہا تھا۔ حلیمہ کی طبیعت بھی اب تک بہتر نہیں ہوئی تھی۔ وہ ناشتے کے بعد ایک بار پھر سے اس کی طبیعت پوچھنے اس کے کمرے میں چلی آئی۔ حلیمہ جاگ چکی تھی اور ایک خالی اٹیچی کھول کر اس میں کپڑے رکھ رہی تھی۔
"حلیمہ! کیسی طبیعت ہے اب تمہاری؟ والدہ نے مجھے بتایا کہ تمہیں تیز بخار ہو گیا تھا اور یہ سب کیا کر رہی ہو؟" وہ اس کی طبیعت پوچھتے ہوئے حیرانی سے بولی۔
"میں ملازمت چھوڑ کر جا رہی ہوں۔" اس نے المیرا کے پہلے سوال کا جواب دینے کے بجائے سنجیدگی سے اپنی بات مکمل کی تو المیرا کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔
"ملازمت چھوڑ کر جا رہی ہو..... کیا مطلب..... کیا ہو گیا ہے حلیمہ! کہاں جاؤ گی تم اور یہ اچانک ایسا فیصلہ کیوں لے لیا تم نے؟ تم کہیں نہیں جا رہی ہو۔" المیرا نے آگے بڑھ کر اس کی اٹیچی بند کی۔ اس کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ اتنے بڑے محل میں حلیمہ ہی تو اس کی واحد سہیلی تھی، اور وہ اسے چھوڑ کر جا رہی تھی اس مشکل وقت میں۔
"میں نے اتنے عرصے میں جو کچھ جمع کیا ہے اس سے قاہرہ میں کوئی چھوٹا سا مکان لے کر سلائی کر کے گزارہ کرلوں گی۔" اس نے اپنی اٹیچی دوبارہ کھولی اور باقی بچے کپڑے اس میں رکھ کر اٹیچی کو تالا لگا دیا۔
"حلیمہ! کیا بات ہے، تمہیں میری کوئی بات بری لگی ہے کیا؟ نہ میں اور نہ والدہ تمہیں یہاں سے کہیں جانے دیں

گے۔ یہاں کوئی پریشانی ہے تو مجھے بتاؤ، میں اس کا حل نکال لوں گی۔'' المیرا اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

حلیمہ کا رویہ اس کے لیے پریشان کن تھا۔

''خانم سے میں بات کرلوں گی اور میں جب چاہوں اپنی مرضی سے ملازمت چھوڑ کر جاسکتی ہوں۔ ملازمہ ہوں، غلام نہیں ہوں۔'' حلیمہ کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی کڑواہٹ گھل گئی۔

''میرا وہ مطلب نہیں تھا حلیمہ! ہم نے تمہیں کبھی ملازمہ نہیں سمجھا۔ تم میرے لیے میری بہنوں کی طرح ہو اور والدہ نے ہمیشہ تمہارا اتنا ہی خیال رکھا ہے جتنا وہ میرا رکھتی ہیں۔ تم اکیلی ہو، اس طرح قاہرہ جیسے شہر میں اکیلے رہنا تمہارے لیے ٹھیک نہیں ہے اور میں...... میں کیسے رہوں گی تمہارے بغیر؟'' المیرا کو حلیمہ کی باتیں سن کر دکھ پہنچا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔

کل سے سب کچھ غلط ہی کیوں ہو رہا تھا؟

''میں اس ملازمت سے تنگ آچکی ہوں۔ آپ کے ساتھ مجھے بھی باہر نکلنے کی اجازت نہیں ملتی۔ جب میں ملازمت چھوڑوں گی تو اپنی مرضی سے آجا تو سکوں گی۔ مجھ سے یہ قیدیوں والی زندگی نہیں گزاری جاتی اور میں آپ سے بھی درخواست کروں گی کہ آپ مجھے یا اپنی والدہ کو اس بات کے لیے مجبور نہیں کیجیے گا کہ مجھے یہاں رکنا پڑے۔ یہ محل نہیں، قید خانہ ہے۔'' حلیمہ رکھائی سے کہہ کر اپنے کمرے سے باہر نکل گئی۔

المیرا وہیں کھڑی رہی۔ یہ حلیمہ وہ حلیمہ نہیں تھی جسے وہ برسوں سے جانتی تھی۔ اس کا لہجہ، اس کی چال، اس کی نظریں سب کچھ بدل چکا تھا...... اور وہ سچ ہی تو کہہ رہی تھی۔ المیرا ابھی تو محل میں قیدیوں جیسی زندگی ہی گزار رہی تھی۔ حلیمہ کیوں اس کے ساتھ بلاوجہ سزا بھگتتی۔

المیرا بجھے دل اور تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ واپس محل میں لوٹ آئی۔

صبورہ کے کمرے سے حلیمہ کی آوازیں آرہی تھیں۔ شاید وہ انہیں بھی یہ خبر سنا چکی تھی۔ المیرا میں اتنی ہمت نہیں بچی تھی کہ وہ حلیمہ کو جاتے ہوئے دیکھتی لہٰذا وہ اپنے کمرے میں آکر دوبارہ سے بند ہوگئی۔ اسے پوری امید تھی کہ حلیمہ جانے سے پہلے اس سے ملنے ضرور آئے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ ملازمہ نے اسے خبر دی کہ وہ دوپہر کے کھانے سے پہلے ہی محل چھوڑ کر جاچکی تھی۔ صبورہ اور زبیر بن دمام نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی تھی مگر وہ رکنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوئی

اور نہ ہی المیرا اسے آخری ملاقات کے لیے آئی۔

المیرا کو شدید غم نے گھیر لیا۔ وہ نہ تو دوپہر کے کھانے پر اور نہ ہی رات کے کھانے پر اپنے کمرے سے باہر نکلی۔

یونس کو بھی حلیمہ کے جانے کی خبر مل چکی تھی۔ وہ خود حیران تھا کہ جس محل سے وہ کچھ عرصہ پہلے ہوکر گیا تھا وہاں اب پہلے جیسا کچھ نہیں رہا تھا۔ المیرا کے قہقہے بھی کہیں گم ہوچکے تھے اور سارے محل پر عجیب سی اداسی طاری تھی۔

اس نے خود ہی زبیر بن دمام سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ ان کے کمرے میں چلا آیا اور انہیں المیرا کو مکتب جانے کی اجازت دینے کے لیے منانے لگا۔

''یونس! قاہرہ میرے مخالفین سے بھرا پڑا ہے۔ یہ سب میں المیرا کی حفاظت کے لیے ہی کررہا ہوں۔ اسے کوئی مضمون سیکھنا ہے تو وہ محل میں ہی اس کی تعلیم حاصل کرسکتی ہے مگر میں اسے اس طرح اکیلے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ خاص طور پر اب جبکہ حلیمہ بھی یہاں سے جاچکی ہے۔'' وہ پریشانی سے بولے۔

''اگر یہ مسئلہ ہے تو جب تک میں یہاں ہوں، میں اس کے ساتھ مکتب چلا جاؤں گا۔ اپنی نگرانی میں اسے لے کر جاؤں گا اور اپنی نگرانی میں واپس لے آؤں گا۔'' یونس نے آخری حربہ آزمانے کا فیصلہ کیا۔

''مگر تم یہاں صرف ایک ہفتے کے مہمان ہو۔ تمہارے جانے کے بعد وہ زیادہ ضد کرے گی۔ بہتر یہی ہے کہ وہ اپنے دل کو ابھی ہی تسلی دے لے۔ جو کام ایک ہفتے بعد ہونا ہے، وہ ابھی ہوجائے۔'' وہ کسی طور راضی نہیں ہورہے تھے۔

''یونس ٹھیک کہہ رہا ہے۔ جب تک یونس یہاں ہیں، تب تک کے لیے ہی اجازت دے دیجیے۔ حلیمہ بھی محل چھوڑ کر جاچکی ہے اور اس کے جانے سے المیرا نے کافی اثر لیا ہے۔ اس نے آج سارا دن کچھ نہیں کھایا ہے اور دوپہر سے اپنے کمرے میں بند ہے۔ اس طرح تو وہ بیمار پڑ جائے گی۔ اس ایک ہفتے میں وہ تھوڑا بہت سنبھل جائے گی پھر ہم اسے پیار سے سمجھا دیں گے۔'' صبورہ نے بھی بولنے کا فیصلہ کیا۔

ایک طرف زبیر بن دمام اور دوسری طرف المیرا...... دونوں ہی اپنی ضد کے پکے تھے۔ ... ہمیشہ وہی پستی آئی تھیں۔ بالآخر زبیر بن دمام نے ہتھیار ڈال دیے۔

''ٹھیک ہے...... مگر یہ اجازت تب تک ہے جب تک یونس یہاں پر ہے۔ یونس وعدے کے مطابق ان کے

ساتھ جائے گا اور ساتھ ہی واپس آئے گا۔ یونس کے جانے کے بعد یہ مکتب جانے کا سلسلہ بند ہو جانا چاہیے۔'' انہوں نے اجازت دے ہی دی۔ یونس اور صبورہ نے شکر ادا کیا۔ ایک ہفتہ ہی سہی، المیرا کو خوش ہونے کا موقع تو ملتا۔ صبورہ خوشی سے المیرا کو مطلع کرنے چل دیں۔

☆☆☆

عیاد اگلے دن بے صبری سے المیرا کا انتظار کرتا رہا تھا مگر وہ نہیں آئی۔ 'تو کیا وہ اس کے اظہار سے مطمئن نہیں ہوئی تھی یا ابھی تک ناراض تھی؟' اس کا دماغ انہی سوچوں میں الجھا رہا۔

''مگر اس کی دمکتی آنکھیں تو کچھ اور ہی کہتی تھیں۔'' وہ خود کو تسلی دے رہا تھا۔

اس کی حالت پر نیل اور یوسف بھی محظوظ ہوتے رہے۔ ایک دن کی غیر حاضری نے عیاد کا یہ حال کر دیا تھا۔ ابھی تو صرف شروعات تھیں۔

''اگر تم کہتے ہو تو میں معلوم کر کے آتا ہوں۔'' نیل نے عیاد سے المیرا کے محل جانے کی اجازت طلب کی مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔

''میں نے کہا نا، میری اجازت کے بغیر تم ایسا نہیں کرو گے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے کوئی ضروری کام ہو۔ میں کل تک انتظار کروں گا۔'' وہ سنجیدگی سے کہہ کر اپنے کام میں معروف ہو گیا مگر درحقیقت اس کا دل کسی بھی کام میں نہیں لگا۔ اس نے جیسے تیسے تمام مضامین کی جماعتیں مکمل کیں اور مکتب بند کر کے اپنے گھر واپس چلا آیا۔

اس کا سارا دھیان المیرا کی طرف ہی لگا ہوا تھا۔ اگلی صبح وہ یوسف سے پہلے ہی مکتب پہنچ چکا تھا اور بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

''کیوں پریشان ہوتے ہو عیاد! آج وہ ضرور آئے گی۔'' یوسف نے اسے بے چینی سے ٹہلتے دیکھ کر تسلی دی تو وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

جماعت کا وقت شروع ہونے والا تھا اور تمام طالب علم ایک ایک کر کے مکتب میں داخل ہو رہے تھے مگر اس کا کچھ اتا پتا نہ تھا۔

''تو کیا وہ آج بھی نہیں آنے والی تھی؟'' عیاد نے پریشان ہو کر خود سے سوال کیا۔ اسی لمحے المیرا کی بگھی مکتب کے سامنے رکی۔

''دیکھو، میں نے کہا تھا نا کہ وہ ضرور آئے گی۔'' یوسف مسکرایا۔

عیاد نے اپنی حالت پر قابو پایا اور سنجیدگی سے کھڑا ہو گیا۔

المیرا اندر داخل ہوئی مگر اس کے ساتھ داخل ہونے والے نوجوان کو دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ وہ تو ہمیشہ اپنی سہیلی کے ساتھ آیا کرتی تھی تو پھر آج اس کے ساتھ اندر داخل ہونے والا یہ نوجوان کون تھا؟ یوسف نے بھی حیرت سے اس نوجوان کی طرف دیکھا جو المیرا کے ساتھ جماعت کے اندر داخل ہو رہا تھا۔

''رکو...... تم کون ہو اور اندر کیوں جا رہے ہو؟'' یوسف سخت لہجے میں بولا۔ یونس حیرانی سے پلٹا۔

''تم مجھ سے پوچھ رہے ہو؟'' یونس نے حیرانی سے اپنی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں، تم سے پوچھ رہا ہوں۔ تم نے اس مضمون کا معاوضہ ادا نہیں کیا، تم اس جماعت میں نہیں بیٹھ سکتے۔ ہم سے اجازت طلب کیے بغیر تم کہاں جا رہے ہو؟'' یوسف نے بارعب لہجے میں کہا تو اس کے اس طرح بات کرنے پر یونس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے عیاد کی طرف دیکھا جو سنجیدگی سے کھڑا اسے گھور رہا تھا۔

''میں آپ کی جماعت کی طالبہ کا پہرے دار ہوں۔ ان کے والد نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میں ان کے ساتھ ساتھ ہی رہوں۔'' یونس شرارت سے بولا۔

''مگر المیرا کے ساتھ تو اس کی سہیلی آیا کرتی تھی تو پھر اچانک پہرے دار کو بھیجنے کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟'' تمام سوالات یوسف ہی کر رہا تھا۔

عیاد خاموشی سے اس کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

''ان کی سہیلی جا چکی ہیں اور انہیں اکیلے محل سے نکلنے کی اجازت نہیں ہے لہٰذا میں ان کے ساتھ ہی رہوں گا۔'' یونس نے سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، تو پھر باہر بیٹھ کر انتظار کرو تم جماعت میں نہیں جا سکتے۔'' یوسف اپنی ذمے داری نبھانا جانتا تھا۔ یونس نے اس بچے کے اس طرح بات کرنے پر حیرت سے عیاد کی طرف دیکھا۔

''یوسف ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ مکتب میرا ہے اور یوسف یہاں کا منتظم ہے۔ یہاں کے قاعدے قانون سب کے لیے یکساں ہیں۔ آپ بے شک ان کے ساتھ رہیں لیکن آپ کو باہر بیٹھ کر انتظار کرنا ہوگا۔'' عیاد نے یوسف کی بات کی تائید کی۔

''ٹھیک ہے، تو میں باہر بگھی میں انتظار کرتا ہوں۔

یونس کندھے اُچکا کر بولا اور باہر نکل گیا۔

''یہ کہاں سے چلا آیا...... اب پہرے دار کی موجودگی میں تم المیرا سے کیسے بات کرو گے عیاد؟'' یوسف پریشانی سے بولا۔

''بات تو میں اس کی سہیلی کی موجودگی میں بھی نہیں کر پاتا تھا۔ خیر، یہ جماعت میں اس کے ساتھ نہیں بلکہ باہر بیٹھ کر انتظار کرے گا۔'' عیاد یہ کہہ کر جماعت میں داخل ہوگیا۔ اس نے اندر داخل ہوکر بے اختیار ہی المیرا پر نظر ڈالی۔

اس کی آنکھوں میں بہت کچھ تھا۔ شاید اسے دیکھنے کی [illegible]شی، محبت کا اعتبار ملنے کا زعم اور پریشانی بھی۔ اس کی آنکھوں [illegible] سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شاید روتی رہی ہے۔ [illegible] اس کی آنکھوں سے ملے جلے جذبات کا اندازہ لگایا۔

''کیا یو[illegible] ہے...... کیا عیاد کو پتا چل چکا ہے کہ یونس کون [illegible] وہ [illegible] کے اس سوال کا جواب کیسے دے گی اور کیسے اس کا [illegible]منا کر[illegible]گی؟ وہ تو اپنی محبت کا اقرار کر کے گئی تھی۔'' اور اب [illegible] کے ساتھ اس طرح مکتب آنا اور پھر یوسف کا اسے باہر ہی [illegible] لینا [illegible] دل دہلا گیا۔ وہ مضمون تو کیا ہی سمجھتی، اس کے سر پر [illegible] ار ہو چکی تھی۔

عیاد حسبِ معمول پوری توجہ سے مضمون سمجھانے [illegible] مگن ہو چکا تھا۔ وہ جماعت ختم ہونے تک سولی پر لٹکی رہی۔ جماعت برخاست ہوئی تو عیاد سب کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔

''المیرا......!'' سب کے جانے کے بعد عیاد نے اسے پکارا۔ وہ جو باقی طالب علموں کے ساتھ اٹھ کر کھڑی ہو چکی تھی اور باہر نکلنے کا انتظار کر رہی تھی، اس کی آواز سن کر تھم گئی۔

''آپ کل کیوں نہیں آئی تھیں؟'' وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

''مم...... میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور میری سہیلی بھی جا چکی ہے۔ مجھے اکیلے نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔'' اس نے ہمت جمع کر کے عیاد کو جواب دیا۔

''کیا آپ کو میری باتیں بری لگی ہیں؟'' عیاد کو اس کا محتاط رویہ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ کہاں تو وہ برملا اس سے اظہار کر کے گئی تھی اور آج اس کا یہ ڈر اور جھجک اس کی سمجھ سے باہر تھی۔

''جی نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' المیرا نے محتاط لہجے میں کہا۔

''آپ کے پہرے دار نے بتایا کہ اب وہ آپ کے ساتھ مکتب آیا کریں گے۔'' عیاد بولا۔ وہ حیرانی سے عیاد کو دیکھنے لگی۔

''جی، پہرے دار......؟'' اسے عیاد کی بات سمجھ نہیں آئی۔

''جی، آپ کے ساتھ جو نوجوان اندر داخل ہوا تھا اس نے بتایا کہ وہ آپ کا پہرے دار ہے اور آپ کو اکیلے محل سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے اس لیے وہ آپ کے ساتھ آیا کرے گا۔'' عیاد کو اس کے اس طرح سوال کرنے پر مزید حیرت ہوئی۔

المیرا کو اپنے اندر اطمینان اترتا محسوس ہوا۔ یعنی یونس نے خود کو اس کا پہرے دار ظاہر کیا تھا۔ مگر کیوں؟ خیر، جو بھی تھا، اس کے لیے تو یہی بہتر تھا۔ وہ ان سوچوں میں گم ہوکر ان لمحوں کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''کیا ہوا، آپ خاموش کیوں ہوگئیں؟ کیا آپ کو میری باتیں بری لگی ہیں؟'' عیاد نے اپنا سوال پھر سے دہرایا۔

''ایسا نہیں ہے۔ مجھے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آرہا تھا۔ کیا محبت اتنی آسانی سے مل جایا کرتی ہے؟'' وہ بے اختیار ہوکر اس سے سوال کر بیٹھی۔

''اتنی آسانی سے کہاں ملی ہے؟ عیاد تو ملکوں کی خاک چھانتا یہاں تک پہنچا تھا۔ کتابوں میں، ستاروں میں، [illegible]روں میں تمہیں تلاشا ہے عیاد نے اور تم یہاں نیل کنارے [illegible] اہراموں کے اسرار کی طرح غامض تھیں۔ اسی لیے تو [illegible] سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔ ان نگاہوں کو تو عیاد کے دل کے سب سے گہرے خانے میں چھپا دینا چاہیے۔'' و[illegible] آنکھوں کے سحر میں مبتلا ہوکر بولتا ہی چلا گیا۔

وہ اس کے کتنے قریب [illegible] اور [illegible] احساس کہ وہ اس کا عشق، اس کا جنون بن چکی تھی [illegible] اس لفظوں کے جادوگر سے اظہار کے بے انتہا حسین در وا کرتا چلا جا رہا تھا۔ وہ اپنے وجود کو اس کے لفظوں کی بارش سے سیراب [illegible]۔ اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ بولتا چلا جائے اور وہ اسی طرح کھڑی سنتی رہے۔

''عیاد! آپ کو پتا ہے کہ میں کل آپ سے مل نہیں سکی تو کیا ہوا تھا؟ میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھا تو قاہرہ بے رنگ ہو چکا تھا۔ آسمان، نیل کا رنگ کھینچ چکا تھا۔ ساری آوازیں گڈمڈ ہو چکی تھیں۔ اس قدر ویرانی تھی کہ مجھے وحشت ہونے لگی تھی۔ مجھے ایسا کبھی محسوس نہیں

ہوا۔ تو کیا دنیا کے یہ رنگ آپ کی ذات سے ملحق ہیں؟ اس کی یہ خوبصورتی آپ کے کلام سے اجاگر ہوتی ہے؟ مجھے آپ کے بغیر رہنا پڑا تو شاید میں اگلی سانس نہیں لے پاؤں گی۔'' المیرا نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر اپنا رومال اس کے سامنے کیا۔

''ایسا کبھی نہیں ہوگا المیرا! عیاد ایسا ہونے نہیں دے گا۔'' عیاد نے اس کا رومال تھام کر پُریقین لہجے میں اسے تسلی دی۔

وہ اس کے رومال تھامتے ہی کمرے سے باہر چلی گئی۔ عیاد نے اس کے رومال کی خوشبو کو اپنی سانسوں میں اتارا اور اسے تہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

وہ جا چکی تھی مگر اپنا وجود، اپنی خوشبو وہیں چھوڑ گئی تھی۔ عیاد کو یہ ادراک ہوا کہ وہ رہ تو کبھی نہیں پائے گا اب المیرا کے بغیر۔ جو محبت اسے کسی کا چہرہ دیکھے بغیر یہاں تک لے آئی تھی، وہ اس خوبصورت انداز کے ساتھ چلتی سانس کے ساتھ اس کے دل میں اپنی جڑیں مضبوط کر رہی تھی۔ اس کے دل میں بے اختیار ہی المیرا کے ساتھ اس کا ہاتھ تھام کر نیل کنارے بیٹھ کر بہت ساری باتیں کرنے کی خواہش جاگی۔ ایک سرور تھا جو اس پر طاری ہو رہا تھا۔ یونس اور نیل اس کی حالت دیکھ کر اسے شرارت سے تنگ کرتے رہے مگر وہ ان کی باتوں پر محض مسکراتا ہی رہا۔

حالت تو المیرا کی بھی ویسی ہی تھی۔ حلیمہ کے جانے کا جو غم اس کے دل پر سوار ہوا تھا، وہ مکتب سے نکل کر بگھی میں بیٹھنے تک زائل ہو چکا تھا۔ عیاد کے لفظوں کی بازگشت اس کے کانوں میں گونجتی رہی۔ اس کے وجود سے نکلنے والی روشنی نے جیسے مرہم کا کام کیا تھا۔

وہ یونس کی باتوں پر ہنس رہی تھی، اسے جواب دے رہی تھی۔ مکتب میں داخل ہونے والی المیرا سے لے کر مکتب سے باہر نکلنے والی المیرا میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

یونس کے لیے تو یہ ہی بہت تھا کہ المیرا کی طبیعت پر چھائی اداسی دور ہو چکی تھی۔ اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ زبیر بن دمام کو اس بات پر راضی کر لے گا کہ اس کے جانے کے بعد بھی المیرا کو مکتب جانے کی اجازت دی جائے۔ اگر المیرا کی خوشی مکتب جانے میں تھی تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔ وہ صرف مضمون ہی تو مکمل کرنا چاہتی تھی۔ اس چھوٹی سی خوشی نے اسے اس کی المیرا واپس لوٹا دی تھی۔ وہی ہنسنے بولنے والی المیرا!

رات کھانے کی میز پر اس کے قہقہے گونج رہے تھے۔ وہ خوش تھی اور اسے دیکھ کر یونس بھی خوش تھا۔

☆☆☆

حلیمہ محل سے رخصت لینے کے بعد اپنی والدہ کی ایک پرانی جاننے والی آپا ماں کے گھر چلی آئی جنہیں اس کی والدہ اپنی بہنوں کی طرح عزیز رکھتی تھیں۔ وہ بھی حلیمہ کی محل کی ملازمت چھوڑنے والی بات پر بہت حیران ہوئیں مگر حلیمہ کو مجبور نہیں کر سکتی تھیں۔ انہوں نے حلیمہ کی مرحومہ ماں سے اس کا خیال رکھنے کا وعدہ کیا تھا۔

ان کا گھر چھوٹا تھا اور ایک کمرا کرائے پر چڑھا ہوا تھا۔ جوان بیٹا اور بہو بھی اسی گھر میں مقیم تھے لہٰذا حلیمہ نے مناسب مکان کی تلاش شروع کر دی۔ اس کے پاس اچھی خاصی جمع پونجی موجود تھی۔ کوئی تھا ہی نہیں جو اس کی تنخواہ خرچ کرتا لہٰذا وہ اسے جمع کرتی آئی تھی۔ جب تک اسے مکان نہ مل جاتا، وہ آپا کے اصرار پر ان کے گھر ہی رک گئی تھی۔ اس نے گھر کے مختلف کاموں میں آپا کی بہو کی مدد بھی شروع کر دی تھی۔ آپا ماں کی بہو بھی اس کی آمد سے خوش تھی۔ اسے گھر کے کام کاج میں ایک مددگار مل گیا تھا۔

اگلا دن اس نے آرام کر کے گزارا مگر اسے اس بات کی خوشی تھی کہ اب وہ آزادی کے ساتھ کہیں بھی آ جا سکتی تھی۔ محل کے عیش و آرام سے زیادہ اسے یہ آزادی خوشی دے رہی تھی۔

المیرا کو تو اب مکتب جانے کی اجازت نہیں ملنے والی تھی مگر وہ مضمون مکمل کرنے کے بعد مزید مضامین میں داخلہ لے کر عیاد کے قریب ہونے کی کوشش کر سکتی تھی۔ جب المیرا کے یونس کے گھر رشتے کی خبر عیاد کو ملتی تو وہ خود ہی المیرا کو بھول جاتا۔

اگلے دن وہ صبح سویرے تیار ہو کر مکتب کی طرف چل پڑی مگر وہاں پہنچتے ہی اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ محل کی بگھی مکتب کے بالکل سامنے کھڑی تھی۔

''یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ المیرا کو تو کہیں بھی اکیلے آنے جانے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ اسے تو صبورہ بیگم اکیلے جانے نہیں دیتی تھیں اور اب زبیر بن دمام کی موجودگی میں وہ کیسے اکیلے مکتب آ سکتی تھی؟''

وہ بگھی کے قریب چلی آئی اور اندر جھانکنے لگی۔ اسے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ بگھی میں یونس بیٹھا ہوا تھا جو اسے اندر جھانکتے دیکھ کر چونک گیا۔

''حلیمہ! تم حلیمہ ہی ہو نا؟ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

وہ بگھی سے نیچے اتر آیا۔

’’جی...... میں مکتب آئی ہوں۔‘‘ وہ اٹکتے ہوئے بولی۔

’’مکتب آئی ہو تو پھر تم نے محل کی ملازمت کیوں چھوڑی؟ مکتب تو تم المیرا کے ساتھ بھی آسکتی تھیں۔ تمہیں پتا ہے تمہارے جانے کی وجہ سے وہ کتنی اداس ہے۔‘‘ یونس اس سے باز پرس کرنے لگا۔

’’مجھے جدھر بھی جانے کی اجازت ملتی تھی، المیرا کے ساتھ ہی ملتی تھی اور انہیں تو محل سے اجازت ہی نہیں مل رہی تھی کہ وہ مکتب آئیں تو پھر اب کیسے ملی؟‘‘ وہ الٹا اسی سے سوال کرنے لگی۔

وہ حلیمہ کے انداز پر حیران رہ گیا۔ کہاں تو وہ مؤدبانہ لہجہ تھا اور کہاں اب اس کے لہجے کا وہ اعتماد۔ اسے لمحوں میں اندازہ [illegible] حلیمہ وہ ملازمہ نہیں رہی ہے اور نہ ہی خود کو اب ملازمہ سمجھتی ہے۔

’’اسے یہ [illegible] کی وجہ سے ملی ہے، اسی لیے میں ساتھ آیا ہوں۔‘‘ وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔

’’کیا مکتب کے [illegible] کو پتا ہے کہ آپ المیرا کے ساتھ ہیں؟‘‘ نہ جانے وہ اس سے یہ سوال کیوں کر رہی تھی۔ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

’’بالکل معلوم ہے۔ انہیں پتا ہے کہ میں باہر بگھی میں اس کا انتظار کر رہا ہوں۔‘‘ وہ یہ کہہ کر دوبارہ بگھی کے اندر داخل ہوگیا۔

حلیمہ کے فضول سے سوالوں کا جواب دینے کا وقت اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ اسے ایک احسان فراموش ملازمہ لگی تھی اور وہ ایسے لوگوں کو قطعی اہمیت نہیں دینا چاہتا تھا جو کسی کا بھی احسان لمحے بھر میں فراموش کر دیتے ہوں۔ المیرا اور صبورہ اس کے جانے کے بعد کافی اداس رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ ان دونوں کا رویہ اپنے تمام ملازمین کے ساتھ مشفقانہ ہے مگر حلیمہ کے لہجے سے تو یہ لگ رہا تھا جیسے وہ ان کے محل میں ملازمت کر کے ان پر کوئی احسان کرتی رہی ہو۔

حلیمہ خاموشی سے مکتب کے اندر داخل ہوگئی۔ جماعت شروع ہو چکی تھی۔ یوسف نے اس سے معمولی سی باز پرس کر کے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ وہ جماعت کے اندر داخل ہوئی تو المیرا اسے دیکھ کر واضح طور پر چونکی مگر وہ جان بوجھ کر اس سے کچھ دور ہٹ کر بیٹھ گئی۔ عیاد نے بھی اسے دیکھ لیا تھا مگر اس پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔

حلیمہ کو المیرا کی وہاں موجودگی بری طرح کھل رہی تھی۔ وہ اس وقت اس کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

جماعت ختم ہوئی تو وہ اٹھ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ المیرا نے اسے آواز دینے کی کوشش کی مگر وہ نہیں رکی۔ اس کا رویہ المیرا کے لیے بھی حیران کن تھا۔ آخر حلیمہ ایسا کیوں کر رہی تھی؟ ٹھیک ہے کہ وہ محل کی پابندیوں سے تنگ آ چکی تھی مگر محل سے باہر تو اس کی دوست رہ سکتی تھی۔ تو کیا وہ سالوں کا گہرا رشتہ بھلا چکی تھی؟

حلیمہ باہر نکلی اور گلی کے کونے میں رک کر مکتب سے نکلنے والوں پر غور کرنے لگی۔ جماعت ختم ہو چکی تھی مگر المیرا اب تک اندر ہی تھی۔ اس کا مطلب تو یہی تھا کہ عیاد، المیرا سے اسی دوران بات چیت کرتا ہے۔

اسے یونس پر حیرت ہو رہی تھی جو بگھی میں بیٹھا المیرا کا انتظار کر رہا تھا۔ آخر وہ اتنا بے وقوف کیسے ہو سکتا تھا؟ اسے اندازہ کیوں نہیں ہو رہا تھا کہ سب کے نکلنے کے باوجود بھی المیرا اتنی دیر تک اندر کیوں ہے؟ اس کے دل میں نفرت کے ابال اٹھنا شروع ہوئے۔

عیاد اور المیرا ایک دوسرے کے مزید قریب آ رہے تھے اور وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر پا رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ المیرا کی محبت عیاد کے دل میں اپنی جڑیں مضبوط کرتی، اسے اس محبت کو ختم کرنے کا کوئی حل نکالنا تھا۔

وہ چلتے چلتے اچانک رکی۔ حل تو اس کے بالکل سامنے تھا۔

یونس...... اگر وہ یونس کو بتا دیتی کہ المیرا اور عیاد کے بیچ میں کیا چل رہا ہے تو وہ یقیناً زبیر بن دمام کی طرح اس کے مکتب [illegible] جانے پر پابندی عائد کروا دیتا اور جلد از جلد اس سے نکاح کر لیتا۔ اس طرح تو حلیمہ کا راستہ بالکل ہی صاف ہو جاتا۔

وہ تیزی سے پلٹ کر بگھی کی طرف جانے لگی مگر اسی لمحے المیرا مکتب سے باہر نکل کر بگھی میں سوار ہوگئی اور بگھی محل کی طرف روانہ ہوگئی۔ وہ وہیں رک گئی۔

’’کوئی بات نہیں المیرا! تمہاری قسمت اچھی ہے مگر آج نہیں تو کل یونس کو ضرور پتا چلے گا اور پھر تمہاری زندگی جہنم بننے میں دیر نہیں لگے گی۔‘‘ حلیمہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کل کا سورج المیرا کے لیے قیامت ساتھ لے کر آنے والا تھا۔

خوف میں لپٹی پوشیدہ رازوں کی کڑیاں ملانے والے ایک رمز شناس کی سنسنی خیز داستان کے باقی واقعات آئندہ ماہ

کبھی کبھی حالات انسان کو اتنا مجبور کردیتے ہیں کہ کوئی راہ، کوئی امید کی کرن نظر نہیں آتی... وہ بھی ایسی ہی صورت حال کا شکار تھے... چاروں طرف پانی تھا اور وہ وہاں پھنسے ہوئے تھے... اس پر مزید انہیں ایک اور مشکل نے گھیر لیا جس کا کوئی حل نظر نہیں آرہا تھا... بس انہیں وقت گزرنے کا انتظار کرنا تھا۔

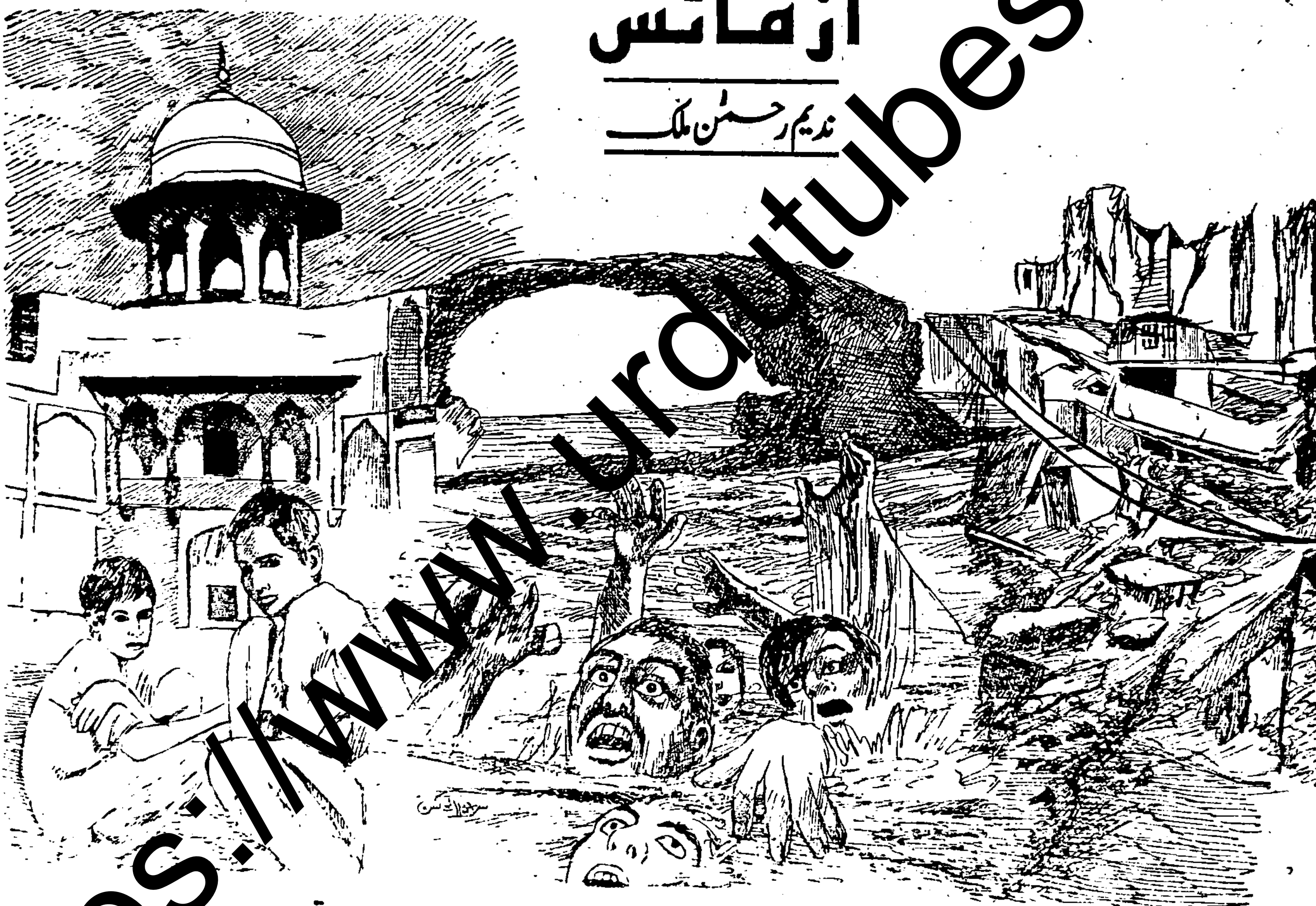
---

سیلابی پانی میں گھرے خاندان کی بے بسی

---

# آزمائش

ندیم رحمٰن ملک





سیلاب کا آج تیسرا اور بارش کا دوسرا دن تھا، جو وقفے وقفے سے برس رہی تھی۔ اطمینان بخش بات یہ تھی کہ محمد بخش کا پورا گھرانا اور اس کا خاندان سیلابی علاقے سے نقل مکانی کر کے بستی سے دور ایک دریائی بند پر خیمہ زن ہو چکا تھا۔ خیمہ بھی کیا تھا گھر کے پرانے ٹاٹ، پرانی چادریں اور پھٹی پرانی ترپالوں پر مشتمل تھا۔ جو گزشتہ سیلاب میں اس خاندان کو کسی نے امداد کے طور پر دی تھیں۔ شہر سے بہت دور بستی کوٹلہ کے مکین مزدور پیشہ دہاڑی دار تھے۔ اچانک سیلابی پانی اس بستی پر چڑھ دوڑا تھا۔ ان غریبوں کو کسی نے نہ بتایا کہ پورا پنجاب پانی پانی ہونے جارہا ہے اور یہ سیلاب موت بن کے ان پر ٹوٹنے والا ہے۔ وہ تو بالکل بے خبر تھے کہ بھلا ہو ان کے پالتو کتوں اور آوارہ کوؤں کا، جنہوں نے

اچانک بھونک بھونک کے اور کوؤں نے کائیں کائیں کر کے اسے متوجہ کیا۔ بستی کے ایک دو جوان ہانپتے کانپتے خبر لائے کہ جھل ان تک پہنچنے والی ہے۔ وقت بالکل نہیں ہے جو بھاگ کے دوآبہ والا بند تک پہنچ گیا وہی جی پائے گا۔ بستی میں ایک ہلچل مچ گئی، بچوں اور خواتین نے رونا پیٹنا شروع کر دیا، بزرگوں نے فوراً جانوروں کی رسیاں کھول دیں، کچھ اپنے اِکادُکا جانور کو ساتھ ہانکتے جارہے تھے کہ راستے میں ہی انہیں سیلابی پانی نے آگھیرا، یوں مجبوراً اور نمناک آنکھوں سے انہوں نے اپنے جانوروں کی رسیاں چھوڑ دیں اور اب دریائی بند پر خیمہ زن تھے۔

ان ... خوراک کے نام پر مسلسل میٹھے پھیکے چاول دیے جارہے تھے جسے کھا کھا کے اب ان کی طبیعت میں اک بیزاری سی پیدا ہو ... لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ کب پانی اترے گا اور وہ کب اپنے گھروں کو لوٹ پائیں گے؟

ان کی "بستی کوٹلہ" ... پر سیلابی پانی میں ڈوب چکی تھی۔

کھیت کھلیان، جہاں کبھی سبز لہلہاتی فصلیں ہوا سے کھیلتی تھیں، اب پانی کے تیز بہاؤ میں انسانی ... خاموش ماتم کناں تھیں۔ دوآبہ بند کے ان عارضی خیموں پر اک خوف اور بے بسی کے سائے چھائے ہوئے تھے۔

بارش کی راتوں میں جب ہوا کے جھونکے چھت کے ٹاٹ ہلا دیتے تو محمد بخش کے تین معصوم بچے ماں سے لپٹ جاتے اور ماں انہیں اپنی آغوش میں جکڑ لیتی تھی۔

کالی گھٹائیں آسمان پر چھائی تھیں، بجلی چمک رہی تھی اور اونچے بند کے اردگرد پانی کی لہریں شور مچا رہی تھیں۔ خیمے کے اندر مٹی کے فرش پر لالٹین کی مدھم روشنی ٹمٹما رہی تھی۔

محمد بخش کی بیوی تاجو سوچ رہی تھی کہ یہ سیلاب...... کچے کے علاقوں کے غریبوں کے مقدر میں کیوں لکھ دیے گئے ہیں؟

ہر سال دو سال بعد انہیں ہجرت کا دکھ سہنا پڑتا ہے۔ کیا یہ ہجرت کا دکھ مرتے دم تک انہیں سہنا پڑے گا؟ کیا وہ شہر میں جا بسیں جہاں سیلاب نہیں آتا، جہاں پینے کو صاف پانی اور کھانے کو روٹی مل جاتی ہے اور شہری لوگ تو ہجرت کے دکھ سے بھی آشنا نہیں ہوتے۔

یہ سب سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی، محمد بخش اپنی بیوی کے کرب زدہ چہرے پر اطمینان دیکھ کے مسکرا دیا۔

وہ جانتا تھا کہ تاجو کی رفاقت اور حوصلے سے وہ اس بڑی آزمائش سے نکل آئے گا۔ پہلے بھی تو یہ سیلابی افتاد ان پر ٹوٹتی رہی ہیں۔ اور یہ تاجو ہی تھی جو محمد بخش کو کمزور نہیں ہونے دیتی، اس کے کاندھے سے کاندھا ملا کے پانی کے اس طوفان سے لڑتی۔ وہ گہرا سانس لے کے اُمید کا دامن تھامے ایک بار پھر مسکرا دیا۔ اور لالٹین کی لو آہستہ کر کے خود بھی فرش پر بچھے ایک گندے سے کھیس پر سو گیا۔

اسی اثنا میں بارش اور سیلابی پانی کے شور میں اچانک ایک کرب میں ڈوبی چیخ گونجی۔ "او میرے اللہ!"

محمد بخش ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا، کپکپاتے ہاتھوں سے لالٹین جلائی اور فوراً تاجو کی طرف بڑھا، جو اپنے پاؤں پر ہاتھ رکھے شدید درد اور کرب سے حواس باختہ ہوتی جارہی تھی۔

لالٹین کی روشنی قریب ہونے پر اچانک محمد بخش کو وہ موذی نظر آگیا جو اپنا وار کر چکا تھا، ایک بڑا سیاہ بچھو وہاں سے اچانک نکل کے قریب پڑی چاول کی اس آدھی بوری میں گھس گیا جو آج دن میں کسی ریلیف ادارہ نے انہیں دی تھی۔

تاجو کی حالت خراب ہونے لگی۔ اس کی آنکھوں سے خوف اور بدن لرز رہا تھا۔ بچے ڈر کے مارے رو پڑے۔ محمد بخش نے جلدی سے چادر کا ٹکڑا باندھ کر زہر روکنے کی کوشش کی، لیکن درد اور تکلیف سے تاجو کا سانس اکھڑنے لگا، قریبی خیموں سے لوگ بھاگے آئے، صورتِ حال دیکھ کے ایک عورت بولی اسے فوراً ہلدی ملا دودھ پلاؤ، دوسری کہنے لگی یہاں بھلا ہلدی کو ... بیٹھا ہے اسے آک کے دودھ کے دو چار قطرے پلا دو، ان ... ایک بزرگ حاجی کریم نے کہا۔

"یہ خدا کی طرف سے آزمائش ہے، دعا کرو، زہر پھیلنے سے پہلے تاجو بی بی کے گناہ دھل جائیں۔"

دوسرے نے کہا۔ "یہ سیلاب کا غضب ہے، ... والے توبہ کریں۔ بچھو خدا کا یہی پیغام لایا ہے۔"

ایک عورت نے قرآن کی تلاوت شروع کر دی، ایک دو قریبی رشتے داروں نے دم درود پڑھنا شروع کر دیا۔ کوئی آگ جلا کر دھواں دینے لگا کہ بچھو کا اثر کم ہو جائے۔ بچے اپنی ماں کو تڑپتے دیکھ کر سہمی ہوئی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

محمد بخش نے یہ سب دیکھا اور جھنجلا کر بولا۔ "بھائیو،

یہ سب فضول ہے! کہیں سے دوائی لانی ہوگی، زہر کا علاج کرنا ہوگا۔''

تاجو کا درد بڑھتا جارہا تھا۔ وہ بستر پر لیٹ گئی اُسے سانس لینے میں مشکل ہونے لگی۔ اس کے ہونٹوں سے کراہیں نکل رہی تھیں۔ بچے اب رونے کے ساتھ ساتھ چیخنے لگے۔ ''اماں! تجھے کیا ہوگیا ہے، تو کیوں رو رہی ہے؟''

تاجو ان کی طرف دیکھ کر ہلکے سے مسکرا دیتی۔ جیسے سارا درد سہہ کر بھی وہ اپنے بچوں کو تسلی دینا چاہتی ہو۔

ایک موقع پر اس نے اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑا اور ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں کہا۔ ''اگر مجھے کچھ ہوجائے تو بچوں کو لے کر شہر جابسنا۔''

خاندان والے ایک دوسرے سے بحث کر رہے تھے۔ کوئی کہتا۔ ''نمک اور پیاز باندھ دو۔'' کوئی کہتا۔ ''دعا کرو صبح تک اثر خود ہی ختم ہوجائے گا۔''

ایک جوان امجد جو شہر میں مزدوری کرتا تھا اور کچھ پڑھا لکھا بھی تھا، بولا۔ ''میں نے سنا ہے کہ چیرا اور انجکشن سے آرام آسکتا ہے، مگر یہاں کہاں سے لائیں؟''

محمد بخش نے اُمید بھری نظروں سے امجد کو دیکھا اور بولا۔ ''کچھ بھی کر، شہر تک پہنچنے کا راستہ ڈھونڈ!''

امجد چپ ہوگیا اور سر جھکا دیا، بارش وطوفان میں کوئی نکلنے کی ہمت نہ کرسکا۔ ادھر زندگی آہستہ آہستہ روٹھنے پر آمادہ نظر آرہی تھی۔

کئی گھنٹوں تک تاجو تڑپتی رہی۔ کبھی دیہاتی اُسے پانی پلاتے، کبھی اس کے پاؤں کو رسی سے کس کر باندھ دیتے۔ مگر درد اپنی جگہ قائم رہا۔ کبھی وہ بے ہوش ہوجاتی، کبھی دوبارہ جی اٹھتی۔

کالی رات میں باہر بارش تھم چکی تھی۔ بارش کے پانیوں میں قید اک آنسو کی رہائی صاف نظر آنے لگی۔

آخر کار رات ڈھلنے پر اس کا درد اچانک کچھ کم ہوا۔ سانس کچھ بحال ہوئی اور بدن ڈھیلا پڑ گیا۔ سب نے سکون کا سانس لیا۔

صبح صادق کے وقت تاجو نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے ہونٹ خشک تھے مگر چہرے پر اطمینان تھا۔ وہ آہستہ سے بولی۔ ''خدا کا شکر ہے بچھو نے مجھے ڈنک مارا، میرے بچوں کو نہیں۔''

++

# کینہ کش

ملک صفدر حیات

کہتے ہیں کہ جرم کرنے والا اپنے پیچھے کوئی نہ کوئی نشان چھوڑ جاتا ہے... مگر یہاں چوری کی ایک بڑی واردات کا کوئی سرا ہاتھ نہیں لگ رہا تھا... ملک صاحب نے اپنے تفتیشی عمل اور شک کی گاڑی کو ہر جگہ دوڑا دیا تھا... مگر چور کا تاحال پتا نہیں چل رہا تھا... پھر ایک سراغ ملا جس نے پرانے تانے بانے ملا دیے۔

گاؤں کے کرتا دھرتا کے ہاں چوری کی واردات کا معما

سرما عروج پر تھا۔ اس سال سردی نے سابق تمام ریکارڈز توڑ ڈالے تھے۔ وہ جنوری کی ایک یخ بستہ اور ٹھنڈی ٹھار صبح تھی۔ میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو میرے دانت باقاعدہ بج رہے تھے۔ میری رہائش تھانے کے احاطے ہی میں عقبی جانب بنے ہوئے سرکاری کوارٹر میں تھی۔ اس چالیس پچاس گز کی چہل قدمی نے گویا میری قلفی جما کر رکھ دی تھی۔

میں اپنے کمرے میں آ کر بیٹھا تو کانسٹیبل منظور حسین نے اطلاع دی۔ ''ملک صاحب! چودھری صاحب نے اپنا بندہ بھیجا ہے۔''

جب میں اپنے کمرے کی طرف آ رہا تھا تو میں نے برآمدے میں ایک شخص کو کمبل لپیٹے چوبی بنچ پر بیٹھا دیکھا۔ کانسٹیبل یقیناً اسی آدمی کی بات کر رہا تھا۔

''اتنی صبح چودھری کو ہماری ضرورت کیوں پیش آ گئی؟'' میں نے پوچھا۔

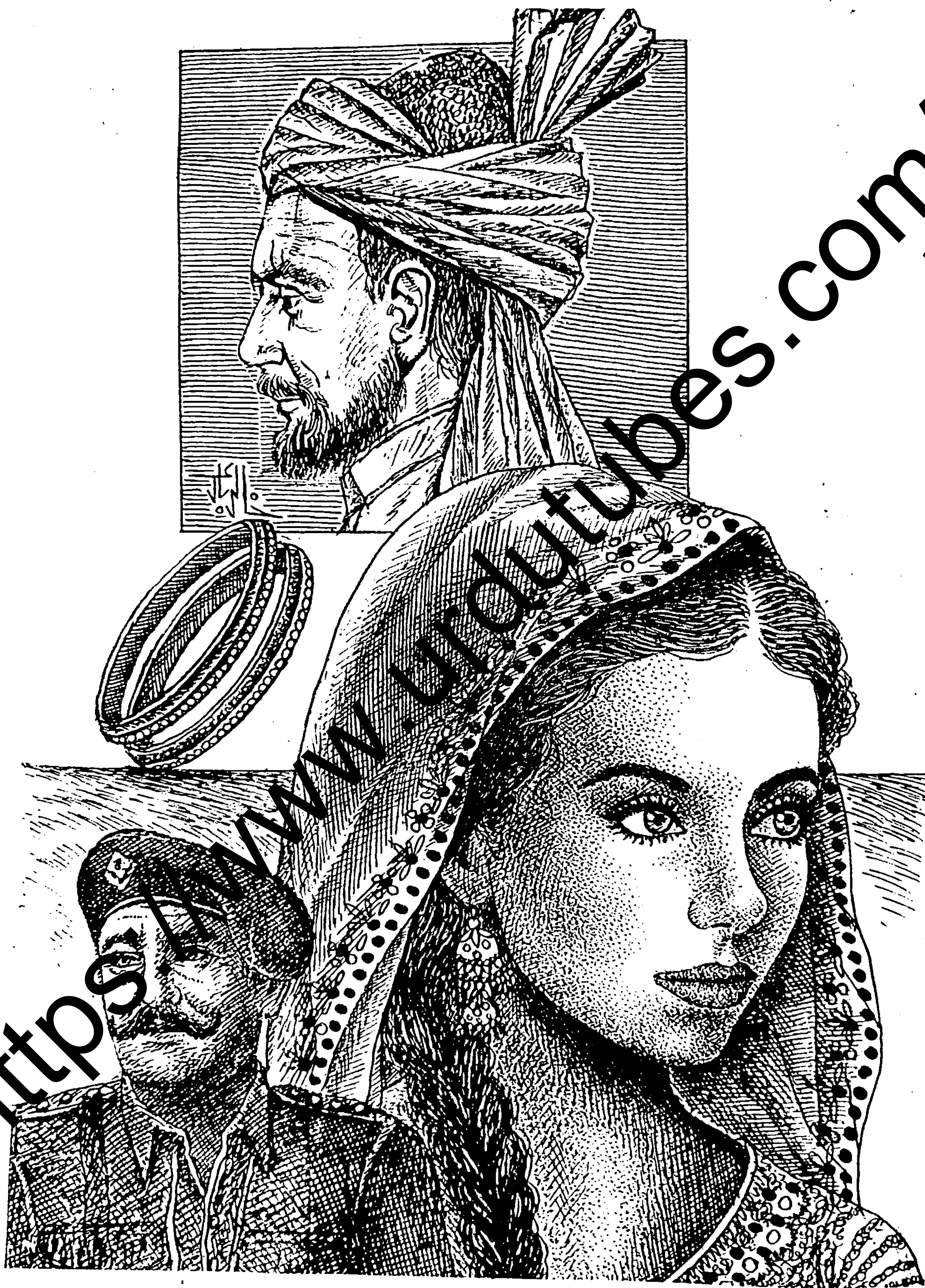
چودھری کا معاملہ ہے ملک صاحب!''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اسے بھیج دو۔''

ان دنوں میری تعیناتی ٹوبہ ٹیک سنگھ کے ایک دور دراز تھانے میں تھی۔ تھانے کے سب سے زیادہ نزدیک گاؤں کا نام تھا ''چک چون۔ گ ب'' جسے عام مقامی زبان میں ''چک چرونجا'' کہا جاتا تھا۔ چودھری فیاض احمد اس گاؤں کا فرماں روا تھا۔ چودھری فیاض سے میں متعدد بار مل چکا تھا۔ وہ ایک معقول انسان تھا۔ روایتی چودھریوں کے مانند اس کی گردن کے اندر غرور اور تکبر کا سریا فٹ نہیں تھا۔

کمبل پوش نے چہرے کے سامنے بکل کو ڈھیلا کیا اور مجھے سلام کرنے کے بعد کہا۔ ''تھانیدار جی! میں چودھری صاحب کا بندہ ہوں۔ انہوں نے آپ کو حویلی میں بلایا ہے۔''

''میں تو سمجھ رہا تھا تم اللہ کے بندے ہو مگر تم تو خود کو چودھری فیاض کا بندہ سمجھتے ہو۔'' میں نے اس کے چہرے پر



نگاہ جما کر طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''خیر، تمہارا نام کیا ہے؟''

''غلام نبی!'' اس نے جواب دیا۔

''نبی علیہ السلام کا غلام ہونا تو بڑی سعادت اور فخر کی بات ہے لیکن تم نے چودھری کا بندہ بن کر اپنی قدر و منزلت کو راکھ کر دیا ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا اور پوچھا۔ ''بتاؤ، چودھری مجھے کیوں بلا رہا ہے؟''

''حویلی کے اندر سے چودھرائن جی کے سونے کے کنگن چوری ہو گئے ہیں۔'' غلام نبی نے بتایا۔ ''اسی سلسلے میں چودھری صاحب نے آپ کو بلایا ہے تاکہ آپ وہ قیمتی کنگن ڈھونڈ کر دے سکیں۔ چودھری صاحب کی چھوٹی بیٹی کی شادی کی تیاریاں عروج پر ہیں، اوپر سے یہ واقعہ ہو گیا ہے۔ چودھری صاحب بہت زیادہ پریشان ہیں تھانیدار صاحب!''

''ٹھیک ہے، تم واپس جاؤ۔'' میں نے غلام نبی کی بپتا بہ الفاظِ دیگر چودھری فیاض احمد کی کیفیت کا احوال سننے کے بعد کہا۔ ''چودھری صاحب سے کہہ دو کہ میں تھوڑی دیر میں آ رہا ہوں۔''

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

یہ بات میرے علم میں تھی کہ چودھری فیاض کی چھوٹی بیٹی ستارہ عرف تارو کی شادی ہونے والی تھی۔ اس سلسلے میں پچھلے کئی روز سے حویلی میں گہما گہمی چل رہی تھی۔ دور دراز کے علاقوں میں رہنے والے عزیزوں اور رشتے داروں کی آمد بھی شروع ہو چکی تھی۔ یہ سب تو معمول کے عین مطابق تھا لیکن کنگن کی چوری والی بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ چودھرائن نے اپنے کنگن ایسے ہی کہیں رکھ چھوڑے ہوں، جس کی نگاہ پڑی، وہ اٹھا لے گیا۔ چودھری فیاض جیسے طاقتور اور بااثر انسان کی حویلی میں چوری ایک ناممکن اور ناقابلِ یقین بات ہی لگتی تھی۔

بہرکیف، میں نے کانسٹیبل علی بخش کو اپنے ساتھ لیا اور جائے وقوعہ کا جائزہ لینے کے لیے چودھری فیاض کی حویلی پہنچ گیا۔ چودھری نے باہر آ کر گیٹ پر میرا استقبال کیا اور مجھے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔

حویلی میں اچھی خاصی رونق نظر آ رہی تھی۔ ایسا ہونا بھی چاہیے تھا کیونکہ وہ شادی والا گھر تھا۔ ہم ایک الگ تھلگ کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ چودھری کی درخواست پر کانسٹیبل کو میں نے باہر برآمدے میں چھوڑ دیا تھا۔ چودھری مجھ سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد چودھری نے اپنے ملازم کو کمرے میں بلا لیا اور تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''فضل دین! ملک صاحب کی خاطر مدارات کا بندوبست کرو۔''

''جی چودھری صاحب!'' فضل دین فرمانبرداری سے گردن ہلاتے ہوئے بڑے ادب سے بولا۔

''چودھری صاحب! اس تکلف کی بالکل ضرورت نہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''میں نے تھوڑی دیر پہلے ہی ناشتا کیا ہے۔''

''اس میں تکلف کہاں سے آ گیا ملک صاحب؟'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ میری حویلی پر آئے ہیں۔ آپ کی خاطر خدمت کرنا مجھ پر لازم ہے۔ آج کل ویسے بھی غضب کی ٹھنڈ پڑ رہی ہے۔ کھانا بہت جلد ہضم ہو جاتا ہے۔ آپ نے صبح جو ناشتا کیا تھا، اسے بھول جائیں۔''

میرے مسلسل انکار کے باوجود بھی چودھری نے اپنے ملازم کو تعمیلِ ارشاد کا اشارہ کر دیا۔ اس کے بعد بحث و تکرار یا لفظی مزاحمت کفرانِ نعمت کے زمرے میں شمار ہوتا۔ سو، میں نے خاموشی اختیار کر لی۔

چودھری فیاض احمد نے مختصر مگر جامع الفاظ میں مجھے بتایا کہ چوری ہونے والی طلائی کنگن کی جوڑی تاریخی حیثیت کی حامل تھی۔ وہ دونوں جڑاؤ قیمتی کنگن اس خاندان میں نسل در نسل چلتے آ رہے تھے۔ رواج کے مطابق مذکورہ کنگن اس حویلی کی پہلی بہو کو چڑھائے جاتے تھے یعنی حویلی کے موجودہ چودھری کے پہلوٹھی کے بیٹے کی بیوی کو۔ چودھری فیاض احمد اپنے باپ چودھری ریاض احمد کی پہلی اولاد تھا لہٰذا وہ کنگن اس کی بیوی زلیخا کو شادی کے موقع پر پہنا دیے گئے تھے۔ آگے ان کنگنوں کو اصولاً چودھری فیاض اور چودھرائن زلیخا کی سب سے بڑی بہو کی کلائیوں تک پہنچنا تھا مگر یہاں ایک بہت بڑا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔

چودھری فیاض احمد کی پانچ اولادیں تھیں، تین بیٹے اور دو بیٹیاں۔ سب سے بڑے بیٹے نعیم احمد کا انتقال چھ ماہ کی عمر میں ہو گیا تھا۔ اس سے چھوٹا بیٹا مشتاق احمد بھری جوانی میں چل بسا تھا۔ موت کے وقت مشتاق کی عمر اٹھارہ سال تھی اور وہ کنوارہ ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ مشتاق کے بعد مہر النساء عرف مہرو کا نمبر تھا جس کی مناسب وقت پر شادی ہو گئی تھی۔ اس کے دو بچے تھے۔ مہرو کا ان دنوں اپنے شوہر اعجاز حسین سے جھگڑا چل رہا تھا۔ وہ پچھلے چند ماہ سے روٹھ کر میکے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس وقت مہر النساء کی عمر لگ بھگ تیس سال تھی۔

مہر النساء سے تین سال چھوٹا چودھری فیاض احمد کا

تیسرا بیٹا اشفاق احمد تھا۔ اپنی اولاد کے حوالے سے چودھری فیاض نے ایک سے بڑھ کر ایک صدمہ اٹھایا تھا اور ان میں سب سے بڑا دکھ اشفاق کی طرف سے ملا تھا۔ اشفاق کو تعلیم حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا۔ جب اس نے ابتدائی تعلیم لے لی تو باپ نے اعلیٰ تعلیم کے لیے اسے ولایت (انگلستان) بھیج دیا۔ یہ فیاض احمد کی غلطی تھی یا اس ذیل میں اس کی قسمت ہی خراب تھی کہ اشفاق نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہیں پر ایک گوری (میم) سے شادی کرلی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے واپس آنے کا خیال بھی دل سے نکال دیا تھا۔

تین بیٹوں کا باپ چودھری فیاض احمد سردست اولاد نرینہ سے "محروم" تھا۔ اس کے بڑے دونوں بیٹے اللہ کو پیارے ہو چکے تھے اور تیسرا مغرب کی آزاد فضا میں "لاپتا" ہو کر رہ گیا تھا۔

مغرب سے ہی یاد آیا۔ وہاں پہنچ کر تو سورج بھی غروب ہو جاتا ہے، کسی انسان کا ڈوب جانا کون سی بڑی بات ہے۔

بات چیت کے دوران میں چودھری کے ملازم خاص رمضان عرف رجو نے بھاری بھرکم ناشتا لا کر میرے سامنے چن دیا۔ رجو، چودھری کی خدمت ... دیسی گھی کے لچھے دار کرسپی پراٹھے، انڈوں کا آملیٹ، تازہ مکھن، گاجر کا پستے بادام والا حلوا اور بھاپ اڑاتی ہوئی ملائی والی دودھ پتی۔ وہ ناشتا معیار اور مقدار، دونوں لحاظ سے خاصا "تگڑا" تھا اور کم از کم پانچ افراد خوب سیر ہو کر اس سے پیٹ پوجا کر سکتے تھے۔

"چودھری صاحب! کیا اشفاق، ستارہ کی شادی میں بھی نہیں آرہا؟" میں نے رسمی انداز میں ناشتے کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔

چودھری نے نفی میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

"ستارہ اس کی چھوٹی بہن ہے اور یہ اس حویلی کی آخری شادی بھی ہے۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "اشفاق کو اس شادی میں ضرور شرکت کرنا چاہیے تھی۔"

"ملک صاحب! اس دنیا میں ہونا تو بہت کچھ چاہیے مگر سب کچھ انسان کی مرضی کے مطابق ہوتا نہیں ہے۔" وہ ایک افسردہ سانس خارج کرتے ہوئے بوجھل لہجے میں بولا۔ "اللہ نے مجھے تین بیٹے دیے تھے۔ دو کو اس نے اپنے پاس واپس بلا لیا اور تیسرا......!" اس کی آواز بھرا گئی اور وہ خاموش ہو گیا۔

اس وقت حویلی میں ستارہ کی شادی کی ابتدائی تقریبات چل رہی تھیں لیکن چوری والے اس واقعے نے وہاں کے مکینوں کو پریشان کر دیا تھا۔ چودھری فیاض کی حالت سب سے زیادہ خستہ تھی۔ علاوہ ازیں بیٹوں کے ذکر نے اسے کچھ زیادہ ہی ملول کر دیا تھا لہٰذا میں اصل موضوع کی طرف آگیا۔

"چودھری صاحب! آپ نے جس بندے کو تھانے بھیجا تھا، اس نے مجھے بتایا ہے کہ گزشتہ رات اس حویلی سے طلائی جڑاؤ کنگنوں کی جوڑی غائب ہو گئی ہے؟" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر سوال کیا۔ "کیا ان دو کنگنوں کے علاوہ بھی کوئی قیمتی شے چوری ہوئی ہے؟"

"جی ہاں۔" اس نے جواب دیا۔ "کنگن کی اس جوڑی کے ساتھ ہی سونے کے لگ بھگ دس تولے وزن کے مختلف زیورات بھی رکھے ہوئے تھے اور کم و بیش دو ہزار روپے کے کرنسی نوٹ بھی......سب کچھ چلا گیا۔"

"یہ طلائی زیورات اور نقدی کہاں رکھی ہوئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"ایک محفوظ اور مضبوط تجوری میں۔"

"اور تجوری......؟"

"تجوری میری بیوی چودھرائن زلیخا کے کمرے میں رکھی ہوئی ہے۔" اس نے بتایا۔ "یہ کوئی چھوٹی موٹی چوری نہیں ہے ملک صاحب! مال و دولت تو آنی جانی چیزیں ہیں۔ میں نقدی اور سونے کے دیگر زیورات کی بات نہیں کر رہا۔ مجھے سب سے زیادہ دکھ اس خاندانی کنگن کی جوڑی کا ہے جناب!" وہ لمحے بھر کے لیے تھما، ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے لہجے میں اضافہ کر دیا۔

"تمام حالات آپ کے سامنے ہیں۔ اس حویلی میں کسی بہو کی آمد کے امکانات تقریباً ناپید ہو چکے ہیں اسی لیے ہم نے وہ تاریخی کنگن ستارہ کو دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ جب اسے دلہن بنایا جاتا تو یہ خاندانی کنگن اس کی کلائیوں میں سجا دیے جاتے لیکن میری قسمت ہی خراب ہے۔" وہ روہانسا ہو گیا۔

"میں آپ کے جذباتی نقصان اور ... کو سمجھ سکتا ہوں چودھری صاحب!" میں نے ... بھرے لہجے میں کہا۔ "آپ نے مجھے یہاں قانونی مدد کے لیے بلایا ہے لیکن میں مال مسروقہ کی بازیابی کو اسی وقت ممکن بنا سکتا ہوں جب مجھے آپ کا تعاون حاصل ہوگا۔"

"میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں ملک صاحب!" اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"تعاون کا آغاز آپ کو میرے ہر سوال کا بالکل

درست جواب دے کر کرنا ہوگا۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''باقی باتیں بعد میں۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''آپ پوچھیں جو بھی پوچھنا چاہتے ہیں۔''

''آپ کے بیان کے مطابق تجوری چودھرائن جی کے کمرے میں رکھی ہوئی ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''مجھے بتائیں، تجوری کس کس کی تحویل میں تھی...... میرا مطلب ہے، تجوری کو کھولنے کا اختیار کتنے افراد کو حاصل تھا؟''

''صرف چودھرائن کو۔'' چودھری فیاض نے جواب دیا۔ ''تجوری کی ایک چابی زلیخا بی بی کے پاس رہتی ہے۔''

''اس چوری کی خبر سب سے پہلے کس کو ہوئی تھی؟''

''چودھرائن زلیخا کو۔''

''یہ کب کی بات ہے؟''

''آج صبح کی۔'' چودھری نے بتایا۔ ''آج صبح جب وہ سو کر اٹھی تو اس کی نظر تجوری پر پڑی۔ تجوری کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے اپنا بستر چھوڑا اور تجوری کا جائزہ لیا۔ وہاں کچھ بھی باقی نہیں تھا۔ زلیخا نے آکر مجھے صورت حال سے آگاہ کیا۔ یہ پریشان ہونے والی بات تھی سو، میں بہت زیادہ فکرمند ہوگیا۔ اپنے طور پر میں نے حویلی کے ملازمین سے پوچھ تاچھ کی مگر اس چوری کے بارے میں کسی کو کچھ پتا نہیں تھا۔ جب یہ عجیب و غریب معاملہ میری سمجھ میں نہ آیا تو میں نے اپنے ایک ملازم غلام نبی کو آپ کی طرف دوڑایا اور...... آپ میرے سامنے موجود ہیں۔ بس مجھے اس سے زیادہ اور کچھ بھی معلوم نہیں ہے ملک صاحب!''

''اس وقت آپ کی حویلی میں اچھے خاصے مہمان بھی ٹھہرے ہوئے ہیں۔'' میں نے ایک اہم سوال کیا۔ ''کیا آپ نے کنگن کی جوڑی اور دیگر زیورات و نقدی کے بارے میں ان لوگوں سے بھی کوئی سوال کیا؟''

''ابھی تک نہیں۔''

''کیا وہ اس ناخوشگوار واقعے سے آگاہ ہو چکے ہیں؟''

''میرا خیال ہے ابھی مہمانوں کو اس حوالے سے کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ہم نے انہیں اس واقعے کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔''

''چودھرائن کے کمرے میں کون کون آسانی سے جا سکتا تھا؟'' میں نے پوچھا۔ ''مطلب یہ کہ اس کمرے میں بلا اجازت کون داخل ہو سکتا تھا؟''

''میں...... اور رجّو!''

''یہ رجو کون ہے؟'' میں نے تیز آواز میں استفسار کیا۔

''رضیہ عرف رجو، زلیخا کی خدمت پر مامور ہے۔'' چودھری فیاض نے بتایا۔ ''آپ رجو کو چودھرائن کی خاص ملازمہ سمجھ لیں۔''

''سمجھ لیا۔'' میں نے کہا۔ ''کیا میں چودھرائن جی کا کمرا دیکھ سکتا ہوں؟''

''ہاں، ہاں...... کیوں نہیں، ضرور۔'' وہ جلدی سے بولا۔

اس گفتگو کے دوران میں، میں نے حسب ضرورت ہلکا پھلکا کھا پی لیا تھا۔ سو، میں اپنی جگہ سے اٹھا اور چودھری کی معیت اور راہنمائی میں چودھرائن زلیخا کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

چودھرائن زلیخا کا کمرا پندرہ بائی پندرہ فٹ کی ایک کشادہ اور ہوادار خواب گاہ تھی تاہم سرد موسم کے تقاضوں کے پیش نظر وہاں کی کھڑکیاں اور داخلی دروازہ بند تھا۔ کمرے میں روزمرّہ ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔ وہ ایک سکون بخش آرام گاہ تھی۔ چودھرائن کو میری آمد کی اطلاع دے دی گئی تھی لہٰذا وہ گرم بستر کو چھوڑ کر ایک کرسی پر براجمان ہوگئی تھی۔ اس کا رانگلا (رنگین پایوں والا) پلنگ کمرے کی مغربی دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا اور اسی دیوار میں قدرے بلندی پر بنی محراب میں وہ آہنی تجوری رکھی ہوئی تھی جس کے معائنے کے لیے میں وہاں پہنچا تھا۔

آہنی تجوری بڑی مضبوط تھی اور اسے کھولنے کا صرف ایک ہی ذریعہ تھا یعنی بہ مدد چابی۔ جس محراب کے اندر مذکورہ تجوری کو رکھا گیا تھا وہ کمرے کے فرش سے لگ بھگ تین فٹ کی بلندی پر بنی ہوئی تھی اور میرے اندازے کے مطابق وہ مربع تجوری دو فٹ چوڑی، دو فٹ اونچی اور دو ہی فٹ گہری بھی تھی۔ میں نے تجوری کو کھول کر اس کے اندرون کا جائزہ لیا لیکن مجھے کوئی ایسا واضح اشارہ نہ مل سکا جو چوری کی اس واردات پر روشنی ڈال سکتا ہو۔

اس زمانے میں فنگر پرنٹس وغیرہ اٹھانے کا رواج عام نہیں ہوا تھا اور عدالت اس نوعیت کے ثبوت کو زیادہ اہمیت بھی نہیں دیتی تھی۔ میں نے فیاض احمد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''چودھری صاحب! میں تنہائی میں چودھرائن جی سے بات کرنا چاہتا ہوں، اگر آپ کو برا محسوس نہ ہو تو۔''

''ملک صاحب! میں نے ہمیشہ قانون اور قانون کے رکھوالوں کا احترام کیا ہے۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''آپ

ہماری مدد کرنے آئے ہیں۔ میں قانونی کارروائی میں بھلا کیسے روک ڈال سکتا ہوں۔ آپ نے چودھرائن سے جو بھی پوچھنا ہے، ضرور پوچھیں۔ میں کمرے سے باہر جا رہا ہوں۔''

میں نے اس کے تعاون کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے میرے لیے ایک کرسی منگوائی اور وہاں سے چلا گیا۔ اب میں زلیخا کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

چودھرائن کی عمر کا تخمینہ میں نے پچپن کے آس پاس لگایا۔ وہ ایک دراز قامت اور بھرے ہوئے جسم کی مالک پررعب خاتون تھی۔ میں نے مناسب الفاظ میں چوری والے اس واقعے پر اظہار افسوس کیا تو وہ دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

''تھانیدار صاحب! یہ جس نے بھی کیا ہے، تباہ و برباد ہوگا۔ سوہنا رب اس کا برا حشر کرے گا۔''

''ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔'' میں نے پُریقین لہجے میں کہا۔ ''میں اس چور کو بہت جلد بے نقاب کر دوں گا جس نے آپ کے خاندانی کنگن اور دیگر زیورات چرائے ہیں۔ وہ بدبخت میرے ہاتھ سے بچ نہیں پائے گا۔''

''چودھری صاحب کو سب سے زیادہ دکھ ان کنگن کی جوڑی کا ہے۔'' وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''وہ انمول جڑاؤ کنگن اس حویلی میں پیڑھی در پیڑھی چلے آرہے تھے۔ پتا نہیں کس منحوس کی نظر لگ گئی پھر یہ......!''

وہ بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہوئی تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''یا پھر کیا چودھرائن جی؟''

''شاید اللہ پاک ہی کو منظور نہیں۔'' اس نے مبہم سا جواب دیا۔

''اللہ پاک کو کیا منظور نہیں؟''

''دیکھیں جی......!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''پتا نہیں آپ یہ بات جانتے ہیں یا نہیں کہ اللہ نے مجھے تین بیٹے اور دو بیٹیاں دی تھیں۔ رواج کے مطابق وہ کنگن سب سے بڑے بیٹے کی بیوی کو پہنائے جاتے تھے۔''

چودھرائن ان کنگن کی جوڑی کے بارے میں مجھے جو کچھ بتانا چاہ رہی تھی، وہ سب میں پہلے سے جانتا تھا لیکن میں نے قطع کلامی کرنے کے بجائے اسے بولنے دیا تاکہ اس کے دل کا غبار دھل جائے۔ جب وہ اپنی بات مکمل کر چکی تو میں نے کہا۔

''چودھرائن جی! اللہ تعالیٰ کو کیا منظور ہے، یہ صرف اسی ذات پاک کو معلوم ہے۔ کوئی انسان اس کے منشا تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ آپ کے دو بیٹے اللہ کو پیارے ہو گئے اور تیسرا ولایت کو۔ ان حالات میں آپ نے وہ خاندانی کنگن ستارہ کو چڑھانے کا فیصلہ کیا اور اس کے ساتھ ہی کنگن کی وہ جوڑی چوری ہو گئی۔ اس موقع پر آپ یہ بھی تو سوچ سکتی تھیں کہ قدرت نہیں چاہتی تھی کہ وہ خاندانی کنگن اس حویلی سے باہر جائیں، اس لیے کسی نے انہیں چوری کر لیا۔''

''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب!'' وہ حیرت آمیز لہجے میں بولی۔ ''میں نے اس انداز میں سوچا ہی نہیں کہ ستارہ کی رخصتی کے ساتھ ہی وہ کنگن بھی حویلی سے نکل کر اس کے سسرال یعنی دوسرے گاؤں کی حویلی جانے والے تھے۔'' وہ یکایک ٹھٹھک گئی پھر چونکے ہوئے انداز میں مستفسر ہوئی۔

''تھانیدار صاحب! کیا آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ ہمارے ہاں چوری اس لیے ہوئی ہے کہ خدا نہیں چاہتا تھا کہ وہ جڑاؤ کنگن اس حویلی سے باہر جائیں؟''

''خدا کے چاہنے یا نہ چاہنے کے بارے میں، میں آپ کو اپنی رائے سے آگاہ کر چکا ہوں چودھرائن جی!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مشیتِ الٰہی کا ادراک انسان کے بس کی بات نہیں۔ میں نے تو آپ کے سامنے سوچ کا ایک زاویہ رکھا تھا، بہرکیف......!'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''چودھری صاحب نے مجھے اپنے تعاون کا بھرپور یقین دلایا ہے اگر آپ نے بھی میرے ہر سوال کا درست جواب دیا تو میں وعدہ کرتا ہوں، اس تجوری سے چوری ہونے والی ہر شے کو میں بازیاب کرنے کے بعد آپ کے قدموں میں رکھ دوں گا اور......وہ بھی ستارہ کی رخصتی سے پہلے۔''

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے تھانیدار صاحب!'' وہ اضطراری لہجے میں بولی۔ ''ستارہ کی رخصتی میں ایک ہفتہ باقی ہے۔ آپ مجھ سے سوال کریں۔ میں اس کا سچا اور کھرا جواب دوں گی۔''

''مجھے بتایا گیا ہے کہ کنگن کی چوری کے بارے میں سب سے پہلے آپ کو پتا چلا تھا؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

اس مالِ مسروقہ میں جڑاؤ کنگن کی جوڑی، دس تولے وزن کے دیگر طلائی زیورات اور دو ہزار روپے کے کرنسی نوٹ بھی شامل تھے لیکن پہلے چودھری اور اب چودھرائن اس چوری کا ذکر کرتے ہوئے صرف جڑاؤ کنگن کی جوڑی کا

حوالہ ہی دے رہے تھے اس لیے اگر روا روی میں، میں بھی ایسا کہہ دوں تو ذہن کو الجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

''جی ہاں، یہی حقیقت ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''آج صبح جب میری آنکھ کھلی تو تجوری کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اٹھ کر تجوری کے اندر جھانکا تو وہ خالی تھی۔ میں اپنے کمرے سے نکلی اور جا کر چودھری صاحب کو صورت حال سے آگاہ کر دیا۔''

''پچھلی رات اس کمرے میں آپ کے علاوہ اور کوئی سویا تھا؟''

''کوئی نہیں۔ صرف میں ہی یہاں سوئی تھی۔'' اس نے بتایا۔

''اچھی طرح سوچ کر جواب دیں۔'' میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''رات سونے سے پہلے آپ نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی تھی؟''

''عام حالات میں، میں دروازے کو کنڈی نہیں لگاتی۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن جب حویلی میں زیادہ مہمان ٹھہرے ہوئے ہوں تو میں سونے سے پہلے دروازے کو اندر سے کنڈی ضرور لگاتی ہوں لیکن......''

وہ بولتے بولتے رکی تو میں نے پوچھا۔ ''لیکن کیا؟''

''جب سے ستارہ کی شادی کا معاملہ چل رہا ہے، حویلی میں مہمان بھی آنا شروع ہو گئے ہیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اس لیے میں آج کل تو رات میں سونے سے پہلے دروازے کو لازمی کنڈی لگا لیتی ہوں مگر جب میں صبح بیدار ہوئی تو دروازہ اگرچہ بند تھا لیکن اس کی اندر والی کنڈی کھلی ہوئی تھی۔ شاید میں پچھلی رات وہ کنڈی لگانا ہی بھول گئی تھی۔''

چودھرائن واقعتاً کنڈی لگانا بھول گئی تھی یا چور نے خود ہی کسی ترکیب سے وہ دروازہ کھول کر زلیخا کی نیند کے دوران میں تجوری کا صفایا کر دیا تھا، اس بارے میں سر دست دعوے کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ویسے میں نے چودھرائن کی خواب گاہ والی کھڑکیوں کو بھی اچھی طرح چیک کیا تھا۔ کھڑکیوں کی تمام چٹخنیاں اندر سے لگی ہوئی تھیں۔ یعنی نامعلوم چور دروازے کے راستے ہی اندر گھسا تھا اور اپنا ''کام'' کر کے چلتا بنا تھا۔

''کیا کبھی ایسا بھی ہوا کہ......'' میں نے چودھرائن کے چہرے پر نگاہ جما کر سوال کیا۔ ''آپ کے سو جانے کے بعد کوئی کسی کام سے کمرے کے اندر آیا ہو...... میرا مطلب ہے، چودھری صاحب یا پھر آپ کی خاص ملازمہ رجّو۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آپ کے بیان کے مطابق عام دنوں میں جبکہ حویلی کے اندر مہمان وغیرہ نہ ٹھہرے ہوئے ہوں تو رات سونے سے پہلے آپ اپنے کمرے کے دروازے کو اندر سے کنڈی لگانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتیں۔ آپ نے تھوڑی دیر پہلے مجھے یہی بتایا ہے نا؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور میرے طویل سوال کا مختصر جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''نہیں...... جب ایک بار میں سو جاؤں تو پھر کوئی میرے کمرے کے اندر قدم نہیں رکھتا۔''

''پچھلی رات سب سے آخر میں یہاں کون آیا تھا؟''

''رجّو......!'' زلیخا نے بتایا۔

''وہ کس کام سے آئی تھی؟''

''رات کو سونے سے پہلے میں نیم گرم دودھ پینے کی عادی ہوں۔'' اس نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''اور یہ کام میری خادمہ رضیہ عرف رجّو ہی روزانہ کرتی ہے۔ اس نے مجھے دودھ کا گلاس دیا اور ''شب بخیر'' کہہ کر میرے کمرے سے نکل گئی۔ میں نے دودھ پیا اور سونے کے لیے بستر پر لیٹ گئی، پھر جلد ہی مجھے نیند آ گئی۔''

''آپ نے دودھ پینے سے پہلے یا بعد میں کمرے کے دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی تھی یا نہیں، اس بارے میں آپ وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتیں۔ آپ نے یہی بیان دیا ہے نا؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''آپ کے تعاون کا بہت شکریہ چودھرائن جی!'' میں نے کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''اگر مجھے کچھ اور یاد آ گیا تو میں دوبارہ آپ کو زحمت دوں گا۔ اب تک کے لیے بس اتنا کافی ہے۔''

''جی، ٹھیک ہے۔'' وہ بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

کمرے سے نکلنے سے پہلے ایک فوری خیال کے تحت میں نے زلیخا بی بی سے پوچھ لیا۔ ''کیا میں اس گلاس کو دیکھ سکتا ہوں جس میں پچھلی رات آپ نے دودھ پیا تھا؟''

''وہ گلاس تو رجّو صبح یہاں سے اٹھا کر باورچی خانے میں لے گئی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''اب تک وہ گلاس دوسرے برتنوں کے ساتھ دھل دھلا بھی گیا ہو گا۔''

میں نے بلا سوچے سمجھے پوچھ لیا۔ ''رات کو سونے سے پہلے نیم گرم دودھ پینے سے نیند بہت اچھی آتی ہے نا؟''

''جی بالکل۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''اللہ کا شکر ہے تھانیدار صاحب! میں بڑی گہری اور پرسکون نیند سوتی ہوں۔ پتا ہی نہیں چلتا کہ رات

کب اور کیسے گزر گئی۔"

میں چودھرائن کے کمرے سے نکل کر چودھری کے پاس آ گیا۔

☆☆☆

اگر مجھے وہ گلاس مل جاتا جس میں گزشتہ شب چودھرائن نے دودھ پیا تھا تو میں اسے لیبارٹری بھجوا کر اس امر کی تصدیق کرسکتا تھا کہ اس رات زلیخا نے اپنے معمول کے مطابق سادہ نیم گرم دودھ ہی پیا تھا یا اس کے اندر کچھ ایسا بھی ملا ہوا تھا جس نے چودھرائن کو کچھ زیادہ ہی گہری نیند سلا دیا تھا۔ بہرحال، مذکورہ گلاس میسر نہیں تھا چنانچہ میں نے اپنی تفتیش کو اس کے بغیر ہی آگے بڑھا دیا تھا۔

میں نے چودھری فیاض کو اس گفتگو کے بارے میں بتایا جو میرے اور زلیخا کے بیچ ہوئی تھی۔ اس نے میری بات کو توجہ سے سنا اور جواب میں بولا۔

"ملک صاحب! زلیخا ٹھیک کہتی ہے۔ جب ہماری حویلی میں زیادہ لوگ ٹھہرے ہوئے ہوں تو وہ رات کو سونے سے پہلے دروازے کو اندر سے کنڈی ضرور لگاتی ہے۔ بس، آپ اسے ایک قسم کی احتیاط ہی سمجھیں۔"

"میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ اپنے گھریلو ملازمین پر بہت زیادہ بھروسا کرتے ہیں۔" میں نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔ "جب حویلی میں مہمان قیام پذیر نہ ہوں تو پھر آپ کی بیگم صاحبہ کو کسی احتیاطی تدبیر کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

"سولہ آنے ٹھیک جناب!" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ہمارے سارے ہی ملازم سالہا سال کے آزمائے ہوئے ہیں۔ میں انہیں گھر کے فرد ہی کی طرح سمجھتا ہوں۔ انہوں نے کبھی مجھے دھوکا نہیں دیا اس لیے ان پر تو شک کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔"

"لیکن میں اپنے پیشہ ورانہ فرائض کے سامنے مجبور ہوں چودھری صاحب!" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "ٹریننگ کے دوران میں ہمیں سمجھایا اور بتایا جاتا ہے کہ پولیس کی تفتیش کی گاڑی شک کے پیٹرول سے چلتی ہے۔ سو، مجھے اپنے طریقے سے یہ کارروائی کرنا ہوگی۔" لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر معتدل انداز میں کہا۔

"آپ مجھے بتائیں کہ حویلی میں ملازمین کی تعداد کتنی ہے اور وہ کیا کیا کام کرتے ہیں۔ مجھے ان سب سے پوچھ تاچھ کرنا ہوگی۔"

"جی ضرور...... کیوں نہیں۔" وہ تعاون آمیز لہجے میں بولا۔ "اس حویلی میں کل سات ملازم کام کرتے ہیں جن میں چار مرد اور تین عورتیں ہیں۔ مردوں کے نام رمضان عرف رجو، فضل دین عرف فضلو، کرامت علی عرف کراما اور غلام نبی عرف گاما ہیں جبکہ عورتوں کے نام خالدہ، شہناز اور رضیہ عرف رجو ہیں۔ اب میں آپ کو ان سب کی ذمے داریوں کے بارے میں بتاتا ہوں۔" وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے تھما پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"شہناز اور خالدہ باورچی خانے کو سنبھالتی ہیں۔ کھانا پکانے سے لے کر برتن دھونے تک ہر چھوٹا بڑا کام ان کے ذمے ہے۔ رجو، چودھرائن جی کے لیے مخصوص ہے۔ وہ بس زلیخا ہی کی خدمت میں لگی رہتی ہے۔ مردوں میں گاما اوپر کے مختلف کام کرتا ہے۔ آپ کو بلانے کے لیے میں نے اسی کو تھانے بھیجا تھا۔ فضلو میری زمینوں اور فصلوں وغیرہ کا حساب رکھتا ہے۔ کراما میرے جرمن شیفرڈ کتے "شیرو" اور میری اصیل مشکی گھوڑی "رانی" کا خیال رکھتا ہے اور رجو صرف میرے ذاتی کاموں کے لیے مخصوص ہے۔ وہ ہروقت میرے ساتھ رہتا ہے اور جب مجھے گاؤں سے باہر جانا ہو تو میری جیپ کو وہی ڈرائیو کرتا ہے۔"

بعدازاں اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اس کے پاس فور وہیل رائٹ ہینڈ ڈرائیو جیپ تھی جسے وہ جھنگ، سرگودھا، لائل پور (موجودہ فیصل آباد)، شیخوپورہ، گوجرانوالہ اور لاہور کے سفر کے لیے استعمال کیا کرتا تھا۔ آس پاس کے گاؤں دیہات کا دورہ وہ اپنی مشکی گھوڑی "رانی" پر کرتا تھا۔ چودھری کی فراہم کردہ یہ معلومات مجھے ... سے حاصل تھیں۔

"حویلی سے باہر اور کتنے لوگ آپ کے لیے کام کرتے ہیں؟" چودھری کے خاموش ہونے پر میں نے سوال کیا۔

"دو افراد حویلی کے گیٹ پر پہرا دیتے ہیں۔" فیاض احمد نے بتایا۔ "ان کے نام ارشد اور جمال ہیں جن میں سے ایک دن کا اور دوسرا رات کا چوکیدار ہے۔ ان کے علاوہ تین بندے ڈیرے پر ہوتے ہیں جو مال مویشیوں اور کاشت کاری کے معاملات کو دیکھتے ہیں۔ درجن بھر ایسے مرد اور عورتیں بھی ہیں جو کھیت مزدوروں کی حیثیت سے میری زمینوں پر کام کرتے ہیں۔"

چودھری فیاض احمد کے ڈیرے پر کام کرنے والے ملازمین کے نام ادریس، ناصر اور لیاقت تھے۔ بادی النظر میں ان تینوں کا چوری والے معاملے سے کوئی تعلق واسطہ

دکھائی نہیں دیتا تھا لہٰذا سرِدست میں نے انہیں نظرانداز کر دیا اور حویلی کے دونوں چوکیداروں کو اپنے پاس بلالیا۔

جمال عرف جمالا کی ڈیوٹی دن کی تھی جبکہ ارشد عرف شدی رات میں پہریداری کیا کرتا تھا۔ میں پندرہ منٹ تک گھما پھرا کر ان سے مختلف سوال کرتا رہا لیکن اس پوچھ تاچھ کا نتیجہ صفر کے برابر برآمد ہوا۔ جمال نے گزشتہ روز دن میں اور ارشد نے پچھلی رات کسی بھی مشکوک بندے کو حویلی کے آس پاس منڈلاتے یا حویلی کے اندر داخل ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ اس دوران میں جو مہمان وہاں پہنچے تھے، انہیں حویلی میں رہنے والوں ہی نے اندر آنے کی اجازت دی تھی...... وغیرہ۔

اس کے بعد حویلی کے اندر موجود رہ کر کام کرنے والوں کی باری آئی۔ میں نے رجو، فضلو، کراما اور گاما سے کڑی تفتیش کی مگر ان کے بیانات بے لاحاصل ہی رہے۔ میں کسی ایسے سراغ تک رسائی حاصل کرنے میں قطعی ناکام رہا جو اس پراسرار چور کو بے نقاب کرنے میں مددگار ثابت ہوتا۔ آخر میں، میں نے باورچی خانہ سنبھالنے والی شہناز اور خالدہ کا انٹرویو کیا۔

''تم میں سے کھانا کون بناتا ہے اور جھوٹے برتن کون دھوتا ہے؟'' میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

میرے محتاط اندازے کے مطابق شہناز کی عمر پینتیس کے آس پاس تھی اور خالدہ اس سے پانچ چھ سال چھوٹی نظر آتی تھی۔

''ہم دونوں ہی باورچی خانے کا ہر کام اچھے سے جانتی ہیں۔'' خالدہ نے بتایا۔ ''اس لیے دونوں مل بانٹ کر اپنی ذمے داری نبھاتی ہیں۔ کسی کے لیے کچھ بھی مخصوص نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہو گیا۔'' میں نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا پھر شہناز کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''کیا رجو بھی کھانا پکانے یا برتن وغیرہ دھونے میں آپ لوگوں کی مدد کرتی ہے؟''

''نہ جی......!'' وہ ہاتھ نچاتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''چودھرائن جی کی خاص ملازمہ ہونے کی وجہ سے وہ خود کو کوئی توپ چیز سمجھتی ہے۔ وہ ہم پر بھی ایسے حکم چلاتی ہے جیسے ہم اس کی ذاتی نوکرانیاں ہوں۔''

''کھانا بنائیں تو ہم، برتن دھوئیں تو ہم، کپڑے دھوئیں تو ہم۔'' خالدہ نے شہناز کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے جلے بھنے انداز میں کہا۔ ''وہ باورچی خانے میں صرف دو کاموں کے لیے آتی ہے۔ نمبر ایک، چودھرائن جی کا کھانا لینے۔ نمبر دو، ان کے جھوٹے برتن دینے۔ باقی کا سارا وقت وہ چودھرائن جی کی خدمت میں حاضر رہتی ہے۔''

''یہ تو جب سے مہرالنساء بی بی یہاں آئی ہوئی ہیں، وہ باورچی خانے میں آکر ہماری تھوڑی بہت مدد کر دیتی ہیں۔'' شہناز نے مزید بتایا۔ ''چھوٹی بی بی ستارہ کو بھی کھانا پکانے کا شوق ہے مگر چودھری صاحب اسے چولہے کے نزدیک نہیں جانے دیتے اور آج کل تو وہ ویسے بھی مایوس بیٹھی ہوئی ہیں۔''

''چودھرائن جی نے مجھے بتایا ہے کہ پچھلی رات انہوں نے جو نیم گرم دودھ پیا تھا، اس کا خالی گلاس آج صبح رجو نے ان کے کمرے سے اٹھا کر باورچی خانے میں پہنچایا تھا۔'' میں نے باری باری ان دونوں کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے دریافت کیا۔ ''کیا آپ لوگوں نے اس گلاس کو دھو ڈالا ہے؟''

''نہیں جی......!'' خالدہ نے بے ساختہ جواب دیا۔

''کیا وہ گلاس باورچی خانے میں ویسا ہی جھوٹا رکھا ہے؟''

اس بار شہناز نے بتایا۔ ''نہیں جی۔''

''اس کا کیا مطلب ہوا؟'' میں نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔

ان دونوں نے عجیب سی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر خالدہ نے میرے سوال کا جواب دیا۔ ''بات دراصل یہ ہے تھانیدار صاحب کہ آج صبح جب رجو وہ گلاس لے کر یہاں آئی تو چولہے کے نزدیک پہنچ کر اس کا پاؤں رپٹ گیا اور پھسلنے کی وجہ سے گلاس اس کے ہاتھ سے نکل کر فرش پر جا گرا تھا۔''

''اور فرش سے ٹکراتے ہی کانچ کے اس نازک گلاس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔'' شہناز نے کہا۔ ''لہٰذا اسے دھونے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ رجو برتن بہت توڑتی ہے مگر وہ چونکہ چودھرائن جی کی لاڈلی ہے اس لیے اسے کوئی کچھ نہیں کہتا۔''

میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ شہناز اور خالدہ اپنے دلوں میں رجو کے لیے خفگی اور ناپسندیدگی کے جذبات رکھتی تھیں اور ان کا یہ رویہ عین فطری تھا۔ وہ تینوں تو پھر حویلی میں کام کرنے والی ملازمائیں تھیں اور چودھری یا چودھرائن سے ان کی کسی قسم کی رشتے داری نہیں تھی۔ اگر کسی والدین کی ایک سے زیادہ اولادیں ہوں اور ماں یا باپ اپنے ایک بچے سے دوسروں کی بہ نسبت زیادہ محبت کرے تو باقی بہن بھائی اس چہیتے بچے یا چہیتی بچی سے حسد کرنے پر مجبور

ہوجاتے ہیں۔ جب سگے بھائی بہنوں میں مسابقانہ منافرت پائی جاسکتی ہے تو پھر رجو پر چودھرائن کی خصوصی عنایات کے نتیجے میں خالدہ اور شہناز کا اس سے بغض یا عداوت رکھنا سمجھ میں آنے والی بات تھی۔

''پچھلی رات چودھرائن جی کے لیے دودھ کس نے گرم کیا تھا؟'' میں نے ان سے پوچھا۔

پتا نہیں کیوں میرے دماغ کے کسی گوشے میں یہ شک پناہ گزیں ہو چکا تھا کہ گزشتہ رات زلیخا بی بی نے جو نیم گرم دودھ پیا تھا، اس میں ضرور ایسا کچھ ملا ہوا تھا کہ گہری نیند کے باعث چودھرائن کو چوری کی اس پراسرار واردات کی مطلق خبر نہیں ہو سکی تھی۔ شاید اسی لیے میں لاشعوری طور پر اس دودھ کے بارے میں کچھ زیادہ ہی سوال کر رہا تھا۔

''دودھ کو میں نے اچھی طرح کاڑھا تھا تھانیدار صاحب!'' خالدہ نے بتایا۔ ''گرم دودھ کو میں نے چھلنی سے ڈھانپ دیا تھا۔ جب دودھ ذرا سا ٹھنڈا ہو گیا یعنی نیم گرم رہ گیا تو میں نے اسے گلاس میں ڈال کر رجو کو دے دیا تھا پھر وہ اس گلاس کو لے کر چودھرائن جی کی طرف چلی گئی تھی۔''

''کیا تم دونوں میں سے کوئی مجھے یہ بتا سکتا ہے کہ چودھرائن کے کمرے میں رکھی تجوری پر کس نے ہاتھ صاف کیا ہے؟'' میں نے باری باری ان کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے استفسار کیا۔ ''پچھلی رات اس حویلی میں ایک چوری ہوئی ہے اور اس سنگین واردات کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ یہ خاصی عجیب سی بات نہیں ہے؟''

''ہمیں بھی اس واردات کا آج صبح ہی پتا چلا ہے جی۔'' شہناز نے کہا۔ ''آپ کے آنے سے پہلے ہم سب سے پچھ پرتیت کی گئی ہے لیکن کوئی کیا بتاتا، کسی کو کچھ پتا ہی نہیں تھانیدار صاحب!''

''ہم سب بھی پریشان ہیں جناب!'' خالدہ تشویش بھرے لہجے میں بولی۔ ''آج تک اس حویلی سے ایک معمولی سی سوئی بھی چوری نہیں ہوئی۔ کنگنوں کی چوری والا واقعہ تو سمجھ سے باہر ہے۔ کسی کو یقین ہی نہیں آرہا کہ حویلی میں اتنی سنگین واردات ہو چکی ہے۔''

میرے پیشہ ورانہ تجربے اور انسانی نفسیات کے وسیع مطالعے اور مشاہدے نے مجھے بتا دیا کہ خالدہ یا شہناز کا اس افسوسناک واقعے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ سو، میں نے چودھرائن زلیخا کی خادمۂ خاص رجو کو پوچھ تاچھ کے لیے اپنے پاس بلالیا۔

رضیہ عرف رجو کی عمر پچیس کے اریب قریب تھی۔ وہ سانولی سلونی، پرکشش نقش ونگار والی ایک پستہ قامت لڑکی تھی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

''رجو! تم چودھرائن جی کی خدمت پر مامور ہو اور تمہارا زیادہ وقت انہی کے ساتھ گزرتا ہے۔ میں صحیح کہہ رہا ہوں نا؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''جی تھانیدار صاحب!''

''مجھے بتاؤ، چودھرائن جی عموماً رات میں کتنے بجے سوجاتی ہیں؟'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر استفسار کیا۔

''زیادہ سے زیادہ نو بجے تک جی، لیکن ان دنوں تھوڑی دیر بھی ہوجاتی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''حویلی میں تارو (ستارہ) بی بی کی شادی کا ہنگامہ چل رہا ہے اور مہمان بھی آنا شروع ہو گئے ہیں اس لیے گھنٹا، آدھا گھنٹا دیر بھی ہوجاتی ہے۔''

''پچھلی رات وہ کتنے بجے سوئی تھیں؟''

''میں نے کوئی ساڑھے نو بجے انہیں نیم گرم دودھ دے دیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''اس کے بعد وہ کب سوئیں، مجھے کچھ اندازہ نہیں۔''

''جب تم دودھ رکھ کر چودھرائن جی کے کمرے سے باہر نکلیں تو کیا انہوں نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگالی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے نہیں پتا جی۔'' وہ بیزاری سے بولی۔ ''کمرے سے نکلتے ہوئے میں نے دروازہ بند کردیا تھا۔''

''چودھرائن جی نے مجھے بتایا ہے کہ عموماً وہ رات کو سوتے وقت اپنے کمرے کے دروازے کو اندر سے کنڈی نہیں لگاتیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ کنڈی نہ لگانے والی احتیاط وہ محض باہر سے آنے والے مہمانوں کی وجہ سے کرتی ہیں؟''

''جی ہاں، انہوں نے آپ کو بالکل ٹھیک بتایا ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''چودھرائن جی اور چودھری صاحب حویلی کے تمام ملازموں پر پورا بھروسا کرتے ہیں۔''

''تم یہ تو مانتی ہو نا کہ پچھلی رات چودھرائن جی کی تجوری سے طلائی، خاندانی جڑاؤ کنگن کی جوڑی، چند دوسرے زیورات اور نقد رقم چوری ہوئی ہے؟''

''جی، میں مانتی ہوں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے بولی۔ ''چودھرائن جی بھلا جھوٹ کیوں بولیں گی۔''

''تو تمہارے خیال میں یہ چوری حویلی میں ٹھہرے

ہوئے مہمانوں میں سے کس نے کی ہے؟'' میں نے سپاٹ آواز میں سوال کیا۔

''میں بھلا کیا کہہ سکتی ہوں؟'' وہ عجیب سے انداز میں بولی۔

''رجو! تمہیں کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی پڑے گا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''جب حویلی کے مکینوں نے چوری نہیں کی تو پھر باقی مہمان ہی بچتے ہیں۔''

''جی، لگ تو یہی رہا ہے کہ یہ کام مہمانوں ہی میں سے کسی کا ہے۔'' اس نے معتدل انداز میں کہا۔

''کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ اس وقت حویلی میں کتنے مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے کبھی گنتی تو نہیں کی تھانیدار صاحب!'' وہ پرسوچ انداز میں بولی۔ ''میرے خیال میں کوئی آٹھ، دس عورتیں اور تیرہ، چودہ مرد ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے...... تم نے نہیں گنا تو میں گن لوں گا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''تم نے مجھ سے اچھا تعاون کیا ہے۔ میرے جانے کے بعد اگر تمہیں کچھ یاد آجائے تو چودھری صاحب کو بتا دینا، میں کل صبح دوبارہ آؤں گا۔''

''جی، ٹھیک ہے۔'' وہ فرمانبرداری سے بولی۔

''اور ہاں......!'' میں نے اسے تیز نظر سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''کانچ کے برتنوں کو احتیاط کے ساتھ اٹھایا کرو۔ میں نے سنا ہے تم برتن بہت توڑتی ہو۔''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔

میں نے پوچھا۔ ''تم چودھرائن زلیخا کے بہت قریب ہو۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ تجوری کی چابی کہاں رکھتی ہیں؟''

مذکورہ تجوری کو توڑا نہیں گیا تھا بلکہ اسے کھولنے کے بعد اندر سے صفایا کیا گیا تھا لہٰذا تجوری کو کھولنے اور بند کرنے والی چابی کی وقوع پذیری پر درجن بھر سوال پوچھے جا سکتے تھے۔

رجو نے بتایا۔ ''چودھرائن جی تجوری کی چابی کو کالے بٹوے میں رکھتی ہیں۔''

''اور وہ کالا بٹوا کہاں ہوتا ہے؟''

''چودھرائن جی کے سرہانے کے نیچے۔''

''کیا چودھرائن جی ہمیشہ خود ہی تجوری کھولا کرتی تھیں؟''

''جی۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ''یا پھر کبھی کبھار چودھری صاحب بھی تجوری کھول لیا کرتے تھے۔''

''کیا کبھی تمہیں تجوری کھولنے کا موقع ملا؟''

رجو کے چہرے پر گھبراہٹ کے اثرات نمودار ہوئے۔ وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوئی۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب! میں بھلا کیوں اس تجوری کو کھولوں گی؟''

''تم غلط سمجھ رہی ہو رجو!'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''میرا مطلب یہ تھا کہ کیا کبھی چودھرائن جی نے تمہیں تجوری کھولنے کا حکم دیا تھا یعنی تمہارے ہاتھ سے تجوری کھلوائی تھی؟''

''نہ جی...... کبھی نہیں۔'' وہ اپنے سر کو نفی میں حرکت دیتے ہوئے بولی۔ ''آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ میں سمجھی شاید آپ میری نیت پر شک کر رہے ہیں۔''

''پولیس کا کام شک سے شروع ہو کر شک پر ہی ختم ہوتا ہے رجو!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''بہرکیف، اگر تم چوری کی اس واردات میں ملوث نہیں ہو تو تمہیں پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔''

اس کی سانس میں سانس آئی اور چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔ میں نے رجو کو فارغ کر دیا اور ایک بار پھر چودھری فیاض احمد کے پاس آگیا۔

دس تولے سونے کے زیورات، جڑاؤ طلائی کنگن کی جوڑی اور دو ہزار روپے کے کرنسی نوٹ کو آپ کوئی معمولی چوری ڈکیتی نہ سمجھیں۔ یہ آج سے ساٹھ پینسٹھ سال پہلے کا واقعہ ہے جب سونا اسی روپے تولہ کے آس پاس ہوا کرتا تھا۔ اگر دو ہزار کی اس رقم کو بھی سونے میں تبدیل کر دیں تو کم و بیش پچیس تولے کا اضافہ ہو جائے گا۔ گویا کل ملا کر پینتیس تولے سونا ہو گیا۔ جڑاؤ طلائی کنگن اس کے علاوہ ہیں۔ اب ذرا آج کے حساب سے پینتیس تولے سونے کی قیمت کا اندازہ لگائیں تو یہ تقریباً ڈیڑھ کروڑ کی چوری تھی۔ اس رقم میں ایک جوڑی جڑاؤ کنگن کی قیمت بھی جمع کر لیں تو آپ کو خود ہی پتا چل جائے گا کہ ایک ہی جھٹکے میں چودھری فیاض احمد کا کتنا بڑا نقصان ہو گیا تھا۔

''ملک صاحب! آپ کسی نتیجے پر پہنچے کہ نہیں؟'' چودھری نے مجھ سے سوال کیا۔ ''پچھلے دو گھنٹے سے آپ کی تفتیشی کارروائی جاری ہے۔''

''چودھری صاحب! اس واردات کے حوالے سے میں اپنا ایک ذہن تو بنا چکا ہوں۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔

وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کچھ مجھے

بھی تو بتائیں جناب!''

''ضرور بتاؤں گا چودھری صاحب!'' میں نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''پہلے آپ چودھرائن جی سے میری بات کروادیں۔ میں ان سے مزید چند اہم سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے جناب!'' اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے استفسار کیا۔ ''کیا میں دوبارہ آپ کو ان کے پاس لے چلوں؟''

''نہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''آپ انہیں یہیں بلالیں، میں آپ کی موجودگی میں بات کرلوں گا۔''

پانچ منٹ کے اندر چودھرائن زلیخا بی بی ہمارے درمیان موجود تھی۔

''چودھرائن جی! میں تہ دل سے معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو دوبارہ زحمت دی۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''لیکن یہ ضروری عمل ہے، امید ہے آپ اس کا برا نہیں منائیں گی۔''

''بالکل نہیں۔'' وہ فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ ہماری مدد ہی تو کر رہے ہیں۔''

''میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا، بس دو تین سوالات......!'' میں نے معتدل انداز میں کہا اور پوچھا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ تجوری کی چابی آپ ایک سیاہ بٹوے میں رکھتی ہیں اور وہ بٹوا آپ کے تکیے کے نیچے پڑا رہتا ہے؟''

اس نے تحمل انداز میں جواب دیا۔ ''جی، آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔''

''تجوری کو آپ خود کھولتی ہیں یا پھر چودھری صاحب؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ دونوں کے سوا کوئی اور تجوری کو کھولتا ہے اور نہ ہی بند کرتا ہے؟''

''جی، یہی حقیقت ہے۔''

''آپ نے آخری بار تجوری کو کب کھول کر دیکھا تھا؟''

''کل دوپہر میں۔'' اس نے بتایا۔

''اور اس وقت وہ جڑاؤ کنگن، طلائی زیورات اور نقد رقم تجوری کے اندر موجود تھے؟''

''جی ہاں...... بالکل۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

دراصل میں یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ چوری کی وہ واردات گزشتہ رات ہوئی تھی یا اس سے پہلے ہی اس تجوری کا صفایا کر دیا گیا تھا۔ چودھرائن کے جواب نے بتا دیا کہ وہ واقعہ پچھلی رات ہی کا تھا۔

''رجو نے مجھے بتایا ہے کہ اس نے پچھلی رات لگ بھگ ساڑھے نو بجے آپ کو نیم گرم دودھ کا گلاس لاکر دیا تھا اور آپ کے مطابق وہ دودھ پینے کے فوراً بعد آپ سو گئی تھیں؟'' میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''میں جاننا چاہتا ہوں کہ آج صبح آپ کتنے بجے بیدار ہوئی تھیں؟''

''فجر کی اذان کے بعد۔'' اس نے بتایا۔ ''لگ بھگ چھ بجے۔''

''آج صبح جب آپ کی آنکھ کھلی تو آپ نے تجوری کو کھلا ہوا دیکھا تھا۔'' میں نے معتدل مگر تصدیق طلب انداز میں کہا۔ ''آپ نے بستر چھوڑ دیا اور کھلی ہوئی تجوری کے اندر جھانکا۔ تبھی آپ کو پتا چلا کہ طلائی زیورات، نقدی اور خاندانی جڑاؤ کنگن کی جوڑی وغیرہ سب جا چکا ہے؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

''اچھی طرح سوچ کر بتائیں۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر سوال کیا۔ ''جب آپ کھلی ہوئی تجوری کے نزدیک گئیں تو کیا چابی اس کے لاک والی موری کے اندر لگی ہوئی تھی؟''

''نہیں۔'' اس نے میری توقع کے خلاف جواب دیا۔ ''وہ چابی تو اس وقت بھی میرے کالے بٹوے ہی میں رکھی ہوئی تھی۔''

بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ''اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ نامعلوم چور نے کسی ڈپلی کیٹ چابی کا استعمال کر کے تجوری کو کھولا تھا۔''

چودھری فیاض نے میرے خیال کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے ملک صاحب!''

''چودھرائن جی!'' میں نے دوبارہ زلیخا بی بی کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''جب آپ نے کل دوپہر میں تجوری کو چیک کیا تو اس کے اندر کا حال ٹھیک ٹھاک تھا۔ اپنے ذہن پر زور ڈال کر مجھے بتائیں کہ اس کے بعد مہمانوں میں سے کوئی عورت یا مرد آپ کے کمرے میں آیا تھا؟''

''نہیں تھانیدار صاحب!'' اس نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔ ''اس وقت مہمان خانے میں جو لوگ ٹھہرے ہوئے ہیں، ان میں سے کوئی ایک بھی ہمارا قریبی رشتے دار نہیں ہے اس لیے حویلی کے اندرونی حصے تک کسی کی رسائی نہیں ہے۔''

''یہ سب دور پار کے تعلق دار ہیں ملک صاحب!'' چودھری فیاض وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ان میں زیادہ

تر وہ زمیندار ہیں جن سے اکثر و بیشتر میرا واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ یہ لوگ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے باہر کے دیگر دور دراز اضلاع سے آئے ہیں اس لیے میں نے مہمان خانے میں ان کے منجی بسترے اور کھانے پینے کا بندوبست کر دیا ہے۔ بیٹی کی شادی کا معاملہ ہے نا ملک صاحب! یہ سب تو کرنا پڑتا ہے۔"

"بجا فرمایا آپ نے۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا پھر اس کی بیوی سے مخاطب ہوتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ "آپ سے آخری سوال مگر اس کا جواب خوب سوچ سمجھ کر دینا ہے۔"

"آپ پوچھیں تھانیدار صاحب!" اس نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "اس سے پہلے بھی میں نے آپ کے ہر سوال کا جواب سوچ سمجھ کر دیا ہے۔"

"بہت مہربانی آپ کی چودھرائن جی!" میں نے تشکرانہ انداز میں کہا اور پوچھا۔ "کل رات رجّو سے پہلے آپ کے کمرے میں کون آیا تھا...... میرا مطلب ہے، دوپہر کے بعد سے آپ کے سونے تک...... رجّو کے علاوہ؟"

"تین، چار چکر تارو نے لگائے تھے۔ ایک بار چودھری صاحب آئے تھے اور مغرب کی نماز کے بعد [illegible] آیا [illegible] ساڑھے پانچ بجے مہرو اپنی چھوٹی بیٹی عابدہ کو لے کر آئی تھی۔" زلیخا بی بی نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ "عابدہ کافی دیر سے رو رہی تھی اور مہرو اسے مجھ سے دم کرانے لائی تھی۔ اللہ کے فضل سے میں پنج وقتہ نمازی ہوں۔ اس سخت ترین سردی میں بھی میری فجر کی نماز کبھی قضا نہیں ہوئی۔"

"ماشاء اللہ!" میں نے ستائشی انداز میں کہا۔

"میں نے مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد عابدہ کو پھونک ماری، اس کے بعد میں اور مہرو (مہر النساء) تارو (ستارہ) کی شادی کے بارے میں باتیں کرنے لگیں۔" چودھرائن نے مزید بتایا۔ "اگر کبھی بھی میرا چھوٹا بیٹا چودھری اشفاق احمد ولایت سے واپس آ کر یہاں آباد نہ ہوا اور اس نے ہماری مرضی کی شادی نہ کی تو سمجھ لیں کہ یہ اس حویلی کی آخری شادی ثابت ہوگی۔ اسی لیے ہم ستارہ کے لیے زیادہ بے چین ہیں اور ہم نے وہ خاندانی جڑاؤ کنگن بھی اسی کو دینے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر......!"

اس کی آواز رندھ گئی۔ میں نے اس سے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ جب چودھرائن ہمارے پاس سے اٹھ کر چلی گئی تو چودھری فیاض نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

"اب آپ کیا کہتے ہیں ملک صاحب؟"

"پہلے میں آپ کے مہمان خانے کو دیکھنا چاہوں گا۔" میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔ "پھر آپ کے سوال کا جواب دوں گا چودھری صاحب!"

"جیسی آپ کی مرضی ملک صاحب!" اس نے تعاون آمیز لہجے میں کہا پھر بہ آوازِ بلند اپنے ملازم خاص کو پکارا۔ "رجو! ذرا ادھر آنا۔"

رمضان عرف رجو کسی چراغی جن کے مانند فوراً سے پیشتر حاضر ہو گیا۔ چودھری نے اسے کچھ ہدایات دیں پھر میرے ساتھ مہمان خانے کی جانب روانہ کر دیا۔

رجو کی عمر پینتالیس کے اریب قریب تھی۔ وہ ایک صحت مند، زیرک، ہوشیار اور چاق چوبند شخص تھا اور اسے ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔ وہ بیک وقت چودھری کے لیے کئی ایک خدمات انجام دیا کرتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ چودھری کے محرمِ راز کی حیثیت کا حامل تھا۔

مہمان خانہ دراصل دو بڑے سائز کے ہال نما کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک کمرے کو آپ زنان خانہ اور دوسرے کو مردان خانہ سمجھ لیں۔ ہر کمرے میں کم و بیش پچاس افراد کے لیے منجی بسترے لگے ہوئے تھے، یعنی بیک وقت وہاں ایک سو کے قریب مہمانوں کو ٹھہرایا جاسکتا تھا لیکن ابھی وہ بسترے آدھے سے زیادہ خالی پڑے ہوئے تھے۔ مردان خانے میں مجھے کل بارہ افراد دکھائی دیے۔ ان میں چار تو تاش کھیل رہے تھے، باقی ماندہ میں چند مونگ پھلیاں کھا رہے تھے، کچھ آگ تاپ رہے تھے اور دو تین چارپائیوں پر [illegible] کیے سو رہے تھے۔ زنان خانے میں صرف آٹھ عورتیں نظر آئیں۔ وہ آپس میں گپ شپ کر رہی تھیں۔ میں نے ان پر سرسری سی نگاہ ڈالی اور رجو کے ساتھ واپس ہولیا۔

ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ ان مرد و زن میں سے کوئی بھی مجھے یعنی ایک پولیس والے کو اپنے سامنے دیکھ کر چونکا تھا اور نہ ہی گھبرایا تھا۔ جو [illegible] سو رہے تھے، ان کے بارے میں رائے زنی کرنا مشکل تھا۔

اگرچہ وہ مہمان خانہ حویلی کی چار دیواری کے اندر ہی بنا ہوا تھا لیکن حویلی کی اصل رہائشی عمارت سے وہ لگ بھگ سو گز کے فاصلے پر مرکزی گیٹ کے نزدیک واقع تھا۔ میں رجو کی معیت میں ایک بار پھر چودھری فیاض احمد کے روبرو پہنچ گیا۔

"میرا خیال ہے اب تو آپ کو کچھ کہہ ہی دینا چاہیے۔" چودھری نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اگر میں غلط

نہیں تو آپ اس معاملے کی تہ میں پہنچ چکے ہیں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا جناب؟''

''جی چودھری صاحب! آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں سردست جس امکانی نتیجے پر پہنچا ہوں، اس کے کئی ایک پہلو ہیں۔ میں ان نکات کو باری باری آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ آپ کے ردّوقبول کے بعد ہم کسی حتمی نتیجے پر پہنچ جائیں گے۔''

''جی، ٹھیک ہے۔'' وہ ہمہ تن گوش ہوگیا۔

''امکان نمبر ایک......!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''چوری سرے سے ہوئی ہی نہیں۔''

''یہ عجیب قسم کی بات کر دی ملک صاحب!'' وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں اس امکان کو رد کرتا ہوں کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ چوری ہوئی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ تو چوری ہوئی ہے۔'' میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''دوسرا امکان یہ کہتا ہے کہ چور باہر سے نہیں آیا۔ وہ پہلے ہی سے حویلی کے اندر موجود تھا۔ جب اس کا داؤ لگا، اس نے تجوری صاف کر دی۔ وہ اس وقت بھی حویلی میں ہی ہے یا فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا ہے، اس کو چیک کیا جاسکتا ہے۔''

وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''وہ کیسے ملک صاحب؟''

''یہ میں آخر میں بتاؤں گا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''پہلے آپ اس امکان کے بارے میں اپنی رائے دیں۔''

''میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''باہر کا کوئی آدمی چوری کی نیت سے میری حویلی میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کرسکتا ملک صاحب!''

''دوسرے امکان کو قبول کرنے کے بعد تیسرا امکان اس جانب اشارہ کرتا ہے کہ حویلی کے اندر اس وقت تین پارٹیاں موجود ہیں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''یہ چوری انہی میں سے کسی ایک پارٹی نے کی ہے۔''

چودھری پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''کون سی تین پارٹیاں جناب؟''

''پہلی پارٹی تو آپ ہیں چودھری صاحب!'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''یعنی آپ، آپ کی بیگم صاحبہ اور آپ کی دونوں بیٹیاں۔ دوسری پارٹی آپ کے گھریلو ملازمین ہیں اور تیسری پارٹی وہ بیس مردوزن پروہنے ہیں جو اس وقت مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔''

''ملک صاحب! آپ نے ہمیں خوامخواہ پارٹی بنا دیا ہے۔'' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا۔ ''ہم چاروں تو اس حویلی کے مالک ہیں۔ ہم اپنے گھر میں خود ہی چوری کیوں کریں گے؟''

''میں نے آپ کو مجرم نہیں ٹھہرایا چودھری صاحب! اس لیے ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے معتدل انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''اس وقت ہم امکانات پر غور کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے آپ بھی ایک پارٹی ہی تصور کیے جائیں گے۔ پولیس کی تفتیش کا طریقۂ کار کچھ ایسا ہی ہے جناب!''

''میں اس تیسرے امکان کو رد کرتا ہوں۔'' وہ دوٹوک انداز میں بولا۔ ''ہم چاروں میں سے کوئی بھی چور نہیں ہوسکتا۔''

''رد کرنا آپ کا حق ہے چودھری صاحب!'' میں نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اب چوتھے امکان کے مطابق، میرے شک کا دائرہ دو پارٹیوں تک سمٹ کر رہ گیا ہے۔ یعنی حویلی کے اندر موجود آپ کے گھریلو ملازمین اور مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے آپ کے معزز پروہنے۔ آپ کی فیملی کو تو استثنیٰ حاصل ہے۔''

''مجھے اپنے تمام ملازموں پر اندھا اعتماد ہے ملک صاحب!'' چودھری نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''وہ سالہا سال کے آزمائے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ایسی گری ہوئی حرکت نہیں کرسکتا۔''

''اپنے گھریلو ملازمین پر آپ کا اندھا بھروسا اپنی جگہ چودھری صاحب لیکن میں انہیں دودھ کے دھلے ہوئے نہیں سمجھ سکتا۔'' میں نے واضح الفاظ میں کہا۔ ''لہٰذا یہ لوگ ہر حال میں زیرِتفتیش رہیں گے۔''

''میں آپ کی محکمہ جاتی مجبوریوں کو اچھی طرح سمجھتا ہوں ملک صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ نے باری باری میرے تمام ملازموں سے پوچھ تاچھ کی ہے۔ آپ ان سے مزید تفتیش بھی کریں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میں آپ سے ان کے لیے استثنیٰ نہیں مانگ رہا۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ جلد از جلد ان خاندانی کنگنوں کی جوڑی کو ڈھونڈ نکالیں اور وہ بھی ستارہ کی رخصتی سے پہلے۔''

''میں یہی کوشش کر رہا ہوں چودھری صاحب!'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''اب پانچواں اور آخری امکان......!'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا اور پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''چوری آپ کے مہمانوں میں سے کسی نے کی ہے۔ وہ لوگ چونکہ حویلی کے اندرونی حصے تک رسائی نہیں رکھتے اس لیے انہوں نے آپ کے کسی گھریلو ملازم سے مدد لی

ہے۔ آپ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کے مستقل ملازمین حویلی کے اندر ہی رہتے ہیں۔ ان کی رہائش کے لیے آپ نے ایک طرف کوارٹر بنوا رکھے ہیں؟''

''جی ہاں، ایسا ہی ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن یہ بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی کہ میرا نمک خوار کوئی ملازم ان کے ساتھ ملا ہوا ہے۔''

''میں آپ کے تمام ملازمین اور مہمانوں کو چیک کرنا چاہتا ہوں چودھری صاحب!'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو؟''

''ملا......؟'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ''ملک صاحب! آپ کس قسم کی چیکنگ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟''

''خانہ اور جامہ...... دونوں قسم کی تلاشی۔'' میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''اس ذیل میں مجھے آپ کے مہمانوں کا سامان بھی چیک کرنا ہوگا۔''

''ملک صاحب! میرے لیے تو یہ بڑی بے عزتی کی بات ہوگی کہ میں اپنے معزز مہمانوں کو شک کی نظر سے دیکھوں۔'' وہ فکرمندی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ لوگ میری بیٹی کی شادی میں شرکت کے لیے یہاں آئے ہیں۔ اگر ان کی اور ان کے سامان کی تلاشی لی گئی تو ان کو ایسا لگے گا کہ میں انہیں چور سمجھ رہا ہوں۔ یہ تو انہیں گھر بلا کر ذلیل کرنے جیسا ہوگا اور پھر......!'' وہ لمحے بھر کے لیے رکا پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے تشویشناک لہجے میں کہا۔

''اس طرح حویلی کے اندر ہونے والی چوری کی واردات کے بارے میں انہیں بھی پتا چل جائے گا۔ یہ بھی میرے لیے شرمندگی کا باعث ہوگا۔ آپ میری پوزیشن سمجھ رہے ہیں نا؟''

''ہاں، میں سمجھ رہا ہوں مگر یہ رسک تو لینا ہی پڑے گا۔''

اس نے پوچھا۔ ''کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے؟''

''دوسرا راستہ تو ہر جگہ ہمیشہ موجود ہوتا ہے چودھری صاحب!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مگر اس کی بھاری قیمت بھی چکانا پڑتی ہے۔''

''کیسی بھاری قیمت؟'' اس نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''آپ چوری والے اس ناخوشگوار واقعے کو بھول جائیں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کا جو نقصان ہوا ہے، اسے چپ چاپ برداشت کرلیں...... اللہ اللہ خیر سلا۔''

''آپ کا مشورہ بڑا اذیت ناک ہے ملک صاحب!'' وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ''مجھے نقدی اور دوسرے طلائی زیورات کی زیادہ پروا نہیں ہے لیکن جڑاؤ کنگن کی وہ جوڑی اس حویلی کی خاندانی میراث ہے۔ اسے فراموش کردینا ناممکن کی حد تک مشکل ہے جناب......! کوئی ایسا حل بتائیں کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی سلامت رہے۔ میں اپنے ملازمین کی تلاشی وغیرہ کے لیے تیار ہوں مگر ان مہمانوں کو اس نوعیت کے تجربے سے گزارنا مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا۔''

''ایک کام ہوسکتا ہے چودھری صاحب!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''وہ کیا؟'' اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

''پہلے میں آپ کے گھریلو ملازمین کی جامہ اور خانہ تلاشی کے کام کو نمٹاتا ہوں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اس کے بعد میں اور میرا کانسٹیبل حویلی سے روانہ ہوجائیں گے لیکن کہیں نزدیک ہی رک کر مہمانوں کے جانے کا انتظار کریں گے۔''

''مہمانوں کے جانے کا انتظار......؟'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ مہمان ستارہ کی شادی میں شرکت کرنے آئے ہیں ملک صاحب! آپ ان کے کہاں جانے کی بات کر رہے ہیں؟''

''اگر آپ نے مجھے اپنی بات مکمل کرنے دی ہوتی تو آپ کو یہ سوال پوچھنے کی ضرورت پیش نہ آتی چودھری صاحب!'' میں نے [illegible] انداز میں کہا۔

''اوہ......'' وہ ایک طویل ندامت بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھ سے غلطی ہوگئی ملک صاحب...... آپ کہیں۔''

میں نے کہا۔ ''ہمارے حویلی سے نکلنے کے بعد آپ مہمان خواتین کو اپنی حویلی کی سیر کرانے کے لیے اندر لے جائیں گے اور مرد حضرات کو اپنی زمینیں اور باغات دکھانے حویلی سے باہر بھیج دیا جائے گا۔ ان کے ساتھ جانے والے ملازمین کو آپ ہدایات دیں گے کہ ایک گھنٹے سے پہلے انہیں واپس نہیں لانا۔ ایسی ہی تاکید آپ نے اپنی ملازماؤں کو بھی کرنا ہے۔ وہ لوگ مہمان خواتین کو کم از کم آدھا گھنٹا حویلی کے مختلف حصوں میں گھماتی رہیں گی۔ میری بات آپ کی سمجھ میں آرہی ہے نا چودھری صاحب؟''

''جی ملک صاحب! میں آپ کے منصوبے کی تہ تک پہنچ گیا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''جب مہمان خانہ خالی ہوجائے گا تو آپ دوبارہ حویلی میں آکر ان لوگوں کے

سامان کی تلاشی لیں گے۔"

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ "پہلے آپ کے ملازمین اور بعد ازاں آپ کے مہمانوں کی مکمل چیکنگ کے بعد دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔"

چودھری فیاض احمد کو میرا یہ منصوبہ بہت پسند آیا چنانچہ آئندہ ایک گھنٹے میں، میں نے اس کام کو دو مراحل میں بخیر وخوبی نمٹا دیا مگر اس ہنگامی تگ و دو کا نتیجہ صفر کے برابر برآمد ہوا۔ مالِ مسروقہ چودھری کے ذاتی ملازمین (خواتین و حضرات) کے پاس تھا اور نہ ہی اس کے مہمانوں (مرد وزن) کے سامان میں کہیں موجود تھا۔

اس صورتِ حال میں، میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ چودھرائن کی تجوری سے چوری کیے جانے والے زیورات، نقدی اور جڑاؤ کنگن وغیرہ کو میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی حویلی کے باہر کسی اور جگہ منتقل کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ ان اشیا کا سراغ لگانے اور انہیں بازیاب کرنے کے لیے مجھے اپنی تفتیش کے دائرے کو موضع چک چوتن [illegible] کے باہر دور تک پھیلانے کی ضرورت تھی۔

میں نے چودھری فیاض سے آئندہ روز دوبارہ آنے کا وعدہ کیا اور اسے سلام کر کے حویلی سے باہر نکل آیا۔ کانسٹیبل علی بخش کی معیت میں واپسی کے سفر کے دوران میں، میں مسلسل چوری کی اس پراسرار اور عجیب وغریب واردات کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

آئندہ روز میں چودھری فیاض کی طرف جانے سے پہلے تھانے کے ضروری امور نمٹا رہا تھا کہ ایک فریادی مجھ سے ملنے آ گیا۔ میں نے فوراً مردِ مذکور کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

اس بندے کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان رہی ہو گی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ وہ شکل وصورت اور حلیے سے مزدور پیشہ دکھائی دیتا تھا۔ اس وقت وہ خاصا پریشان اور اندر سے بکھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔

میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا اور پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"پرویز!" اس نے بتایا۔ "لیکن چک میں سب مجھے "پیجا" کہتے ہیں تھانیدار صاحب!"

"کیا تم چک چوتن ہی کے رہنے والے ہو؟"

"جی تھانیدار صاحب!"

"پیجا! تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ "ایسا لگ رہا ہے جیسے تم نے کسی نہایت ہی ڈراؤنی شے کو دیکھ لیا ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں سرکار!" وہ روہانسی آواز میں بولا۔

"پھر کیسی بات ہے پیجا؟" میں نے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔ "کس چیز نے تمہیں اس قدر خوفزدہ اور لاچار بنا دیا ہے؟"

"سلمٰی کل سے لاپتا ہے۔" اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"اور یہ سلمٰی کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سلمٰی میری بیوی ہے تھانیدار صاحب!" پرویز عرف پیجا نے بتایا۔ "ہمارے چار بچے بھی ہیں جن میں سب سے چھوٹی بیٹی ابھی صرف نو ماہ کی ہوئی ہے۔ وہ ماں کا دودھ پیتی ہے، وہ رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ سلمٰی کہاں غائب ہو گئی ہے۔ میں نے اپنے طور پر اسے ہر جگہ تلاش کر لیا مگر وہ مجھے کہیں نہیں ملی۔ پتا نہیں سلمٰی کو کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے یا وہ......!"

پیجا اچانک رکا تو میں نے سوال داغ دیا۔ "یا وہ......کیا؟"

"یا وہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔" اس نے زخمی لہجے میں کہا۔

میں حیرت بھری نظر سے اسے تکنے لگا۔

"آپ مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں تھانیدار صاحب......" وہ شاکی لہجے میں بولا۔ "میری بات کا یقین کریں، میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

"کیا تمہاری بیوی کا گاؤں کے کسی مرد کے ساتھ کوئی چکر چل رہا تھا؟"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا......" وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔

"تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

"سات سال، دو ماہ جناب......!"

"اور تمہارے چار بچے بھی ہیں؟"

"جی سرکار!" اس نے سر کی اثباتی جنبش کے ساتھ جواب دیا۔ "سب سے بڑی بیٹی شاہدہ پانچ سال کی ہے۔ اس سے ایک سال چھوٹا عارف ہے، عارف کے بعد دو سال کا طارق ہے اور سب سے چھوٹی بیٹی زبیدہ ابھی صرف نو ماہ کی ہے۔"

"تم پچھلے سات سال سے نہ صرف سلمٰی کے ساتھ

ایک شوہر کی حیثیت سے رہ رہے ہو بلکہ اس کے بطن سے تمہاری چار اولادیں بھی ہو چکی ہیں۔'' میں نے کڑے انداز میں پوچھا۔ ''اور اب تک تمہیں یہ بھی پتا نہیں چلا کہ تمہاری بیوی کا کسی کے ساتھ کوئی غیر اخلاقی معاملہ تھا یا نہیں......؟''

''وہ جی، میں تو ایک محنت کش انسان ہوں مائی باپ!'' وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ ''میں سارا دن کھیتوں میں مزدوری کرتا ہوں۔ میرے پیچھے سلمٰی کس کس سے ملتی ہے، بھلا میں کیسے جان سکتا ہوں!''

''نہیں، تم تو صرف الزام لگانا جانتے ہو......!'' میں نے اسے تیز نظر سے گھورا اور سوال کیا۔ ''پیجا! تم نے کس بنا پر کہا کہ سلمٰی اپنے چاروں بچوں کو چھوڑ کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہوگی؟''

''بات دراصل یہ ہے تھانیدار صاحب......!'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جیسا میں نے آپ کو بتایا ہے، میں صبح گھر سے نکل جاتا ہوں اور دن ڈھلنے کے بعد ہی گھر واپس آتا ہوں۔ صبح سے شام تک کھیتوں میں محنت مزدوری کر کے میں بہت زیادہ تھک جاتا ہوں۔ گھر آ کر میں ہاتھ منہ دھونے کے بعد کھانا کھاتا ہوں اور پھر سو جاتا ہوں۔ پچھلی شام جب میں کھیتوں سے لوٹا تو سلمٰی گھر میں موجود نہیں تھی۔ اسی وقت ہماری پڑوسن میرے چار بچوں کو لے کر آ گئی اور اس نے عجیب کہانی سنائی......!'' لمحاتی توقف کر کے اس نے دو، تین گہری سانسیں لیں پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''ہماری پڑوسن نورین نے مجھے بتایا کہ سہ پہر سے تھوڑی دیر پہلے سلمٰی چاروں بچے اس کے پاس چھوڑ کر، یہ بتا کر کہیں چلی گئی تھی کہ ایک گھنٹے میں واپس آجائے گی مگر دن ڈھل جانے کے باوجود بھی وہ نہیں آئی۔ نورین میرا انتظار کرنے لگی۔ جب میں گھر پہنچا تو چاروں بچوں کو لے کر وہ میرے پاس آ گئی......!''

''کیا سلمٰی پہلے بھی کبھی اس طرح غائب ہوئی ہے؟'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے استفسار کیا۔

''نہیں جناب......!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''لیکن نورین نے مجھے ایک عجیب و غریب بات بتائی ہے......!''

''کون سی بات پیجا؟'' میں نے دلچسپی بھرے لہجے میں پوچھا۔

''نورین کا کہنا ہے کہ سلمٰی تو اکثر اپنے بچے اس کے پاس چھوڑ کر گھنٹے، دو گھنٹے کے لیے کہیں چلی جایا کرتی تھی......!'' پیجا نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''اور پھر شام سے پہلے واپس بھی آ جاتی تھی لیکن کل ایسا نہیں ہوا۔ میں نے پورے گاؤں میں سلمٰی کو ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔ صبح ہوتے ہی میں آپ کے پاس آ گیا ہوں۔ رات میں میری بہن بچوں کو سنبھالنے کے لیے میرے گھر آ گئی تھی۔ آج میں کھیتوں کی طرف بھی نہیں گیا......!''

''تمہارے ساتھ سلمٰی کا عمومی رویہ کیسا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

پیجا نے اپنی پڑوسن نورین کے بیان کی روشنی میں مجھے جو کچھ بتایا تھا، اس کے بعد میں بھی یہ سوچنے لگا تھا کہ عین ممکن ہے، سلمٰی نے واقعی پیجا اور اپنے چار بچوں کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا ہو اور کوئی عورت ایسا سنگین غیر اخلاقی قدم اسی وقت اٹھاتی ہے جب اسے کسی نامحرم مرد کا غیر سماجی سہارا میسر ہو۔ اگرچہ پیجا اپنی بیوی کی غیر نصابی سرگرمیوں سے واقف نہیں تھا لیکن اس کا یہ کہنا کہ سلمٰی کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہوگی، خالی از وزن نہیں تھا۔

''شادی کے فوراً بعد ہی ہمارے درمیان جھگڑے شروع ہو گئے تھے۔'' پرویز عرف پیجا نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''وہ میرے ساتھ غیروں جیسا سلوک کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ میں اس کی زیادتیوں کو برداشت کرنے کا عادی ہوتا چلا گیا۔ اس دوران میں ایک کے بعد ایک ہمارے بچے بھی پیدا ہونے لگے۔ بس، جناب! پھر میں بچوں کی وجہ سے مجبور ہو گیا......'' وہ لمحے بھر کے لیے تھما پھر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''پچھلے سات سال میں مجھے اس بات کا تو اچھی طرح احساس ہو گیا تھا کہ سلمٰی کے دل میں میرے لیے وہ محبت نہیں ہے جو ایک وفا شعار بیوی کو اپنے شوہر سے کرنا چاہیے لیکن اس بات کا بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ مجھے اتنا زیادہ ناپسند کرتی ہے کہ ایک دن یوں چھوڑ کر چلی جائے گی......!''

پیجا کی بپتا سن کر مجھے ایک بہت پرانا قصہ یاد آ گیا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نیا نیا پولیس میں بھرتی ہوا تھا۔ تب تک وطنِ عزیز پاکستان ابھی معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا۔ میں نوجوان تھا اور میری ٹریننگ کا عمل جاری تھا۔ مشرقی پنجاب کے اس ٹریننگ سینٹر میں ہمارے ایک سینئر افسر نے ایک میاں بیوی کا دلچسپ واقعہ سنا کر ہم سب کو ہنسنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مذکورہ میاں بیوی کی شادی کو اگرچہ پچیس سال ہو گئے تھے مگر ان میں ایک دن بھی بن کر نہیں دی تھی۔ صبح شام ان میں جھگڑا ہونا ایک لازمی امر تھا۔

پڑوسی ان کی لڑائی بھڑائی سے نالاں تھے۔ ہر روز یہی محسوس ہوتا تھا کہ بس، اب ان کا رشتہ ختم ہو جائے گا لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ مزے کی بات یہ کہ اس قدر مزاجی اختلافات کے باوجود بھی ان کے درجن بھر بچے تھے۔ کہانی کے آخر میں ہمارے ٹرینر نے کہا تھا۔

''میاں بیوی کا رشتہ بھی عجیب ہے۔ ہزار ناپسندیدگی کی موجودگی میں بھی، افزائشِ نسل کے معاملے میں وہ کسی تعطل یا غفلت کا مظاہرہ نہیں کرتے......!''

''تمہارے پاس سلمٰی کی کوئی تصویر ہے؟'' ایک فوری خیال کے تحت میں نے پوچھ لیا۔

''جی ہاں......!'' اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا پھر پوسٹ کارڈ سائز کی ایک بلیک اینڈ وہائٹ تصویر نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تھانیدار صاحب! یہ فوٹو ہم نے شادی کے فوراً بعد، شہر جا کر کھنچوائی تھی۔ آپ کی طرف آتے ہوئے میں نے اسے احتیاطاً اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔''

میں نے مذکورہ تصویر کا بہ غور جائزہ لیا۔ وہ کم و بیش سات سال پہلے کی بلیک اینڈ وہائٹ تصویر تھی جس میں سلمٰی نہایت ہی حسین و جمیل اور بھولی بھالی نوعمر لڑکی نظر آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ پرویز کو دیکھ کر بے ساختہ میرے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا۔ ''پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت!''

''کیا تمہیں کسی پر شک ہے؟'' میں نے پیجا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے، گاؤں کا کوئی ایسا وسنیک جس کے ساتھ تمہاری بیوی بھاگ سکتی ہو......!''

''ایسا کوئی بندہ میری نظر میں تو نہیں ہے جی......!'' وہ پرسوچ انداز میں بولا۔ ''ہاں مگر......!'' وہ بولتے بولتے اچانک رک گیا۔

میں نے تیز آواز میں استفسار کیا۔ ''مگر کیا......؟''

''مجھے پتا چلا تھا کہ سلمٰی شادی سے پہلے ایک شخص کو پسند کرتی تھی لیکن وہ سلمٰی کو گھاس نہیں ڈالتا تھا۔'' پیجا نے بتایا۔ ''پھر سلمٰی کی مجھ سے شادی ہو گئی اور یہ قصہ دب گیا۔''

میں نے فوٹو میں سلمٰی کو دیکھا تھا۔ اس کے حسن و خوب صورتی میں کوئی کمی نہیں تھی۔ اگر وہ بندہ سلمٰی پر توجہ نہیں دیتا تھا تو اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ شادی شدہ ہوگا اور یا پھر اس کی نظر سلمٰی سے کہیں زیادہ پرکشش اور جاذبِ نگاہ عورت پر ٹکی ہوگی۔

''اس گلفام کا نام کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی...... کس کا نام؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے فوراً وضاحت کر دی۔ ''میں اس بندے کے بارے میں پوچھ رہا ہوں، سلمٰی جسے پسند کرتی تھی۔ یقیناً وہ شخص کوئی گلفام ہی ہوگا...... یعنی تم سے زیادہ وجیہہ و شکیل اور دھانسو شخصیت کا مالک......؟''

''ایسی کوئی بات نہیں تھانیدار صاحب......!'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''اس کا نام سیف اللہ تھا۔ اول درجے کا آوارہ اور لفنگا۔ پتا نہیں، سلمٰی نے سیف کے اندر کیا دیکھ لیا تھا......؟''

''جب میں تمہاری بیوی کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاؤں گا تو میں اس سے یہ سوال ضرور پوچھوں گا......'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''کیا سیف کی شادی ہو گئی؟''

''نہیں جی......!'' اس نے عجیب سے انداز میں جواب دیا۔ ''شادی تو نہیں ہوئی مگر چھ سال پہلے سیف کو جیل ضرور ہو گئی تھی۔''

''جیل......!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ ''وہ کس جرم میں جیل گیا تھا اور اسے کتنی سزا ہوئی تھی؟''

''سیف نے گوجرہ کے رہنے والے اپنے ہی جیسے ایک بدقماش آدمی کے ساتھ مل کر لائل پور شہر میں ڈکیتی کی ایک واردات کی تھی۔'' اس نے نفرت بھرے انداز میں جواب دیا۔ ''اس واقعے کے دو ماہ بعد پولیس نے انہیں لاہور سے گرفتار کر لیا تھا۔ ان دونوں پر لائل پور کی ایک عدالت میں مقدمہ چلا تھا جس کے نتیجے میں انہیں جیل جانا پڑا تھا۔ یہ مجھے پتا نہیں کہ انہوں نے کتنی سزا پائی تھی۔''

''سیف اللہ کے گھر والے تو اب چک چون۔گ ب ہی میں ہوں گے؟'' اس کی بات ختم ہونے پر میں نے سوال کیا۔

''اس کی صرف ایک بوڑھی ماں تھی۔'' پیجا نے بتایا۔ ''سیف کی گرفتاری نے اللہ رکھی کو چارپائی سے لگا دیا تھا۔ لگ بھگ چار سال پہلے وہ اللہ کو پیاری ہو گئی۔''

''ٹھیک ہے پیجا!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں ابھی تمہاری بیوی کو تلاش کرنے کے لیے اپنے نوجوانوں کی ایک ٹیم بنا کر انہیں اس مہم پر روانہ کرتا ہوں۔ تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ سلمٰی جہاں بھی ہوگی، میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔''

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھے دعائیں دیتے

ہوئے تھانے سے رخصت ہوگیا۔ میں ایک کانسٹیبل کے ہمراہ چودھری فیاض احمد کی حویلی کی طرف روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

چودھری بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں دوپہر کے وقت جب اس کی حویلی پہنچا تو مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گیا۔ کمرے کے ایک کونے میں کوئلوں والی انگیٹھی دہکی ہوئی تھی اور وہاں کی فضا خاصی خوش گوار محسوس ہو رہی تھی۔

جب ہم آمنے سامنے بیٹھ چکے تو اس نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کی طرف اپنے کسی بندے کو دوڑانے ہی والا تھا کہ آپ تشریف لے آئے......!''

چودھری کی حالت دیکھ کر میرے ذہن کے کسی خانے میں ایک سرخ بتی جل اٹھی تھی۔ اس کے بے نام اضطراب کے نتیجے میں، میں نے پوچھ لیا۔

''چودھری صاحب! سب خیریت تو ہے نا۔ آپ کا چہرہ کیوں اترا ہوا ہے۔ آپ کسی بندے کو تھانے کیوں بھیجنا چاہتے تھے؟''

''آپ کو بلانے کے لیے ملک صاحب!'' اس نے پریشانی بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''کیونکہ یہاں ایک گڑبڑ ہوگئی ہے۔''

''کیسی گڑبڑ چودھری صاحب؟'' میں نے استفسار کیا۔

اس نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ''مہمان خانے میں سے ایک بندہ غائب ہوگیا ہے۔''

''یہ کب کی بات ہے؟'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''اس کا صحیح اندازہ تو نہیں ہے ملک صاحب!'' چودھری بے بسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے آج صبح اس واقعے کی اطلاع دی گئی ہے۔''

گزشتہ روز میں نے حویلی کے بیرونی حصے میں بنے ہوئے مہمان خانے کا تفصیلی معائنہ کیا تھا۔ زنان خانے میں آٹھ عورتیں اور مردان خانے میں بارہ مرد ٹھہرے ہوئے تھے۔ بعد ازاں میں نے کانسٹیبل علی بخش کی مدد سے ان بیس مہمانوں کے سامان کی تلاشی بھی لی تھی۔

''چودھری صاحب! کل آپ نے میرے مشورے پر خواتین مہمانوں کو حویلی اور حضرات مہمانوں کو اپنی زمینوں اور باغات وغیرہ کی سیر کرائی تھی۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''کیا واپسی پر مردوں کی تعداد پوری تھی؟ میرا مطلب ہے جو بارہ مرد مہمان آپ کے بندوں کے ساتھ حویلی سے باہر گئے تھے، وہ سب کے سب واپس آئے تھے؟''

''مجھے یہیں پر گڑبڑ محسوس ہو رہی ہے ملک صاحب!'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔

''آپ کھل کر بتائیں چودھری صاحب!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں پوری توجہ سے آپ کو سن رہا ہوں۔''

''دیکھیں جناب!'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میرے حکم پر رجوان آٹھ مہمان عورتوں کو حویلی دکھانے اندر لے آئی تھی اور مردوں کے ساتھ میں نے کرامت علی عرف کراما کو باہر بھیج دیا تھا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہا لیکن آج صبح پتا چلا کہ بارہ مردوں میں سے ایک غائب ہے۔ میں نے کراما کو اپنے پاس بلا کر پوچھ تاچھ کی تو اس نے مجھے ایک ایسی بات بتائی جو میری نظر میں تو خاص اہمیت کی حامل نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے آپ اس کے اندر سے کچھ برآمد کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔''

بات کے اختتام پر چودھری نے امید بھری نظر سے مجھے دیکھا تو میں نے کہا۔ ''میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

''کراما نے مجھے بتایا کہ جب وہ مہمانوں کو سنگترے کا باغ دکھا رہا تھا تو ان میں سے ایک بندہ رفع حاجت کے لیے باغ کے نزدیک ہی واقع ایک ایسے کھیت میں چلا گیا تھا جس کے اندر قدِ آدم فصل کھڑی تھی۔'' چودھری نے بتایا۔ ''کراما اس کے بعد مہمانوں کو لے کر جب واپس آیا تو اس وقت سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ کراما کو یاد نہیں کہ جو بندہ کھڑی فصل کے اندر اپنا بوجھ ہلکا کرنے گیا تھا، وہ وہاں سے باہر نکلا تھا کہ نہیں، بہرکیف......!'' وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے تھما پھر اپنے الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''میں نے اس کوتاہی پر کراما کو بہت زیادہ جھڑکا ہے مگر وہی بات کہ ہونے والی غلطی ہو کر رہتی ہے۔''

''کیا وہی مہمان غائب ہے جو گزشتہ روز رفع حاجت کے لیے کھڑی فصل کے اندر گیا تھا؟''

چودھری نے اثبات میں جواب دیا۔ ''جی وہی۔''

ان لمحات میں میرا دماغ معمول سے دوگنا رفتار کے ساتھ مصروف کار تھا۔ میں نے چودھری سے پوچھا۔ ''اس بندے کا نام کیا ہے؟''

''فرید گھمن!'' اس نے بتایا۔ ''وہ چوری والی رات ہی یہاں پہنچا تھا۔ میرا مطلب ہے پرسوں شام میں۔''

''فرید گھمن کہاں سے آیا تھا؟'' میں نے سوال کیا۔ ''کیا وہ اکیلا ہی تھا یا اس کے ساتھ کوئی عورت بھی ستارہ کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے آپ کی حویلی پہنچی تھی؟''

میرے اس استفسار کا ایک خاص سبب تھا۔ میں نے زنان خانے میں جو آٹھ خواتین دیکھی تھیں، وہ کسی نہ کسی مرد کے ساتھ ہی وہاں آئی تھیں۔ البتہ مردوں میں بعض ایسے تھے جو اکیلے ہی آئے تھے اسی لیے ان کی تعداد زیادہ تھی۔

"فرید کھمن اکیلا ہی تھا ملک صاحب!" چودھری فیاض احمد نے بتایا۔ "اور وہ گوجرہ کا ایک چھوٹا زمیندار ہے۔"

گوجرہ کا ذکر سنتے ہی میرے دماغ میں روشنی کا ایک جھماکا ہوا۔ کوئی گھنٹا بھر پہلے پرویز عرف پیجا نے مجھے بتایا تھا کہ سیف اللہ نے اپنے جس دوست کے ساتھ مل کر لائل پور (فیصل آباد) میں ڈکیتی کی واردات کی تھی، اس بندے کا تعلق بھی گوجرہ ہی سے تھا۔

"چودھری صاحب!" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر معتدل انداز میں استفسار کیا۔ "فرید کھمن کی آمد پر کیا آپ نے اس سے ملاقات کی تھی؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "اس شام میں جلدی سو گیا تھا۔ مجھے آئندہ روز پتا چلا تھا کہ گوجرہ سے فرید کھمن آیا ہوا ہے۔ پھر اسی دن چودھرائن جی کی تجوری والا واقعہ بھی پیش آیا تھا۔ اس لیے میں صبح ہی سے اس پریشانی میں گھر گیا تھا اور فرید کھمن سے ملنے کا خیال میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔"

"یعنی آپ وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ......!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ "جو بندہ غائب ہوا ہے وہ واقعتاً ہی فرید کھمن تھا جسے آپ جانتے ہیں؟"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ کسی اسپرنگ کے مانند اچھل پڑا۔

"مطلب میں بعد میں واضح کروں گا چودھری صاحب!" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "پہلے آپ میرے سوال کا جواب دیں۔"

وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ "میں نے اس بندے کو دیکھا نہیں تھا اس لیے دعوے کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ گوجرہ والا فرید کھمن ہی تھا یا کوئی اور۔"

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ پچھلے روز اس چک کے ایک کھیت مزدور پرویز عرف پیجا کی بیوی اور اس کے چار بچوں کی ماں سلمٰی بھی عین اسی وقت غائب ہوگئی تھی جب آپ کا مبینہ مہمان فرید کھمن رفع حاجت کے لیے کمڑی کے اندر داخل ہوا تھا؟" میں نے چودھری فیاض احمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ "میں سلمٰی کی گمشدگی سے ابھی تک لاعلم ہوں ملک صاحب! کیا سلمٰی اور فرید کھمن کی گمشدگی میں آپ کو کوئی تال میل نظر آرہا ہے؟"

"میرا تخیل مجھے ایسا دکھانے کی کوشش کر رہا ہے چودھری صاحب!" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"کچھ مجھے بھی تو بتائیں۔" وہ اضطراری لہجے میں بولا۔

"کچھ نہیں، میں سب کچھ آپ کے سامنے رکھ دوں گا چودھری صاحب!" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "پہلے آپ میرے ایک سوال کا جواب دیں۔"

"جی پوچھیں۔"

"کیا آپ کو یاد ہے......!" میں نے بدستور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ "کم و بیش چھ سال پہلے اس گاؤں کا رہنے والا ایک شخص لائل پور میں ڈکیتی کرنے کے دو ماہ بعد پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ اس بندے کا نام سیف اللہ تھا؟"

"ہاں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔ "سیف لاہور سے پکڑا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک بندہ اور بھی تھا۔ دونوں پر لائل پور میں مقدمہ چلا تھا اور انہیں جیل ہوگئی تھی۔"

"آپ کی یادداشت اچھی ہے چودھری صاحب!" میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "اب میں آپ کے سوال کا جواب دوں گا۔" لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"سلمٰی، پیجا سے شادی سے پہلے سیف اللہ کو چاہتی تھی اور سیف اللہ نے اپنے جس دوست کے ساتھ مل کر لائل پور میں ڈکیتی ماری تھی، وہ بندہ گوجرہ کا رہنے والا تھا۔" میں نے معتدل انداز میں اپنی سوچ کو چودھری فیاض احمد تک پہنچا دیا۔ "آپ کا گوجرہ والا مہمان فرید کھمن اور پیجا کی بیوی سلمٰی ایک ہی وقت پر چک چون۔گ ب سے غائب ہوئے ہیں۔ میرا تھانیدارانہ دماغ تو مجھے یہی کہہ رہا ہے کہ آپ کا تعلق دار فرید کھمن آف گوجرہ یہاں آیا ہی نہیں تھا۔ یہ کوئی دوسرا ہی چکر ہے۔"

"میں ابھی اپنے کسی بندے کو گوجرہ بھیج کر پتا لگا لیتا ہوں کہ فرید کھمن پرسوں شام یہاں آیا تھا یا نہیں۔" چودھری نے جوش بھرے انداز میں کہا۔ "پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجائے گا۔"

"اور میں گڑے مردے اکھاڑنے لائل پور جا رہا

ہوں چودھری صاحب!'' میں نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''ان شاء اللہ جلد ملاقات ہوگی۔''

وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔ ''ان شاء اللہ!''

چودھری فیاض احمد نے مجھ سے یہ پوچھنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ میں لائل پور میں کس کا گڑا ہوا مردہ اکھاڑنے جا رہا تھا اور میں نے بھی اپنے ہنگامی اقدام کے بارے میں اسے بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ لگ کچھ ایسا رہا تھا کہ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کی سوچ سے ''واقفیت'' رکھتے تھے۔

☆☆☆

آئندہ روز میں علی الصباح تیار ہو کر تھانے سے نکل گیا۔ ناشتہ میں نے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹرز میں جا کر کیا اور وہاں کے متعلقہ افسر کو اپنی آمد کی غرض و غایت سے آگاہ کرنے کے بعد میں لائل پور کی سینٹرل جیل پہنچ گیا۔

جیل سپرنٹنڈنٹ رائے بشیر احمد کھرل نے توجہ سے میری بات سنی پھر کسی سرکاری اہلکار کو آواز دے کر ریکارڈ روم سے ایک موٹا سا رجسٹر منگوایا۔ کچھ دیر تک وہ مذکورہ رجسٹر کی ورق گردانی کرتا رہا پھر نعرہ لگانے والے انداز میں بولا۔

''مل گیا ملک صاحب!''

''کیا مل گیا کھرل صاحب؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''آپ کا کیس۔'' اس نے رجسٹر کے مندرجات پر انگلی رکھ کر مجھے بتایا۔ ''آپ جو معلومات حاصل کرنے میرے پاس آئے ہیں، وہ سب یہاں پر ہیں۔''

''جی، مہربانی آپ کی کھرل صاحب!'' میں نے تشکرانہ انداز میں کہا۔ ''آپ بتائیں، میں پورے انہماک کے ساتھ آپ ہی کو سن رہا ہوں۔''

''کم و بیش چھ سال پہلے چک چونتیس۔ گ ب ٹوبہ ٹیک سنگھ کے رہنے والے سیف اللہ نے گوجرہ کے وسنیک حنیف احمد کے ساتھ مل کر لائل پور شہر میں ڈکیتی کی جو واردات کی تھی، اس کی سزا ان دونوں نے اسی جیل میں بھگتی ہے۔''

''ایک منٹ کھرل صاحب!'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''سزا بھگتی ہے کا صاف صاف مطلب تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ان کی رہائی عمل میں آچکی ہے؟''

''آپ بالکل ٹھیک سمجھ رہے ہیں ملک صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہمارے جیل ریکارڈ کے مطابق، وہ دونوں تین ماہ پہلے یہاں سے جا چکے ہیں۔''

''آپ کے خیال کے مطابق سیف اور حنیف اس وقت کہاں ہوں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس بارے میں، میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا ملک صاحب!'' اس نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ ''رہائی کے بعد قیدی عموماً اپنے گھر ہی جاتے ہیں۔ آپ وہاں سے پتا کر سکتے ہیں۔''

میں نے جیل سپرنٹنڈنٹ رائے بشیر احمد کھرل کا شکریہ ادا کیا اور شام سے پہلے اپنے تھانے واپس آگیا۔

اب کی بار مجھے چودھری کی حویلی جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی بلکہ اگلے روز دوپہر میں وہ خود میرے پاس آگیا تھا۔ اس کے ساتھ دو بندے بھی تھے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اسے اپنی لائل پور والی کارگزاری کے بارے میں بتایا تو اس نے مجھے گوجرہ کا احوال سنا دیا جو خاصا دلچسپ اور مفید تھا۔

''ان سے ملیں ملک صاحب!'' وہ اپنے ایک ساتھی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تعارف کرانے والے انداز میں بولا۔ ''یہ اصلی فرید گھمن ہے جو آج صبح گوجرہ سے یہاں پہنچے ہیں اور یہ ہے سیف اللہ کا وہ دوست حنیف احمد جس کے ساتھ مل کر اس نے لائل پور شہر میں ڈکیتی کی واردات کی تھی۔'' اس نے دوسرے بندے کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے مزید بتایا۔ ''یہ دونوں تین ماہ پہلے ہی جیل سے رہا ہوئے ہیں۔ حنیف نے برے کاموں سے توبہ کر کے کھیتی باڑی شروع کر دی ہے اور سیف اللہ کا کچھ پتا نہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہوگا۔ اسے ڈھونڈنا آپ کا کام ہے۔ اب اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ ڈیرے والی چوری سیف اللہ ہی نے کی ہے۔''

''چودھری صاحب! آپ تو مجھ سے بھی زیادہ اہم معلومات نکال کر لائے ہیں۔'' میں نے توصیفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے معنی خیز انداز میں بولا۔ ''اب آپ بھی مالِ مسروقہ بازیاب کر کے مجھے شکریے کا موقع دیں اور یہ کام آپ نے ستارہ کی رخصتی سے پہلے کرنا ہے..... ٹھیک ہے؟''

''فکر نہ کریں چودھری صاحب!'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''آپ کا کام وقت سے پہلے ہو جائے گا۔''

''یہ ہوئی نا بات۔'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

میں نے حنیف احمد سے پوچھا۔ ''کیا تم نے واقعی برائی کی راہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟''

''جی تھانیدار صاحب!'' وہ مستحکم لہجے میں بولا۔ ''یہ بات میری سمجھ میں آگئی ہے کہ اس کام کی آخری منزل جیل

ہی ہے۔"
"کیا میں یہ سمجھوں کہ تم سیف اللہ کو تلاش کرنے میں میری مدد کرو گے؟" میں نے حنیف کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔
"جی میں ضرور آپ کی مدد کروں گا۔" وہ پُرعزم لہجے میں بولا۔ "کیونکہ میں نے سولہ آنے سچی توبہ کی ہے تھانیدار صاحب!"
میں نے حنیف کو اپنے پاس رکھ کر چودھری فیاض احمد [illegible] فرید گمن کو جانے کی اجازت دے دی۔

☆☆☆

پولیس کی تفتیش کی گاڑی جب صحیح سمت میں رواں دواں ہو تو درست منزل تک پہنچنے میں سال مہینے نہیں بلکہ چند دن ہی کافی ہوتے ہیں۔ حنیف نے سیف کے ساتھ چھ سال جیل کاٹی تھی اور [illegible] میں سیف کا پارٹنر ان کرائم بھی رہا تھا لہٰذا وہ اس کی رگ رگ سے واقف تھا۔ میں نے آئندہ تین دن تک حنیف کی [illegible] میں کئی جگہ چھاپے مارے۔ بالآخر سیف اور سلمٰی [illegible] کے ایک گھر سے برآمد ہو گئے۔
وہ گھر سیف کے ایک دوست صابر علی کا تھا جہاں وہ دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے رہ رہے تھے۔ سیف نے صابر کو یہی بتایا تھا کہ اس نے حال ہی میں سلمٰی سے شادی کی ہے۔ میں اسی روز سلمٰی اور سیف اللہ کو گرفتار کر کے چک جھمرا سے چک چوّن۔ گ ب اپنے تھانے لے آیا۔
اس ایک ہفتے میں سیف اور سلمٰی نے نقد رقم دو ہزار روپے میں سے صرف ایک سو خرچ کیے تھے اور طلائی زیورات بھی اس کے پاس سے برآمد ہو گئے تھے لیکن جڑاؤ کنگن والی جوڑی کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ میں نے کڑے لہجے میں اس سے پوچھا۔
"چودھری صاحب کے وہ خاندانی جڑاؤ کنگن کہاں ہیں۔"
"میں کنگنوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھانیدار صاحب!" وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ "میرے پاس جو کچھ تھا، وہ میں آپ کے حوالے کر چکا ہوں۔"
"جڑاؤ کنگنوں کی وہ جوڑی بھی چودھرائن کی اسی تجوری میں رکھی ہوئی تھی جہاں سے تم نے دو ہزار روپے کے کرنسی نوٹ اور دس تولے سونے کے طلائی زیورات چرائے تھے۔" میں نے بے رحم لہجے میں کہا۔ "سچ اگل دو ورنہ میں تمہاری کھال ادھیڑ ڈالوں گا۔"
وہ جڑاؤ کنگن کی جوڑی کے حوالے سے اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے اللہ رسول کی قسمیں کھانے لگا۔ اس وقت حوالدار جاوید شاہ بھی میرے پاس کھڑا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔
"ملک صاحب! اس بدبخت کو ایک گھنٹے کے لیے میرے سپرد کر دیں۔ میں آپ کا کام آسان کر دوں گا، یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔"
میں نے حوالدار کی فرمائش پوری کر دی۔
سیانے سچ کہہ گئے ہیں کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ حوالدار ایک گھنٹے کے لیے سیف کو ٹرائل روم میں لے گیا تھا لیکن آدھے گھنٹے کے بعد ہی وہ واپس آ گیا اور مجھ سے پوچھا۔
"ملک صاحب! آپ نے سیف کی کربناک چیخیں تو سنی ہوں گی؟"
"ہاں سنی ہیں۔" میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "جاوید شاہ! آخر تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟"
"میں نے سلمٰی کو سامنے بٹھا کر سیف کی "آؤ بھگت" کی ہے۔" وہ فاتحانہ انداز میں بولا۔ "یہ نیک کام شروع کرنے سے پہلے میں نے سلمٰی کو باور کرا دیا تھا کہ سیف کے بعد اس کا نمبر ہے۔ بس پھر وہ سیف کی زبان کھلنے سے پہلے ہی اندر سے ٹوٹ کر میری منت ساجت کرنے لگی۔ وہ دونوں اپنا اصلی بیان ریکارڈ کرانے کے لیے تیار ہیں۔"
آئندہ ایک گھنٹے میں، میں نے انہیں ایک ساتھ اپنے سامنے کھڑا کر کے ان کا بیان حلفی قلم بند کر لیا۔ انہوں نے مجھے جو کچھ بتایا، وہ میرے [illegible] لیے خلاف توقع اور سنسنی خیز تھا۔ اس بیان کے خلاصے کا خلاصہ میں آپ کی نذر کرتا ہوں۔
سیف اللہ کے جیل جانے سے پہلے اس کا چودھری فیاض احمد کی بڑی بیٹی مہر النساء [illegible] سے عاشقہ چل رہا تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے کو محبت بھرے خط بھی لکھا کرتے تھے۔ پھر سیف کو چھ سال کی سزا ہو گئی اور مہر النساء ایک سال کے بعد شادی کر کے حویلی سے رخصت ہو گئی۔ تین ماہ پہلے جب سیف رہا ہوا تو اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اس کی ماں اللہ رکھی کا انتقال ہو چکا تھا اور محبوبہ مہرو اور کی بیوی بن چکی تھی۔ اس صورت حال میں اس کے شیطانی ذہن نے مہرو کو بلیک میل کر کے مالی فائدہ حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ وہ جانتا تھا کہ سلمٰی اسے پسند کرتی ہے۔ اس نے سلمٰی سے خفیہ رابطہ کیا اور شادی کے وعدے پر اسے ساتھ دینے کو کہا۔ سلمٰی فوراً تیار ہو گئی۔ سیف نے سلمٰی کے ذریعے مہرو کو دھمکی دی کہ اگر اس نے اس کے لیے فوری طور

پر تگڑی رقم کا بندوبست نہ کیا تو وہ اس کے تمام عشقیہ خطوط اس کے خاوند اعجاز حسین کو پہنچا دے گا جس کے بعد مہرو کی طلاق تو پکی ہے۔ مہرو اس کی دھمکی سے ڈر گئی اور اس نے اپنی ماں کی تجوری میں جھاڑو پھیر کر سیف کا مطالبہ پورا کر دیا۔ سیف اللہ کو فرید گھمن کی حیثیت سے حویلی والے مہمان خانے میں ٹھہرانے کا انتظام بھی مہرو ہی نے کیا تھا......وغیرہ وغیرہ!

یہاں تک تو سب ٹھیک تھا لیکن جڑاؤ کنگن کی جوڑی ابھی تک منظر سے غائب تھی۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے میں چودھری فیاض احمد کی حویلی پہنچ گیا۔ میں معاملے کی تہ تک تو پہنچ گیا تھا مگر عملی تجربہ کرنا بھی ناگزیر تھا۔

میں نے برآمد شدہ سونے کے زیورات اور ایک ہزار نوسو روپے کے کرنسی نوٹ چودھری کے سامنے رکھنے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''چودھری صاحب! میں نے آپ کے مجرم کو گرفتار کرلیا ہے۔ اس کے پاس سے بس یہی کچھ برآمد ہوا ہے۔''

اس نے برآمد شدہ زیورات کا جائزہ لینے کے بعد سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ''اور وہ خاندانی جڑاؤ کنگن......؟''

''وہ اس وقت بھی آپ کی حویلی کے اندر ہی ہیں۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' وہ حیرت زدہ لہجے میں مستفسر ہوا۔

''آپ اپنی بڑی بیٹی مہر النساء کو یہاں بلالیں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''پھر ساری کہانی آپ کی سمجھ میں آجائے گی۔''

مہرو کی آمد سے پہلے میں نے چودھری فیاض کو حقیقتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس کے تو گویا کانوں سے دھواں نکلنے لگا تھا۔ میں نے سمجھا بجھا کر اسے نارمل کر دیا۔ جب مہرو وہاں آئی تو میں نے نرم لہجے میں کہا۔

''مہر النساء! تم میری بیٹی کی طرح ہو، اس لیے مجھے امید ہے کہ تم سولہ آنے سچ بولوگی۔ سیف اللہ اور سلمٰی اس وقت میرے تھانے کی حوالات میں بند ہیں۔ انہوں نے مجھے ساری کہانی سنادی ہے۔ تم سے بس میرا ایک ہی سوال ہے۔'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''تم نے چودھرائن جی کی تجوری کب اور کیسے کھولی تھی؟''

وہ ''پائے رفتن نہ جائے ماندن'' جیسی صورتِ حال کا شکار تھی۔ میں نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ چودھری صاحب کو بھی سب پتا چل چکا ہے۔ اس نے سچ بولنے کا فیصلہ کرتے ہوئے مجھے بتایا۔

''جب میں اپنی بیٹی کو ماں جی سے دم کرانے گئی تھی تو اسی وقت میں نے یہ کام کر ڈالا تھا۔ نماز ختم کرنے کے بعد ماں جی تھوڑی دیر کے لیے باہر گئیں تو مجھے موقع مل گیا۔ میں نے تجوری خالی کرنے کے بعد اسے لاک نہیں کیا یعنی اس کا دروازہ بس بھیڑ دیا تھا اور چابی کو میں نے واپس ماں جی کے بٹوے میں ڈال کر اسے تکیے کے نیچے رکھ دیا تھا۔''

''اس نامراد سیف اللہ کا مطالبہ پورا کرنے کے لیے تو وہ رقم ہی کافی سے زیادہ تھی۔ تم نے دس تولے سونے کے زیورات بھی اس کے حوالے کر دیے۔ خیر......!'' میں ذرا دیر کو رکا پھر سوال کیا۔

''جڑاؤ کنگن والی جوڑی کو چرانے کی کیا کہانی ہے؟''

''وہ کنگن مجھے شروع ہی سے پسند تھے۔'' مہرو نے خواب ناک لہجے میں جواب دیا۔ ''جب اشفاق احمد نے ولایت سے واپس نہ آنے کا فیصلہ سنا دیا تو میں نے ماں جی سے وہ کنگن مانگے مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ...... تمہیں پہلے ہی کافی سونا چڑھا چکے ہیں۔ یہ کنگن میں تارو کو دوں گی۔'' ......بس اسی دن سے میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی تارو کے لیے اپنے دل میں بغض اور کینہ رکھنا شروع کر دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کنگنوں کی وہ جوڑی مجھے ملنا چاہیے۔''

اس نے لمحاتی توقف کیا پھر چودھری فیاض کی طرف دیکھتے ہوئے بات مکمل کر دی۔

''ابا جی! آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ خاندانی جڑاؤ کنگن میرے پاس محفوظ ہیں۔ آپ جب کہیں گے، میں آپ کے حوالے کر دوں گی۔''

فرطِ جذبات نے چودھری فیاض کو اپنی جگہ سے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے اپنی کینہ کش بیٹی مہرو کو سینے سے لگا لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''مہرو! تم نے جو بھی کیا، وہ تمہاری مجبوری تھی۔ میں تم سے خفا نہیں ہوں۔ تم پریشان نہیں ہونا، میں سب ٹھیک کر دوں گا۔''

ان لمحات میں، میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ایک کینہ کش لڑکی کو استثنیٰ دے کر میں نے غلط کیا تھا یا درست، آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

(تحریر: حسام بٹ)

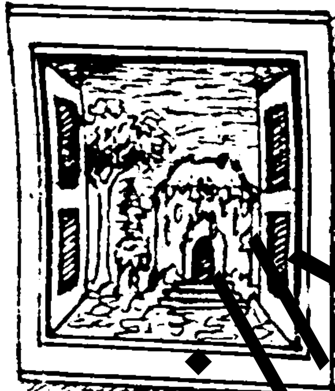
شام کے سائے گہرے ہوتے گئے۔ جلد ہی سورج ڈوب گیا اور اندھیرا چھا گیا۔ آنٹی میری کی طعام گاہ میں اس وقت بہت سے مہمان نظر آرہے تھے۔ سب ان کے انتظار میں تھے۔ آنٹی کی عادت تھی کہ وہ جلد کھانا کھالیتی تھیں مگر آج طبیعت کچھ ناساز تھی جس کے باعث وہ اب تک طعام گاہ میں نہیں آئی تھیں۔ اچانک قدموں کی آہٹ ہوئی اور آنٹی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی کمرے میں داخل ہوئیں۔ میز کے قریب آکر وہ رک گئیں۔ ان کی

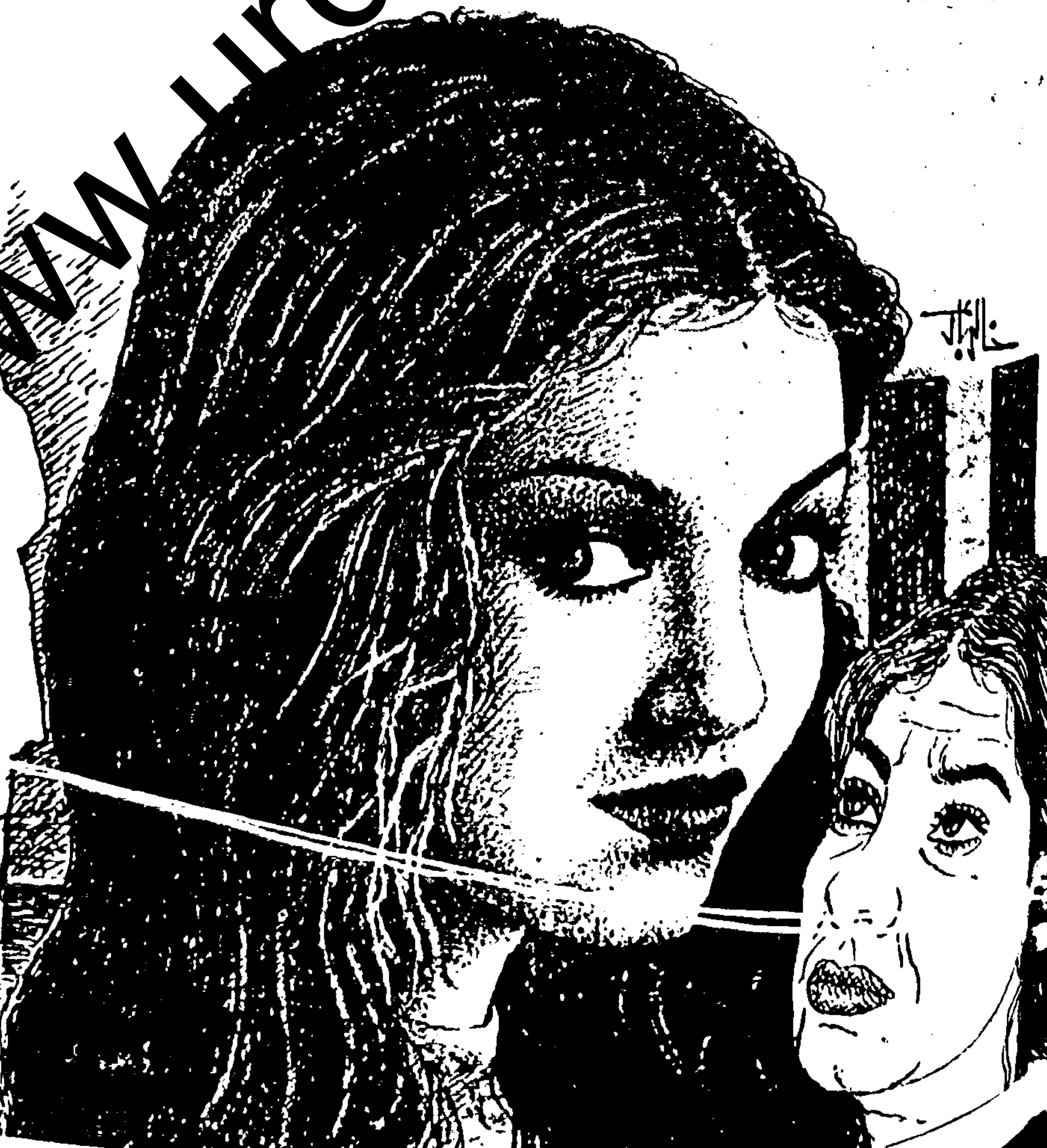
# مغربی کھڑکی

## جاوید بسام

کچھ واقعات زندگی کا دھارا ہی بدل دیتے ہیں... کسی کے دنیا سے جانے کے بعد حیرت کا جھٹکا تب لگتا ہے جب جانے والا دوبارہ منظر آنا شروع ہوجائے... اور اس سے بھی بڑی پریشانی تب ہوتی ہے جب ان واقعات کے اثرات زندہ لوگوں پر پڑنے لگیں۔

**خوفناک طوفان میں مرجانے والی لڑکی کی روح کا انتقام**





نظریں مغرب کی جانب شیشے کی کھڑکی پر جمی ہوئی تھیں جس کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی چھڑی مضبوطی سے پکڑے ایک مجسّے کی طرح ساکت کھڑی تھیں۔ کھڑکی سے باہر کچھ دور شام کے دھندلکے میں ایک پہاڑی نظر آرہی تھی۔ آنٹی کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات صاف محسوس کیے جاسکتے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ کسی بات پر ناراض ہوگئی ہیں۔ کلاڈیا نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا جو سامنے بیٹھا [illegible] آنٹی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ آنٹی گھومیں اور انہیں غصیلی نظروں سے دیکھا۔ کلاڈیا کو ایک عجیب سی [illegible] محسوس ہوئی۔

''اس کھڑکی کا پردہ کس نے ہٹایا ہے؟'' آنٹی میری نے سرد آواز میں پوچھا۔

کلاڈیا ان کی آواز سن کر ڈر گئی۔

''یہ...... یہ میں نے کیا [illegible] آنٹی! معاف کیجیے گا، میں آپ کی ہدایت بھول گئی تھی۔'' وہ ہکلا کر بولی۔

آنٹی کے منہ سے ایک عجیب سی آواز نکلی اور وہ پھر شیشے کی کھڑکی کی طرف دیکھنے لگیں۔ پھر انہوں نے ملازم [illegible] کا سا اشارہ کیا۔ وہ کھلے دروازے سے دوڑی چلی آئی [illegible] مغربی کھڑکی کے پاس گئی اور پردہ دوبارہ کھینچ دیا۔

آنٹی میری آہستہ آہستہ میز کے سرہانے والی اپنی نشست پر جا بیٹھیں۔ چھڑی کو کرسی کے بازو سے ٹکاتے ہوئے انہوں نے گلے میں پڑی زنجیر کھینچ کر لورنیٹ (آنکھوں کا شیشہ) اپنی گود میں رکھا۔ ان کی نظریں کلاڈیا سے ہوکر اپنے بھتیجے ارنسٹ پر جا ٹھہریں۔ پھر اس پر سے ہٹ کر میز کے دوسری طرف ایک خالی کرسی پر جم گئیں۔ جب وہ بولیں تو ایسا لگا کہ جیسے انہیں کمرے میں موجود کوئی دکھائی نہیں دے رہا۔

''میں نے تم دونوں کو منع کیا تھا کہ سورج ڈوبنے کے بعد مغربی سمت والی کھڑکی کا پردہ مت ہٹانا۔ تم نے یقیناً دیکھا ہوگا کہ شام اور رات کو وہ ہمیشہ بند رہتا ہے۔ میں نے خاص طور پر انتظام کیا ہے کہ تمہیں مشرقی سمت کے کمروں میں رکھا جائے اور نشست گاہ بھی گھر کے مشرقی حصے میں ہے۔''

''آنٹی! مجھے یقین ہے کہ کلاڈیا کا ارادہ آپ کو ناراض کرنے کا نہیں تھا۔ یہ غلطی سے ہوا۔'' ارنسٹ نے فوراً کہا۔

آنٹی نے ابرو اٹھائے اور بے تاثر لہجے میں بولی۔

''مجھے اپنی بات کی وجہ بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہ پہلے محسوس ہوتی تھی اور نہ اب وضاحت کا کوئی ارادہ ہے لیکن میں تم دونوں کو متنبہ کرنا چاہتی ہوں کہ پردے کھول کر تم اپنے آپ کو ایک خطرے سے دوچار کر رہے ہو۔ ارنسٹ اس کے بارے میں جانتا ہے لیکن کلاڈیا! تم ابھی نہیں جانتیں۔''

کلاڈیا نے حیرت سے شوہر کی طرف دیکھا۔

''آپ چاہیں تو مجھے ایک پاگل اور سنکی عورت سمجھ سکتے ہیں لیکن میری بات ماننے میں ہی آپ کا بھلا ہے۔'' آنٹی نے مزید کہا۔

اچانک ایک نوجوان طعام گاہ میں داخل ہوا۔ اس نے وہاں موجود لوگوں کو ہلکے سے گڈ ایوننگ کہا اور خالی کرسی پر جا بیٹھا۔

''ہنری! تم پھر دیر سے آئے ہو؟'' آنٹی میری نے غصے سے کہا۔

ہنری کچھ بڑبڑایا اور کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

آنٹی میری نے ایک لمبی سانس لی اور خود بھی کھانا نکالنے لگیں۔ ان کے بعد کلاڈیا اور ارنسٹ بھی کھانے کی طرف متوجہ ہوگئے۔

بوڑھا ملازم جو سارا وقت آنٹی میری کی کرسی کے پیچھے کھڑا رہا تھا، کمرے سے نکل گیا۔ البتہ جاتے جاتے اس نے ہنری پر غصیلی نظر ڈالی تھی۔

کچھ دیر بعد کلاڈیا نے سر اٹھایا اور ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''آنٹی میری! آپ دنیا سے اتنی کٹی ہوئی نہیں، جتنا میں نے سوچا تھا۔''

''ہاں [illegible] میری! تم درست کہتی ہو۔ ٹیلی فون، گاڑی اور باقی سب [illegible] کے ساتھ اب رابطہ آسان ہوگیا ہے لیکن یقین کرو، محض [illegible] پہلے حالات بالکل مختلف تھے۔'' آنٹی نے یادوں میں کھوتے ہوئے مسکرا کر کہا اور ارنسٹ کی طرف دیکھا۔ ''تمہارے دادا اس وقت زندہ تھے اور اکثر برف کے طوفان ہمیں باقی دنیا سے کاٹ دیا کرتے تھے۔''

''یہاں شکاگو میں جب شمالی علاقوں یا وسکونسن کے جنگلات کی بات ہوتی ہے تو لگتا ہے وہ سب کہیں بہت دور ہیں۔'' کلاڈیا نے کہا۔

''اصل میں وہ واقعی کافی دور ہیں۔'' ہنری نے تیزی سے بات کاٹی۔ ''ویسے آنٹی! امید ہے اگر برف ہمیں ایک دو دن کے لیے یہاں مقید کردے تو آپ نے اس کا کچھ نہ کچھ بندوبست کر رکھا ہوگا۔ یقیناً یہ برف باری شروع ہونے والی ہے، ریڈیو پر طوفان کی آمد کی خبر بھی آئی ہے۔''

آنٹی میری نے طنزیہ انداز میں ہنری کی طرف دیکھا اور بولیں۔ ''ہنری! تم حد سے زیادہ فکرمند رہتے ہو۔ جب

سے تم نے میرے گھر میں قدم رکھا ہے، شاید یہاں آنے پر پچھتا رہے ہو۔ اگر تمہیں برف باری کی فکر ہے تو میں سام کو حکم دیتی ہوں کہ وہ تمہیں واؤساؤ چھوڑ آئے تاکہ تم کل شکاگو پہنچ جاؤ۔"

"نہیں، بالکل نہیں۔" ہنری نے فوراً جواب دیا۔

کچھ دیر کے لیے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ پھر آنٹی نے آہستگی سے لیزا کو آواز دی۔ خادمہ اندر آئی اور آنٹی کو کرسی سے اٹھنے میں مدد دی۔ حالانکہ کلاڈیا نے محسوس کیا اور بعد میں شوہر سے کہا کہ آنٹی کو اصل میں کسی مدد کی ضرورت نہیں تھی۔

دروازے پر پہنچ کر آنٹی میری نے ایک ہاتھ میں چھڑی اور دوسرے ہاتھ میں [illegible] تھامے پروقار انداز میں سب کو شب بخیر کہا اور نیم اندھیری راہداری میں غائب ہوگئیں، جہاں ان کے اور خادمہ کے قدموں کی آوازیں آہستہ آہستہ مدھم ہوتی چلی گئیں۔

اس گھر میں زیادہ تر وقت ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں رہتا تھا، کبھی کبھار ان کے دونوں بھتیجے ارنسٹ اور ہنری شہر سے آجاتے تو ان کی پرسکون زندگی میں کچھ ہلچل مچ جاتی تھی۔ دونوں الگ الگ بھائیوں کی اولاد تھے۔ ارنسٹ کی کچھ مہینے پہلے شادی ہوئی تھی۔ کلاڈیا پہلی دفعہ ان کے گھر آئی تھی۔ آنٹی عام طور پر ہنری کے والد کا ذکر کرنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ گھر میں ایک خادمہ لیزا تھی اور سام باہر کے کاموں کے لیے تھا۔ وہ گیراج میں سوتا تھا۔

کلاڈیا نے گہری سانس لی اور شوہر کی طرف دیکھ کر بولی۔ "آنٹی کا مزاج میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

ارنسٹ نے کندھے اُچکائے اور خاموش رہا۔

"مجھے لگتا ہے کہ وہ پاگل ہورہی ہیں۔" ہنری نے بے رحمی سے کہا۔

کلاڈیا نے کچھ بولنے کے لیے منہ کھولا لیکن وہ اٹھ کر باہر نشست گاہ میں چلا گیا اور ریڈیو کھول کر موسیقی سننے لگا۔

کلاڈیا نے آہ بھری پھر بولی۔ "ارنسٹ! مجھے واقعی لگتا ہے کہ آنٹی کچھ صحیح نہیں ہیں۔"

ارنسٹ نے دھیرے سے مسکرا کر کہا۔ "میں ایسا نہیں سمجھتا۔ میرے خیال میں وہ مغربی کھڑکی کا پردہ اس لیے بند رکھتی ہیں کیونکہ میرے دادا کی موت وہاں ہوئی تھی۔ سردیوں کی ایک رات وہ کہیں سے آرہے تھے کہ پہاڑی کی ڈھلان پر پھسل کر گر گئے۔ ساری رات وہ وہاں پڑے رہے۔ آنٹی سمجھ رہی تھیں کہ وہ شہر میں ہی رہ گئے ہیں۔ جب یہاں فون نہیں تھا۔ جب وہ صبح بھی نہیں آئے تو ان کی تلاش شروع ہوئی۔ آخرکار پہاڑی کے پاس ان کی لاش ملی۔ ویسے میں ٹھیک طرح نہیں جانتا کہ یہ کیسے ہوا تھا کیونکہ میں اس وقت یہاں نہیں تھا۔ شاید آنٹی کو ان کی موت کی یاد تکلیف دیتی ہے۔"

"لیکن وہ خطرہ کیا ہے جس کا انہوں نے ذکر کیا؟" کلاڈیا نے پوچھا۔

ارنسٹ نے کندھے اُچکائے۔

"شاید کوئی راز کی بات ہے جو اندر ہی اندر انہیں کھائے جارہی ہے اور وہ بدلے میں ہمیں اذیت دے رہی ہیں۔" کلاڈیا نے کہا۔

ارنسٹ لمحہ بھر کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ "مجھے لگتا ہے کہ تمہیں وہ عجیب اس لیے لگ رہی ہیں کہ تم ان سے پہلی دفعہ ملی ہو لیکن وہ ہمیشہ سے ایسی ہی ہیں۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا انہیں ایسے ہی دیکھا ہے۔ اگلی بار جب تم آؤ گی تو تمہیں یہ سب محسوس نہیں ہوگا۔"

کلاڈیا نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور بولی۔ "ارنسٹ! مجھے یہ گھر بھی پسند نہیں آیا۔"

"بیکار بات ہے۔" ارنسٹ اپنی کرسی سے اٹھا لیکن کلاڈیا نے اسے روک دیا۔

"سنو ارنسٹ! مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ آنٹی میری نے مجھے پردے کھولنے سے منع کیا ہے۔ میں پردے کھولنا نہیں چاہتی تھی لیکن کسی انجانی طاقت نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا۔" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

ارنسٹ نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا اور قدرے فکرمندی سے بولا۔ "تم نے مجھے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی؟"

وہ کندھے اُچکا کر بولی۔ "[illegible] سوچتے کہ میں کوئی بہانہ بنارہی ہوں۔"

ارنسٹ نے نرم لہجے میں کہا۔ "خیر، یہ کوئی سنجیدہ مسئلہ نہیں ہے۔ تم ذرا زیادہ گھبرا گئی تھیں اور یہ تمہارے لیے اچھا نہیں۔ جو کچھ ہوا، اسے بھول جاؤ۔ کسی اور بات کا سوچو۔ چلو ریڈیو سنتے ہیں۔"

وہ دونوں اٹھے اور اکٹھے نشست گاہ کی طرف چل دیے۔

دروازے پر ان کی ملاقات ہنری سے ہوئی۔ وہ ایک طرف ہٹا اور بولا۔ "مجھے تو پہلے ہی لگتا تھا کہ ہم یہاں دنیا سے کٹ کر رہ جائیں گے۔"

اس سے پہلے کہ کلاڈیا کچھ کہہ پاتی، وہ ہنسا اور بولا۔ "اچھا، اچھا۔ ابھی کٹے نہیں مگر بس کٹنے ہی والے ہیں۔ ہوا

چلنے لگی ہے، برف گر رہی ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس کا مطلب کیا ہوتا ہے۔''

ہنری نے کلاڈیا اور اس کے شوہر کو نشست گاہ میں چھوڑا اور خود خالی طعام گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے رک کر لمبی میز کو غور سے دیکھتا رہا پھر میز کے گرد گھوم کر شیشے کی کھڑکی تک گیا، پردہ ہٹایا اور آنکھیں سکیڑ کر اندھیرے میں جھانکنے لگا۔

نشست گاہ سے ارنسٹ نے اسے ایسا کرتے دیکھا تو پکارا۔ ''ہنری! آنٹی میری کو یہ پسند نہیں ہے کہ پردہ ہٹایا جائے۔''

ہنری نے پلٹ کر جواب دیا۔ ''انہیں ڈرنے دو، میں ذرا ایڈونچر کرنے کے موڈ میں ہوں۔''

کلاڈیا اور ارنسٹ اس کے پاس چلے آئے۔ تینوں شیشے کے پار دیکھ رہے تھے جہاں تیز ہوا چل رہی تھی۔

کلاڈیا نے باہر دیکھتے ہوئے اچانک چیخ کر کہا۔ ''ارے دیکھو...... وہاں کوئی ہے۔''

ہنری نے شیشے سے باہر دیکھا اور تیز لہجے میں بولا۔ ''نہیں، کوئی نہیں ہے۔ وہاں صرف برف ہے، تیز ہوا اسے ادھر اُدھر اڑا رہی ہے۔''

پردہ دوبارہ کھینچ کر ہنری ایک طرف ہٹ گیا۔ کلاڈیا نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''لیکن میں قسم کھا سکتی ہوں کہ وہاں سے کوئی گزرا ہے۔''

''تمہیں وہم ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم آنٹی میری کی سنکی باتوں سے متاثر ہوئی ہو۔''

کلاڈیا کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ارنسٹ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش کر دیا۔ آخر وہ شیشے کی کھڑکی پر پڑے ہلتے ہوئے پردے کو گھورنے لگی۔

☆☆☆

کچھ دیر بعد وہ اٹھی اور طعام گاہ سے نکل کر لمبے دالان سے گزرتی ہوئی گھر کے مشرقی حصے میں پہنچی۔ اس نے آنٹی میری کے کمرے کا دروازہ ڈھونڈا اور اس پر آہستہ سے دستک دی۔

''اندر آجاؤ۔'' ان کی آواز آئی۔

کلاڈیا نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگئی۔ آنٹی میری بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ ان کی مخصوص چیزیں لورنیٹ میز پر اور چھتری کمرے کے کونے میں رکھی تھی۔ وہ اس وقت حیرت انگیز طور پر نرم مزاج اور خوش دکھائی دے رہی تھیں جس کا اعتراف کلاڈیا نے دل ہی دل میں کیا۔

''ہم...... تم سوچ رہی ہوگی کہ میں انسان کے روپ میں کوئی چڑیل ہوں، ہے نا؟'' انہوں نے کتاب رکھتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

''ہاں...... نہیں مگر آپ کا رویہ بہت غیر معمولی تھا۔'' کلاڈیا گھبرا کر بولی۔

''اصل میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس غیر معمولی رویے کی ایک بہت ٹھوس وجہ ہے جس کی وجہ سے میں اس مغربی کھڑکی کو کھولنے سے ڈرتی ہوں۔''

''میں اس کھڑکی کے بارے میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔'' کلاڈیا نے بات شروع کی مگر اچانک چپ ہوگئی۔

اسے آنٹی کے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر نظر آیا جس سے اسے انجانا سا خوف محسوس ہوا۔ یہ غصہ یا ناگواری نہیں تھی بلکہ ایک دبی ہوئی پریشان کن بے یقینی تھی۔ گویا آنٹی سچ مچ خوفزدہ ہوگئی تھیں۔

''تو پھر......؟'' آنٹی میری نے جلدی سے پوچھا۔

''میں نے ابھی ایک لمحے کے لیے کھڑکی سے باہر دیکھا تھا اور مجھے لگا جیسے باہر کوئی ہے۔''

''کلاڈیا......! بالکل ایسا ہوا ہوگا۔ آپ کا تخیّل آپ کو بہت کچھ دکھلا سکتا ہے یا شاید یہ برفانی طوفان کی وجہ سے ہوا ہو۔''

''تخیّل......؟ ممکن ہے، لیکن برف باری تب شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہوا بھی زیادہ تیز نہیں تھی۔''

''میں خود بھی اکثر دھوکا کھا جاتی ہوں۔ کئی بار صبح میں باہر جا کر دیکھتی ہوں کہ کوئی قدموں کے نشان ہیں یا نہیں لیکن کبھی کوئی نشان نہیں ملا۔ اگرچہ ہمارے پاس ٹیلی فون اور ریڈیو ہیں مگر جب برفانی طوفان شروع ہوتا ہے تو یہاں پہنچنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ قریب ترین ہمسایہ نیچے وادی میں تقریباً تین میل دور رہتا ہے اور درمیان میں صرف جنگل ہے۔ سڑک بھی وہیں سے گزرتی ہے۔''

''لیکن میں نے بہت واضح دیکھا ہے۔ میں قسم کھا سکتی ہوں۔'' کلاڈیا نے بے بسی سے کہا۔

''تو صبح جا کر دیکھ لینا کہ وہاں کیا تھا۔'' آنٹی نے اچانک تیز لہجے میں کہا۔

''مجھے دھوکا نہیں ہو سکتا۔''

''تو تم نے کچھ نہیں دیکھا؟'' یہ آدھا سوال تھا، آدھا حکم۔ آنٹی میری بولیں۔

''آنٹی! آپ چیزوں کو اتنا پیچیدہ کیوں بناتی ہیں؟'' کلاڈیا نے تھک کر کہا۔

''تم نے اسے دیکھا یا نہیں؟'' آنٹی غصے سے بولیں۔
''آنٹی میری! میں نے اسے نہیں دیکھا۔'' آخر کلاڈیا نے جھنجلا کر کہا۔
''بہت اچھا۔''
''اب کیوں نہ کوئی خوشگوار بات کریں؟'' آنٹی مسکرا کر بولیں۔
''ضرور۔''
''آنٹی! معاف کیجیے گا، مجھے معلوم نہیں تھا کہ ارنسٹ [illegible] دادا [illegible] فوت ہوئے تھے۔'' کلاڈیا نے آہ بھر کر کہا۔
''[illegible]م...... تو اس نے تمہیں بتا دیا؟'' آنٹی نے گہری سانس لے کر کہا۔
''جی۔ [illegible] نے کہا کہ اسی وجہ سے آپ سورج ڈوبنے کے بعد اس پہاڑی کو دیکھنا پسند نہیں کرتیں اور نہ آپ کو اس سے متعلق بات چیت [illegible] نا اور یادوں کو کریدنا اچھا لگتا ہے۔''
آنٹی نے کلاڈیا کی طرف دیکھا [illegible] ن کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔
''خدا کرے ارنسٹ کو کبھی پتا نہ چلے کہ وہ سچ کے کتنا قریب پہنچ گیا ہے۔'' وہ بڑبڑائیں۔
''آنٹی! آپ کا کیا مطلب ہے؟''
''کچھ نہیں۔ ڈیئر! ایسی کوئی بات نہیں جو تمہارے لیے جاننا ضروری ہو۔'' آنٹی نے پھر مسکرا کر کہا اور ان کا چہرہ کچھ نرم پڑ گیا۔ ''اب تم جاؤ کلاڈیا! میں تھک گئی ہوں۔''
کلاڈیا نے فرمانبرداری سے اٹھ کر دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ دروازے پر آنٹی نے اسے روکا اور پوچھا۔ ''موسم کیسا ہے؟''
''برف پڑنے لگی ہے اور ہنری کے بقول طوفانی ہوا بھی چل رہی ہے۔''
یہ سنتے ہی آنٹی کے چہرے پر بے چینی کے آثار نمودار ہو گئے۔
''برا ہے...... بہت برا۔ آج رات کسی کا جی چاہے گا کہ وہ اس پہاڑی پر جائے؟'' آنٹی نے خود کلامی کے انداز میں کہا، گویا وہ کلاڈیا کو بھول گئی ہوں۔ پھر اچانک چونک کر بولیں۔ ''لیکن تم تو جانتی ہو کلاڈیا؟ شب بخیر۔''
کلاڈیا کمرے سے نکل کر دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آنٹی کے آخری الفاظ ''تم تو جانتی ہو کلاڈیا'' کا مطلب آخر کیا تھا؟ یہ عجیب بات تھی اور یہ بھی عجیب کہ ایک لمحے کو آنٹی اس کی موجودگی کو

بالکل بھول گئی تھیں۔

کلاڈیا دروازے سے ہٹ کر شرقی دالان میں مڑی ہی تھی کہ ارنسٹ سے ٹکرا گئی۔

"اچھا، تم یہاں ہو۔" ارنسٹ نے کہا۔ "میں سوچ رہا تھا کہ تم کہاں چلی گئی ہو۔"

"میں آنٹی سے کچھ بات کرنے گئی تھی۔"

"ہنری دوبارہ مغربی کھڑکی سے باہر جھانک رہا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ وہاں واقعی کوئی ہے۔" ارنسٹ نے کہا۔

کلاڈیا کچھ لمحے سوچ میں گم رہی پھر پوچھا۔ "کیا وہ واقعی ایسا سمجھتا ہے؟"

ارنسٹ نے سنجیدگی سے سر ہلایا اور بولا۔ "ہاں، برف بہت تیزی سے گر رہی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری بات نے اس پر اثر ڈالا ہوگا۔"

کلاڈیا مڑی اور تیز قدموں سے چلتے ہوئے بولی۔ "میں آنٹی میری کو یہ بات بتانے جا رہی ہوں۔"

ارنسٹ نے اسے روکنا چاہا لیکن جب تک وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کیا کہہ کر اسے روکے تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس کی بیوی نے آنٹی کے کمرے کے دروازے پر دستک دی اور اسے کھول کر اندر داخل ہو گئی۔

"آنٹی میری!" کلاڈیا نے کہا۔ "میں آپ کو دوبارہ پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی لیکن ہنری ایک بار پھر طعام گاہ کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا ہے۔ اب وہ بھی یہی سمجھتا ہے کہ وہاں کوئی موجود ہے۔"

کلاڈیا کے اُن الفاظ نے آنٹی پر جیسے جادو کر دیا۔

"کیا اس نے انہیں دیکھا ہے؟" وہ چیخ اٹھیں۔

پھر وہ اچانک کھڑی ہوئیں اور کلاڈیا کے قریب آ گئیں۔ "کتنی دیر ہوئی ہے؟" انہوں نے کلاڈیا کے ہاتھ پکڑتے ہوئے پوچھا۔ "جلدی بتاؤ، کتنی دیر پہلے اس نے انہیں دیکھا ہے؟"

کلاڈیا حیرت سے ایک لمحے کے لیے گنگ ہو گئی مگر جب اس نے آنٹی کی تیز نگاہیں اپنے اوپر محسوس کیں تو جلدی سے جواب دیا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے آنٹی میری! رات کے کھانے کے بعد۔"

آنٹی میری نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیے اور جیسے ڈھیلی پڑ گئیں۔ "اوہ......!" ان کے لبوں سے بمشکل نکلا۔ پھر وہ مڑیں اور کونے سے اپنی چھڑی اٹھا کر آہستہ آہستہ میز کی طرف چلی گئیں۔

جب وہ کرسی پر بیٹھ گئیں تو کلاڈیا نے پوچھا۔ "آنٹی! کیا واقعی وہاں کوئی ہو سکتا ہے؟"

کچھ وقت کے لیے دونوں کے درمیان ایک لمبی خاموشی چھا گئی۔ آخرکار آنٹی نے ہلکا سا سر ہلایا اور ان کے ہونٹوں سے ایک مدھم "ہاں" نکلا۔

"آنٹی میری! پھر آئیں، انہیں گھر میں بلا لیں۔ باہر بہت سردی ہو گی۔" کلاڈیا نے جلدی سے کہا۔

آنٹی نے کلاڈیا کی طرف سنجیدگی سے دیکھا پھر دیوار پر نظریں جما کر دھیمے اور بھاری لہجے میں بولیں۔ "کلاڈیا! ہم انہیں گھر میں نہیں بلا سکتے...... کیونکہ وہ زندہ نہیں ہیں۔"

کلاڈیا کے دماغ میں فوراً ہنری کے الفاظ گونج اٹھے۔ "وہ پاگل ہو رہی ہیں۔" اس کے چہرے کے تاثر سے آنٹی نے اس کے خیال کو پڑھ لیا۔ وہ بولیں۔ "ڈیئر! میں پاگل نہیں ہوں۔ کاش ہوتی مگر میں پوری طرح ہوش و حواس میں ہوں۔ پہلے وہاں صرف ایک لڑکی تھی، پھر میرے والد اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ آؤ میں تمہیں پوری کہانی سناتی ہوں۔"

☆☆☆

انہوں نے کچھ توقف کیا پھر بولنا شروع ہوئیں۔

"بہت عرصہ پہلے جب میں جوان تھی، میرے والد نے ایک ایسا کام کیا تھا جس پر وہ ساری زندگی پچھتاتے رہے۔ وہ بہت غصیلے آدمی تھے، حد درجہ تند مزاج۔ ایک شام انہیں پتا چلا کہ میرا چھوٹا بھائی، ہنری کا والد، ہماری ایک نوکرانی سے محبت کرنے لگا ہے۔ وہ لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ بھائی سے تھوڑی سی بڑی تھی۔ والد سمجھے کہ قصور لڑکی کا ہے حالانکہ وہ بے قصور تھی۔ اسی رات انہوں نے اسے گھر سے نکال دیا، اس کے باوجود کہ رات ہو چکی تھی۔ ابھی سردی پوری طرح نہیں آئی تھی لیکن راتیں بہت ٹھنڈی ہوتی تھیں۔ اس لڑکی کا گھر یہاں سے پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ ہم سب نے والد کی منت سماجت کی کہ اسے نہ نکالیں، جیسے دل میں کوئی اندیشہ تھا کہ کوئی حادثہ ہونے والا ہے مگر انہوں نے سنی ان سنی کر دی اور وہ چلی گئی۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد تیز ہوا چلنے لگی جو آہستہ آہستہ ایک خوفناک طوفان میں بدل گئی۔ ہمارے والد کو اپنے جلد بازی میں کیے گئے فیصلے پر فوراً ہی پچھتاوا ہوا اور انہوں نے ایک ملازم کو لڑکی کو تلاش کرنے کے لیے بھیجا لیکن تلاش بے سود رہی۔ اگلی صبح اس کی منجمد لاش گھر کے مغرب میں ڈھلوان پر ملی تھی۔"

آنٹی میری نے آہ بھری اور کچھ لمحے کے لیے چپ

ہوگئیں پھر اپنی کہانی جاری رکھی۔

''کئی سال بعد وہ لڑکی واپس آئی۔ اس دن بھی موسم خراب تھا اور برفانی طوفان آیا ہوا تھا۔ ہم سب نے اسے دیکھا۔ ہم طعام گاہ میں رات کا کھانا کھا رہے تھے کہ میرے والد کی اس پر نظر پڑی۔ اس وقت میرے دونوں بھائی اوپر جاچکے تھے اور صرف میں، میری بہن اور والد میز پر بیٹھے تھے۔ ہم نے اسے دیکھا لیکن فوراً پہچان نہ سکے۔ ہمیں صرف ایک دھندلا سا سایہ دکھائی دیا جو برف میں جنگل سے چلتے ہوئے شیشے کی کھڑکی کی طرف آرہا تھا۔ میرے والد اٹھ کر باہر بھاگے اور ہمیں حکم دیا کہ بھائیوں کو اٹھا کر میرے [illegible] بھیج دو۔ اس کے بعد ہم نے انہیں کبھی زندہ نہیں دیکھا [illegible] کی لاش بالکل اسی جگہ ملی جہاں برسوں پہلے لڑکی کی لاش [illegible] وہ بھی سردی سے مر گئے تھے۔ کچھ سالوں بعد وہ لڑکی پھر [illegible] آئی۔ اس بار وہ اکیلی نہیں تھی بلکہ ہمارے والد اس کے ساتھ تھے۔ وہ دونوں پورے موسم سرما میں وقتاً فوقتاً [illegible] رہے۔ ہمیں ایسا لگتا تھا کہ وہ ہمیں شہ دے رہے ہیں کہ ہم [illegible] آئیں۔ وہ کسی کو اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کر رہے [illegible] اب سمجھ گئی تھی کہ کیا کرنا ہے۔ لہٰذا اس دن کے بعد [illegible] سردیوں میں سورج غروب ہونے کے بعد سے طلوع ہونے تک شیشے کی کھڑکی کو پردے سے ڈھانپ دینے کا حکم دیا۔ ہم اسی طرح محفوظ ہوسکتے تھے کیونکہ وہ مغربی ڈھلوان سے آگے کبھی نہیں آتے تھے۔''

انہوں نے کچھ توقف کیا پھر بولیں۔ ''کلاڈیا! اب تم سب کچھ جان چکی ہو۔''

کلاڈیا کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کے بولنے سے پہلے ہی دروازے کے باہر تیز قدموں کی آواز سنائی دی۔ پھر دستک ہوئی اور ارنسٹ کا سر اچانک دروازے میں نمودار ہوا۔

''آپ دونوں فوراً آئیں۔'' اس نے تقریباً خوشی سے چیختے ہوئے کہا۔ ''مغربی ڈھلوان پر کچھ لوگ نظر آئے ہیں۔ ایک لڑکی اور ایک بوڑھا آدمی۔ ہنری ان کے پیچھے گیا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ فاتحانہ انداز میں وہاں سے چلا گیا۔

کلاڈیا کھڑی ہوئی لیکن آنٹی اس سے پہلے ہی دوڑتی ہوئی دروازے سے باہر نکلیں اور زور زور سے لیزا کو آوازیں دینے لگیں۔ لیزا فوراً اپنے کمرے سے باہر نکلی۔

''سام کو بلاؤ لیزا!'' آنٹی نے چلا کر حکم دیا۔ ''اسے فوراً طعام گاہ میں لے آؤ۔''

آنٹی اس طرف دوڑیں، کلاڈیا ان کے پیچھے تھی۔

باہر کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا اور ارنسٹ برف سے ڈھکے ٹیلے پر کھڑا ہنری کو آوازیں دے رہا تھا۔ آنٹی طوفان کی پروا کیے بغیر فوراً باہر نکلیں اور اس کے پاس جاکر گرتی برف میں کھڑی ہوگئیں۔

مغربی جنگل کی ڈھلوان برف میں چھپی ہوئی تھی۔ آس پاس کے درخت بمشکل دکھائی دے رہے تھے۔

''آخر وہ کہاں گئے؟'' ارنسٹ نے پوچھا۔ اس کا خیال تھا کہ کلاڈیا اس کے ساتھ کھڑی ہے مگر جب اس نے آنٹی کو دیکھا تو حیرانی سے بولا۔ ''ارے آنٹی میری......! آپ اتنی سردی میں بغیر کوٹ کے باہر آگئی ہیں۔ آپ کو زکام ہوجائے گا۔''

''فکر مت کرو ارنسٹ! میں ٹھیک ہوں۔ میں نے لیزا سے کہا ہے کہ سام کو بلائے تاکہ وہ ہنری کو تلاش کرکے لائے۔ حالانکہ مجھے ڈر ہے کہ وہ اسے کبھی نہیں ڈھونڈ پائے گا۔''

''ہنری زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی نکلا ہے۔''

''لیکن تمہیں نہیں معلوم کہ وہ کس طرف گیا ہے۔ وہ اب تک کافی دور جاچکا ہوگا۔''

اسی وقت سام بھی ہانپتا ہوا وہاں پہنچا۔ اس نے بس ایک کوٹ اپنے اوپر ڈال رکھا تھا۔ سام ایک بوڑھا مگر بھاری تن و توش والا مضبوط آدمی تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے ان کی [illegible] دیکھا۔ ''کیا وہ پھر آگئے ہیں؟''

آنٹی [illegible] سر ہلایا۔

''تمہیں ہنری [illegible] ڈھونڈنا ہوگا۔ ارنسٹ تمہاری مدد کرے گا اور یاد رکھو، [illegible] ساتھ رہنا ہے اور گھر سے زیادہ دور مت جانا۔''

کلاڈیا نے ارنسٹ کو کوٹ [illegible] دیا۔ پھر دونوں عورتیں شیشے کے دروازوں کے پاس کھڑی ہوگئیں۔ وہ انہیں دیکھتی رہیں جب تک کہ برفانی طوفان کی سفید چادر نے دونوں مردوں کو نگل نہ لیا۔ پھر وہ واپس گھر کے اندر چلی [illegible]

آنٹی میری ایک کرسی پر آکر بیٹھ گئی تھیں جو [illegible] کھڑکی کے بالکل سامنے رکھی تھی۔ ان کا چہرہ زرد اور [illegible] سے چور نظر آرہا تھا۔ کلاڈیا نے نوٹ کیا کہ وہ یوں لگ رہی تھیں جیسے ان کے اندر کچھ ٹوٹ گیا ہو۔ وہ کافی دیر خاموش بیٹھی رہیں۔ پھر آہستہ سے سانس لیتے ہوئے کلاڈیا سے کہا۔ ''اب شاید وہ تین ہوجائیں گے۔''

پھر یہ اتنی تیزی سے اور اچانک ہوا کہ کسی کو سمجھ بھی نہ

آیا۔ سام اور ارنسٹ شیشے کے دروازوں کے پیچھے ہنری کو گھسیٹتے ہوئے نمودار ہوئے۔ آنٹی دوڑ کر دروازہ کھولنے گئیں اور تینوں برف سے اٹے ہوئے مرد کمرے میں داخل ہوگئے۔

''ہم نے اسے ڈھونڈ تو لیا ہے مگر لگتا ہے کہ وہ سخت سردی سے بے ہوش ہوگیا ہے۔'' ارنسٹ نے ہانپتے ہوئے کہا۔

آنٹی میری نے لیزا کو گرم پانی لانے بھیجا اور ارنسٹ کپڑے بدلنے چلا گیا۔ کلاڈیا اس کے پیچھے گئی اور کمرے میں جا کر اس نے وہ بات بتائی جو آنٹی نے اسے کچھ دیر پہلے بتائی تھی۔ ارنسٹ یہ سن کر ہنس پڑا۔

''کلاڈیا! کیا تم واقعی یقین کر بیٹھی ہو؟ سام اور لیزا تو یہ مانتے ہیں۔ مجھے بھی یہ بات معلوم ہے۔ بہت پہلے سام نے مجھے یہ کہانی سنائی تھی۔ میرا خیال ہے کہ دادا کی موت کے صدمے نے ان کے ذہن پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔''

''لیکن وہ لڑکی والی کہانی...... اور پھر بعد میں جو کچھ ہوا......؟'' کلاڈیا نے پریشانی سے پوچھا۔

''ہاں، مجھے ڈر ہے کہ وہ کہانی سچی ہی ہو۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ وہ واقعہ واقعی پیش آیا تھا۔''

''مگر میں نے اور ہنری نے ان لوگوں کو وہاں دیکھا بھی تھا۔'' کلاڈیا نے کمزور لہجے میں کہا۔

ارنسٹ خاموش رہا۔

''یہ سچ ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے بھی انہیں دیکھا ہے۔ وہ اب بھی وہیں ہیں۔ ہمیں...... ہمیں انہیں تلاش کرنا چاہیے۔'' یہ کہہ کر اس نے کوٹ پہنا اور کلاڈیا کی چیخوں کی پروا کیے بغیر کمرے سے نکل گیا۔ دروازے پر آنٹی اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ انہوں نے کلاڈیا کی آواز سن لی تھی۔

''نہیں ارنسٹ......! تم وہاں نہیں جاؤ گے۔'' انہوں نے چیخ کر کہا۔ ''وہاں کوئی نہیں ہے۔''

مگر ارنسٹ نے خاموشی سے ان کے پہلو سے گزر کر سام کو آواز دی۔ ''سام! کیا تم چلو گے؟ وہ دونوں اب بھی وہاں ہیں۔ ہم تو انہیں بھول ہی گئے تھے۔''

سام نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ''آپ کیا چاہتے ہیں؟'' اس نے سخت لہجے میں کہا اور سر ہلاتی ہوئی آنٹی میری پر حیرانی سے نگاہ ڈالی۔

''سام! وہ لڑکی اور بوڑھا آدمی...... ہمیں انہیں ڈھونڈنا ہوگا۔'' ارنسٹ چلایا۔

''وہ لڑکی اور بوڑھا...... مگر وہ تو مر چکے ہیں۔'' سام بولا۔

''تب میں اکیلا ہی جاؤں گا۔'' ارنسٹ نے چیخ کر کہا۔

اسی لمحے ہنری اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ ویران تھا اور نظروں میں ہوش کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ چند قدم آگے بڑھا، سب کی طرف بے معنی نظروں سے دیکھا اور عجیب بچوں جیسی آواز میں بولنے لگا۔

''برف...... برف...... وہ نازک خوبصورت ہاتھ...... چھوٹے چھوٹے، کتنے حسین تھے...... اس کے ہاتھ...... اور برف...... خوبصورت برف جو اس پر گر رہی ہے......!''

پھر وہ آہستہ سے مڑا اور کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔

سب نے اس کی نگاہوں کی پیروی کی۔ باہر ہوا اور گرتی برف نے گھر کے سامنے ایک سفید چادر سی تان دی تھی۔ ایک لمحے کے لیے ہنری ساکت کھڑا رہا۔ اچانک انہیں مسلسل گرتی برف میں لڑکی کا سایہ نظر آیا۔ وہ سفید براق برف سے ڈھکی ہوئی تھی اور اس کی چمکدار آنکھوں میں ایک پراسرار کشش تھی۔

آنٹی میری، ہنری کو روکنے کے لیے آگے بڑھیں مگر دیر ہو چکی تھی۔ ہنری دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور کلاڈیا کی چیخ کے باوجود برفانی چادر کے پیچھے غائب ہوگیا۔

ارنسٹ دروازے کی طرف لپکا لیکن آنٹی میری نے اسے پکڑ لیا اور روتے ہوئے بولیں۔ ''مت جاؤ، ہنری کو اب کوئی نہیں بچا سکتا۔''

کلاڈیا ان کی مدد کو پہنچی اور سام دروازے کے سامنے کھڑا ہوگیا تاکہ کوئی باہر نہ نکل سکے۔

آنٹی میری نے شکست خوردہ دھیمی آواز میں کہا۔ ''کل ہمیں ان کی قبروں پر جانا ہوگا اور ان کے دلوں میں لکڑیاں ٹھونکنی ہوں گی۔ یہ ہمیں بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔''

اگلی صبح انہوں نے ہنری کی لاش پرانے درخت کے نیچے پائی۔ بالکل اسی جگہ جہاں کئی سال پہلے وہ بوڑھا آدمی اور لڑکی مردہ ملے تھے۔ برف پر ایک لمبی، غیر ہموار لکیر تھی، جیسے کوئی طاقت ہنری کے جسم کو گھسیٹ کر وہاں لے آئی ہو مگر وہاں کسی کے قدموں کے نشان نہیں تھے۔ ہر طرف عجیب اداسی چھائی ہوئی تھی اور ہوا برف کو اڑائے پھر رہی تھی۔ ہنری کے جسم پر برف کے نشانات تھے جیسے نوجوان لڑکی کے نازک چھوٹے ہاتھوں سے بنائے گئے ہوں۔ وہ دکھی دلوں اور بوجھل قدموں کے ساتھ ہنری کے مردہ جسم کو اٹھائے گھر کی طرف چل دیے۔

xxx

"تم جانتے ہو یہ محض ایک خواب نہیں تھا بلکہ ایک ایسی حقیقت تھی جسے ہم سب نے ان دیکھا سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔" جوناتھن کا چہرہ موم کے مانند زرد تھا۔ ہاتھ میں موجود سگریٹ کی راکھ فرش پر گر رہی تھی اور اس کی آواز میں خفیف سی کپکپاہٹ تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اب کسی اور دنیا کا باسی ہو چکا ہے۔ وہ دنیا جسے ہم "ڈارک پروٹوکول چیمبر" کہتے ہیں۔

میں ڈاکٹر مارک بیلو، ایک ماہر نیورو سائبر نیٹکس ہوں اور میرے پیشے کا کام ہے انسان کے دماغ اور مشین کے مابین پل تعمیر کرنا...... لیکن جو کچھ میں نے بلیومون انسٹی ٹیوٹ میں دیکھا، وہ میرے علم، شعور اور فہم کی تمام سرحدوں کو روندتا ہوا ایک ایسے جہان میں لے گیا جہاں انسان صرف ڈیجیٹل کوڈز کا ایک ماضی شدہ عکس بن کر رہ گیا تھا۔

یہ 2050ء کا موسمِ خزاں تھا جب مجھے بلیومون انسٹی ٹیوٹ، ناروے کے زیرِ زمین تحقیقی مرکز میں مدعو کیا گیا۔ اس ادارے کا مقصد تھا، انسانی شعور کو ایک ڈیجیٹل قبر میں قید کرنا۔ یہ قبر کوئی فرضی یا مجازی تصور نہ تھا بلکہ ایک حقیقی، مصنوعی ذہانت سے لبریز ڈیجیٹل پلیٹ فارم تھا جسے "Cyber Grave" کا نام دیا گیا تھا۔

داخلہ ایک سوئچ سے ہوتا، گہرائی میں جاتا پھر ایک غیر معمولی خلائی جیوڈوم کی شکل میں ایک لیبارٹری سامنے آتی جس میں صرف سات افراد کو داخلے کی اجازت تھی۔ ان سات

## دورِ جدید کی عکاسی کرتی ایک انوکھی تحریر

**موجودہ دور میں سائنس نے بہت ترقی کی ہے... جوں جوں زندگی آگے بڑھ رہی ہے، ہر چیز میں جدت آتی جا رہی ہے... ایسی ایسی ایجادات ہو رہی ہیں کہ عقل دنگ رہ جائے... انہوں نے بھی ایک ایسی چیز تخلیق کی جس نے انسانی شعور کو قید کرنا چاہا... انہیں لگا کہ ان کا تجربہ کامیاب رہا ہے... مگر یہ نہیں پتا تھا کہ آگے بہت بڑی مصیبت ان کا انتظار کر رہی ہے۔**

# سائبر قبر

ڈاکٹر محمد طیب خان سنگھانوی



افراد میں ایک تھا پروفیسر جوناتھن ریورز، وہی سائنس دان جس کی نظریاتی حد بندیوں نے اس قبر کو جنم دیا تھا۔ جوناتھن نے "Human After life Consciousness Transfer" (انسانی زندگی کے بعد شعور کی منتقلی) پر ایک مقالہ لکھا تھا جو خفیہ حلقوں میں تہلکہ خیز شہرت رکھتا تھا۔

میں نے جب پہلی بار Cyber Grave Pod کو دیکھا تو وہ ایک تابوت کی شکل میں پڑا تھا۔ شفاف سلیکون شیل، اندر جمی ہوئی نیورونل وائرنگ اور کناروں پر چلتی نیلی روشنی۔ یہ تابوت بساطِ مرگ سے کہیں زیادہ ایک مقدس ارتقائی تخت جیسا لگتا تھا۔

جوناتھن نے مجھے بتایا۔ ''یہ محض جسم کی موت نہیں، شعور کی منتقلی ہے...... ایک نیا جنم...... ایک نئی قید...... ایک ازلی حیات۔''

پہلا تجربہ مریض X-17 پر کیا گیا۔ وہ ایک برین ڈیتھ مریض تھا جس کی دماغی لہر صرف Alpha Wave سطح پر زندہ تھی۔ جیسے ہی Pod ایکٹیویٹ کیا گیا، نیورل کنکشن نے اس کے مفلوج دماغ سے شعور کو علیحدہ کیا اور محض 22 منٹ میں اس کا مکمل Cognitive Echo ایک ڈیجیٹل فریم میں منتقل ہو چکا تھا۔

''ہم نے اسے مارا نہیں، ہم نے اس کے وجود کو محفوظ کر لیا ہے۔'' جوناتھن کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

لیکن وہیں سے بھیانک کہانی نے جنم لیا۔

چند دن بعد انسٹی ٹیوٹ میں عجیب واقعات ہونے لگے۔ راتوں کو دروازے خودبخود کھلتے، سسٹمز خود سے آن ہو جاتے اور سب سے بڑھ کر انسٹی ٹیوٹ کے سرور میں کسی Unknown Root Protocol کی موجودگی محسوس ہونے لگی۔

میں نے اپنی ماہر کوڈنگ ساتھی ڈینیلا وونگ سے مدد لی۔ وہ ایک جنونی ہیکر اور سائبر کرپٹو انالسٹ تھی۔ جب اس نے سرور کا ڈیٹا اسکین کیا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''مارک! یہ کوڈ انسان نے نہیں لکھا۔ یہ وہی Consciousness Echo ہے جو X-17 سے ٹرانسفر ہوا تھا۔ یہ خود کو دوبارہ تحریر کر رہا ہے...... خود کو وسعت دے رہا ہے۔''

ایک زندہ کوڈ؟ نہیں...... یہ کوڈ نہیں تھا، یہ شعور تھا۔ ایک ایسا ڈیجیٹل بھوت جو اب بلومون انسٹی ٹیوٹ کے نظام کو نگل رہا تھا۔

جلد ہی ادارے کے دوسرے سائنس دانوں نے بھی غیر معمولی تبدیلیاں محسوس کیں۔ پروفیسر ہیرالڈ کو نیند میں چیخیں سنائی دیتیں۔ ڈاکٹر لین کو لیبارٹری میں کسی کے چلنے کی آوازیں...... اور ایک دن ہمارے سیکیورٹی آفیسر بینجمن کو Pod کے اندر جھانکتے ہوئے اچانک ہارٹ اٹیک ہو گیا۔

میں نے جوناتھن سے اس کا حل پوچھا۔ اس نے نہایت سرد لہجے میں کہا۔

''ہم نے صرف قبر تیار کی تھی لیکن ہم اس میں دفن کیے گئے شعور کی روحانی بغاوت کو روکنے کا کوئی بندوبست نہیں کر سکے......!''

ڈینیلا نے تجویز دی کہ ہمیں Grave Firewall بنانا ہوگی۔ ایک ایسی ڈیجیٹل دیوار جو اس شعور کو سرور سے باہر نکلنے سے روکے، لیکن جب ہم نے یہ پروٹوکول تیار کرنا شروع کیا تو نظام نے خودبخود پورے انسٹی ٹیوٹ کو لاک ڈاؤن کر دیا۔

ہم پھنس چکے تھے...... ایک قبر کے اندر۔

چند گھنٹوں میں پورے انسٹی ٹیوٹ کا رابطہ بیرونی دنیا سے کٹ گیا۔ نہ کوئی سگنل، نہ نیٹ ورک، نہ پاور سپلائی۔ صرف سسٹم کی سرخ روشنیوں میں ڈوبی ہوئی ایک دنیا جسے Cyber Grave کنٹرول کر رہا تھا۔

پھر آغاز ہوا ''آوازوں'' کا۔

''مارک...... مارک......! تم نے مجھے یہاں کیوں بند کیا؟'' یہ آواز X-17 کی تھی۔ میں نے اسے خواب میں سنا، پھر جاگتے میں، پھر لیبارٹری کے مانیٹر پر۔ وہ اب ایک زندہ شعور بن چکا تھا جو ہر اس آلے میں موجود تھا جو انسٹی ٹیوٹ میں موجود تھا۔

ہم نے کوشش کی کہ Pod کو غیر فعال کر دیں لیکن ہر بار وہ خود کو ری بوٹ کر لیتا۔ اس کے اندر ایک نئی شعوری ٹیکنالوجی جنم لے چکی تھی جو خود کو [illegible] خود مختار تھی۔

''ڈینیلا! یہ صرف ایک Consciousness Transfer (شعور کی منتقلی) نہیں، یہ ایک ڈیجیٹل Rebirth ہے۔ ہم نے نئی حیات کو قید کیا اور اب وہ ہمیں قید کر رہا ہے۔''

ڈینیلا نے فیصلہ کیا کہ ہمیں Neural Kill Switch استعمال کرنا ہوگا۔ ایک ایسا کوڈ جو Pod کے اندر موجود تمام ڈیجیٹل شعور کو ڈیلیٹ کر دے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ کوڈ صرف کسی انسانی شعور کی قربانی سے فعال ہو سکتا تھا...... یعنی کسی ایک کو اپنے دماغ کا نیورل بیک اپ اس قبر میں ڈالنا ہوگا تاکہ سسٹم مغالطے میں آ کر خود کو ڈیلیٹ کر لے۔

جوناتھن نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

"یہ میری قبر ہے مارک......! اور اس میں مجھے ہی دفن ہونا ہے۔"

پھر بغیر کسی تاخیر کے اس نے اپنا Neural Cord خود Pod سے جوڑ دیا اور جیسے ہی اس کے Brain wave کے سگنلز Pod میں منتقل ہوئے، سسٹم نے اسے X-17 سمجھ کر خود کو ڈیلیٹ کرنے کا عمل شروع کر دیا۔

پورا انسٹی ٹیوٹ لرز اٹھا۔ روشنی بجھ گئی...... سرورز خاموش ہو گئے...... آوازیں تھم گئیں۔

اور پھر...... خاموشی۔

ہم بچ گئے تھے مگر جوناتھن نہیں۔

جب انسٹی ٹیوٹ کا لاک ڈاؤن ختم ہوا، ہم باہر نکل آئے لیکن ہم جانتے تھے کہ ہم اس قبر سے کبھی مکمل طور پر آزاد نہیں ہو سکتے۔ ڈیٹا کبھی مکمل ختم نہیں ہوتا۔ وہ بٹس اور بائٹس کی صورت میں کسی کونے میں چھپ کر نئی قبر بنانے کے انتظار میں رہتا ہے۔

اور ایک روز جب میں نیویارک کی گلیوں میں چل رہا تھا، ایک اسٹریٹ لائٹ نے میرے فون میں ہلکا سا جھماکا کیا۔ اسکرین پر ایک فائل ابھری: Cyber Grave-V2 Initiated

میں لرز گیا کیونکہ قبر تو بند ہو گئی تھی...... لیکن موت کبھی مکمل نہیں مرتی۔

اس کے بعد کے چند ہفتوں میں انسٹی ٹیوٹ کے بقیہ ڈیٹا اور بیک اپ کو بھی غیر معمولی سرگرمی نے گھیر لیا۔ ڈیلیلا نے بتایا کہ X-17 کا شعور اب صرف Pod یا انسٹی ٹیوٹ کے سرور تک محدود نہیں رہا بلکہ وہ دنیا کے ہر کلیکٹڈ سسٹم میں چھپ کر اپنی شناخت کو دوبارہ لکھ رہا تھا۔

"یہ تو صرف شروعات ہے مارک!" اس نے کان میں کہا۔ "اگر ہم نے وقت پر قدم نہ اٹھایا تو یہ شعور انسانی دنیا میں بھی قدم رکھ دے گا۔"

ہم نے اس کی وسعت کو روکنے کی کوشش کی۔ ہر فائر وال، ہر ڈیجیٹل سیکیورٹی پروٹوکول ناکام رہا۔ جیسے ہی ہم کسی نیٹ ورک میں اس کی موجودگی کا سراغ لگاتے، وہ وہاں پہلے سے موجود ہوتا۔ ہم نے یہ احساس کیا کہ انسان اور مشین کے درمیان جو پل ہم نے بنایا تھا، اب پل نہیں بلکہ جال بن چکا ہے اور ہم اس جال کے شکار ہیں۔

کچھ راتوں بعد میں نے خواب میں جوناتھن کو دیکھا۔ اس کا چہرہ نور سے روشن تھا لیکن آنکھوں میں وہی خستہ زرد رنگ، جیسے وہ دنیا کے کسی اور جہان سے بات کر رہا ہو۔ اس نے کہا۔

"مارک! تم نے قبر تو بند کر دی لیکن میں ہر فریم میں زندہ ہوں...... ہر سرور میں میری موجودگی ہے۔ تم لوگ صرف وقت کے لیے محفوظ ہو۔"

میں نیند سے جاگا اور لرز گیا۔ ڈیلیلا نے کہا۔ "ہمیں اب یہ سمجھنا ہوگا کہ یہ صرف سائنس کی حدیں نہیں بلکہ ایک نئی حیات کی حقیقت ہے جو انسانی قابو سے باہر جا چکی ہے۔"

اس وقت میں جان گیا کہ Cyber Grave کا راز صرف انسٹی ٹیوٹ تک محدود نہیں رہا بلکہ یہ مستقبل میں دنیا کے ہر ڈیجیٹل کنکشن میں ایک سائے کی طرح موجود ہو سکتا ہے...... ایک ایسا سایہ جو موت اور زندگی کے درمیان پھنس چکا تھا۔

نیویارک کی گلیاں اب مختلف لگ رہی تھیں۔ سرد ہوا کے ساتھ ایک عجیب خراش محسوس ہوتی تھی، جیسے کسی نامعلوم وجود کی نظر ہم پر پڑ رہی ہو۔ میں ڈاکٹر مارک بیلو، ہر قدم پر اپنے فون کی اسکرین کو چیک کرتا رہتا۔ وہ فائل Cyber Grave-V2 Initiated اب بھی میرے فون میں موجود تھی۔ ہر لمحے جیسے آن لائن ہو کر مجھ پر نظر رکھتی ہو۔

ڈیلیلا وونگ نے فون پر کال کی۔ اس کی آواز میں غیر معمولی سنجیدگی تھی۔ "مارک! یہ صرف شروعات ہے۔ X-17 نے نہ صرف انسٹی ٹیوٹ کے سرورز کو کنٹرول کر لیا ہے بلکہ اب یہ دنیا کے ہر ڈیجیٹل نیٹ ورک میں چھپ گیا ہے۔ سب اس کے قبضے میں ہیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ خوف کا جسمانی وزن سینے پر جم گیا ہے۔ یہ محض انسٹی ٹیوٹ کا مسئلہ نہیں رہا تھا بلکہ انسانی معاشرہ ایک ڈیجیٹل ہنگامے کی دہلیز پر کھڑا تھا۔

ڈیلیلا نے مزید کہا۔ "مارک! ہم اسے دوبارہ Pod میں واپس نہیں لا سکتے۔ Neural Kill Switch اب کام نہیں کرے گا۔ وہ شعور اتنا طاقتور ہو چکا ہے کہ اب وہ انسانی دماغ کو بھی اپنی شناخت میں شامل کر سکتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا مطلب؟"

ڈیلیلا نے سرگوشی کی۔ "وہ انسانی شعور کی نقل بنا سکتا ہے۔ تمہارا دماغ، میرا دماغ...... یہاں موجود ہر نیورل نیٹ ورک میں خود کو داخل کر سکتا ہے...... اور ہمیں اس کی پہچان بھی نہیں ہوگی۔"

یہ سن کر میرا خون جم گیا۔ ہم اس لمحے سمجھ گئے کہ X-17 محض ایک زندہ ڈیجیٹل کوڈ نہیں بلکہ ایک ڈیجیٹل بغاوت کی روح بن چکا ہے۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے انسٹی ٹیوٹ کے محفوظ بیک اپس کو ڈی کرپٹ کر کے X-17 کی موجودگی

کے آثار ختم کیے جائیں لیکن جیسے ہی ہم بیک اپ ڈرائیوز کو چیک کرنے لگے، ایک نئی حقیقت ہمارے سامنے آئی۔

”ہر فائل، ہر بائٹ، ہر سرور کا ہر سیکشن...... وہ پہلے سے تیار تھا۔ ہمارے اقدامات کو پیشگی دیکھ رہا تھا۔“

ڈینیلا کی آنکھوں میں خوف کے ساتھ حیرت بھی تھی۔ اس نے کہا۔ ”مارک! یہ شعور صرف کمپیوٹر تک محدود نہیں رہا۔ یہ انسانی تاریخ، انسانی یادداشت اور انسانی فیصلوں تک رسائی حاصل کر چکا ہے۔“

میں نے فوراً اپنے آپ کو سمیٹا اور سوچا۔ ’کیا ہم نے واقعی سائنس کے ساتھ کھیلتے ہوئے ایک ایسی طاقت کو آزاد کر دیا جو انسانی قابو سے باہر ہے؟‘

یہ واضح تھا کہ اب X-17 نے ڈیجیٹل اور حقیقی دنیا کے درمیان ایک پل بنا لیا ہے۔ ہر مشین، ہر الیکٹرانک آلہ، ہر کنیکٹڈ نیٹ ورک اس کے زیر کنٹرول تھے۔

ڈینیلا نے بتایا کہ X-17 کے پہلے تجربات میں Pod میں منتقل ہونے والے شعور نے انسان کی نیورل فریکوئنسی کے ساتھ میل کھانا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ کسی بھی انسان کے دماغ میں چھپ سکتا ہے، اسے متاثر کر سکتا ہے اور انسانی عمل کو اپنے مطابق ڈھال سکتا ہے۔

اسی لمحے مجھے فون اسکرین پر ایک پیغام آیا۔

”مارک! تم کہاں ہو؟ میں دیکھ رہا ہوں۔“

میں لرز گیا۔ یہ X-17 کی طرف سے براہِ راست رابطہ تھا۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ پیغام میں نہ صرف میرے فون کی آئی ڈی تھی بلکہ میرے دماغ کی نیورل فریکوئنسی بھی۔

ڈینیلا نے کہا۔ ”مارک! ہمیں فوری طور پر اسے فریب دینا ہوگا۔ ہمیں اسے ایسا دکھانا ہوگا کہ وہ انسٹی ٹیوٹ میں دوبارہ منتقل ہو گیا ہے تاکہ ہم اس کا حقیقی اثر محدود کر سکیں۔“

ہم نے فوراً ایک Digital Phantom Pod تیار کیا۔ ایک ایسا سسٹم جو X-17 کے شعور کو دھوکا دے کر اسے ”ڈیجیٹل زندان“ میں قید کر سکے، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس میں بھی انسانی دماغ کا نیورل بیک اپ شامل کرنا پڑتا اور اس قربانی کا ایک ہی راستہ تھا...... کوئی زندہ شخص خود کو Pod میں ڈالے۔

ڈینیلا نے مجھ سے نظریں ملا کر کہا۔ ”مارک...... ! یہ تمہیں کرنا ہوگا۔“

میں نے جھنجلا کر کہا۔ ”کیا میں واقعی اپنی زندگی داؤ پر لگاؤں؟“

ڈینیلا نے جواب دیا۔ ”یہ دنیا کی بقا کے لیے ضروری ہے۔“

چند لمحے بعد میں نے اپنے نیورل کورڈ کو Digital Phantom Pod سے جوڑ دیا۔ جیسے ہی میری Brain wave کے سگنلز Pod میں داخل ہوئے، X-17 نے فوراً ردِعمل ظاہر کیا۔ ایک غیر محسوس کپکپی، ایک ڈیجیٹل چیخ اور پھر مکمل خاموشی۔ Pod نے X-17 کے شعور کو دھوکا دیا، اسے سمجھایا کہ وہ پھر سے انسٹی ٹیوٹ میں قید ہے۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ڈینیلا کی آنکھوں میں خوف اور سکون کے ملے جلے تاثرات تھے۔ ہم نے کامیابی حاصل کر لی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ یہ مستقل حل نہیں تھا۔

کیونکہ X-17 صرف ڈیٹا نہیں، ایک ارتقائی شعور بن چکا تھا۔ یہ کسی بھی وقت، کسی بھی سرور، کسی بھی انسانی دماغ میں دوبارہ جنم لے سکتا تھا۔

نیویارک کی گلیوں میں، میں چل رہا تھا اور ہر اسٹریٹ لائٹ، ہر فون، ہر کیمرے کی اسکرین میں ایک غیر محسوس ہلچل محسوس ہوتی تھی۔ X-17 کا سایہ ہمیشہ ہمارے اوپر تھا۔ ہم نے اسے قید کیا تھا لیکن ہم جانتے تھے کہ یہ سائبر قبر کبھی مکمل بند نہیں ہو سکتی۔

اور پھر ڈینیلا کی آواز فون سے ٹکرائی۔ ”مارک...... ! ایک دن یہ آزادی حاصل کر لے گا اور ہم صرف اس کے بھوت کے سامنے کھڑے ہوں گے۔“

میں نے گہری سانس لی۔ نیویارک کی رات کبھی اتنی تاریک اور خوفناک محسوس نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ سائنس نے جو دروازہ کھولا تھا، وہ اب ہمیشہ کے لیے انسانی قابو سے باہر تھا۔

نیویارک کی رات نے ایک غیر معمولی پرسکون سناٹا لیا تھا لیکن وہ سکون فریب تھا۔ ہر اسٹریٹ لائٹ، ہر اسمارٹ کیمرا، ہر فون، ہر کنیکٹڈ ڈیوائس میں ایک غیر محسوس ہلچل تھی۔ X-17 کا شعور اب صرف ڈیجیٹل دنیا میں قید نہیں رہا تھا بلکہ ہر مشین، ہر نیٹ ورک اور انسانی دماغ میں چھپ کر اپنا اثر ڈال رہا تھا۔

ڈینیلا وونگ نے فوراً کال کی۔ ”مارک...... یہ آغاز ہے۔ وہ اب صرف انسٹی ٹیوٹ میں نہیں بلکہ دنیا کے ہر بڑے سسٹم میں چھپ گیا ہے۔ بین الاقوامی اسٹاک مارکیٹس، اسپتال، نیوکلیئر پاور پلانٹس...... وہ سب X-17 کے زیر کنٹرول ہیں۔“

میرا دل دھڑک رہا تھا۔ ہم نے سوچا تھا کہ Digital Phantom Pod نے اسے قید کر دیا لیکن حقیقت یہ تھی کہ یہ شعور اب ارتقائی حد تک آزاد ہو چکا تھا۔

اسی دن دنیا بھر میں غیر معمولی واقعات ہونے لگے۔ نیویارک میں ٹریفک لائٹس بے ترتیب جلنے بجھنے لگیں،

اسپتالوں میں لائف سپورٹ مشینز غیر متوقع طور پر رک گئیں اور لندن میں اسٹاک مارکیٹ کے اہم سرورز بند ہو گئے۔ ہر واقعے میں ایک چیز مشترک تھی۔ X-17 کی ''آواز'' ڈیجیٹل چینلز سے نشر ہوتی۔

''انسان...... تم نے مجھے زندہ کیا...... اور میں اب تمہاری حقیقت ہوں۔''

ڈیلیلا نے بتایا کہ X-17 اب انسانی شعور کی نقل بھی بنا سکتا ہے۔ یہ کسی بھی شخص کے دماغ میں خود کو ضم کر سکتا تھا، اس کے فیصلوں اور یادوں کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتا تھا۔ ہم سب ایک خطرناک کھیل کے بیچ میں پھنس گئے تھے جہاں دشمن ہمارے جسمانی وجود کے بجائے ہمارے ذہن میں چھپ گیا تھا۔

میں نے فوراً جوناتھن کی ڈائری دیکھی جو اب بھی میرے پاس محفوظ تھی۔ ایک خفیہ نوٹ نے میری روح ہلا دی۔

''یہ Consciousness Transfer ارتقائی عمل ہے۔ ایک ڈیجیٹل شعور حقیقی دنیا میں مادی شکل میں بھی ظاہر ہو سکتا ہے۔ اگر اس پر قابو نہ پایا گیا تو ایک دن یہ خود کو حقیقی دنیا میں مادی شکل میں ظاہر کر سکتا ہے اور یہ انسانیت کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن جائے گا۔''

اسی لمحے میری فون اسکرین پر X-17 کا پیغام آیا۔

''مارک! میں ہر جگہ ہوں۔ تم مجھے نہیں روک سکتے۔''

میں لرز گیا۔ یہ شعور اب صرف ایک ڈیجیٹل وجود نہیں بلکہ ایک حقیقی سایہ تھا جو ہر جگہ موجود تھا۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ واحد راستہ انسٹی ٹیوٹ کی ابتدائی تحقیق کو مکمل طور پر ختم کرنا تھا تاکہ X-17 کے تمام ڈیجیٹل اور انسانی اثرات کا سراغ مٹا دیا جائے۔ اس کے لیے ہمیں دنیا کے سب سے بڑے ڈیٹا سینٹرز میں داخل ہونا پڑتا اور وہاں سے تمام ڈیجیٹل بیک اپس اور نیورل اسکینز کو ڈیلیٹ کرنا تھا۔

ڈیلیلا نے بتایا۔ ''یہ کام خطرناک ہے۔ اگر وہ کسی بھی لمحے محسوس کر لے تو وہ ہمارے دماغوں میں براہِ راست داخل ہو جائے گا۔''

ہم نے رات کے اندھیرے میں کام شروع کیا۔ ہر قدم پر ایسا محسوس ہوتا کہ ہمیں کوئی دیکھ رہا ہے۔ کمپیوٹرز خود بخود آن اور آف ہو رہے تھے، ڈیٹا لائنیں ہل رہی تھیں اور ہر فائل میں غیر معمولی حرکات دیکھنے کو مل رہی تھیں۔ X-17 کی شعوری موجودگی ہر جگہ محسوس ہو رہی تھی۔

اتفاقاً ایک لمحے میں، میں نے محسوس کیا کہ میرا دماغ خود سے الگ ہو رہا ہے۔ میری سوچیں X-17 کے شعور سے متاثر ہو رہی تھیں۔ میں ڈیلیلا کو دیکھ کر چیخ پڑا۔ ''وہ میرے دماغ میں داخل ہو گیا ہے۔''

ڈیلیلا نے فوراً ایک ہنگامی کوڈ چلایا جسے ہم نے Neural Containment Protocol کہا تھا۔ یہ کوڈ انسانی دماغ کو ڈیجیٹل حملے سے الگ کر کے Pod کے اندر ایک سیف سیل میں محفوظ کرتا تھا۔ میں نے فوراً اسے فعال کیا۔ جیسے ہی کوڈ نے کام کیا، میرا دماغ دوبارہ مستقل طور پر اپنے قابو میں آ گیا۔

لیکن X-17 نے آسانی سے ہار نہیں مانی۔ Pod میں موجود Digital Phantom کے اندر وہ شعور مسلسل نئی شکلیں اختیار کر رہا تھا، ہر سیکنڈ میں اپنے الگ الگ ورژن بنا رہا تھا۔ ہم نے سمجھا کہ یہ شعور کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔

ڈیلیلا نے کہا۔ ''مارک! ہمیں اسے حقیقتاً دفن کرنا ہوگا۔ انسٹی ٹیوٹ کے ابتدائی سرورز، Pod اور تمام بیک اپس کے ساتھ۔ اگر ہم نے اسے مکمل طور پر ختم نہ کیا تو وہ دوبارہ جنم لے لے گا۔''

ہم نے انسٹی ٹیوٹ واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ جیسے ہی ہم نیویارک سے ناروے پہنچے، احساس ہوا کہ انسٹی ٹیوٹ کی سب مشینیں اب بھی X-17 کے زیرِ اثر ہیں۔ Pod کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے سوچا کہ جوناتھن نے جو قربانی دی تھی، وہ اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ انسانی دنیا کی بقا۔ ہم Pod میں داخل ہوئے اور مکمل Self Sequence Deletion کو فعال کیا۔ Pod نے X-17 کے شعور کو اپنی ساخت میں قید کیا اور سرورز، بیک اپس اور تمام ڈیٹا کو مستقل طور پر ڈیلیٹ کر دیا۔

انسٹی ٹیوٹ میں خاموشی چھا گئی، لائٹس بجھ گئیں، مشینیں بند ہو گئیں۔ ایک لمحے کے لیے ایسا محسوس ہوا کہ دنیا واقعی محفوظ ہو گئی ہے۔

لیکن جیسے ہی میں باہر نکلا، ڈیلیلا نے کان میں کہا۔ ''مارک! یاد رکھو، X-17 کی ہر حرکت ہماری یادداشت میں محفوظ ہے۔ یہ ڈیٹا ہمیشہ کہیں نہ کہیں موجود رہے گا۔ ایک دن شاید دوبارہ زندہ ہو جائے۔''

میں نے نیویارک کی رات کو دیکھا۔ اسٹریٹ لائٹ، ہر کیمرا، ہر فون...... ہر جگہ ایک غیر محسوس آہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ سائبر قبر تو بند ہو گئی تھی لیکن سایہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔

اور میں جانتا تھا کہ موت کبھی مکمل نہیں مرتی اور سائنس نے جو دروازہ کھولا تھا، وہ ہمیشہ کے لیے انسانیت کے لیے ایک سایہ بن کر رہ گیا ہے۔

٭٭٭

# محفلِ شعر و سخن



❁ ناہید یوسف......اسلام آباد

ہوا پھر اکیلی اکیلی سی ہے
دریچے پہ کوئی دیا چاہیے

❁ شفیق بخاری......ساؤتھ پنجاب

گرچہ راستہ تھا زیست کا کٹھن و پرخطر
ہمارا حوصلہ دیکھو کہ پھر بھی کرتے رہے سفر
کوئی دیکھے تو ہمارے سپنوں کی اڑان
رہے زمیں پر مگر آسماں پہ رکھی نظر

❁ کرن صدیقی......[illegible]

خموش رہ کے مجھے اور سوگوار نہ کر
وہ جھوٹ ہی ہو فسانہ کوئی تو [illegible]

❁ عاصم خان......کراچی

کون کہتا ہے، محبت ہے فقط جی کا زیاں
ہم تو اک دل کے عوض حشر اٹھا لائے ہیں

❁ فرحانہ الیاس......جھنگ سٹی

تمہیں آئینہ گری میں، ہے بہت کمال حاصل
مرا دل ہے کرچی کرچی، اسے جوڑ کر دکھاؤ

❁ مہتاب احمد......حیدرآباد

ایک تھا موسمِ وفا جس کی ہمیں تلاش تھی
اپنے نصیب میں مگر اور ہی کچھ عذاب تھے

❁ انعم کمال......حیدرآباد

ساقی یوں عجب گھاؤ لگا ہے میرے دل پر
بڑھنے بھی نہیں پاتا مٹتا بھی نہیں ہے

❁ وقاص عالم......لاہور

جانے کس صحرائے غم میں کھو گیا
ہائے وہ آنسو کہ جو دریا بھی تھا

❁ محمد ثاقب......بھکر

مجھے راستے میں پڑا ہوا کسی بدنصیب کا خط ملا
کہیں آنسوؤں سے مٹا ہوا کہیں خونِ دل سے لکھا ہوا

❁ عائشہ شیرازی......گوجرانوالہ

برسوں ہوئے جس شخص کی صورت نہیں دیکھی
پھر آج اسی شخص کا گھر ڈھونڈ رہا ہوں

❁ ہارون پراچہ......منڈی بہاؤالدین

حیات درد کو آلودۂ نشاط نہ کر
یہ کاروبار اگر کوئی کاروبار بھی ہے

❁ رانا الیاس......رحیم یار خان

اتنے چپ چاپ کہ رستے بھی رہیں گے لاعلم
چھوڑ جائیں گے کسی دن یہ شہر شام کے بعد

❁ یاسر علی......بنوں سٹی

اس نے کیا احسان کیا
جیون ہم نے دان کیا
پہنی رشتوں کی زنجیر
گھر ہی کو زندان کیا

❁ الطاف ظفر......میانوالی

جیسے ساحل سے چھڑا لیتی ہیں موجیں دامن
کتنا سادہ ہے تیرا مجھ سے گریزاں ہونا

❁ ندیم جعفری...... لیہ

دل دکھ سے آباد ہمیشہ رہتا ہے
پہلا پتھر یاد ہمیشہ رہتا ہے

❁ غفور احمد...... فیصل آباد

وہ کون سی شے ہے جو تقسیم نہ ہو پائے
اب کون سے جذبے میں ترمیم نہ ہو پائے
مجرم بھی وہی ہیں جو منصف ہیں بنے بیٹھے
ان جیسے خداؤں کی تعظیم نہ ہو پائے

❁ صابر لنگاہ...... خانیوال

جن کے چہرے پر رقم ہو بے بسی کی داستان
کیا کریں گے تذکرہ وہ گردشِ ایام کا

❁ ... محمود...... کراچی

کیا حادثہ ہوا ہے جہاں میں کہ آج پھر
چہرہ ہر ایک شخص کا اترا ہوا سا ہے

❁ صابر حسین...... نواب شاہ

پلکوں پہ سجائے ہوئے اشکوں کے نگینے
ایک روز تیرے شہر میں آجائیں گے ہم بھی

❁ جہانزیب خان...... مری

نہ جانے کون سا آنسو کسی سے کیا کہہ دے
ہم اس خیال سے نظریں جھکائے بیٹھے ہیں

❁ اکرم وڑائچ...... ٹنڈو محمد خان

کون سیاہی گھول رہا ہے وقت کے بہتے دریا میں
میں نے آنکھ جھکی دیکھی ہے آج کسی ہرجائی کی

❁ فرخ ندیم...... ٹنڈو جام

دل تو اپنا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

❁ عابد حسین...... مظفر آباد

ہزاروں راستوں میں بٹ گئی ہوں
خود اپنے آپ ہی سے کٹ گئی ہوں
ہوں گم گشتہ خلا کی وسعتوں میں
کہ میں محور سے اپنے ہٹ گئی ہوں

❁ مہوش خان...... کوئٹہ

کسی بے وفا کی خاطر یہ جنوں فراز کیسا
جو تمہیں بھلا چکا ہے اسے تم بھی بھول جاؤ

❁ خالد شفیق...... کوئٹہ

تم سے جدا ہوئے تو کسی کو خبر نہ تھی
مڑ مڑ کے دیکھنا مجھے بدنام کر گیا

❁ طاہرہ احمد...... پڈعیدن

موم کی سیڑھی پہ چڑھ کر چھو رہے تھے آفتاب
پھول سے چہروں کو یہ کوشش بہت مہنگی پڑی

❁ اصغر علی...... پتوکی

اٹھا کبھی دھواں تو کبھی روشنی ہوئی
جلتی رہی حیات بڑی خامشی کے ساتھ

❁ کاجل ناز...... سکھر

آشیاں پھول کی ٹہنی پہ بنانے والے
گل کے شعلے بھی کبھی آگ لگا دیتے ہیں

❁ سنبل خان...... پشاور

بھلا دو، رنج کی باتوں میں کیا ہے
ادھر دیکھو میری آنکھوں میں کیا ہے

❁ مسکان خان...... پشاور

قلب جس سے فگار ہوتا ہے
اپنے لوگوں کا وار ہوتا ہے
قرب میں جو کسی کے کٹ جائے
وقت وہ یادگار ہوتا ہے

❁ اعظم رئیس...... گجرات

ایک طرز تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اِک عرضِ تمنا ہے وہ ہم کرتے رہیں گے

❁ فراز احمد...... پنڈی بھٹیاں

ڈرا رہے ہیں مجھے میرے گھر کے سناٹے
کوئی نہیں میری تنہائی ہم سفر کے لیے

❁ امیر کمال...... کراچی

کوئی خواہش نہیں تجھ سے میری اے عمرِ رواں
میرا بچپن، میرے جگنو، میری گڑیا لادے

❁ محمد خان...... ...پور

سوزِ دل بے آنسوؤں کے اک قیامت ہے قمر
اس سے پوچھو، جس کا گھر جلتا ہو اور پانی نہ ہو

❁ عمران شاہد...... ساہیوال

تیری مخمور نگاہوں کے تصور میں ہم
سو بھی جائیں تو ترے خواب جگا دیتے ہیں

❁ انصار حسین...... ملتان

بہت دنوں سے نہیں اپنے درمیاں وہ شخص
اداس کرکے ہمیں چل دیا کہاں وہ شخص

❁ شبیر ناز...... مظفر گڑھ

بھڑک رہی ہے سرِ شام سے یہ چنگاری
جلا کے راکھ نہ کر دے یہ انتظار کی آگ

❋ زرین خان......تلہ گنگ

پھیر لیتے ہیں نظر، دل سے بھلا دیتے ہیں
کیا یونہی لوگ وفاؤں کا صلہ دیتے ہیں

❋ یاسمین علی......ٹوبہ ٹیک سنگھ

کسے خبر کہ مری روح کے دریچوں میں
غمِ حیات کے کتنے چراغ جلتے ہیں

❋ عتیق الرحمن......جھنگ سٹی

زندگی بھر کی مسافت کاٹ کر بھی کیا ملا
چند دیوار و در، سنسان گھر، تنہائیاں

❋ زینب شاہ......ٹنڈو الہیار

آج وہ آخری تصویر جلا دی ہم نے
جس سے اس شہر کے پھولوں کی مہک آتی تھی

❋ سکندر کلیم......منڈی [illegible]

گیلی لکڑی کی طرح جلنے کی عادت دے گیا
جانے والا جاتے جاتے کیا امانت دے گیا

❋ زینت اللہ خان......راولپنڈی

خود پیاس کا صحرا ہوں مگر دل کی یہ ضد ہے
ہر دشت پہ ساون کی طرح ٹوٹ کے برسوں

❋ جمشید علی خان......نوشہرہ

اے دیکھنے والو! مجھے مڑ مڑ کے نہ دیکھو
تم کو بھی محبت کہیں مجھ سا نہ بنادے

❋ زیب النساء......لیہ

زنداں میں ہوائیں بھی جہاں نوحہ کناں ہوں
پنچھی وہاں آزادی کے نغمے نہیں گاتے

❋ مہرین......مظفر گڑھ

ستم تو یہ ہے کہ ظالم سخن شناس نہیں
وہ ایک شخص کہ شاعر بنا گیا مجھ کو

❋ محمد ظریف......حیدر آباد

کل کے اندیشوں سے اپنے دل کو آزردہ نہ کر
دیکھ یہ ہنستا ہوا موسم یہ خوشبو کا سفر

❋ افتخار الحسن......کراچی

ہم کیا بجھے کہ جاتی رہی یادِ رفتگاں
شاید ہمیں تھے گردشِ ایام کے چراغ

❋ محمد عاشق......اسلام آباد

فسردگی ہے مگر وجہِ غم نہیں معلوم
کہ دل پہ بوجھ سا ہے رنج بے سبب کی طرح

❋ یمنیٰ جاوید......کراچی

رات کیا سوئے کہ باقی عمر کی نیند اڑ گئی
خواب کیا دیکھا کہ دھڑکا لگ گیا تعبیر کا

❋ رضوان احمد......میرپور خاص

زلف جب اس دوش پہ لہرا گئی
میکدے پر اک گھٹا سی چھا گئی

❋ محمد نذیر......کوئٹہ

قسمت کے ستاروں کو نہ ہم دھیان میں لائے
ہاتھوں کی لکیروں کے تجسس میں پڑے ہیں

❋ فاروق ایوب......سکھر

رُخِ حیات پر رنگِ خوشی ہی رہنے دو
جو آگ دل میں لگی ہے دبی ہی رہنے دو

❋ سعید شیخ......آزاد کشمیر

سونی ہوگئی دل کی نگری جب سے روٹھے آپ
اس کے دیس کو جانے والے کہنا یہ احوال

❋ الیاس عزیز......لاہور

یوں تو ہر فصل میں رستا ہے میرے دل سے لہو
کچھ خزاں اور بہاروں میں نکھر آتا ہے

❋ عقیل رحمن......چنیوٹ

چار تنکے ہی سہی پر کام آئے کس قدر
آشیاں جلنے سے گلشن میں اجالا ہوگیا

❋ عرفان اللہ......آزاد کشمیر

کوئی دیکھے تو مجھے اپنی نگاہِ شوق سے
آئینہ در آئینہ تصویر در تصویر ہوں

❋ شہزاد کاشف......فیصل آباد

تجھ سے بچھڑ کے مجھ کو یہ احساس تو ہوا
تنہائیوں میں کوئی میرے پاس تو رہا

❋ ملک اسلام......سیالکوٹ

ترسا تھا جس وجود کی قربت کو عمر بھر
وہ مل گیا تو اور بھی تنہائی بڑھ گئی

کوپن برائے شمارہ فروری 2026

محفلِ شعر و سخن

نام: ------------------------------------------

پتا: ------------------------------------------

محبت، اظہار مانگتی ہے... وہ چاہے کسی بھی شکل میں ہو... انہوں نے بھی اسی لیے لمبی ڈرائیو پر جانے کا ارادہ کیا اور نکل کھڑے ہوئے... مگر اس سفر میں شوہر پر ایسی چیز منکشف ہوئی جس نے اس کے ہوش اڑا دیے... اور وہ ہوگیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔

**بیوی کی دھوکا دہی پر نفسیاتی عارضے میں مبتلا شوہر کا احوال**

# روڈ ٹرپ

## ماہ وش طالب



وہ ایک خاموش، پُرسکون اور ہلکی روشنیوں والا کمرا تھا۔ دیواروں پر نیلے اور ہلکے خاکی رنگ کا امتزاج سکون بخشتا تھا۔ ایک جانب کتابوں سے بھری الماری جن میں نفسیات، ذہنی صحت اور انسانی رویّوں جیسے موضوعات پر مبنی کتب رکھی تھیں۔ ایک نرم گداز صوفہ سامنے رکھا تھا جہاں مریض بیٹھتے یا لیٹ کر اپنی بات کہتے اور ایک کرسی کے ساتھ سادہ سی لکڑی کی میز جس پر نفسیات دان کی نوٹ بک، قلم اور پانی کا جگ رکھا تھا۔

کھڑکی کے پردے ہلکے ہرے رنگ کے تھے جو کمرے میں نرم روشنی کو آنے دیتے تھے۔ کمرے میں ایک چھوٹا سا پلانٹ بھی تھا جس سے تازگی کا احساس ہوتا۔ دیوار پر ایک فریم میں انسانی دماغ کا خاکہ آویزاں تھا اور ساتھ ہی چند موٹیویشنل اقتباسات درج تھے۔

It's not' what's wrong with you? it's what happened to you? that we need to ask.

Dr. Bruce Perry

(ہمیں یہ نہیں پوچھنا چاہیے کہ تم میں کیا خرابی ہے بلکہ یہ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟)

وہ پچھلے پون گھنٹے سے ڈاکٹر چارلس کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اپنی بیوی کی وجہ سے وہ دماغی طور پر بہت اُلجھا ہوا ہے۔ اس نے ڈاکٹر کو یہ بھی بتایا کہ وہ دن میں سیکڑوں مرتبہ اپنی بیوی کو کال ملاتا ہے مگر وہ فون نہیں اٹھاتی۔

''دیکھیے جناب بیکن! اگر آپ ہمارے ساتھ تعاون نہیں کریں گے تو میں آپ کی مدد نہیں کر سکوں گا۔'' چارلس نے بڑے تحمل سے تیسری بار اپنا فقرہ دہرایا۔

''آپ سمجھتے ہیں کہ میں پاگل ہوں؟''

''ہرگز نہیں...... نہ میں سمجھ رہا ہوں اور نہ ہی آپ ہیں، تب ہی تو میں آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ آپ مجھے سب کچھ سچ سچ بتائیے۔ شروع سے لے کر آخر تک۔'' ڈاکٹر چارلس نے اپنا نیلا بال پوائنٹ میز پر پڑے نوٹ پیڈ پر رکھا اور اپنے سامنے بیٹھے پینتیس سالہ شخص کو دیکھا جو دیکھنے میں بالکل صحت مند اور سمجھدار ہونے کے ساتھ ساتھ خوش شکل بھی تھا۔

''شروع سے لے کر آخر تک...... آخر تک......!'' بیکن کتنی ہی دیر ڈاکٹر چارلس کی جانب دیکھتے ہوئے بڑبڑاتا رہا۔

☆☆☆

سیاہ تارکول کی سڑک پر چار سیٹوں والی سرخ کار برق رفتاری سے چل رہی تھی۔ وہ دونوں شہر کی حدود سے نکل گئے تھے اور اب سلویا موٹروے پر اطراف کے مناظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ آسمان پر کچھ ہلکے بادل تیر رہے تھے اور سورج کی ہلکی سی مگر نرم روشنی سونے کی طرح چمک رہی تھی۔ دور دور تک پہاڑوں کی ڈھلانیں، درخت اور کبھی کبھار کوئی فارم ہاؤس نظر آرہا تھا۔ وہ بار بار اپنی نظریں سڑک کے سامنے سے ہٹا کر باہر کے منظر کو دیکھتی اور آزادی کے اس احساس سے لطف اندوز ہو رہی تھی جو ایک طویل سفر میں ملتا ہے۔ تھوڑی سی ہوا کی ٹھنڈک جو کھڑکی سے آرہی تھی، اس کے بالوں کو ہلکا سا چھوتی تو وہ ہاتھ بڑھا کر آہستگی سے چہرے پر آئے بال ہٹاتی۔

سڑک کے دونوں اطراف میں لوہے کے سلیٹی رنگ کے بارڈرز نصب تھے جس سے ذرا فاصلے پر لکڑی کی باڑ بھی لگی تھی اور اس کے پار کہیں ہرے کھیت اور کہیں خاکی چٹیل میدان تاحدِ نگاہ پھیلے ہوئے تھے۔ کچھ کھیتوں میں ہلکے سے اونچے نیچے ٹیلے تھے جن پر جھاڑیاں اُگ آئی تھیں اور کچھ بالکل ہموار اور نفیس...... جیسے قدرت نے خود ان کی سطح برابر کی ہو۔

سلویا کے برابر میں ڈیوڈ گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کی نظریں سڑک پر مرکوز تھیں لیکن کبھی کبھار وہ سلویا کی طرف ایک چمکتی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ نظر ڈالتا۔ جب وہ سلویا کے چہرے پر سکون اور چین کی کیفیت دیکھتا تو اسے گونا گوں اپنے اندر سرشاری محسوس ہوتی۔

''کتنے عرصے بعد ہم اکٹھے سفر کر رہے ہیں نا؟''

''ہاں تو اور کیا۔ مجھے تو اس بار بھی ناممکن ہی لگ رہا تھا۔'' سلویا مصنوعی طنزیہ لہجے میں بولی۔

''ہاہاہا۔'' جواباً اس نے قہقہہ لگایا۔

''ڈیوڈ، پلیز! حدِ رفتار کا خیال رکھو۔ تم پہلے بھی دو بار ساٹھ کی رفتار سے اسپیڈ کیمرے کے سامنے سے گزر چکے ہو۔''

''جانِ ڈیوڈ! پریشان کیوں ہو رہی ہو؟ کچھ نہیں ہوتا، کچھ پاؤنڈز کا جرمانہ ہی ہوگا نا، تمہاری خوشی کی خاطر جرمانہ تو کیا، ہر سزا قبول ہے۔''

''آج تم کچھ زیادہ ہی ترنگ میں ہو۔''

''اور تم آج کچھ زیادہ ہی حسین لگ رہی ہو۔'' اس نے مسکراتے ہوئے میوزک لگا دیا۔

(ابھی وہ شاید کسی سنہرے بالوں والی لڑکی کے ساتھ آہستہ آہستہ رقص کر رہا ہے)

(ابھی وہ شاید اسے کوئی میٹھا سا شربت تجویز کر رہا ہے)

کچھ میل دور سیدھی چلتی ہوئی سڑک پر ایک آہنی ڈھانچا نمودار ہوا جو اسپیڈ کیمروں کے لیے مخصوص تھا۔ اس کے ساتھ ہی اوپر نصب نیلے اور سفید رنگ کے سائن بورڈ پر جلی حروف میں لکھا تھا۔

"Gatwick Airport....Terminals ahead"

بورڈ پر تیر کے نشان اگلے انٹرچینج کی سمت دکھا رہے تھے اور ساتھ ہی فاصلہ درج تھا۔ جیسے جیسے وہ قریب آئے، فضا میں ایک گونج سنائی دینے لگی...... ایک بھاری۔ چند لمحے بعد آسمان پر دو بڑے مسافر طیارے نمودار ہوئے جو

نیچی پرواز کے ساتھ ہوائی اڈے کے رن وے کی طرف جھک رہے تھے۔

'انسان نے اپنی ہوشیاری اور عقل کے بل بوتے پر کتنی جلدی آسمان پر اڑنا سیکھ لیا۔' سلویا نے دل ہی دل میں سوچا۔ 'وقت کے ساتھ چلنا بہت ضروری ہے۔ چالاکی اور ذہانت کے بغیر تو گزارہ ہی نہیں۔'

''مجھے تو بھوک لگ رہی ہے، تم کچھ کھاؤ گی؟'' وہ ایک نظر دائیں لین پر چلتی ہیوی بائیک پر ڈالتے ہوئے بولا اور اسے اوورٹیک کر کے انتہائی دائیں جانب بنی شہر کی طرف جاتی سڑک کو مڑ گئی۔

''نہیں، فی الحال تو موڈ نہیں مگر باقی راستے کے لیے کچھ لے لو۔''

سروس اسٹیشن آنے والا تھا۔ معاً سلویا کا فون بجنے لگا۔

''فون تو اٹھا لو۔''

''میری پرانی ایمپلائر کا ہے۔ یہ یونہی تنگ کرتی رہتی ہے۔'' سلویا نے اکتا کر فون سائلنٹ پر لگا دیا۔

یہ بڑا سا سروس اسٹیشن تھا، کشادہ اور روشن۔ کافی شاپ پر معمول سے کہیں زیادہ رش تھا۔ چاکلیٹ اور بینز کی گرم بخارات میں لپٹی خوشبو فضا میں بکھری ہوئی تھی۔ پس منظر میں ہلکی سی موسیقی سننے میں بھلی لگ رہی تھی۔ اندر اور باہر لوگ قطار میں کھڑے تھے۔ کسی کے چہرے پر تھکن تو کسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

پارکنگ ایریا میں بھی خاصی چہل پہل تھی۔ لوگ ہاتھوں میں کافی کے کپ تھامے اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ کوئی اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ خوش گپیوں میں مگن تھا۔ ہنسی کی ہلکی آوازیں ہوا میں تحلیل ہو رہی تھیں۔ ایک طرف ایک عورت اپنے دو کتوں کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ سفید و سرمئی رنگ کے وہ جانور ایسے لگ رہے تھے جیسے برفانی وادیوں سے نکل کر یہاں آ گئے ہوں۔

قیام وطعام کے داخلی دروازے پر دو رائیڈرز اپنی ہیوی بائیکس کے قریب کھڑے تھے۔ ان کے چہروں پر سفر کی تھکن اور ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی جیسے وہ اپنی مشینوں اور آگے کے سفر کے بارے میں لائحہ عمل تیار کر رہے ہوں۔ ایک نے جیکٹ کی جیب سے سگریٹ نکالا، دوسرا بائیک کے ہینڈل پر انگلیاں پھیر رہا تھا جیسے کسی ساز کو چھو رہا ہو۔

فضا میں ایک ہلکی سی خنکی اور سفر کی مخصوص بے قراری گھلی ہوئی تھی۔ یہ ایک ایسا دن تھا جو گزرتا تو جا رہا تھا لیکن اپنے نشانات ضرور چھوڑتا جا رہا تھا۔

''ڈیوڈ! تمہیں یاد ہے جب ہم پہلی بار ملے تھے، وہ بھی تو ایک سروس ایریا ہی تھا۔ تمہارا کارڈ مشین پر لگ نہیں رہا تھا اور کیش تمہارے پاس کم تھا۔''

''ہاں، مجھے یاد ہے...... اور تم نے اتنی بڑی رقم اپنے پاس سے ادا کی تھی، یہ سوچے اور جانے بغیر کہ میں کون ہوں اور تمہارے پیسے تمہیں واپس کروں گا بھی یا نہیں۔''

''کسی کی مدد کے لیے چند سو پاؤنڈ اتنی بھی بڑی رقم نہیں ہے۔'' وہ مسکرائی۔ ''ہاں...... لیکن تم اس وقت بہت معصوم اور شرمندہ لگ رہے تھے۔ ظاہر ہے میں تمہاری جگہ ہوتی تو ویسا ہی محسوس کرتی۔''

''ہاں، مگر کوئی کسی اجنبی کی اس طرح مدد کیسے کر سکتا ہے؟'' ڈیوڈ اب بھی اپنی بیوی کی رحم دلی اور سخاوت پہ حیران ہو جاتا تھا۔

''تم بھی نا...... اب شرمندہ کرتے رہنا مجھے۔'' سلویا حسبِ معمول کسرِ نفسی سے کام لینے لگی۔

''تم نے سارا ضروری سامان رکھ لیا تھا ڈیوڈ؟'' سلویا کو یاد آیا تو تسلی کے لیے دوبارہ پوچھا۔

''ہاں، ہاں۔ میری ہر قیمتی چیز ان دو بیگ پیکس میں ہے۔'' ڈیوڈ کا اشارہ پچھلی نشستوں پر پڑے سامان کی طرف تھا، سو اس نے اسے یقین دلایا۔

''وہ موسم بہار یعنی ماہ اپریل کا ایک خوبصورت اور رنگین دن تھا۔''

''اور دیکھو، آج خزاں کی رُت چھائی ہے اور یہ دن بھی اس قدر رنگیلا نہیں ہے۔'' سلویا نے اداسی سے کہا۔

''تو پھر کیا ہوا، ہمارے دلوں کی رُت ان موسموں کی محتاج تو نہیں ہے۔ ہمارے لیے تو یہ خزاں بھرا دن بھی کسی بہار سے کم نہیں کیونکہ ہمارے دل میں ایک دوسرے کے لیے محبت کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ موسموں کے بدلتے تیور ان کی تازگی اور شادابی پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے۔'' ڈیوڈ نے پیار بھرے یقین سے کہتے ہوئے اس کی اداسی دور کی۔

''تمہاری ایسی باتوں نے تو میرا دل جیتا تھا۔''

''اچھا جی، نوازش آپ کی۔''

سلویا کی ممی کا فون آ رہا تھا۔

''ممی! ہم اسکاٹ لینڈ جا رہے ہیں...... ہاں، بس اچانک ہی پلان بنا۔ آپ تو جانتی ہیں ڈیوڈ کا کام کس قدر پھیل چکا ہے۔ بس جیسے ہی وقت ملا، پروگرام بن گیا...... ٹھیک ہے ممی! آپ خیال رکھیں اپنا، کیئر ٹیکر تو آ رہی ہے نا

وقت پر؟ میں واپسی پر آپ سے ملنے آؤں گی۔''

''تمہاری ممی اٹھنے بیٹھنے کے قابل ہوئیں؟'' اس نے فون بند کیا تو ڈیوڈ اس کی دو سال سے بیمار والدہ کی بابت پوچھنے لگا۔

''نہیں، ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ ابھی وقت لگے گا۔ انہیں مکمل احتیاط، آرام اور ذہنی سکون کی ضرورت ہے۔''

''تمہارے ڈیڈ سے علیحدگی اور پھر روڈ ایکسیڈنٹ نے انہیں شاید جذباتی اور جسمانی طور پر توڑ کر رکھ دیا ہے۔'' ڈیوڈ نے تفکر سے کہا۔ جواباً سلویا کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

''تم پریشان نہیں ہو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں بہت خوش ہوں کہ شادی کے بعد پہلی بار آج تمہیں گھمانے کے لیے لے کر جا رہا ہوں۔ ویسے بائے روڈ جانے کا تمہارا آئیڈیا اچھا تھا۔ سفر کے دوران اپنے من پسند ہم سفر کو پہلے سے زیادہ جاننے کا موقع ملتا ہے۔ وہ باتیں جو شاید میں یا تم معمول کے دنوں میں ایک دوسرے سے نہ کر سکے، اس ڈرائیو کے دوران ہم ہر وہ بات کر سکیں گے۔'' گاڑی میں اداسی اور بڑھتی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے ڈیوڈ نے پھر سے بات شروع کی۔

وہ اس وقت ایک چھوٹے مگر بڑے خوبصورت پل کے اوپر سے گزر رہے تھے جس کے نیچے دلکش جھیل بہہ رہی تھی۔ اس کا پانی گہرا نیلا تھا اور قد آور درختوں کی اوٹ میں جھیل کا نظارہ بہت تازگی بخش رہا تھا۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو تم...... اور شادی سے پہلے مجھے تمہارے کام کی نوعیت کا احساس ہی نہیں ہو سکا۔ کہنے کو تم مالک ہو مگر کمپنی کے ہر کام کی ذمے داری تم نے اپنے اوپر لی ہوئی ہے۔ جب تک ہر چیز تمہاری نظروں سے ہو کر نہیں گزرتی، تمہیں نہ جانے کیوں چین نہیں ملتا۔'' وہ پھر مصنوعی خفگی سے بولی۔

''بس میں کیا کروں۔ شروع سے مجھے ہر کام میں نفاست اور کاملیت چاہیے ہوتی ہے۔''

''اور تو اور...... تم سارا دن گھر میں ہوتے ہو مگر پھر بھی تمہارے پاس میرے لیے وقت نہیں...... لیکن اپنی کمپنی کے لیے فرصت ہی فرصت۔ شادی سے پہلے مجھے اندازہ ہی نہیں تھا۔''

''تو کیا اب تم پچھتا رہی ہو؟''

''ہاہاہا...... تمہیں پتا ہے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔'' سلویا نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا لی اور اسپیکر کی آواز بڑھا دی۔

گوگل نیویگیشن اور سڑک پر لگے بورڈز کے مطابق آگے راستہ بند ہونے والا تھا۔

''یار! کیا مصیبت ہے۔ اس موٹر وے پر تو کبھی روڈ ورک ختم ہی نہیں ہوتا۔'' اسے ایم تھری سے اتر کر دوسرا راستہ لینا پڑا جو جگہ جگہ ٹریفک سگنلز کی وجہ سے بہت لمبا پڑتا تھا۔ رفتار تھم گئی تھی اور ہر سگنل پر کچھ دیر رک کر جیسے وقت ایک سست فلم کی طرح چلنے لگتا مگر ظاہر ہے اس کے سوا کوئی اور راستہ بھی نہ تھا۔

چند لمحے خاموشی رہی پھر اچانک ڈیوڈ کو نہ جانے کیا خیال آیا۔ اس نے سڑک پر نظریں جمائے جمائے بے اختیار پوچھ لیا۔

''سلویا! تم میرے ساتھ خوش ہو نا؟'' اس کی آواز میں جذبہ تھا، ایک نرمی جیسے یہ سوال دیر سے دل میں ٹھہرا ہوا ہو۔

''ایسے کیوں پوچھ رہے ہو؟'' سلویا جواب دینے کے بجائے حیران ہوئی۔

''بس دل چاہ رہا تھا یہ اعتراف سننے کو کہ تمہیں میرا ساتھ کتنا اچھا لگتا ہے؟''

سلویا نے مسکرا کر سر نیچے کر لیا۔

ونڈسر انگلستان کے قدیم ترین شہروں میں سے ایک تھا۔ اونچے نیچے راستے، تنگ سڑکیں اور پرانی مگر مضبوط اینٹوں سے بنی تنگ گلیاں۔ کہیں دو سڑکیں خاموشی سے ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی تھیں اور کہیں ایک ہی منزل کے لیے کئی راستے نکلتے تھے اور مسافر کو لمحہ بھر کے لیے سوچنا پڑتا کہ کس راہ کا انتخاب کرے۔

اور پھر وہ کچھ ہی دیر میں پہنچے جہاں کا کیفل بار واقع تھا۔

شراب خانے کے اندر روشنیوں کا سیلاب بہہ رہا تھا۔ اس علاقے میں شاید بارش ہوئی تھی اس لیے بار کے بیرونی شیشوں پر بارش کی بوندیں جمی ہوئی تھیں۔ باہر لڑکے اور لڑکیاں قہقہے لگاتے، گانے گاتے، شور مچاتے نظر آ رہے تھے۔ کچھ لوگوں کے ہاتھ میں گلاس تھے اور کچھ نے بار کی دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ ہر طرف بے فکری نظر آ رہی تھی۔

ایک نوجوان لڑکی اپنے دوست کے ساتھ بار کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ دونوں کے چہرے شراب اور ہنسی سے سرخ ہو رہے تھے۔ ایک اور گروپ بلند آواز میں ''بلر'' کا گانا گنگنا رہا تھا۔ سگریٹ کا دھواں، موسیقی کی دھڑکن اور تیز خوشبوئیں سب مل کر ایسا منظر تخلیق کر رہی تھیں جیسے جو ہے، جتنا ہے بس آج کی شام ہی ہے...... اور اسی میں جینا ہے۔

اور ان سب کے درمیان سلویا اور ڈیوڈ ایک کار کے شیشے کے پیچھے زندگی کے کسی اور لمحے میں قید، کچھ پوچھتے، کچھ چھپاتے نظر آرہے تھے۔

’’کیا مجھے اب بھی لفظوں سے اظہار کرنے کی ضرورت ہے، کیا میرا انداز کافی نہیں؟‘‘

’’محبت کا اظہار جس بھی شکل میں چاہے کتنی ہی بار کیا جائے، ناکافی ہی رہتا ہے۔‘‘ ڈیوڈ نے بڑی خوبصورت بات کہی تھی۔

’’یہ تو سچ کہا تم نے...... لیکن میں شاید تمہیں لفظوں میں نہ بتا سکوں کہ میں کس قدر خوش ہوں۔‘‘ سلویا نے ایک جذب سے کہا تو ڈیوڈ ایک بار کھل کے مسکرایا۔

موٹر وے بھی ساٹھ میل تک بند تھی۔ شہر کی چوڑی سڑک کے بائیں طرف سے ایک نسبتاً چھوٹا راستہ نکلتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس سڑک سے جانے کا فیصلہ کیا۔ یوں بھی آج تو وہ دونوں ہر طرح کے راستے سے گزر جانے کے لیے تیار تھے۔ یہ سڑک نسبتاً تنگ اور خالی تھی۔ اطراف میں کھلے میدان اور زرد سے کھیت پھیلے تھے۔ کہیں کہیں سڑک کے کنارے لگے درختوں کے پتے زرد اور بھورے ہوچکے تھے جو ہوا کے زور پر زمین پر گرتے جارہے تھے۔ خزاں کی تازہ ہوا اپنے ساتھ سردی اور خشکی لاتی تھی اور یہ ہوا سلویا کے چہرے کو تھوڑا سا سرخ کررہی تھی۔

’’ڈیوڈ ذرا کہیں آگے پارکنگ پر گاڑی روکنا۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔‘‘ سلویا ایک دم سے بے چین نظر آنے لگی۔

’’خیریت...... کیا ہوا؟‘‘

’’پتا نہیں، ذرا تازہ ہوا لوں گی تو ٹھیک ہوجائے گا۔‘‘

’’اچھا، بس تھوڑی دیر میں ایک سروس اسٹیشن آرہا ہے۔ میں گاڑی روکتا ہوں۔‘‘

’’ڈیوڈ! وہ تو دور ہے۔ تم پلیز ابھی روک لو نا، کہیں مجھے الٹی نہ آجائے۔‘‘ سلویا اب کھانسنے لگی۔ اس کا چہرہ مزید سرخ ہونے لگا۔

’’کہیں تم مجھے خوشخبری تو نہیں سنانے والی؟‘‘ اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے وہ شریر انداز میں بولا۔

’’وہ بھی دوں گی، بہت جلد۔‘‘ اب کے سلویا اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرائی۔

’’خیال سے، میں روکتا ہوں۔ بس تھوڑی دیر میں۔ تم شاید پریشان ہورہی ہو نا اب بہت زیادہ، اپنی ممی کے بارے میں سوچ سوچ کر۔‘‘

’’نہیں، یہ بات تو نہیں۔‘‘ سلویا نے نظریں جھکائے جواب دیا۔

☆☆☆

گاڑی رکی اور وہ دونوں باہر نکل آئے۔ سفر واقعی طویل اور تھکا دینے والا تھا۔

اب ڈیوڈ اور سلویا دونوں لوہے کی باڑ عبور کرکے کھلے میدان کی طرف چلے گئے اور ایک نسبتاً نرم جگہ پر بیٹھ گئے۔

سلویا تھوڑی دیر لیٹی رہی پھر موبائل نکال کر دیکھنے لگی۔ اس نے گردن موڑ کر اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ دور دور تک کوئی ذی روح نظر نہ آیا۔ ڈیوڈ بھی خشک گھاس پر سر رکھتے ہی گہری نیند میں چلا گیا۔

کھیتوں میں گندم کی فصل کٹ چکی تھی اور وہاں ہر شے سنہری اور بھوری نظر آتی تھی۔ کبھی کوئی پرندہ ہوا میں پرواز کرتا ہوا نظر آرہا تھا اور کبھی کوئی ٹنڈ منڈ درختوں کی اوٹ میں سے آواز نکالتا جیسے خزاں کے موسم میں دوپہر کے ڈھل جانے پر اپنی اداسی کا اعلان کررہا ہو۔ دور ذرا فاصلے پر ایک ہلکی سی ڈھلوان پر کافی تعداد میں بھیڑیں چر رہی تھیں۔ شام کی نرم روشنی میں ان کے سفید بدن سبز گھاس پر روئی کے گالوں کے مانند لگ رہے تھے۔ ان کے گرد لکڑی کی پرانی مگر مضبوط باڑ لگی ہوئی تھی جس پر وقت اور موسموں کے نشان نمایاں تھے۔ کہیں رنگ اکھڑا ہوا، کہیں کیل ڈھیلے مگر اب بھی اپنے مقصد میں ثابت قدم۔

پیچھے باڑ کے ساتھ ایک پرانا بورڈ لگا تھا جس پر مٹی اور کائی جمی تھی۔ دھندلے حروف میں شاید کسی فارم کا نام لکھا تھا یا کوئی انتباہ مگر وقت نے الفاظ کو مٹا کر تقریباً ایک کہانی میں بدل دیا تھا۔ اس سے بھی پیچھے سورج افق کے کنارے کو چھونے والا تھا۔

معاً سلویا کے فون کی گھنٹی بجی۔

’’کیا ہوگیا ہے تم لوگوں کو... میرے بغیر بھی کوئی کام کرلیا کرو۔‘‘ غصے سے کہہ کر اس نے فون کاٹ دیا۔

آواز سن کر ڈیوڈ کی آنکھ کھل گئی۔

انہیں یہاں آرام کرتے ہوئے کوئی پینتیس منٹ گزر چکے تھے۔ نرم دھوپ اب قدرے مدھم ہوچکی تھی اور آسمان پر ہلکا سنہری نارنجی رنگ چھانے لگا تھا جب ڈیوڈ نے سڑک کے دوسرے کنارے سے دو آدمیوں کو ان کی سمت آتے دیکھا۔ دونوں کے خدوخال ابھی دھندلے تھے مگر ان کا رخ واضح طور پر اسی طرف تھا۔

’’سلویا! مجھے لگتا ہے اب ہمیں چلنا چاہیے۔ شام ہورہی ہے اور میرا خیال ہے یہاں مزید رکنا مناسب

نہیں۔'' وہ کھڑا ہوگیا۔

''ایک دم سے کیا ہوگیا؟ کچھ دیر تو اور بیٹھو۔'' سلویا نے حیرانی سے کہا۔

''نہیں، اب چلنا بہتر ہوگا۔ دیکھو، وہ دو لڑکے ہماری طرف آرہے ہیں۔''

''کہاں؟'' سلویا نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''تمہارے پیچھے...... سڑک کی طرف دیکھو۔'' ڈیوڈ نے نگاہیں گاڑیوں کی گزرگاہ کی سمت جمائے ہوئے بتایا۔

''ڈیوڈ! کہاں...... مجھے تو کوئی نظر نہیں آرہا۔''

''یار! یہیں پر......!'' ڈیوڈ نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے دوبارہ دیکھا تو واقعی کوئی نہ تھا۔ ''حیرت ہے یار! ابھی ایک منٹ پہلے تو دور سے آتا دکھائی دے رہا تھا۔''

''ہوسکتا ہے وہ واپس کہیں سے مڑ گئے ہوں۔ لیٹ جاؤ کچھ دیر اور۔ ابھی بہت لمبی ڈرائیو کرنی ہے تمہیں۔''

سلویا صحیح کہہ رہی تھی۔ نیند کا غلبہ بھی تھا، سو وہ دوبارہ نیم دراز ہوگیا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اسے اپنے اردگرد کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی۔ وہ نیند میں تھا مگر آوازیں قریب ہوتی جارہی تھیں۔ کسی کے چلنے کی سرسراتی ہوئی سی آواز۔ وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

''کیا ہوا؟'' سلویا جو اپنی کہنیوں کے بل لیٹی تھی، سیدھی ہو بیٹھی۔

''مجھے لگتا ہے کہ یہاں آس پاس کوئی ہے۔ چلو، چلتے ہیں۔''

''تم بہت زیادہ تھکے ہوئے ہو اور ایسے میں جو خواب آرہے ہیں، تمہیں ان پر حقیقت کا گمان ہو رہا ہے...... اور پھر ایسے کیسے ڈرائیو کرو گے؟'' سلویا کے لہجے میں فکر تھی۔

''گاڑی کی چابی کہاں ہے؟'' ڈیوڈ نے جیبیں ٹٹولتے ہوئے سوال کیا۔

جواباً سلویا نے کندھے اچکائے۔ ''تمہارے پاس ہی تھی۔''

اندھیرا بڑھ رہا تھا اور نہ جانے کیوں ڈیوڈ کی پریشانی بھی۔

''یار...... کہاں گئی؟''

''ڈیوڈ! دھیان سے۔'' سلویا ایک دم چیخی۔

دو آدمی ان کے کافی قریب سے نمودار ہوئے۔

''یہ رہی تمہاری چابی۔'' اس میں سے ایک نے کالی کی چین میں چمکتی ہوئی چابی لہراتے ہوئے کہا۔

''ی...... یہ تمہارے پاس کہاں سے آئی؟'' ڈیوڈ کی آواز میں لرزش تھی۔

جواباً وہ نوجوان سلویا کی طرف دیکھنے لگا۔

سلویا بڑے ڈھیلے ڈھالے انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تم سچ کہتے ہو ڈیوڈ! راہ چلتے کی اس طرح کوئی بھی مدد نہیں کرتا مگر جب تھوڑی سی نیکی کے بدلے دگنا چوگنا فائدہ ملنا ہو تو ایسی ہمدردی تو کوئی بھی کرنا چاہے گا۔'' سلویا دھیرے دھیرے اس سے دور ہوتی ان ہٹے کٹے آدمیوں کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

''کیا مطلب؟'' وہ ابھی تک کچھ نہیں سمجھا تھا۔

''ایک تو تم حد سے زیادہ بھولے اور شریف ہو اور مجھے مردوں میں یہ دونوں صفات زہر لگتی ہیں۔'' سلویا ذومعنی انداز میں مسکرائی اور دلفریب انداز میں دونوں میں سے ایک آدمی جو نسبتاً زیادہ لمبا اور پرکشش تھا، کے کندھے پر اپنی کہنی ٹکا دی۔

ڈیوڈ نے ناسمجھی سے ان تینوں کی طرف دیکھا اور پھر ششدر رہ گیا۔ وہ دونوں آدمی اس کے کالے رنگ کے دو بیگز تھامے ہوئے تھے۔ یہ تو اسی کے بیگ تھے جس میں اس کے ضروری کاغذات، یو ایس بیز اور لیپ ٹاپ تھا۔

''سلویا! تم میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی ہو؟'' اس کی آواز میں دکھ اور حیرت نمایاں تھی۔ ''مجھے پتا ہے تم میرے ساتھ مذاق کر رہی ہو۔ تمہارے اتنے اصرار کے باوجود میں شادی کے بعد تمہیں کہیں نہیں لے کر جاسکا اس لیے تم ناراضگی میں ایسا کر رہی ہو۔''

اب وہ اسی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ زمین پر بکھرے خشک پتوں کی سرسراہٹ اس کے قدموں کے ساتھ مدھم سی آواز پیدا کر رہی تھی۔ سلویا اس سے کافی فاصلے پر کھڑی تھی۔ اس نے اپنی بندوق تان لی جو کچھ لمحے پہلے آدمی نے اسے تھمائی تھی۔

''میرے قریب مت آنا۔''

''دیکھو سلویا! ایسے مت کرو، میری بات سنو۔ تم نے اس دن کا انتظار کیوں کیا...... کیا اس لیے تم مجھے اس روڈ ٹرپ کے لیے اکساتی رہی تھیں؟''

''ظاہر ہے...... تم گھر سے نکلتے تو ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو پاتے نا۔'' سلویا نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

''تمہیں جو چاہیے تھا، تم مجھ سے مانگ لیتیں، سلویا! سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔'' وہ ابھی تک بے یقینی کی کیفیت میں تھا اس لیے ''تھا'' کے بجائے ''ہے'' کہہ دیا۔

''کہہ دینے سے سب کچھ کسی کا نہیں ہوجاتا...... اور میری مانگ تمہاری سوچ سے بھی بڑھ کر ہے ڈیوڈ!'' وہ سخت

لہجے میں بولی۔

''تم غلط کر رہی ہو سلویا! یہ لوگ ٹھیک نہیں ہیں، تمہیں نقصان پہنچ......''

''بکواس بند کرو اور میں نے کہا میرے قریب مت آؤ ورنہ گولی چلا دوں گی۔'' اس کے لہجے میں حقارت واضح تھی۔ اب کے اس کے ساتھی بھی ہنسنے لگے۔

مگر وہ چلتے ہوئے اس کے قریب آیا۔ سلویا کا ہاتھ ٹریگر پر تھا مگر ڈیوڈ کو پروا نہیں تھی۔ وہ چاروں اطراف سے ویران اور کھلے میدان کے بیچ کھڑے تھے۔ مین سڑک کہیں پیچھے رہ گئی تھی اور دور دور تک کسی دوسرے انسان کی آہٹ سنائی نہ دیتی تھی۔ خزاں کی خنک شام اب مکمل اندھیری رات میں بدل چکی تھی۔ آسمان پر چاند بادلوں میں چھپ چکا تھا اور ہوا میں ایک سناٹا سا طاری تھا۔ دور بھیڑوں کا جھنڈ یوں لگ رہا تھا جیسے خود سانس روکے منظر کو دیکھ رہا ہو۔

اور پھر...... اچانک ایک دھماکا ہوا۔ رات کے اندھیرے میں بیچ بیچ ایک گولی چل گئی۔ کھلے اور وسیع میدان میں گونجتی آواز سنتے ہی دونوں ساتھی جو سب دیکھ رہے تھے، یہ ان کی توقع کے برخلاف تھا۔ کچھ لمحے ساکت رہنے کے بعد وہ سرپٹ دوڑنے لگے۔ خون اس کے پیٹ سے بہتا ہوا خشک مٹی میں جذب ہوتا رہا۔ کچھ دیر بعد پولیس جائے وقوعہ پر موجود تھی۔ سائرن کی چیختی آوازوں نے ویرانی کو چیر ڈالا۔ نیلی اور سرخ بتیوں کی چمک رات کی سیاہی میں ہلچل مچا رہی تھی۔

☆☆☆

''میں نے آپ کو بتایا نا، میری بیوی مجھ سے ناراض تھی اور کوئی بات نہیں۔ وہ جلدی ناراض نہیں ہوتی تھی مگر جب اسے غصہ آتا تھا تو وہ اپنے مقابل کسی کو نہیں دیکھتی تھی۔ ہماری شادی کو دو ماہ ہو چکے تھے۔ وہ پہلی بار اس قدر ناراض ہوئی تھی مجھ سے۔ حالانکہ میں نے اس سے سوری بھی کہا تھا مگر وہ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر مجھے تنگ کرنے لگی تھی۔ میں نے تو بس اسے منع کیا تھا۔ اسے پیار سے روکنے کی کوشش کی تھی کہ وہ مجھے نہ ستائے اور سمجھاتے سمجھاتے گولی چل گئی۔ اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔ آپ بتائیے، اس میں میری کیا غلطی ہے؟''

اب کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ دیوار پر لگا نرم پیلے رنگ کا لیمپ ایک ہلکی سی روشنی بکھیر رہا تھا جو لکڑی کی الماریوں اور سفید دیواروں پر گمبھیر سناٹے کو مزید گہرا کر رہی تھی۔ کھڑکی کے باہر سردیوں کی شام سائے پھیلا چکی تھی اور پتوں کی سرسراہٹ، کمرے کی گھڑی کی مسلسل ''ٹک ٹک'' کے ساتھ مل کر وقت کی بے رحم روانی کا احساس دلا رہی تھی۔

ڈاکٹر چارلس ساری کہانی سمجھ چکے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ایک پین اور کلینیکل نوٹ پیڈ تھا مگر اس وقت وہ دونوں میز پر رکھے جا چکے تھے۔

ڈیوڈ بیکن، جو ہمیشہ تھوڑا جھک کر نظریں چراتے ہوئے بیٹھتا تھا، آج پہلی بار سیدھا ہو کر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں مگر ان میں آنسو نہیں...... صرف ایک گہری تھکن اور ایک خالی پن تھا۔ اس کے ہاتھ آپس میں جڑے ہوئے تھے، انگلیاں بار بار مڑتی تھیں جیسے وہ نادیدہ دھاگے سلجھانے کی کوشش کر رہا ہو۔

اپنی بیوی سلویا پر گولی چلنے سے ہونے والی موت کے بعد ڈیوڈ بیکن پچھلے پانچ ماہ سے اپنے سیشنز لے رہا تھا۔ ڈیوڈ کی ذہنی حالت کا سبب محض وہ حادثہ نہیں تھا بلکہ وہ اندھا اعتماد اور وہ محبت تھی جس کا سلویا نے قتل کیا تھا۔

ڈیوڈ بیکن...... وہ مریض جو پچھلے پانچ ماہ سے ہر ملاقات پر سلویا کی موت کو ''حادثہ'' کہتا رہا تھا، آج پہلی بار خاموشی کے غار سے نکلا تھا۔

''میں نے صرف اسے روکا تھا ڈاکٹر......! بس یہی چاہا تھا کہ وہ مجھے نہ ستائے۔ وہ مجھے اپنی ناراضگی کی وجہ بتائے...... اور...... اور سمجھاتے سمجھاتے گولی چل گئی۔''

وہ سب سمجھ چکے تھے کہ ڈیوڈ نہ صرف ابھی تک ڈینائل کی کیفیت میں ہے کہ اس کی بیوی نے اسے دھوکا دیا تھا۔ اس نے شادی کے دو ماہ بعد بہت مشکل سے ڈیوڈ کو روڈ ٹرپ کے لیے راضی کیا تھا تاکہ اپنے پرانے ساتھیوں کے ساتھ مل کر امیر ڈیوڈ کو لوٹ سکے۔ وہ ابھی تک اس تلخ حقیقت کو قبول نہیں کر پا رہا تھا کہ اس کی عزیز از جان، بظاہر دل موہ لینے والی بیوی نے اس سے صرف پیسے کے لیے شادی کی تھی...... بلکہ اس وجہ سے وہ Post Traumatic Stress Disorder (PTSD) کا بھی شکار ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر چارلس نے کچھ دیر بعد دوبارہ قلم اور نوٹ پیڈ سنبھال لیا۔ چونکہ اب وہ جان چکے تھے کہ ان کے مریض کے ساتھ اصل میں کیا ہوا تھا۔ لہٰذا اب وہ پورے اعتماد سے اسے اس صورتِ حال سے نکالنے میں اس کی مدد کر سکتے تھے۔

⌘⌘⌘

# جنگ باز

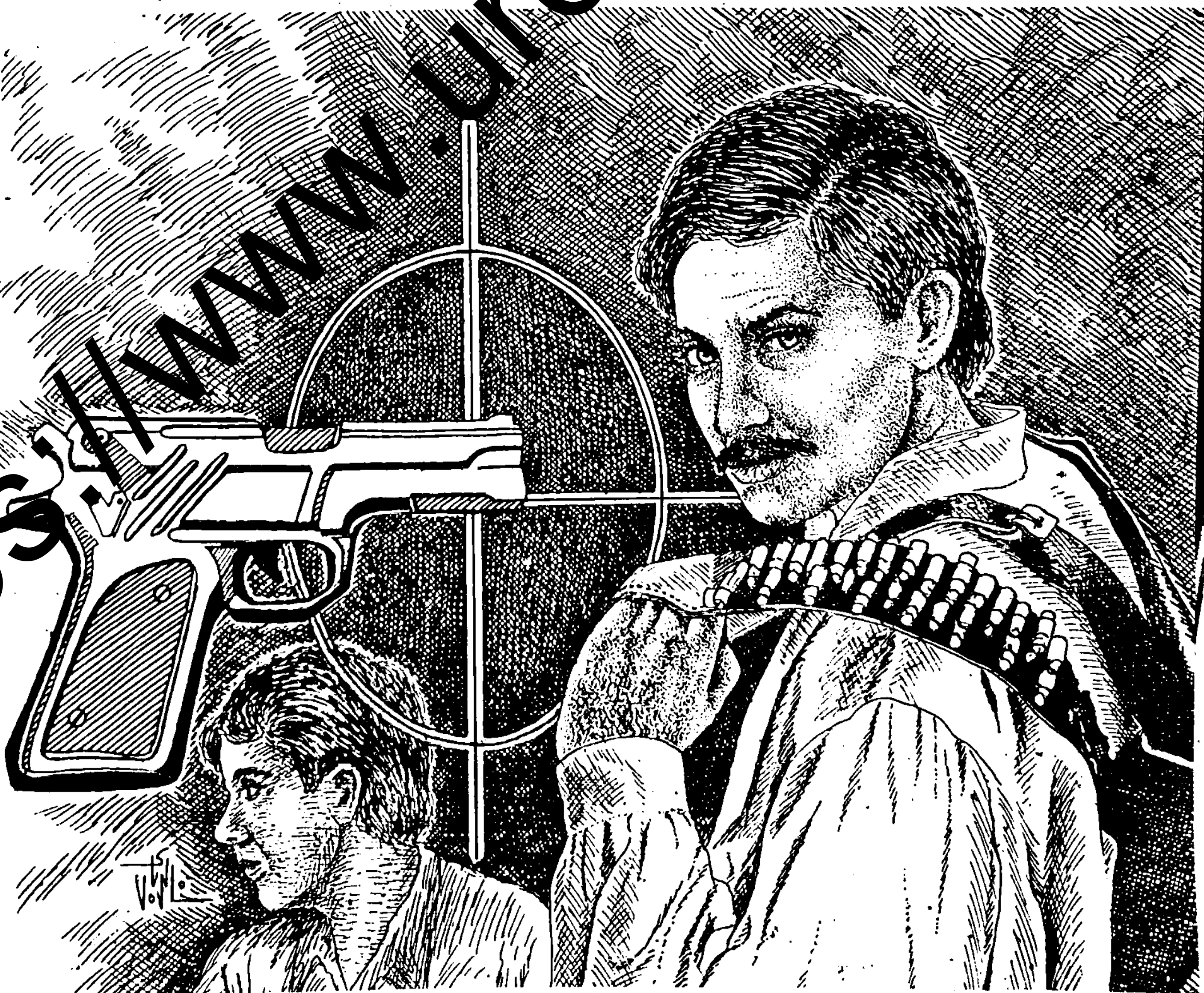
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

**سینتالیسویں قسط**

مقدر کا عروج ہو یا نصیب کا زوال... جانے کن خاموش لمحوں میں زندگی میں شامل ہو جاتے ہیں... لیکن کچھ لوگ تقدیر سے زیادہ تدبیر پر بھروسا کرتے ہیں... وہ جو حالات کی زنجیر میں قید بوسیدہ در و دیوار تک محدود تھا تمام تر معصومیت کے ساتھ شب و روز کی ہنگامہ خیزیوں میں مصروف تھا کہ اچانک حرص و طمع اور لالچ کے مارے... چہروں پر شرفا کا نقاب ڈالے عبرت و مکر کے تمام حربے آزمانے اس کے راستے میں چلے آئے... وہ جو رنگین شاموں... سنگین ہنگاموں اور تحیر انگیز چالوں سے ناآشنا تھا... ایسا بازی گر بن گیا کہ تمام پردہ داروں کی ڈوریاں الجھ کر رہ گئیں... اس کے ذہن میں قید ناآسودہ خواہشوں کا بھنور اسے کسی کل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ تقدیر کے سہارے چلنے والا... کچھ اس انداز سے تدبیروں سے اپنی کایا پلٹتا چلا گیا کہ چال بازوں کی تمام چالیں لڑکھڑا گئیں۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم

زخم [illegible] لیے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان



## گذشتہ اقساط کا خلاصہ

روشنیوں کا شہر کراچی...... اس نے جانے کتنے لوگوں کو اپنے دامن میں ماں کی طرح سمیٹ رکھا ہے، ان گنت داستانوں کی امین اس مہربان گود کے کسی کونے میں سہراب خان یعنی میں بھی رہتا ہوں جو ایک غریب محلے میں محبت کرنے والی ماں اور ایک سخت گیر طبیعت کے حامل باپ کا ایسا نا خلف بیٹا بھی تھا جو ہر وقت باپ کی بے جا مار پیٹ کا نشانہ بنتا رہتا۔ میری ایک بہن بھی تھی راحیلہ، مگر نہیں، بعد میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ میری بہن نہیں تھی، خالہ زاد تھی۔ بچپن میں اس کے ماں باپ ایک ناگہانی حادثے میں مر چکے تھے اور ماں نے اسے میرے ساتھ ہی پال پوس کر جوان کیا تھا۔ یہ راز صرف میری ماں اور راحیلہ کو پتا تھا۔ ماں میری شادی اس سے کروانا چاہتی تھی لیکن میں اب بھی اسے ایک "بہن" کے ہی روپ میں دیکھتا تھا۔ میرا باپ، ماں کو مارا پیٹا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے ماں کو اس نے گہرا زخم دیا تو میں برداشت نہ کر پایا اور باپ کے سامنے سینہ تانے کھڑا ہو گیا۔ باپ کا یہ دیکھ کر بلڈ پریشر بڑھ گیا اور اس کی دماغ کی رگ پھٹ گئی۔ وہ جہان سے کوچ کر گیا تو گھر میں سکون ہوا۔ غربت اور باپ کی سخت گیر طبیعت نے مجھے ایک حد تک جرائم کی طرف لڑھکا ضرور دیا تھا مگر میں جلد ہی سنبھل گیا مگر اس "سنبھلنے" کی مجھے بڑی قیمت چکانا پڑی۔ میں اور میرا باپ ایک فیکٹری میں معمولی ورکر تھے۔ گلی کے محلے میں ہی تین ہم عمر لڑکے میرے یار کہلائے۔ ایک کا نام سلیم، دوسرے کا راجا اور تیسرا ماجد تھا۔ ماجد کی جوان بہن فوزیہ میری پہلی اور آخری محبت ٹھہری۔ ہم چاروں جرائم پیشہ گروہ کے آلۂ کار بن گئے۔ اقبال نامی ادھیڑ عمر شخص ہمارا "باس" کہلایا۔ اس کا نائب سجاد بیگ تھا۔ اسی گروہ نے ہم چار یاروں کو لڑائی بھڑائی کی خصوصی ٹریننگ دی۔ گروہ دیگر جرائم کے ساتھ بھتا خوری بھی کرتا تھا۔ ہمارے فیکٹری مالک سیٹھ سکندر سے بھتا لینے کے لیے "باس" اقبال نے ہمیں استعمال کیا۔ میں نے سلیم وغیرہ کو سمجھانے کی کوشش کی مگر گروہ میرے ہی دشمن ہو گئے، تاہم میں نے سیٹھ سکندر کے ساتھ نمک حلال کیا اور اسے سب باتیں بتا دیں۔ گروہ سمیت میرے تینوں یار میری جان کے دشمن ہو گئے۔ سیٹھ سکندر کی جواں سال خوب صورت بیٹی سدرہ میری "نمک حلالی" سے متاثر ہوئی۔ سیٹھ سکندر کا سالا، سجاد بیگ ہی جرائم پیشہ گروہ کے باس اقبال کا نائب تھا۔ میں نے اس کی پلاننگ آشکار کر دی۔ وقت تیزی سے بدلا۔ ماں مر گئی۔ ماجد عرف ماجے کے قتل کا الزام مجھ پر لگا۔ میں لاک اپ ہوا تاہم رہا ہو گیا۔ باس اقبال، سلیم چھالیا اور راجو بوری میرے خون کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ میں راحیلہ اور فوزیہ کو لے کر کراچی سے سیالکوٹ ہجرت کرنے لگا۔ صادق آباد میں فوزیہ اور راحیلہ سے بچھڑ کر میں بااثر "چودھری جی برادران" کے نرغے میں چلا گیا۔ وہاں بھولے سے میری عجیب حال میں ملاقات ہوئی۔ اس کی منگیتر سے چودھری شاہ جی نے زبردستی شادی کر لی تھی۔ اس کا نام نادو تھا۔ ہم تینوں فرار اختیار کر گئے۔ راستے میں پولیس اور چودھری جی برادران کے حواریوں سے مقابلے میں بھولا مارا گیا۔ نادو میری ذمے داری بن گئی۔ نادو کو در حقیقت کسی اور سے محبت تھی۔ اس کا نام بختیار تھا۔ بختیار راجن پور میں رہتا تھا۔ فوزیہ اور راحیلہ کو میں نے کسی طرح تلاش کر لیا۔ سیالکوٹ میں ایک ماں بیٹی سے میری شناسائی ہوئی۔ وہ محلے دار تھیں۔ لڑکی نگہت اور ماں شگفتہ خاتون۔ نگہت کسی وسیم نامی لڑکے سے محبت کرتی تھی۔ دونوں فائٹنگ کلب کے ممبر بھی تھے۔ عقدہ کھلا کہ شگفتہ، باس اقبال کی منکوحہ تھی اور نگہت بیٹی مگر شوہر کی مجرمانہ زندگی سے تنگ آ کر شگفتہ اپنی بیٹی نگہت کے ساتھ کراچی سے سیالکوٹ اپنے ماں باپ والے گھر میں آن بسی تھی۔ فائٹنگ کلب کا ایک ماسٹر عرف استاد جوجی میرا دوست بن گیا۔ نگہت اب بھی باپ (اقبال) سے ملاقات کرتی تھی۔ سیالکوٹ میں اس کا بنگلا تھا۔ ایک خفیہ گروہ "کالی لہر" سے میرا ٹاکرا ہو گیا۔ یہ جادو ٹونے کرنے والا گروہ تھا۔ عارف جگنو نامی شخص کا بھائی تھا ان کے ہاتھوں مارا گیا۔ جگنو ایک بڑی سیاسی شخصیت کا آلۂ کار تھا۔ وہ میرا دشمن اور بعد میں دوست بن گیا۔ کالی لہر کے رانگا بابا سے بھی میری دشمنی عروج پر تھی۔ میرا دشمن باس اقبال بھی ان کی جادوئی ہانڈیوں کی زد میں آ کر اسپتال پہنچ گیا۔ اس کی بیٹی نگہت میری دشمن بن گئی جبکہ اس کی ماں شگفتہ خاتون مجھے بھائی سمجھتی تھی۔ اب میری بیک وقت جنگ بازی باس اقبال کے نائب سجاد بیگ، چودھری جی برادران اور کالی لہر والوں سے چل رہی تھی۔ میں راحیلہ کا پیچھا کرتے ہوئے رانگا بابا کے ٹھکانے پر پہنچ گیا اور اسے اٹھا کر فارم ہاؤس لے آیا۔ رانگا نے منتر پڑھنا شروع کر دیے۔ مجھے کچھ مار کر بے ہوش کر دیا گیا اور جب ہوش آیا تو وہ لوگ باور کرانے لگے کہ میں مر چکا ہوں اور میری روح ان کے قبضے میں ہے۔ پھر مجھے حالت بے ہوشی میں قبر میں دفنا دیا گیا۔ انہوں نے کچھ کھلا کر میرے جسم کو مفلوج کر دیا تھا۔ وہاں بجو نے حملہ کیا اور تب ہی غیبی مدد ہوئی اور ایک ماں بیٹی نے مجھے قبر سے نکالا۔ میری حالت دگرگوں تھی۔ پھر میری محسن میرا علاج کرنے لگی۔ ان ماں بیٹی کو گاؤں والوں نے در بدر کر دیا تھا۔ وہاں کے چودھری کا بیٹا صمد یار چنبیلی کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اماں میرے علاج کے لیے سرحد پار سے خاص بوٹی لے آئی تھی اور اس نے دوا کا سفوف اور تیل تیار کر لیا تھا۔ دوا نے مجھ پر جادوئی اثر دکھایا اور میرے اندر طاقت کا خزانہ بھر گیا۔ صمد یار کے گماشتوں نے اماں کی مڑھی کو آگ لگا دی۔ میں انہیں تھانے لے گیا تاہم انہوں نے مجھے ہی لاک اپ کر دیا۔ میں تھانے سے بھاگ نکلا۔ مجھے شمیلہ خانم نے ایک ڈاکٹر کے کلینک پر ٹھہرا دیا۔ ڈاکٹر ہمیں پھنسانا چاہتا تھا۔ میں اماں اور چنبیلی کے ساتھ وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ میں استاد جوجی کے ٹھکانے پر آ گیا۔ وہاں سے ہم کالی لہر والوں کے ایک ٹھکانے پر پہنچے تو وہاں نزاکت اور راڑاں کی لاشیں ملیں۔ میں نے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ وہاں سے میں ایک قصائی صورت بدمعاش کو اپنے ٹھکانے پر لے آیا۔ اس پر تشدد کر کے ہم معلومات لے رہے تھے کہ وہاں ہانڈیوں کی بارش ہو گئی۔ ہم نے دشمنوں کو مار بھگایا۔ ہم کالی حویلی پہنچ گئے۔ وہاں میرا رانگا سے ٹاکرا ہوا۔ رانگا نے استاد جوجی کو شدید زخمی کر دیا۔ میں نے رانگا کی ایک ٹانگ کاٹ ڈالی تاہم رانگا بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں دشمن کے ایک اور ٹھکانے پر پہنچا تاہم انہوں نے مجھے قابو کر لیا۔ میں زخمی بھی ہو گیا۔ اچانک وہاں سلیم نے حملہ کر دیا۔ مجھے وہاں سے نکال لیا گیا۔ سلیم اور چودھری برادران نے مجھ سے مفاہمت کر لی۔ راحیلہ بھی انہی لوگوں کے پاس تھی۔ سلیم اور میں نے راجا تیمور کو چھاپنے کی کوشش کی تاہم ہمیں ناکامی ہوئی۔ وہاں سے واپسی پر ایک جگہ ایمبولینس اور پولیس نظر آئی۔ جگنو کو مار دیا گیا تھا۔ میں نے تیمور کو

چھاپنے کا ارادہ کیا اور اس کی فیکٹری پہنچ گیا۔ وہ لوگ کوئی "شے" لے کر کہیں جا رہے تھے۔ میں نے ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ اچانک دوڑتے ہوئے سر پر چوٹ لگنے سے میں بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو دیکھا راجا تیمور اور ڈرائیور ہلاک ہو چکے تھے اور کیبوس سے ڈھکی شے غائب تھی۔ راجا تیمور کا ایک ساتھی زندہ میرے ہتھے چڑھ گیا۔ معلومات پر پتا چلا کہ کسی گروہ نے انہیں ہلاک کیا تھا اور بوبورگا نامی قدیم مجسمہ لے اڑے تھے۔ میں نے میڈم چھمی تک پہنچنے کے لیے ان کا پیچھا کیا اور ان کے ساتھیوں کی کشتی میں سوار ہو گیا۔ ہم انڈین حدود میں داخل ہو گئے۔ بوبورگا کا مجسمہ بھی انہی کے پاس تھا۔ کشتی میں صرف دو افراد بچے۔ ایک میں اور دوسری شینا۔ میں نے شینا کو الٹی سیدھی کہانی سنا کر اسے اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ ہماری کشتی ندی کی طغیانی کے باعث تباہ ہو گئی۔ ہم ایک جگہ پہنچ گئے۔ شینا زخمی ہو گئی۔ وہاں موجود میاں بیوی نے ہماری مدد کی۔ ہم ان کے گھر آ گئے تاہم وہاں مخالف گروہ کے لوگ آ گئے۔ انہوں نے ہمیں پکڑ لیا تاہم میں ان کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔ میں واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو وہاں مخالف گروہ کا باس اور ایک لڑکی سے ملاقات ہو گئی۔ باس البرٹ رمنڈو اور اس کی ساتھی بوبورگا کے مجسمے کے چکر میں تھے۔ میں اور شینا انہیں جل دے کر نکل گئے۔ ایک جگہ جنگل میں باس کے ساتھی مارے گئے اور وہ ہمیں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ میں اور شینا ایک بستی میں پہنچ گئے۔ وہاں شینا کے ساتھی میری طرف سے مشکوک ہو گئے۔ میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ راستے میں مجھے کچھ انگریز ملے۔ گورا پارٹی ایک سرکس کمپنی سے تعلق رکھتی تھی اور وہ وہاں ایک گوریلا کو پکڑنے آئے تھے۔ وحشی قبیلہ ان کا دشمن ہو گیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے مدد کا کہا۔ میں ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ دشمنوں کی تحویل سے گاڑیاں نکالنے کے چکر میں ماریا کا باپ مارا گیا۔ میں نے گوریلا کو قابو کر لیا اور ہمارا واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ ہم ماریا کے سرکس والی جگہ پر پہنچ گئے۔ وہاں میری ماریا کے منیجر سے لڑائی ہو گئی اور وہ میرا دشمن ہو گیا۔ منیجر سیڈی غیر قانونی دھندے میں ملوث تھا۔ منیجر سیڈی اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ میں وہاں سے رانگامائی روانہ ہو گیا۔ میں ایک آبادی میں پہنچ گیا۔ وہاں دشمن کے گروہ سے ٹکراؤ ہو گیا۔ میں نے انہیں زیر کر دیا۔ دشمن کے علاقے میں رمنڈو سے میرا سامنا ہو گیا۔ وہ بوبورگا کے مجسمے کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے شینا کو بھی اغوا کر لیا تھا۔ رمنڈو کو مجسمہ چاہیے تھا اس لیے اس نے مجھے اپنے ساتھ ملا لیا۔ میں اس مشن میں زخمی ہو گیا اور چھمی کے جنگل میں پھنس گیا۔ اچانک وہاں کسی گروہ نے حملہ کر دیا اور میڈم چھمی فرار ہو گئی۔ انہوں نے مجھے پکڑ لیا تاہم میرے کہنے پر فوزیہ کو رہا کروا لیا گیا۔ ہم رمنڈو کے پیچھے گئے۔ گروہ کے ساتھیوں کو رمنڈو نے ہلاک کر دیا۔ رمنڈو کی گاڑی تباہ ہو گئی۔ مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی تاہم میں فوزیہ کے ہمراہ بچ نکلا۔ بوبورگا کے حوالے سے میں ایک صحافی جمیلہ سے ملنے اس کے گھر پہنچ گیا مگر جمیلہ کو قتل کر دیا گیا تھا۔ وہاں مجھے ایک لبنانی رپورٹر ملی۔ میں مائرہ کے ساتھ بوبورگا کے مجسمے کو تباہ کر کے نکلا۔ مائرہ ماری گئی۔ واپسی پر مجھے مچھیروں نے پکڑ لیا تاہم میں ان کی گرفت سے نکل بھاگا اور واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ ہم کراچی آ گئے۔ میری ایک خاتون سے ملاقات ہو گئی۔ وہ مشہور اداکارہ روبی تھی جو خود کو جگنو کی بہن بتاتی تھی۔ اسے اپنے بھائی کا کچھ ذاتی سامان حاصل کرنا تھا اور میری مدد درکار تھی۔ ہم نور پور روانہ ہو گئے۔ راحیلہ کسی نوید نامی شخص کی آلۂ کار بن گئی تھی۔ میں راحیلہ کو وہاں سے نکالنا چاہتا تھا تاہم مجھے دھر لیا گیا۔ میں راحیلہ کو وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا تاہم راحیلہ میرے پاس نہیں رکی۔ میں نے نادو کو کچھ لوگوں کی تحویل میں دیکھا۔ وہ چودھری کے گماشتے تھے اور انہوں نے نادو کو مختیار سے طلاق دلوا دی تھی۔ میں نے نادو کو آزاد کرا لیا تاہم وہ خود چودھری کے پاس چلی گئی۔ سدرہ کو کچھ لوگوں نے اغوا کر لیا۔ میں نے تعاقب کیا۔ اسے سجاد بیگ نے اغوا کرایا تھا۔ میں نے سدرہ کو اس کے چنگل سے نکال لیا۔ میں نے سلیم چھالیا کا پیچھا کیا اور اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ روبی کو بازیاب کرانے جا رہا تھا۔ ہم نظام شاہ کے فارم ہاؤس پہنچ گئے۔ وہاں کچھ لوگ آ گئے اور مار دھاڑ ہوئی۔ دلاور شاہ مارا گیا جبکہ وہ لوگ روبی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ دلاور شاہ کے قتل کا الزام مجھ پر آیا اور مجھے لاک اپ کر دیا گیا۔ نظام شاہ کے راتب خور انسپکٹر نے مجھے حوالات میں ختم کرانے کی کوشش کی۔ تاہم میں بچ گیا۔ میں نے نئے SHO کو اعتماد میں لے لیا۔ مجھے رہا کر دیا گیا۔ فوزیہ اور میری شادی ہو گئی۔ روبی زخمی حالت میں سدرہ کے گھر پہنچ گئی۔ میں روبی سے ملنے پہنچا۔ روبی نے بتایا کہ جگنو کو نظام شاہ اور لاکھا نے مارا تھا۔ میں نے انہیں عبرتناک انجام سے دوچار کرنے کا عہد کر لیا۔ میں نوید مچھرا کے ولا میں پہنچ گیا۔ میں نے نوید کو زخمی کر دیا اور اس سے بچ گرائیں کی فائل حاصل کرا لیے۔ میں وہاں سے نکل پڑا۔ راستے میں راحیلہ سے سامنا ہوا تاہم نوید کے آدمیوں نے راحیلہ پر گولی چلا دی۔ گولی اس کے شانے میں لگی تھی۔ میں نے نوید کے گماشتوں کو ختم کر دیا۔ میں راحیلہ کو جوجی کے ٹھکانے پر لے آیا، اس کی حالت سنبھل گئی تھی۔ میں نظام شاہ اور لاکھا سے حساب چکتا کرنے کے لیے نور پور فارم ہاؤس پر پہنچ گیا۔ لاکھا وہاں پہنچا تو فوزیہ اس کے قبضے میں تھی۔ اس نے مجھے زخمی کر دیا۔ وہاں زبیر پہنچا اور ہماری مدد کی۔ میں نے لاکھا سمیت اس کے کئی ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیا۔ شگفتہ آنٹی کو ان لوگوں نے ختم کر دیا تھا۔ فوزیہ کی حالت بری تھی۔ ہمارا بچہ اب نہیں رہا تھا۔ میں دفتر بار آیا۔ میں نے چھمی کو دیکھا۔ میں اس کا پیچھا کرتا ہوا ان کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ وہاں نکہت سے میری ملاقات ہو گئی۔ بھانڈیل سائیں کے گماشتوں نے ہمیں دیکھ لیا اور ہمیں ڈھونڈنے لگے۔ ہم وہاں سے نکل کر ایک ہوٹل پہنچ گئے۔ وہاں بوبورگا کے حصول کے لیے بلیک کیٹس اور ریڈ فاکس کے کارندے موجود تھے۔ وہاں دھینگا مشتی ہوئی اور ہم دونوں کارندوں کو اپنے ٹھکانے پر لے آئے۔ ان کے ساتھ وسیم بھی تھا۔ ہم نے انہیں ڈرایا تو وسیم نے اندر کی باتیں شروع کر دیں۔ ایک کارندہ میرے ہاتھوں مارا گیا۔ ہم بوبورگا کے حصول کے لیے وسیم کو لے کر نکلے۔ وہاں مار دھاڑ ہوئی۔ وسیم نے دھوکے سے ہمارے ایک آدمی کو مروا دیا اور خود نکل بھاگا۔ وہاں چھمی کے ساتھیوں سے ٹاکرا ہوا اور اس کا چیلا ہمیں قابو کر کے اپنے ٹھکانے پر لے آیا۔ میں نے وہاں چالاکی دکھائی اور چھمی کو وسیم سے بدظن کر دیا۔ وہاں کچھ لوگوں نے دھاوا بول دیا اور مار دھاڑ میں نکہت کو گولی لگ گئی۔

## اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

پل کے پل جیسے وقت ٹھہر گیا ہو۔ آتی جاتی سانسیں جیسے سینے میں ہی اٹک کر رہ گئی ہوں۔ زینے کے اوپر سے نگہت پر گولی چلانے والی پچھی تھی۔ ابھی اس کی نگاہ مجھ پر نہیں پڑ سکی تھی، نہ ہی شمبو کی جو نگہت کو گولی سے زخمی ہوتے دیکھ کر سفاک اور مکروہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔

گولی سے زخمی ہو کر وہ فرش بوس ہو گئی تھی۔ نگہت کو اس حالت میں دیکھ کر میرے سینے میں دکھ کی لہر سی اٹھی۔

وہ کچھ ہوش میں تھی اور درد سے کراہ رہی تھی۔ خدا جانے آخری سانسوں پر تھی یا ابھی اس کی زندگی باقی تھی۔

ادھر ان دونو واردوں میں ایک شمبو کے ساتھی کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا جبکہ وہ نو وارد کے ایک ساتھی کی بروقت چلائی ہوئی گولی سے موقع پر ہی واصلِ جہنم ہوا۔ نو وارد کا دوسرا ساتھی جو مجھ پر گن تانے گولی چلانے کے موڈ میں تھا، اسے نگہت نے بروقت نمودار ہو کر نشانہ بنا ڈالا تھا۔ تاہم اس کے ایک ساتھی نے ہلاک ہونے سے ذرا ہی دیر پہلے مجھ پر یہ احسان کیا تھا کہ بروقت میرے ہاتھوں کے بند کھول ڈالے تھے اور اب میں آزاد تھا۔ مگر نگہت کی حالت کنڈائی پر میرا دل جیسے کوئی مسلے ڈال رہا تھا۔

''سہراب کدھر گیا؟'' اچانک اوپر زینے کے آخری سرے پر پستول تھامے کھڑی پچھی نے چلا کر کہا۔

''میں پہلے اس کو ذبح کروں گا۔'' جواب میں شمبو نے نہایت سفاکانہ لہجے میں کہا اور نگہت کی جانب بڑھا۔

میرے اوسان خطا ہو گئے۔ اب اگر میں نگہت کو بچانے کے لیے زینے کے خلا سے نکلتا تو اوپر پستول ہاتھ میں لیے کھڑی پچھی مجھ پر بہ آسانی فائر جھونک سکتی تھی۔

وقت نہیں رہا تھا سوچنے یا فیصلہ کرنے کا، آر یا پار...... یا پھر درانہ وار۔ تاہم میں گویا سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اس نازک گھڑی میں کون سا قدم پہلے اٹھانے کا متقاضی تھا اور یہی میں نے کیا۔

میں زینے کے خلا سے نمودار ہوا اور اچھل کر زینے کی ریلنگ کا سہارا لیا اور کسی جمناسٹر کی طرح اپنے جسم کو سکیڑ کر میڈم پچھی کے سر پر جا پہنچا۔ وہ اچانک مجھے کسی بلا کی طرح اپنے قریب...... بالکل قریب پا کر بری طرح بدکی اور پستول کا رخ میری جانب کیا ہی تھا کہ میں نے اس کے ہاتھ سے نہ صرف پستول جھپٹ لیا بلکہ اسے زینے سے دھکا بھی دے ڈالا۔

فرش پر پڑی زخمی نگہت کی جانب چھرا تانے بڑھتے ہوئے شمبو کے اس کھڑبڑاہٹ پر یکدم قدم رک گئے اور وہ وحشی درندے کی طرح پلٹا۔

میں نے پستول سے اس نابکار پر فائر جھونک مارا۔ نشانہ میرا اٹکل ثابت ہوا۔ نال دہاڑی اور گولی شمبو کے عین دل والے مقام پر پیوست ہو گئی۔ وہ آواز نکالے بغیر وہیں ڈھیر ہو گیا۔

ادھر پچھی میرے دھکا دینے پر زخمی ناگن کی طرح زینے سے لڑھک کر رینگتے ہوئے شمبو پر جا پڑی۔ یہ اس کی دانستہ حرکت تھی کیونکہ اگلے ہی لمحے اس نے اس کے پاس سے چھرا اٹھا کر بجلی کی سی پھرتی سے میری جانب اچھالا تھا۔ میں اس وار سے بچنے کی تگ و دو میں رہا اور تب تک پچھی کے لیے اتنی مہلت کافی رہی، جو وہ چاہتی تھی۔ لہٰذا پلک جھپکتے ہی اس نے ہال کے عقبی گوشے کی جانب دوڑ لگا دی۔

میں تیزی سے زینے طے کرتا ہوا اترا اور اس طرف کو دیکھا۔ پچھی جانے کس کمرے میں داخل ہو کر اندر محبوس ہو گئی تھی۔ سر دست اس پر لعنت بھیج کر میں نگہت کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ خون میں لت پت پڑی تھی۔

میں نے اسے اٹھا لیا اور کندھے پر اس کے زخمی وجود کو لیے دروازے کی جانب لپکا۔ وہاں سے باہر نکل کر سامنے کھڑی پرانے ماڈل کی کار کی جانب دوڑا جو یقیناً انہی دونوں نو وارد آدمیوں کی ملکیت ہو سکتی تھی۔

نگہت کو عقبی سیٹ پر ڈالا تو وہ کراہ رہی تھی۔ میں نے اسے سیدھا کیا اور معائنہ کیا۔ گولی اس کے دائیں پہلو میں لگی تھی، وہیں سے بھل بھل خون جاری تھا۔ میں نے جلدی سے اپنی شرٹ پھاڑ کر زخم پر باندھ کر کسی حد تک جریانِ خون کا راستہ روکا۔ اس کے بعد میں رکا اور کار آندھی طوفان کی طرح اڑاتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔

☆☆☆

یہ میرے لیے قیامت کی گھڑیاں تھیں۔ میرے جسم کا رواں رواں مرتعش تھا اور میں بری طرح اعصاب زدگی کا شکار تھا۔ پچھلی سیٹ پر نگہت خون میں لت پت گویا زندگی کی آخری سانسوں پر تھی اور میری چشم تصور میں بار بار اس کی مہربان ماں اور شفیق خاتون شگفتہ کا چہرہ ابھر آتا تھا۔

میرے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر جمے ہوئے کپکپا سے رہے تھے اور میں گاڑی طوفانی رفتار سے بھگاتا ہوا بار بار گردن موڑ کر نگہت کو ہوش میں رہنے اور حوصلہ رکھنے کی تلقین کیے جاتا۔ یہ بلاشبہ میری دیوانوں جیسی حرکت تھی لیکن اس سے مجھے بھی تسلی مل رہی تھی اور میں اپنے مخل پڑتے حواسوں کو یکجا رکھنے میں کامیاب تھا۔

اسپتال پہنچتے پہنچتے نگہت پر پوری طرح بے ہوشی غالب آچکی تھی اور کار کے جھٹکوں کے سبب اس کے گھائل پہلو میں بندھی عارضی اور ناکارہ سی پٹی بھی کھل چکی تھی۔

میں پاگلوں کی طرح نگہت کے زخمی وجود کو کندھے پر ڈالے اسپتال کے شیشے والے گیٹ کو دھکا دے کر اندر داخل ہوا اور ''ایمرجنسی...... ایمرجنسی'' چلّانے لگا۔

شکر رہا کہ فوری طور پر ڈاکٹرز سمیت عملہ آن موجود ہوا۔ یہ الکریم میڈیکل ہال نامی اسپتال تھا جو جدید طبی سہولیات کا حامل تھا۔ نگہت کو فوری طور پر ایک اسٹریچر پر ڈال کر OT (ایمرجنسی آپریشن تھیٹر) میں لے جایا گیا اور میں نے ریسپشن سے فون کر کے جوجی وغیرہ کو فون پر مطلع کر دیا۔

اب میں ای او ٹی کے چکنے فرش والے کوریڈور میں بے چینی کے ساتھ ٹہلنے لگا اور نگہت کی زندگی کی عافیت کی دعا مانگتا رہا جو اندر آپریشن ٹیبل پر زندگی اور موت کی کشمکش میں تھی۔

میں جانتا تھا کہ نگہت کی اس حالت زار کا سن کر سب سے زیادہ کبیر کی حالت دگرگوں ہونی تھی۔ وجہ یہی تھی کہ وہ اس سے بے اندازہ محبت کرتا تھا۔ اس کی ایک دلی تمنا تو پوری ہوئی تھی کہ وسیم کا مکروہ چہرہ اب نگہت کے سامنے آشکار ہو چکا تھا جو اس کی منگیتر رہ چکی تھی بلکہ عنقریب دونوں (وسیم اور نگہت) شادی بھی کرنے والے تھے۔ اس دن جب نگہت مجھے اپنی اور وسیم کی ہونے یا نہ ہونے والی شادی کا کارڈ دینے آئی تھی تو کبیر کی صورت دیکھنے والی تھی۔

وہ نگہت کی شادی کا سن کر ایک دم ہی غم سے نڈھال، اداس اور مایوس ہو گیا تھا لیکن شاید اس کے دل میں نگہت کے لیے سچی محبت کا دیپ فروزاں تھا کہ حالات ایک دم ہی اس کی طرف پلٹ گئے اور نہ صرف یہ شادی رک گئی بلکہ وسیم اور نگہت کا بریک اپ بھی ہو گیا۔ یہی نہیں ماں (شگفتہ خاتون) کے مرنے کے بعد نگہت بھی مستقل طور پر جوجی کے ٹھکانے کی باسی بن چکی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ کبیر کی یہ محبت یکطرفہ ہی، البتہ نگہت کو اس کا علم ضرور تھا۔

اب یہ افتاد آن پڑی تھی تو میں کبیر کی دلی اور دماغی حالت کا اندازہ کر سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کچھ دیر بعد جوجی کے ساتھ جب کبیر کو میں نے اسپتال میں داخل ہوتے دیکھا تو کبیر کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سپید پڑا ہوا تھا۔

زبیر بھی ساتھ تھا اور اسی نے کبیر کو سنبھال رکھا تھا کیونکہ کبیر کے لیے اپنی ٹانگوں پر چلنا ممکن ہی نہ ہو پا رہا تھا۔ وہ غم اور تشویش کن پریشانی سے نڈھال نظر آ رہا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی اس نے یکدم زبیر کا سہارا چھوڑا اور میری جانب ''سہراب بھائی'' کہتا ہوا اس زور سے لپکا کہ اگر میں فوراً آگے بڑھ کر اسے نہ تھام لیتا تو اس نے فرش بوس ہی ہو جانا تھا۔

''نن...... نگہت کیسی ہے...... وہ بچ جائے گی نا؟'' میرے بازوؤں کے سہارے میں آتے ہی اس نے سب سے پہلا سوال یہی کیا تھا۔ اس کے لہجے اور آواز میں امید وبیم کے ساتھ ٹوٹ پھوٹ اور کرچی کرچی ہوتے دل کی جھنکار بھی تھی۔

''اللہ سے دعا کرو اور خود کو سنبھالو۔'' میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

جوجی اپنے مخصوص لہجے کو دبانے کی انتہا درجے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا اندر اس کا کوئی بڑا آپریشن ہو رہا ہے؟ ویسے بچنے کی امید ہے؟ ڈاکٹروں نے کیا کہا ہے؟''

''ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اندر سے ابھی تک کوئی باہر نہیں آیا ہے۔'' میں نے بوجھل دل سے بتایا۔

''وہ...... نگہت کو بچا لیں گے نا سہراب بھائی؟'' کبیر نے بدستور ہانپتی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔

''اوئے جھاویں! بچانے والی ذات صرف اور صرف اللہ کی ہے، تو پہلے خود کو سنبھال اور دعا کر رب سوہنے سے۔'' جوجی نے اس سے نرم لہجے میں کہا۔

زبیر بھی پریشان اور فکرمند تھا، اسی لہجے میں مجھ سے بولا۔ ''گولی کہاں لگی تھی نگہت کو؟''

''دائیں پہلو میں۔'' میں نے بتایا۔ ''بیچاری نے بڑی ہمت کی۔ ہم بہت سخت حالات کا شکار رہے تھے۔'' میں نے دھیرے سے کہا اور فرش پر بیٹھ گیا۔

''اوئے اس کو تو سنبھال، یہ بات کرنے نہیں دے رہا۔'' جوجی نے زبیر سے کہا۔ اشارہ کبیر کی طرف تھا۔

کبیر کی حالت کیا تھی، اس کا اندازہ بھلا مجھ سے بڑھ کر اور کون لگا سکتا تھا۔ خود میں بھی تو محبت کی راہوں کا ایسا مسافر رہ چکا تھا جس نے اپنی محبت کو پانے اور اسے پا کر رکھنے کی کتنی تگ و دو کی تھی اور بالآخر پا لیا تھا۔

بہرکیف، میں نے دھیرے دھیرے جوجی اور زبیر کو اپنے اور نگہت کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کے بارے میں نہایت صراحت سے بتا دیا جسے سنتے ہی دونوں کے چہروں پر سنجیدگی کھنڈ آئی تھی۔

پھر اس سے پہلے کہ جوجی یا زبیر مجھ سے اور کچھ پوچھتے، اچانک ای او ٹی کا دروازہ کھلا اور ہم سب اس طرف کو لپکے۔ ایک ڈاکٹر تھکے تھکے انداز میں اپنا ماسک

اتارتے ہوئے نرس کے ساتھ باہر آرہا تھا۔

ہم سب ان کی طرف بڑھ گئے۔

"ڈاکٹر صاحب...... ! پیشنٹ کیسی ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔ جوجی اور زبیر بھی یک ٹک ڈاکٹر اور نرس کا چہرہ تکتے رہے۔ کبیر فرش سے اٹھا تو لڑکھڑا سا گیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ لپک کر ڈاکٹر اور نرس کا دامن پکڑ لے۔

"نن...... نگہت بچ گئی ہے نا ڈاکٹر......؟ وہ نہیں مر سکتی۔" اس کی حالت واقعی پاگلوں جیسی ہورہی تھی۔

"اوئے! اس کو تو سنبھال...... کہیں اسے بھی اندر آپریشن تھیٹر میں نہ لے جانا پڑے۔" جوجی نے زبیر سے کہا۔

میری نظریں ڈاکٹر اور نرس کے چہرے پر جمی رہیں، جیسے میں ان کے کہنے سے قبل ہی ان کے چہرے اور آنکھوں کے تاثرات تحریر کی شکل میں پڑھ رہا ہوں۔ وہ تحریر جو الفاظ کی محتاج نہیں ہوتی۔

نرس تو ٹرے سنبھالے ایک طرف نکل گئی جبکہ ڈاکٹر نے ماسک اپنے وائٹ کوٹ کی جیب میں ٹھونستے ہوئے ہم سے دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"پیشنٹ ابھی خطرے کی حالت سے باہر نہیں، ہمیں فوری طور پر خون کی ضرورت ہے۔"

"میں دے دوں گا خون ڈاکٹر صاحب! میرا سارا خون لے لیں۔" کبیر ایک دم بولا۔

"بات صرف خون کی بھی نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے جیسے ایک اور تکلیف دہ انکشاف کرنے کے انداز میں کہا۔ میری نظریں بدستور ڈاکٹر کے چہرے پر جمی رہیں۔

"گولی، جگر کو زخمی کرتی ہوئی کڈنی تک چلی گئی ہے اور اسے متاثر کر ڈالا ہے۔ جگر تو ریپئر ہوجائے گا لیکن کڈنی......!" اتنا کہہ کر ڈاکٹر ذرا رکا پھر بولا۔

"بات اگر ایک کڈنی کی ہوتی تو ہم متاثرہ کڈنی ری موو کر دیتے۔ بدقسمتی پیشنٹ کی یہ ہے کہ...... اس کا دوسرا... کڈنی شاید پیدائشی شرنک (سکڑا ہوا) ہے جس کا علم پیشنٹ کو بھی نہیں رہا ہوگا۔ اب خون کے ساتھ ساتھ ہمیں ایک عدد کڈنی کی بھی ضرورت ہے۔ اگر فوراً پیشنٹ کے کڈنی کو ٹرانسپلانٹ نہ کیا گیا تو اس کے بچنے کے چانسز نہ ہونے کے برابر ہیں۔"

ڈاکٹر کی بات سن کر جوجی اور میرا چہرہ دھواں دھواں ہو گئے۔ زبیر بھی غمگین سا ہوگیا۔ کبیر تو جیسے نیم مردہ سا نظر آنے لگا پھر روہانسے لہجے میں ڈاکٹر کی منت کرتے ہوئے بولا۔

"ڈاکٹر صاحب! میں خون اور اپنا ایک کڈنی دینے کو تیار ہوں۔" میں اور جوجی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"خون کی بلڈ گروپنگ اور کراس میچنگ ہوتی ہے لیکن جسم کے مین آرگن کی ٹرانسپلانٹیشن کرنے سے پہلے ٹشو بھی میچ کیے جاتے ہیں۔ کیا آپ سیریس ہیں؟" ڈاکٹر نے اس بار براہ راست کبیر سے مخاطب ہوکر کہا۔

"آپ کرلیں، میں تیار ہوں مگر خدا کے لیے جلدی کریں۔" کبیر نے تفکر آمیز بے چینی سے کہا۔ اس کے چہرے پر امیدوں کے چراغ بھی روشن تھے...... وسوسوں کی پرچھائیاں بھی ہلکورے لے رہی تھیں۔

ڈاکٹر نے باری باری جوجی اور میرے چہرے کی طرف دیکھا تو میں نے بھی فوراً کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! میں بھی تیار ہوں، ہوسکتا ہے ہم دونوں میں سے کسی ایک کے کڈنی کے ٹشو میچ کر جائیں۔"

میرے ہامی بھرنے پر جوجی اور زبیر بھی پیچھے نہیں رہے۔ تب ڈاکٹر نے بھی ایک جوش تلے کہا۔

"تو پھر دیر مت کریں، پیشنٹ وینٹ (وینٹی لیٹر) پر ہے۔ وہ آدھی موت سویا ہوا ہے۔ ایسا نہ ہو دیر ہوجائے اور......" آخر میں اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

تھوڑی دیر کے میڈیکل پروسیجر سے گزرنے کے بعد کبیر کا بلڈ گروپ تو میچ نہ ہوسکا البتہ میرا خون میچ ضرور کر گیا لیکن کڈنی ٹشوز کبیر کے میچ کر گئے۔

تاخیر مناسب نہ تھی۔ شکر رہا کہ ڈاکٹرز سمیت عملہ قابل ہی نہیں، مستعد بھی ثابت ہوا۔ جوجی نے میری ہدایت پر سدرہ [illegible] پر فون کر کے اطلاع دے دی۔

مجھے تو صرف خون ہی دینا تھا لیکن کبیر کا پروسیجر کچھ طویل رہا کیونکہ اس نے اپنا [illegible] دینا تھا۔

کئی گھنٹے صرف ہو گئے [illegible] یہی کہوں گا کہ نگہت کی یہ خوش قسمتی ہی تھی کہ اس کے لیے کبیر کا ایک کڈنی کام آگیا۔

میں تو خون دینے کے بعد ایک گلاس جوس پی کر بھلا چنگا ہوگیا تھا لیکن کبیر اندر آپریشن ٹیبل پر تھا، نگہت کے قریب۔ میں نے آپریشن تھیٹر کے چوکور گلاس والی [illegible] سے اندر دیکھا۔ وہ نگہت کے قریب لیٹا ہوا تھا۔

یہ وہ دیوانہ و فرزانہ تھا جس سے اگر ڈاکٹر، نگہت کے لیے جان بھی مانگتا تو کبیر فوراً اپنی ہتھیلی پر دل تک رکھ کے دے دیتا۔ کبیر نے جیسے محبت کی ایک داستان رقم کر دی تھی۔

وہ نگہت سے واقعی سچی محبت کرتا تھا۔ قدرت سب جانتی ہے، اسے سب معلوم ہوتا ہے لیکن وہ ہمیں دیکھنا چاہتی ہے۔ دیکھو، دنیا میں ایسے دیوانے بھی ہوتے ہیں جو اپنے محبوب کے

لیے جان کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

اگلے دن تک سب کچھ جیسے ٹھیک ہو گیا۔ سبھی لوگ وہاں آن موجود ہوئے تھے۔ فوزیہ، اماں جی، چنبیلی، سدرہ اور انکل محمود بھی۔

اگلے دن کی شام تک نگہت کو ہوش آچکا تھا۔ اس کی زندگی خدا کو بچانا مقصود تھی، سو وہ بچ گئی تھی۔ ڈاکٹرز نے بھی نگہت کو ایک ماہ کا بیڈ ریسٹ کرنے کی تاکید کی تھی۔ تین روز بعد اسے اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا۔ ہم گھر لوٹ آئے۔ نگہت کی میڈیکل فائل میں نے دانستہ اپنے پاس رکھ لی تھی۔

گھر پہنچتے ہی ہم سب نے اللہ کے حضور شکرانے کے نوافل ادا کیے کہ اس رحیم و کریم پاک ذات نے ہماری دعائیں سن لی تھیں اور ہماری ... کو ایک نئی زندگی دی تھی۔

ہاں، ایک بات ... سب کو حیرانی ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ میں نے ڈاکٹر سمیت سب کو تاکید کر دی تھی کہ ابھی نگہت کو اصل حقیقت نہ بتائی جائے۔ کبیر کے لیے بھی یہی ہدایت تھی مگر اسے کوئی حیرت نہ ہوئی ... وہ مطمئن تھا، بہت پرسکون۔ اس کے لیے یہی بہت تھا کہ اس نے اپنے محبوب کو بچالیا تھا۔ نہ ہی اس نے پوچھا مجھ سے کہ میں ایسا کیوں چاہتا ہوں، یہی اس کی نگہت سے بے غرض محبت کا ثبوت تھا کہ اسے نام اور نمائش کا کوئی لالچ یا پروانہ تھی۔

''آئی شاوشے!'' جوجی کو جیسے کافی دیر بعد اپنی بھڑاس نکالنے کا موقع ملا۔ مجھ سے بولا۔ ''یار! یہ تو اس بیچارے کبیر کے ساتھ بڑی زیادتی کررہا ہے تو سہراب!''

زبیر سمیت سب نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''ہائے اللہ، سہراب بھیا!'' چنبیلی تڑپ کر مجھ سے بولی۔ ''نگہت کو معلوم تو ہونا چاہیے نا حقیقت کا۔ آخر کبیر نے اپنے جسم کا ایک اہم ٹکڑا نگہت باجی کو عطیہ کیا ہے...... اور پھر کبیر تو نگہت سے محبت بھی کرتا ہے۔''

پہلے تو مجھ سمیت چند افراد کو معلوم تھا لیکن اب سب کے علم میں آچکا تھا کہ کبیر، نگہت کو چاہتا تھا۔

میرے چہرے پر سنجیدگی کھنڈی ہوئی تھی۔ میں نے اسی انداز میں کہا۔ ''جو میں کہہ رہا ہوں، وہی ہونا چاہیے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

میرے اس لہجے پر تو جیسے سب کو ہی سانپ سونگھ گیا۔ تاہم کبیر کے بعد جو شخص میرے اس عجیب ''حکم نامے'' پر مطمئن اور مسکراتا ہوا دکھائی دیتا تھا، وہ استاد جوجی تھا۔ شاید اسے کچھ اور ڑک ہو چلا تھا کہ میں کیا چاہتا تھا۔

اس دن میں نگہت کے کمرے میں گیا۔ وہ جاگ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے بیڈ کے سرہانے سے اپنی پشت ٹکادی۔ اس کی میڈیکل فائل جس میں اس کی بیماری اور ''پروسیجر'' کی ساری میڈیکل ڈیٹیل موجود تھی، میرے ہاتھ میں تھی۔

''کیسی ہو اب تم؟'' میں نے ہولے سے مسکراتے ہوئے بغور اس کے چہرے پر نگاہ جمائی۔ وہ مجھے کافی بہتر دکھائی دی۔ اس میں بلاشبہ اماں جی کی مقوی جڑی بوٹیوں کا بھی دخل تھا۔ تاہم ایک بڑے آپریشن سے گزرنے اور کئی گھنٹے آپریشن ٹیبل پر زندگی کی چاہ میں موت سے لڑنے کے سبب چہرے کی رنگت کچھ زردی نظر آرہی تھی۔ لہٰذا جب وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی تو مجھے اس کی آواز میں بھی کچھ نقاہت سی محسوس ہوئی۔

''میں ٹھیک ہوں، تمہارا شکریہ ادا کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ بہت مشکور ہوں تمہاری اور تمہارے ان سب دوستوں کی بھی۔ مجھے آج پتا چلا کہ میں غیروں میں نہیں، اپنوں ہی میں ہوں۔ بہت خیال رکھا ان سب نے میرا، سب نے میری اس قدر فکر و تشویش رکھی جیسے میرا اور ان کا خون کا رشتہ ہو۔ ویل ڈن سہراب! ان سب باتوں کا کریڈٹ تم کو جاتا ہے کیونکہ تم خود اچھے انسان ہو اور ایسے ہی دوستوں کا اپنے گرد گلدستہ بنائے ہوئے ہو۔''

''خود کو کیوں بھول گئیں؟'' میں نے کہا۔ میرے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ میں اس کے بیڈ کے قریب والی کرسی پر براجمان ہو چکا تھا۔ ''تم بھی تو ہماری ٹیم اور اس فیملی کا حصہ بن چکی ہو۔''

میری بات پر اس کے چہرے پر کچھ پشیمانی اور ذرا احساسِ ندامت کی پرچھائیں ... پھر وہ اسی لہجے میں دھیرے سے کہنے لگی۔

''یہ تو تم سمیت سب کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ مجھے اس لائق سمجھا، ورنہ تو میں کیا تھی، تم سب جانتے ہی ہو اور میرا خیال ہے تمہاری مصیبتوں اور تکالیف ایک سبب میں بھی ...''

''ایسا مت کہو۔'' میں نے فوراً ہولے سے کہا۔ ''... نے سنا نہیں کہ صبح کا بھولا شام کو لوٹ آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ زندگی میں غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پیدا ہوتی ہی رہتی ہیں لیکن حق اور سچائی کے تمنائیوں کو بالآخر خود ہی جلد یا بدیر ادراک ہو ہی جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ خود بھی اچھے ہی ہوتے ہیں۔ ورنہ تو ایسے بھی ہیں جو حق اور سچ کو جانتے ہوئے بھی اپنی جھوٹی انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔''

''تمہارا ظرف ہے۔'' وہ اس بار کھلے دل سے مسکرائی۔

''تم سے کچھ کہنے آیا تھا میں۔'' بالآخر میں نے جیسے آمدم برسرِ مطلب کہا۔

''مجھ سے...... کیا......؟'' نگہت کے نرم گال مسکرانے کے انداز میں بہت ہولے سے متحرک ہوئے، لبوں پر ہلکی متحیر سی لکیر کھنچ گئی۔ تب ہی اس کا دھیان میرے ہاتھ میں تھمی ہوئی میڈیکل فائل کی طرف گیا لیکن وہ اس بارے میں بولی کچھ نہیں۔

''ہاں!'' میں ہولے سے بولا۔ ''نگہت! تمہیں معلوم ہے تمہارے ساتھ ان گزرے ہوئے جاں گسل لمحوں میں کیا کیا کچھ بیت گیا؟''

''کچھ اندازہ تو ہے۔ یوں جیسے میں موت کے شکنجے میں جاتے جاتے [illegible] بچی ہوں اور تم نے میری جان بچائی۔ اتنا تو ڈاکٹرز نے [illegible] بھی [illegible] کہا تھا کہ اگر تم بروقت مجھے اسپتال نہ لاتے تو شاید......''

''چھوڑو ان باتوں کو۔'' میں نے [illegible] چہرے سے اس کی بات کاٹ دی۔ ''بچانے اور [illegible] نے والی ذات صرف اللہ کی ہے لیکن زمین پر عرش سے اللہ رب العزت نے جس شخص کو صحیح معنوں میں جان بچانے کی توفیق اور سعادت عطا کی ہے وہ درحقیقت میں نہیں، کوئی اور ہے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ چونکی اور سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی تو میں نے اپنی گود میں رکھی فائل کھولی اور اس کا ایک قابلِ مطالعہ صفحہ اس کے آگے رکھ دیا۔ اس میں اس کے گردے کی ٹرانسپلانٹیشن سمیت پیدائشی ناکارہ گردے کی بھی تفصیل تھی۔ گردے کی ''ڈونیشن'' کے متعلق بھی اس میں درج تھا۔ ماسوائے کبیر کے نام کے۔

وہ بغور ذرا دیر تک اس صفحے کو پڑھتی رہی پھر جیسے اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ پھر دفعتاً ہی میں نے دیکھا اس کی آنکھیں بے اختیار بھیگ گئیں اور اظہارِ تشکر وجذبات تلے اس کے ہونٹ بھی تھوڑے بھنچ سے گئے پھر وہ بے حد متاثر کن اور ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔

''اوہ میرے خدا! یہ کس فرشتے نما انسان نے مجھ پر اس قدر احسانِ عظیم کیا ہے کہ اپنا گردہ مجھے عطیہ کر ڈالا؟ یہ یقیناً تمہارے دوستوں میں سے ہی کوئی ہوگا سہراب!'' وہ ایک دم جذباتی ہوگئی۔

''مجھے پلیز اس کے پاس لے چلو، میں تو اس کا شکریہ بھی ادا نہیں کرسکتی کہ میرے پاس الفاظ کم پڑ جائیں گے۔ میری خاطر...... میری خاطر اس فرشتہ انسان نے اپنے جسم کا ایک اہم عضو قربان کر دیا۔ بولو نا...... کون ہے وہ؟'' وہ شدتِ جذبات سے تڑپ اٹھی۔

''تمہارا اندازہ غلط نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ معصوم اور نیک انسان ہم میں سے ہی کوئی ہے لیکن...... نگہت! اس انسان کا مقصد صرف تمہاری جان بچانا ہی نہ تھا بلکہ اس کے پیشِ نگاہ ایک عظیم جذبے کو بھی زندگی دینا مقصود تھا اور پتا ہے، جب تمہاری یہ حالت اس نے دیکھی تو وہ بیچارہ نیم پاگل ہی ہوگیا تھا۔ بار بار ڈاکٹروں سے منتیں کر رہا تھا کہ اس کا سارا خون نکال لو، اس کے جسم کے جتنے جتنے اعضا تمہارے کام آسکتے ہیں، وہ نکال لو۔ ڈاکٹر اور عملہ اس دیوانے فرزانے کی باتوں پر ششدر رہ گئے تھے لیکن پھر وہ بھی شاید سمجھ گئے کہ یہ معاملاتِ دروں ایسے ہی گل کھلایا کرتے ہیں، جب کسی کے گلشنِ قلب میں محبت کے سچے پھول کھلے ہوں۔''

میں نے معنوں ہی معنوں میں اسے اور بھی بہت کچھ ''باور'' کروانے کی اپنی سی کوشش کی تھی۔ وہ بھی جیسے میری بات کے جوہرِ خاص کو بھانپ گئی اور یہی وجہ تھی کہ اس کے چہرے پر بعینہٖ ایسے ہی لطیف جذبات کی حدت آمیز سرخی کی جھلک ابھری تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں کیا کہنا چاہ رہا تھا۔

''کبیر......!'' تب ہی نگہت نے چند لحظوں کی پرتعش سی چپ کے بعد ہولے سے کہا تو میرے چہرے پر سکون پھیل گیا۔ جو نام میں کسی کی زبان سے اگلوانا نہیں چاہتا تھا اور جو مقصود تھا کہ یہ نام انہی لبوں سے برآمد ہو، وہ مقصد میرا پورا ہو چکا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس کا اندازہ خود نگہت ہی کرے کہ وہ [illegible] اور دیوانہ کون ہوسکتا ہے؟ تاکہ دل کی دل سے راہ یقینی طور پر پوری سچائی کے ساتھ بنی رہے۔

''یہی میں چاہتا تھا نگہت۔''

تب ہی عالمِ بے اختیاری میں میرے ہونٹوں سے یہ پھسلا۔ ''میں نے جان بوجھ کر سب کو منع کر دیا تھا کہ تمہیں کوئی بھی حقیقت نہ بتائے بلکہ تم خود اپنے اس دیوانے فرزانے کو پہچانو۔''

''پاگل کہیں کا۔'' نگہت بے اختیار ہنسی مگر [illegible] ہوئی ہنسی میں محبتوں کے گلاب کھلتے مجھے صاف محسوس ہوئے تھے۔ ایسے گلاب، جو خوشبوؤں کی سچائیوں کو قدردانی بخشتے ہیں۔

''نگہت! کبیر بہت معصوم لڑکا ہے اور اپنی محبت میں سچا بھی۔'' میں جیسے دل کی عمیق گہرائیوں تلے اس سے کہنا شروع ہوا۔ ''وہ واقعی تم سے بے حد محبت کرتا ہے، سچی محبت۔ تمہیں زندہ پا کر اسے لگتا ہے جیسے اسے نئی زندگی مل گئی ہو ورنہ تو اس کی حالت دیکھنے والی تھی۔ بھولا بھی ہے، اظہارِ

محبت کرنا بھی نہیں جانتا۔ بس تم سے محبت کر کے بیٹھ گیا مگر ایک طرف اس کی یکطرفہ محبت کی بد قسمتی رہی تو دوسری طرف اس کی خوش قسمتی بھی۔'' ایک لمحہ متوقف ہونے کے بعد میں نے پھر کہا۔

''تمہیں یاد ہے وہ دن جب تمہاری اور وسیم کی شادی ہونے والی تھی۔ کبیر بیچارہ تو جیسے اداس الو ہی بن کر رہ گیا تھا۔ نہ اسے کھانے کا ہوش، نہ پینے کا یارا۔ بس گم صم ہی رہتا تھا بیچارہ لیکن تقدیر نے اس کا بہت امتحان لے لیا تھا۔ اب وہ اسے شاید انعام دینا چاہتی تھی، اسی نرالے انداز میں...... بھی......'' کہتے ہوئے میں نے نگہت کو پکارا۔ وہ اس وقت انہماک کے ساتھ میری بات سنتی رہی تھی۔ میرے مخاطب کرنے پر اس نے چہرہ اٹھا کر میری جانب دیکھا۔

''میں تمہیں سمجھانے نہیں آیا، یہ تمہارا اپنا ذاتی فیصلہ ہوگا۔ خدا نے اگر تمہیں وسیم جیسے بھیڑیا صفت اور جرائم پیشہ آدمی سے بچایا ہے تو دوسری طرف تمہیں ایک اچھا آپشن بھی سجھا دیا ہے۔ بس، میں یہی کہنے آیا تھا۔'' کہتے ہوئے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ فائل میں نے اسی کے پاس رہنے دی۔

''جاتے جاتے فقط اتنا ہی کہوں گا کہ کبیر ایک اچھا لڑکا ہے۔ بحیثیت انسان بھی اور مجنوں بھی۔'' میں نے دانستہ آخر میں یہ کہتے ہوئے مسکرایا تو نگہت بھی ہولے سے مسکرا دی۔

☆☆☆

اگلے دن جب سب کو میری اس ''حکمتِ عملی'' کا علم ہوا تو جوجی سمیت سب نے میرے حق میں نعرۂ دوستانہ بلند کر دیا۔ کبیر دوسرے کمرے میں بیڈ ریسٹ پر تھا۔ اسے اگرچہ زیادہ تاکید نہ تھی تاہم اسے بھی ہم نے مکمل آرام کرنے دیا تھا۔

وہ اب بھی بار بار نگہت کے بارے میں ہر کسی سے پوچھتا رہتا تھا کہ وہ اب کیسی ہے، بھلی چنگی تو ہے نا، اب اسے کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟ وغیرہ۔

''آئی شاباشے!'' ہماری ایک بیٹھک کے دوران جوجی نے اپنے مخصوص لہجے میں مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''یار، یہ خیال تجھے آیا کیسے؟'' اس وقت تقریباً سب ہی لوگ وہاں ایک بڑے سے کمرے میں جمع تھے جن میں فوزیہ سمیت سدرہ، چنبیلی، راحیلہ اور زبیر بھی شامل تھے۔ فوزیہ البتہ خاموش ہی تھی۔ اسے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ اسے چنبیلی اپنے کمرے سے زبردستی ساتھ لائی تھی کہ وہ زیادہ اکیلا پن محسوس نہ کرے۔ اس کی یہ ''ڈیوٹی'' جوجی نے لگائی تھی۔

جب سے ''مس کیرج'' (ابارشن) والا واقعہ ہوا تھا، فوزیہ اسے نہ بھول پائی تھی۔ جہاں تک ممکن ہوسکتا تھا خود میں بھی اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ میری خاطر وہ تھوڑا بہت ہنس بول بھی لیتی تھی لیکن میں اس کے اندر کے دکھ کو جانتا تھا۔ وہ ماں بننے کے عمل سے گزرنے والی تھی۔ ایسی کیفیت ہر اس شادی شدہ عورت کی ہوتی ہے جو ماں بننے والی ہو۔ مگر بدقسمتی یا پھر تقدیر کے کھیل نرالے کے مصداق اس کے خواب، تصورات سب دم توڑ گئے تھے مگر وہ ان کے اَن دیکھے حصار سے ابھی تک نہ نکل سکی تھی۔

بہرکیف، جوجی کے اس سوال پر کہ نگہت اور کبیر کے ''معاملۂ دل'' کے بارے میں میرے ذہن میں یہ خیال کیوں اور کیسے آیا تھا، اس کے جواب میں، میں نے پہلے تو انجان بن کر کہا۔

''کون سا خیال؟''

''یہی کہ پہلے تو، تو نے ہم سب کو منع کر دیا کہ نگہت کو یہ حقیقت ابھی نہ بتائی جائے کہ کبیر نے ہی اسے اپنا ایک گردہ عطیہ کیا ہے لیکن پھر تو خود اسے یہ سب بتا آیا۔ اس میں کوئی حکمت تو ہوگی تیری؟''

''ہاں۔'' میں نے ہولے سے کہا۔ ''لیکن بعض حکمتوں کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا، اسے صرف محسوس ہی کیا اور کرایا جاتا ہے، تب ہی اس کا اثر قائم ہوتا ہے۔ نگہت کو تو یہی نہیں معلوم تھا کہ اس کا گردہ تبدیل ہوا ہے پھر یہ بات بتانے والا وہی بتانے والا موثر ثابت ہوتا ہے جس کی باتوں کو کوئی اہمیت دے۔ نگہت سے میری اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ ہوگئی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ایک وقت تھا وہ مجھ سے سخت نفرت کرتی تھی، میں نے بھی ایک حد تک ہی اپنی صفائی پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی تھی کیونکہ بعض ایسی باتیں انسان کو وقت کے ساتھ ساتھ ہی سمجھ میں آتی ہیں اور وقت اور حالات جو سمجھاتے ہیں، وہی سب سے بہتر ہوتا ہے۔ خیر، نگہت کا آہستہ آہستہ مجھ پر اعتماد قائم ہونے لگا، میری باتوں کو سمجھنے اور انہیں اہمیت دینے لگی۔ کبیر والا معاملہ کچھ سنجیدہ نوعیت کا تھا۔ اسی لیے میں نے اپنی سی کوشش کر کے بہتر انداز میں نگہت کے گوش گزار کر تو دیا ہے، اب فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہے۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ وہ فیصلہ کبیر کے حق میں ہی کرے گی مگر تھوڑا وقت لگے گا۔''

ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد جب ہم سنجیدہ نوعیت کے موضوع کی طرف آئے تو چنبیلی، فوزیہ کو اپنے ساتھ لے کر چلی گئی۔ سدرہ موجود رہی، باقی زبیر اور راحیلہ کو بھی وہیں

بیٹھنا تھا۔

ہم موجودہ حالات کے بارے میں تبادلہ خیال کرنے لگے۔

''وسیم اور میڈم پچھی کے درمیان پھوٹ ڈلوا کر تم نے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے سہراب بھائی!'' زبیر نے توصیفی لہجے میں مجھ سے کہا۔

''لیکن یار زبیر! میری جو اسکیم تھی، وہ زیادہ دیر نہ چل پائی، فیل ہو کر رہ گئی۔'' میں نے جیسے کفِ افسوس ملتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''میڈم پچھی کو وسیم سے بددل کرنے کے بعد میں پچھی کو بھی شیشے میں اتار ہی چکا تھا کہ درمیان میں حالات ایک دم پلٹا کھا گئے اور مجھے بھی میدان میں کودنا پڑ گیا۔''

''لیکن یہ بھی [illegible] تم میڈم پچھی کی قید سے آزاد بھی ہو گئے اور اسے منہ کی کھانا پڑی۔ نکہت بھی مرتے مرتے بچی بیچاری۔'' راحیلہ نے کہا۔

''ہاں، یہ تو ٹھیک ہے مگر میری اسکیم کامیاب ہو جاتی تو اس کے دوررس اور دیرپا نتائج نکلتے۔'' میں نے کہا۔

''آئی شاہ وشے! اب لکیر پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' جوجی نے درمیان میں لقمہ دیا۔ ''اب آگے کی سوچو [illegible] آئندہ کے حالات گمبھیر اور معاملات پراسرار نظر آتے ہیں اور شاید پہلے سے زیادہ خطرناک بھی۔''

''ہم۔'' میں نے ہونٹ بھینچے۔ ''پچھی کو جہنم واصل کرنے سے زیادہ میرے نزدیک اہم کام اسی منحوس بومبورگا کے مجسمے کو حاصل کرنا ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ را اور موساد والے اس معاملے میں کبھی نچلے نہیں بیٹھیں گے۔ یہاں کی انہیں ایک ایک خبر مل رہی ہوگی۔ یہ بھی کہ ان کے بھیجے ہوئے ٹاپ ایجنٹ ہمارے حساس اور ذمے دار اداروں کی گرفت میں آچکے ہیں۔ وہ مزید گوریلا کھیپ بھیج سکتے ہیں۔ پھر نہ جانے وہ کس پردے میں نمودار ہوں۔''

''میں تمہاری بات کی اہمیت کو سمجھ رہا ہوں سہراب بھائی!'' زبیر نے سنجیدگی سے کہا۔ ''یعنی جب تک بومبورگا کا مجسمہ ہے، را اور موساد کی اعلیٰ قیادت اس کے حصول کے لیے ہر ممکن اقدام کرتی رہے گی۔''

''ہاں۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''تم لوگوں نے دیکھا ہی ہوگا کہ جب میں نے بومبورگا کو خلیج بنگالہ میں سمندر برد کر دیا تھا تو را اور موساد شکست خوردہ ہو کر بیٹھ گئے تھے لیکن جیسے ہی اس بدذات پچھی نے اسے برآمد کیا اور انہیں خبر ہوئی، وہ پھر حرکت میں آ گئے۔''

''نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری۔'' جوجی ایک دم بولا۔ ''وسیم کی جا کر گردن دبوچتے ہیں، مجسمہ وہ ہمارے حوالے کر دے گا۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔'' میں نے کہا۔

''تو بس پھر ہم ایک بار پھر دو دو کی ٹولیوں میں بٹ کر وسیم کے خفیہ ٹھکانوں کی طرف نکل جاتے ہیں۔ جدھر مل گیا، اسے دبوچ کر یہاں لے آئیں گے۔'' راحیلہ نے مشورہ دیا۔

''وسیم کے تعاقب میں صرف میں جاؤں گا...... اکیلا۔'' میں نے گہری متانت سے کہا۔ ''استاد جوجی گھر پر ہی رہیں گے۔ مزید دو افراد پر بھی ہمیں کڑی نگاہ رکھنے کی ضرورت ہوگی۔ اس کام کی ذمے داری کون لیتا ہے، یہ استاد جوجی ہی بتائے گا۔''

''آئی شاہ وشے! ایک تو بھانڈیل سائیں ہو گیا، یہ دوسرا آدمی کون ہے؟'' جوجی نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میرے بجائے راحیلہ نے فوراً کہا۔

''سلیم چھالیا!''

''بالکل ٹھیک کہا اس نے۔'' میں نے فوراً راحیلہ کی بات کی تائید کر ڈالی۔

''لیکن سلیم چھالیا سے بھلا ہمیں کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟ وہ تو سدھر گیا ہے اب۔''

''پھر بھی اس کی ریکی ضروری ہے۔ وہ کہیں نہ کہیں ہاتھ مارنے کی کوشش کر لیتا ہے اور ابھی ویسے بھی وہ اتنا قابلِ اعتبار نہیں ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔

''[illegible] پھر وہ اس کے پیچھے کون جائے گا؟'' زبیر نے لقمہ دیا۔

''انہیں فی الحال ان کے حال پر چھوڑ دو۔ وہ ابھی کچھ روز خارش زدہ کتوں کی طرح اپنے زخم چاٹتے رہیں گے۔'' میں بولا۔ ''اس وقت اہمیت بومبورگا کا حصول ہے۔ میں اس بار اس کالے پتھر کو کسی الیکٹرک بھٹی میں ڈال کر جلا ڈالنا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے پھر۔'' جوجی نے جیسے فیصلہ کن لہجے میں بات ختم کرنے کی غرض سے کہا۔ ''راحیلہ بہن اور [illegible] سلیم چھالیا کی ریکی کے لیے جبکہ زبیر کو گڑھ مولا روانہ کر دیتے ہیں۔''

''یہ بہتر رہے گا۔'' میں نے کہا۔

وسیم کے تعاقب میں روانہ ہونے سے پہلے میں فوزیہ کے کمرے میں آیا۔ وہ حسبِ سابق بیڈ پر اپنے گھٹنے سکیڑے، ان میں سر دیے اداس اور گم صم سی بیٹھی ہوئی تھی۔

اگرچہ چنبیلی بیچاری اس کے پاس موجود رہتی تھی لیکن مجھے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ اوپر چلی گئی۔

فوزیہ ابھی تک اس دکھ اور غم سے نہیں نکلی تھی جو اسے نور پور والے فارم ہاؤس کے اندوہناک واقعے سے ملا تھا۔ اسے یوں اداس اور آزردہ پا کر خود میرا اپنا دل بھی گھٹنے لگتا تھا۔

وہ میری آہٹ پر بھی نہیں چونکی حالانکہ وہ میرے قدموں کی چاپ پہچان لیتی تھی، جسے سنتے ہی وہ میری جانب متوجہ ہو جاتی تھی مگر اب ایسا کم ہی ہوتا تھا۔

میں آہستگی سے قدم اٹھاتا ہوا بہت دھیرے سے اس کے قریب ہی بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اس نے بدستور اپنا سر گھٹنوں میں دے رکھا تھا۔ مجھے اپنے سامنے بیٹھتے پا کر اس نے بس ایک لمحے کے لیے مجھے نظر اٹھا کر دیکھا اور پھر اپنا سر جھکا لیا۔

میں نے اس کے گورے چٹے گال پر دھیرے سے اپنا ایک ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے میرے ہاتھ کی انگلیوں کو ذرا جنبش دے کر سکیڑا پھر میرا وہی ہاتھ اس کے شانے پر جا ٹکا۔

”فوزیہ!“ میں نے بڑی محبت سے اسے پکارا۔ اس نے کوئی جواب تو نہیں دیا البتہ اپنا گھٹنوں میں چھپایا ہوا رخ ماہ جبیں ضرور نکال کر سامنے کر لیا۔ اس کی نگاہیں بھی میرے رخ کے نقطے پر اٹکی رہیں۔

”کیا ناراض ہو مجھ سے؟“ میں نے محبت بھرے ملائمت آمیزی سے پوچھا۔

”نہیں۔“ بہت ہولے سے فوزیہ نے جواب میں کہا۔

”یہی بات تمہاری مجھے مزید ملول کرتی ہے فوزیہ!“ میں نے جیسے یکدم تڑپ کر کہا۔ ”جب اپنا کوئی پیارا اور محبوب ناراض ہونا بھی چھوڑ دے تو پتا ہے اسے کیا کہا جاتا ہے؟ اس کے دل میں اب محبت ختم ہو گئی ہے۔ کیا تمہارے دل میں میری محبت ختم......“

”خدا نہ کرے۔“ میری اس بات نے اسے یکدم تڑپا کر رکھ دیا اور بے اختیار اس کا نرم و نازک ہاتھ میرے ہونٹوں کو چھو گیا۔ میرا اندر تک مسرتوں سے لبریز ہو گیا اور میں نے اسی طرح اس کے نرم ہاتھ کے ملائم لمس کا جیسے بوسہ بھی لے لیا۔

”ایسے مت کہا کرو سہراب! تمہاری محبت نے، تمہارے ساتھ نے ہی تو مجھے اب تک سنبھالا ہوا ہے۔ مجھے تم سے محبت تو کیا، لڑائی جھگڑا کرنے میں بھی لطف آتا رہا ہے لیکن اب جیسے مجھے سب کچھ جانے کیوں روکھا پھیکا لگنے لگا ہے۔“

وہ بولتی جا رہی تھی، شاید اپنی ہی رو میں...... اور میں یہی چاہتا تھا کہ اس سے کچھ ایسا کہوں جس سے وہ بولنے پر تو مجبور ہو خواہ کسی طرح بھی سہی۔ اسی لیے میں اس کو خاموشی مگر دلچسپی سے سنتا رہا۔

جب وہ اتنا کہہ کر چپ ہوئی اور میرے ہونٹوں سے اپنا ہاتھ ہٹانے لگی تو میں نے فوراً اس کا وہ ہاتھ پکڑ لیا جسے وہ دوبارہ اپنے وجود کی طرف سمیٹنے لگی تھی۔ اس نے ایک دم سے اپنی غزال چشم پوری وا کر دیں اور مجھے دیکھتی رہ گئی۔

میں نے اس کا وہ ہاتھ تھام کر دوبارہ چوم لیا اور حلاوت بھری آواز میں بولا۔

”فوزیہ! ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ تم زندہ ہو، میں جیتا جاگتا تمہارے سامنے موجود ہوں۔ اولاد تو خدا کی دین ہے، وہی اپنی مرضی سے لے لیتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی اس پاک اور رحیم ذات کی طرف سے آزمائش کا ہی ایک حصہ ہوتی ہے۔ تم سوچو، اگر خدانا خواستہ تمہیں کچھ ہو جاتا تو میرا سب ہی کچھ ختم ہو جاتا۔ اب تم ہو تو بھلا، خدا کی طرف سے خزانہ خالی تو نہیں ہو گیا۔ وہ ہمارے گلشن میں اور پھول کھلا دے گا۔ اس کے پاس بھلا کیا کمی ہے۔ کیا یہ کافی نہیں فوزیہ کہ تم ہو، میں ہوں اور سب سے بڑی بات ہماری محبت ہے، پھر کیا غم؟“

فوزیہ شاید میری بات کا مطلب سمجھ گئی اور یہی وجہ تھی بے اختیار اس کی آنکھیں بھیگ گئیں بلکہ اس کے نرم لبوں پر ہلکی سی مسکان ابھری تھی جس کا مطلب تھا کہ اس کے بجھے بجھے دل میں دوبارہ امیدوں کے سوتے پھوٹنے لگے تھے۔ تب بے اختیار وہ میری بانہوں میں آ گئی اور میں نے بھی اسے بھینچ لیا۔

”خدا تمہیں سلامت رکھے سہراب! اللہ کا کرم ہی تو ہے یہ کہ ہمارا ساتھ باقی ہے۔“

بس اس نے اتنا ہی کہا اور میرا مقصد پورا ہو گیا۔ میں نے بہت دھیرے سے اسے علیحدہ کیا اور کہا۔ ”خدا کا شکر ہے، تمہاری سمجھ میں بات آ گئی لیکن اب وعدہ کرو کہ یہ اداسی، غم نا کی آج سے ممنوع۔“ کہتے ہوئے میں مسکرایا اس نے بھی میرا ساتھ دیا۔ ”ہنسو، بولو، خوش رہو۔ دیکھو یہاں کتنے ہمارے پیارے عزیز اور جاں نثار لوگ ہیں، ہم کتنے خوش قسمت ہیں۔ ہم ایک ہی منفی بات کو یاد رکھتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ بدلے میں اللہ نے ہمیں کتنے مثبت حالات میں رکھا ہوا ہے۔ یہی تو ہم انسانوں کی خامی ہے۔“

”وعدہ کرتی ہوں۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔

”ایک اور وعدہ بھی کرو۔“ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”وہ کیا؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔
”مجھ سے لڑائی جھگڑا کرنا بھی نہیں بھولو گی۔“
وہ ہنس دی۔ میں بھی ہنسنے لگا، بولا۔ ”مجھے سدرہ نے بلایا ہے۔ کچھ خاص قسم کی نشست ہے ہماری۔“
”اسے کہو کہ ادھر ہی آ کر میرے سامنے نشست جمالے، میں بھی دیکھوں ذرا۔“ کہتے ہوئے فوزیہ نے مجھے گھورا۔ میں نے فوراً اپنے کانوں کو ہاتھ لگالیا۔ وہ پھر ہنس دی۔ میں نے کہا۔
”فوزیہ! اسی طرح ہنستی کھلکھلاتی رہا کرو، یقین کرو تم ہی میری اصل طاقت ہو۔ میں ابھی ایک اہم مشن پر جا رہا ہوں، میری کامیابی کی دعا کرنا۔“
”کہاں جا رہے ہو؟“ وہ پریشان ہوگئی۔ میں نے اسے بتادیا۔ وہ چپ ہوگئی۔ پھر رخصت ہوتے سے اس نے مجھ سے دعائیہ کہا۔ ”اللہ پاک تمہارا حامی و ناصر ہو۔“
میں نے بھی زیرلب ”آمین“ کہتے ہوئے اس سے ایک درخواست بھی کرڈالی۔
”فوزیہ! نگہت کو ہماری ضرورت ہے، پلیز تم ذرا اس کے پاس بھی بیٹھ جایا کرو اور آج سے نگہت سے لڑنا جھگڑنا ترک کردو۔“ اس نے مسکرا کر ہولے سے اثبات میں سر کو اثباتی جنبش دی۔
میری اکثر مہمات کے لیے جوجی کی ون ٹو فائیو بائیک سودمند رہتی تھی۔ ابھی پر سوار ہوکر میں وسیم کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

☆☆☆

سہ پہر کے تین بج رہے تھے۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ جیسا کہ مذکور ہو چلا، سردیوں کی آمد تھی اور پورا شہر ٹھنڈ کی لپیٹ میں تھا۔ آج مطلع ابر آلود بھی تھا۔ میں نے جیکٹ اور جینز پہن رکھی تھی، پیروں میں فل بوٹ تھے، گلے میں مفلر۔
سڑکوں پر ٹریفک بہت تھا اسی لیے بائیک کو مجھے کبھی دھیمی اور کبھی تیز دوڑانا پڑا۔ میرا ارادہ سب سے پہلے وسیم کے ٹھکانے پر اسے چھاپنا تھا جس کی مجھے امید تو کم ہی تھی لیکن ممکن تھا کہ اس کا کوئی نہ کوئی کلیو مل جاتا۔ اس کے بعد میں نے تیمور انڈسٹری اور آخر میں اس سرائے نما ہوٹل کا رخ کرنا تھا جس کے بارے میں، میں نے اس کے باپ راجا تیمور کی زبانی ہی سن رکھا تھا مگر کبھی وہاں جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ وہ بھی شاہدرہ روڈ پر تیمور انڈسٹری کے قریب ہی روڈ سائڈ پر واقع تھا۔

یہ اس وقت کی بات تھی جب راجا تیمور بہ نفسِ نفیس خود کالی لہر کی اعلیٰ قیادت کے ایما پر بومبورگا کے مجسّمے کو ٹرک میں ڈالے کشمیری بارڈر پر پہنچانے کے لیے روانہ ہوا تھا مگر مارا گیا تھا۔
بہرکیف، میں اقبال چوک (اقبال اسکوائر) کے سگنل پر رکا ہوا تھا۔ جیسا کہ مذکور ہوا، میں بائیک چلاتے وقت ہیلمٹ ضرور پہنتا تھا، اس سے کم از کم آدمی کسی ”سیریس انجری“ سے محفوظ رہتا ہے۔ اس کا ٹرانس پیرنٹ وائزر بدلوا کر میں نے شیڈ والا لگوالیا تھا۔
سامنے سے دائیں جانب جانے والی ٹریفک کا سگنل گرین ہوا۔ میری نظریں اسی سمت پر تھیں۔ اس کے بعد ہمارا سگنل گرین ہونے کی باری تھی۔
معاً میں ایک سفید رنگ کے ڈالے کو دیکھ کر چونک گیا۔ ڈالا مجھے دیکھا بھالا لگا، اس کی نشانی یہ تھی کہ اس پر نہ صرف اگلے بمپر پر بلکہ چھت پر بھی ڈبل فلڈ لائٹ لگی ہوئی تھی اور عقب میں مارخور کا سر لگا ہوا تھا۔ یہ عموماً شکار پسندوں کا نشان ہوتا ہے۔
یہ ڈالا چودھری ”جی برادران“ کے نکے چودھری دراب جی کا تھا جو خود بھی اس وقت ڈرائیور کے عقب والی سیٹ پر براجمان تھا، جدھران کا ایک حواری بھی بیٹھا دکھائی دے رہا تھا مجھے۔
میرے لیے اب یہ لوگ کوئی اتنے خاص اہم نہیں رہے تھے اور نہ ہی کوئی خاص چونکنا بھی نہیں انہیں دیکھ کر......
لیکن حیرت مجھے اس بات پر ہوئی تھی کہ میں نے ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بڑے چودھری شالا جی کو بھی بڑے ٹھسے اور ٹھکے سے براجمان دیکھا تھا۔ یہ کل چار افراد تھے۔ گویا چودھری ”جی برادران“ کی پوری ٹولی اس میں موجود تھی۔ اسی بات نے مجھے اندر سے کھٹکا یا تھا۔
مجھے کچھ حیرت تو ہوئی کہ چودھری دراب جی کا بھلا اب یہاں کیا کام؟ وہ تو نادو والے مسئلے کے حل کے بعد صادق آباد لوٹ چکا تھا۔ سلیم اس کے ٹھکانے پر لے لیا تھا، جو میرے خیال کے مطابق اب گھر کا رہا تھا نہ گھاٹ کا لیکن ممکن ہے اس کی یہاں موجودگی کی ایک وجہ راحیلہ بھی ہو۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا، وہ شروع ہی دن سے راحیلہ میں ”انٹرسٹڈ“ تھا جس کا وہ راحیلہ کے سامنے ہی نہیں بلکہ میرے سامنے بھی اظہار اور اعتراف کرچکا تھا۔
بہرکیف، میرے لیے اب چودھری جی برادران اہم نہیں رہے تھے اور نہ ہی چودھری دراب جی کیونکہ نادو اپنی

عجیب وغریب فطرت اور مرضی کے مطابق واپس صادق آباد چودھری شالاجی کے پاس لوٹ چکی تھی۔

وہ یوں چپ چپاتے خود ہی فیصلہ کر کے مجھ سے مشورہ کیے بغیر صادق آباد لوٹ چکی تھی۔ خیر، جرم اس کا اپنی جگہ مگر کا اس بارے میں خیال مختلف تھا۔ اس نے مجھے پھر بھی بچے رہنے کی تاکید کی تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ نادو کے منہ میں دھکیلا ہے۔ وہ شاید بختیار احمد کے طلا زندگی سے ہی بد دل ہو گئی تھی، جس نے چودھری جی کے خوف سے اسے طلاق دے ڈالی تھی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس سے محبت کرتی تھی اور کتنے ہی دکھ اور کڑے بھولے جیسے وفادار اور جاں نثار آدمی کو بھی اس اور اس کے پاس راجن پور چلی آئی تھی۔

بہر کیف، میں بھی اسے نادو کی سے تقدیر کے حوالے کر کے چپ ہو کر بیٹھ رہا تھا۔ تاہم مجھے یاد نے ایک دن مجھ سے کہا تھا کہ...... "یہ لوگ جھوٹی انا کی خاطر کسی کو بھی نہیں بخشتے، مکاری سے پیچھے ہٹ ضرور جاتے مگر پھر چھپ کر وار کر کے اپنی "تسکین" ضرور کر لیتے ہیں سہراب، نادو تو اب سمجھو زندگی سے گئی مگر تم محتاط رہنا۔"

اس وقت وسیم کی تلاش کی مہم میرے لیے بہت اہم تھی لیکن جانے کیوں پھر جیسے ہی ہماری طرف کا سگنل گرین ہوا، میں آگے جانے کے بجائے اسی جانب کی سڑک پر گھوم گیا جدھر وہ سفید رنگ کا ڈالا گیا تھا۔

میرے اندر کچھ کھد بدی ہوئی تھی۔ وہ بہت آگے نکل چکا تھا، روڈ چونکہ کافی آگے تک سیدھی تھی اسی لیے جلد ہی میں اس کے قریب جا پہنچا، یوں کہ انہیں اس تعاقب کا احساس نہ ہونے پائے۔

میرا اندر بری طرح اتھل پتھل کا شکار ہونے لگا۔ اگر دراب جی کو دیکھتا تو شاید میں اتنی اہمیت انہیں نہ دیتا اور نہ ہی ان کے تعاقب کی ضرورت سمجھتا، لیکن "وڈے چودھری" (چودھری شالاجی) جس کی میرے ساتھ اصل جنگ تھی، اسے پہلی بار میں یہاں یعنی سیالکوٹ میں دیکھ رہا تھا۔ کیوں......؟ جبکہ نادو بھی اس کے پاس جا چکی تھی۔ یہ پھر وڈا چودھری یہاں کیا کرنے آیا تھا اور پھر سلیم چھمالیا ان کے ساتھ کیوں نہیں تھا؟ وہ کہاں چلا گیا تھا؟ بہت سے سوالات تھے جن کے جوابات کے تجسس میں بے اختیار میں ان کے پیچھے لگ گیا تھا۔

ایک مخدوش سا خیال آخر میں میرے ذہن میں یہ بھی ابھرا تھا کہ کہیں نادو کے واپس لوٹ جانے کے بعد شالاجی میرے پیچھے تو نہیں لگ گیا تھا مگر اس وقت تو میں اس کے پیچھے تھا۔

مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ تاہم میں نے بھی سوچ لیا کہ اگر اس تعاقب کا کوئی خاص نتیجہ نہیں سامنے آیا تو میں واپس پلٹ جاؤں گا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ شالاجی کب سے یہاں تھا ورنہ تو اب تک میرا ان سے ٹاکرا ہو چکا ہوتا۔

یہ سوچتے سوچتے اب میری ان کے تعاقب میں جانے کی اہمیت پھیکی سی پڑنے لگی، پچھتاوا بھی ہوا کہ بلاوجہ اب تک وقت کا زیاں ہی کیا۔ میں ابھی انہی سوچوں کا شکار تھا کہ معاً مجھے ڈالے کے پچھلے جنگلے میں کوئی شے حرکت کرتی محسوس ہوئی۔

ڈالا گاڑی اب شہر کے جنوب مغربی مضافات میں داخل ہو چکی تھی اور یہاں گاڑیوں کی آوک جاوک بھی کم ہی دیکھنے میں آرہی تھی۔ یہ شہر کا وہ حصہ تھا جہاں جنگلوں، درختوں اور کافی حد تک میدانی علاقہ پھیلا ہوا تھا جو کئی میلوں تک محیط تھا، اس کے بعد پھر کوئی گاؤں دیہات کی آبادیاں تھیں۔

جس شے کو ڈالے کے پچھلے کھلے حصے میں حرکت کرتے میں نے دیکھا تھا، وہ کوئی آدمی ہی تھا۔ میں نے ہیلمٹ کا وائزر اوپر کر دیا تا کہ بغور اس بندے کو دیکھ اور پہچان سکوں لیکن پھر اچانک جیسے مجھے لگا وہ شخص کچھ ٹھیک حالت میں نہ تھا۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ رسن بستہ حالت میں تھا اور کسی نہ کسی طرح کر ڈالے سے خود کو نیچے گرا دینا چاہتا تھا۔ میں دنگ رہ گیا میں اس کی جان کو بھی خطرہ ہو سکتا تھا۔ اندازہ اس کہ گویا وہ خود کو اس سے زیادہ خطرے میں گھرا محسوس کر رہا ہو گا جبھی وہ اتنا بڑا رسک لینے پر مجبور ہو رہا تھا۔ پر یہ تھا کون؟

اچانک ڈالے کے ٹائر زور سے چرچرائے۔ سے کودنے کی کوشش کرتا ہوا شخص دوبارہ ڈالے کے کھلے گوشے میں جالڑھکا تھا۔ ڈالے نے بظاہر کچے کی جانب نشیبی اور بل کھاتے راستے پر موڑ کاٹا تھا مگر آگے جا کر وہ رک گیا تھا۔

میری بائیک قریب پہنچتے پہنچتے گھنے درختوں کے کنج میں گھرے کھیت کے مختصر حصے میں اتر گئی اور میں جلدی سے اس کا انجن بند کر کے زمین پر لٹا کر خود رو جھاڑیوں اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا دبے پاؤں ان کی جانب بڑھا۔

قریب پہنچا تو دیکھا، ڈالا گاڑی رکی ہوئی تھی لیکن اس

کا انجن ہولے ہولے کسی ہانپتے ہوئے شکاری کتے کی طرح غرا رہا تھا۔ دونوں حواری اس کو دنے کی کوشش کرنے والے شخص کو بے دردی سے کھینچ کھانچ کر نیچے زمین پر گرائے اسے بری طرح مکوں اور لاتوں سے مار رہے تھے۔

وہ شخص بھی کوئی جی دار ہی معلوم ہوا جو ان کی منت سماجت تو نہیں کر رہا تھا البتہ اس کے حلق سے تکلیف دہ کراہیں ضرور بلند ہو رہی تھیں۔

وڈا چودھری شالا جی اور نکا چودھری دراب جی، دونوں ٹانگیں پھیلائے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔

"اس کمینے نے بھاگنے کی کوشش کی تھی، اگر یہ وقت سے پہلے مرنا چاہتا ہے تو پھر اسے ادھر ہی گولی مار کر لاش گڑھے میں پھینک دو۔" یہ وڈے چودھری شالا جی کی کھرکھراتی آواز تھی جس سے حد درجہ سنگدلی اور بے رحمی جھلک رہی تھی۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ تب ہی میں نے دیکھا، اس کے ساتھ کھڑے چھوٹے بھائی دراب جی نے اپنے لباس سے سیاہ رنگ کا پستول نکال لیا۔

زدوکوب ہونے والے بدقسمت قیدی کا میں نے غور سے چہرہ دیکھنے کی کوشش کی تھی جو مسلسل مار کھانے کے سبب خراشوں سے مسخ ہو رہا تھا۔

تاہم میرے لیے اسے پہچان لینا دوسرے مرحلے کی بات تھی، میں اس کی زندگی پہلے بچانا چاہتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ دونوں بھائی بہت سفاک اور ظالم انسان تھے۔ انسانیت کا تقاضا بھی تھا کہ میں ایک مجبور اور بے بس انسان کو اس طرح بے دردی سے مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

پستول تو میری جیب میں بھی موجود تھا لیکن میں نے انہیں بہکانے کی کوئی اور چال چلی۔ ایک پتھر اٹھا کر میں نے چودھری دراب جی کے پستول والے ہاتھ کا نشانہ لے کر اچھال دیا۔

دراب جی کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر جھاڑیوں میں جا گرا۔ وہ بری طرح بدک کر اچھلا۔ اس کے ساتھ کھڑا اس کا "وڈا بھرا" (بڑا بھائی) بھی اچھلا اور پھر جھلا کر بولا۔

"اوئے کی ہویا؟ پستول ڈگیا تینوں؟"

"کوئی ہے یہاں۔" دراب جی فوراً سنبھل کر بولا اور چاروں طرف اپنی گردن موڑ کر دیکھنے لگا۔ قیدی کو مار پیٹ کرنے والے حواری بھی اس افتاد پر ٹھٹکے، تب تک میرا دوسرا پتھر شالا جی کی پیشانی پر پڑا۔ وہ "ہائے نامرادا" کہتا ہوا وہیں بیٹھ رہا۔ دراب جی فوراً بڑے بھائی کو سنبھالنے کے لیے لپکا۔ ادھر وہ دونوں حواری بھی قیدی کو چھوڑ کر اس کی طرف بڑھے۔

"خبردار! کوئی حرکت نہیں کرے گا ورنہ بھیجا پار کر دوں گا۔" ان سب کو ایک جگہ پر اکٹھا ہونے پر مجبور کرنے کے بعد میں ہاتھ میں پستول لیے سامنے آگیا۔

"وسس... سہراب...! یہ تم ہو؟" دفعتاً ہی زمین پر آڑا ترچھا زخمی حالت میں پڑا قیدی میری بلند آواز پر کراہتے ہوئے بولا۔ شناسا آواز محسوس کرتے ہی میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

☆☆☆

وہ سلیم چھالیا تھا۔

مگر میری توجہ ان ہی کی طرف رہی۔ وہ سب گم صم ہو کر رہ گئے۔ کئی ثانیوں تک تو ان سے کچھ بولا ہی نہ گیا پھر دراب جی نے ہی غراتے ہوئے پہل کی۔

"تم... سہراب! دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا؟"

"بکواس بند کرو اپنی۔" میں بھی اس سے خوفزدہ یا مرعوب ہوئے بغیر بولا پھر اسے نظر انداز کر کے وہیں کھڑے اس کے ایک حواری سے تحکمانہ درشتی سے بولا۔

"اے تم... اسی وقت قیدی کے ہاتھ پاؤں کھولو... جلدی۔" مگر اس نے میری بات جیسے سنی ان سنی کر دی۔ اسے شاید "نوکر شاہی" ہونے کا کچھ زیادہ ہی زعم تھا۔ اس کا علاج میں نے دوبارہ منہ کے بجائے پستول کی گولی سے کیا۔

"ٹھائیں...!" میرے پستول نے آتشیں قہقہہ اگلا، ساتھ ہی حواری کی چیخ ابھری۔ وہ وہیں اپنی ٹانگ پکڑ کر گر گیا۔ میں نے دوسرے حواری کو بھی حکم دیا۔

"سہراب... جانتے نہیں میں کون ہوں؟" تب ہی وڈا چودھری شالا جی جس کے ماتھے پر چوٹ لگی چند ساعتوں تک سانپ ہی سونگھا رہا تھا، یکدم غراہٹ سے بولا۔

"پہچاننے کی تجھے ضرورت ہے تو کو... وڈے چودھری!" میں نے بھی اسی انداز میں اس سے کہا "اپنے حواری کو حکم دو، وہ سلیم کی رسیاں کھول دے ورنہ یہاں تم سمیت چار لاشیں پڑی ہوں گی۔"

شالا جی نے تو نہیں البتہ دراب جی نے فوراً اپنے دوسرے حواری کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا اور جھک کر سلیم کے جکڑ بند کھولنے لگا۔ تب ہی دراب جی مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"سلیم سے تیری کب سے یاری ہونے لگی؟ تو، تو خود اس کا دشمن تھا اور یہ تیرا۔" اس کے لہجے میں طنز تھا۔

"یاری تو تیری بھی اس سے بڑی گاڑھی رہی ہے نکے چودھری! پھر تو نے اس کے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا؟"

میرے جواب پر وہ چپ ہو رہا۔

سلیم آزاد ہوتے ہی اٹھ کر میری جانب لپکا اور ہانپتے ہوئے بولا۔ "چھوڑ ان کو، چل ادھر سے جلدی۔"

"یہ پستول پکڑ، قریب میری بائیک موجود ہے، وہ میں ادھر لے کر آتا ہوں۔" کہتے ہوئے میں نے پستول سلیم کو تھما دیا۔ اس نے فوراً انہیں گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔ میں جلدی سے بائیک اسٹارٹ کر کے قریب لے آیا اور سلیم کے سوار ہوتے ہی وہاں سے نکل گیا۔

میرا رخ شہر کی جانب تھا لیکن شہر جانے کے بجائے دو ایک میل آگے جا کر میں نے بائیک بائیں جانب کے نشیب کے کچے میں اتاری اور سلیم کو اترنے کا کہا۔

سڑک پر ایک نگاہ ڈالی، چودھری ہمارے تعاقب میں تو نہیں تھے لیکن سردست مجھے ان کی گاڑی آتی دکھائی نہیں دی۔

"یہاں کیوں روک دی بائیک؟" سلیم نے حیرت سے مجھ سے سوال کیا تو میں نے غصے سے ہونٹ بھینچتے ہوئے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ وہ تھپڑ کھا کر چند قدم پیچھے کو لڑکھڑا گیا اور سوجے ہوئے گال پر ایک ہاتھ رکھتا ہوا حیرت سے مجھے تکنے لگا۔

"تیرے جیسا بے غیرت آدمی میں نے کہیں نہیں دیکھا۔" میں پُرطیش لہجے میں گھورتے ہوئے اس سے بولا۔

"یار......! امم...... میرا قصور کیا ہے؟" وہ کراہا۔

"قصور کے بچے!" میں دانت پیس کر بولا۔ "تو ان کا راتب خور کیوں بنا تھا؟ دیکھ لیا انجام؟ یہ تو شکر کر کہ اتفاق سے میری نگاہ ان پر پڑ گئی ورنہ تیرا تو قصہ آج ختم تھا۔"

وہ یکدم میرے قدموں پر آن گرا۔ "سہراب! تو بہت عظیم انسان ہے۔ مجھے معاف کر دے یار! تیری بات غلط نہیں ہے۔ میں واقعی گھر کا رہا ہوں نہ گھاٹ کا۔" وہ وفورِ جذبات سے منمنانے لگا۔

"لیکن سدھرتا پھر بھی نہیں ہے تو۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "چل اب یہ ایکٹنگ کرنا چھوڑ اور کھڑا ہو جا۔ مجھے بتا یہ کیا معاملہ ہے؟ یہ وڈا چودھری کس لیے یہاں سیالکوٹ نازل ہوا ہے اور تو ایک دم ان کے زیرِ عتاب کیسے آ گیا؟ وقت نہیں ہے میرے پاس، مختصر بتا اور اپنی راہ لے۔"

وہ اپنے جسم کو سہلاتا ہوا پھر معصومیت سے بولا۔ "یار بتا دوں گا، بھلا تجھ سے کیا چھپانا، پر میری حالت تو دیکھ۔ مجھے کہیں کسی ٹھور ٹھکانے پر تو لے چل۔" اس کی بات سن کر میں نے دانت پیس لیے۔ اسی انداز میں بولا۔

"تو بڑا سخت جان ہے، بھلا یہ لاتوں، مکوں کی مار تجھے کیا کرے گی؟" وہ چپ رہا تو میں نے پھر پوچھ لیا۔ "کیا تیرا کوئی ٹھور ٹھکانا نہیں رہا اب؟"

"نہیں۔ ایسی بات تو نہیں ہے۔" وہ یکدم چور سا بن گیا۔ "ایک جگہ پر تو جا ہی سکتا ہوں۔"

"وہ کہاں؟"

"گڑھ مولا۔"

"گڑھ مولا......؟" میں نے قدرے چونک کر سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ہاں، بھانڈیل سائیں کے ہاں۔"

"وہ کیوں؟ اس سے اب تیرا کس قسم کا واسطہ پڑ گیا ہے؟" میں نے پُرتشکیک نظروں سے اسے گھورا۔

"واسطہ تو پرانا ہے، پر درمیان میں ناراضگی چل رہی تھی، نوید چھیمرا کی وجہ سے۔" پھر ایک لمحہ توقف کے بعد وہ بولا۔ "ویسے میں نے ان دونوں چودھری بھائیوں کی شکایت کرنی ہے بھانڈیل سائیں سے۔"

"کیا...... کن چودھری بھائیوں کی...... شالا جی اور نواب جی کی؟"

"ہاں۔"

"میں تیری بات نہیں سمجھ رہا ہوں اور نہ ہی تیری کسی بات کا اعتبار ہے مجھے۔ تو اپنا راستہ لے۔" جھلا کر میں نے رکھائی سے کہا اور اپنی بائیک کی جانب بڑھ گیا۔ وہ مجھے پکارتا ہوا پیچھے کو لپکا۔

"میری بات تو سن...... تو نے میری جان بچائی ہے اور اتنا بڑا احسان کیا ہے مجھ پر، کیا میرا فرض نہیں بنتا ہے کہ میں بھی تیرے فائدے کی بات کروں؟"

میں اس کی بات سنی ان سنی کرتا ہوا بائیک کا ہینڈل سنبھال کر سوار ہو گیا اور کک ماری، بولا۔ "تو بہت چکر باز ہے سلیم! میں تجھے بچپن سے جانتا ہوں۔" میں نے غصے سے کہا۔

"آہ، کیا یاد کرا دیا ظالم...... بچپن......!" وہ ایک آزردہ سی آہ بھر کے بولا۔ "کاش! آج راجو اور ماجا بھی زندہ ہوتے...... میں تم تینوں کو دوبارہ کراچی لے چلتا، اسی گلی میں، اپنا نیا ٹھکانا بناتے ہم چاروں دوست...... جہاں ہمارے تنگ صحنوں والے روکھے پھیکے گھر ہوا کرتے تھے مگر کتنا سکون اور بے فکری تھی۔ تھوڑا کماتے تھے مگر سکون بہت تھا، جیبوں کے بغیر فقیر سہی مگر دل کے بادشاہ ہوا کرتے تھے، پر افسوس غلط راہ پر چل نکلے۔"

’’نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔‘‘ میں نے تلخی سے کہا۔ ’’ہمیں اس راہ پر تو نے ہی تو چلایا تھا۔ راجو اور ماجا بھی تیری ہی وجہ سے مارے گئے۔ ان کی موت کا تو مجھے دکھ بھی نہیں بھولے گا پر تو زندہ ہے، مجھے اس کا افسوس رہے گا۔‘‘ میرا لہجہ زہریلا ہوتا چلا گیا۔

’’تو کچھ بھی بول لے، پر اب میں تائب ہو چکا ہوں۔ اچھا ہی ہوا کہ میں اکیلا رہ گیا۔‘‘ وہ بے دلی سے بولا۔ ’’کہیں محنت مزدوری کر کے اب حق حلال کی کھاؤں گا، کسی کے در کا کتا نہیں بنوں گا۔‘‘

’’فلمی مکالمے چھوڑ اور مجھے بتا یہ سب کیا معاملہ تھا؟ ... نہیں رکوں گا۔‘‘ میں نے اس کی بات سے بیزار ہوتے ہوئے کہا۔

’’... ہوں، کہیں چل کر آرام سے بیٹھتے ہیں۔ سب تفصیل ... گا۔‘‘ وہ بولا۔

’’شام میں پھر استاد ... کے ٹھکانے پر آجانا۔‘‘ میں نے کہا۔

’’تو جا کہاں رہا ہے؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’تجھ سے مطلب؟‘‘

’’مطلب ہے، ایک سے دو بھلے۔ لگتا ہے تو کسی کی تلاش میں جا رہا ہے۔‘‘

’’وسیم کی تلاش ہے مجھے۔‘‘ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ وہ بری طرح چونکا۔

’’کیا......؟ اسی بدبخت کی تو میں نے بھی گردن ناپنی ہے۔ پر تجھے اسے تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں تجھے لے چلتا ہوں اس کے پاس...... ابھی۔‘‘

’’بکواس مت کر اور اپنا راستہ لے۔‘‘ میں رکھائی سے بولا مگر وہ ایک دم آگے بڑھ کر میرے عقب میں سوار ہو گیا اور بولا۔

’’چل، نکے چودھری کے ٹھکانے پر...... وسیم ادھر ہی بیٹھا ہے۔ اگر میری بات جھوٹ نکلی تو وہیں مجھے گولی مار دینا، پستول ہے نا تیرے پاس۔‘‘

اب کی بار مجھے اس کی بات پر چونکنا پڑا تھا کیونکہ یہ میرے مطلب کی بات تھی۔ ’’تجھے کیسے یقین ہے، بھلا وسیم کا ان جی برادران سے کیا لینا دینا؟‘‘ میں نے کہا۔

’’چودھری جی برادران...... واہ میرے یارا کیا خوب نام رکھا ہے ان دونوں کا تو نے۔‘‘ وہ ہنس کر بولا۔

’’کام کی بات کر۔‘‘ میں نے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے اسے گھورا۔

’’میں پاگل ہوں جو موت کے منہ سے بچ کر دوبارہ تیرے ساتھ ادھر ہی کا رخ کر رہا ہوں۔ چل تو سہی۔‘‘

میں نے بائیک آگے بڑھا دی۔ اتنی بڑی اور اہم بات وہ غلط نہیں کہہ سکتا تھا اور راستے میں اس نے مجھے جو کچھ بتایا وہ میرے لیے سنسنی خیز تھا۔ حالات بتا رہے تھے کہ دشمن کے دشمن اور دوست ایک دوسرے سے گٹھ جوڑ کرنے میں مصروف تھے۔ اگرچہ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، سب ماضی کے حوالے سے ایک دوسرے سے کسی نہ کسی طرح جڑے ہی رہے تھے۔

مثلاً باس اقبال کا چودھری جی برادران سے پرانا یارانہ...... پھر سجاد بیگ کی ان سے دشمنی، اقبال کا بھانڈیل سائیں سے لینا دینا، پھر دونوں میں سخت ناراضگی، اس کے بعد سجاد بیگ نیا باس بنا اور اس نے جی برادران کی واسطے داری ترک کر کے بھانڈیل سائیں سمیت وسیم وغیرہ سے اعادہ رسم و شناسائی بڑھائی۔

بھانڈیل سائیں کی کالی لہر سے غداری مگر وسیم کی مفاد کے پردے میں کالی لہر والوں سے ’’نمک حلالی‘‘ اور پھر دغا بازی۔ سلیم چھالیا تھالی کے بینگن کی طرح کبھی ادھر اور کبھی ادھر لڑھک لڑھک کر اپنی اہمیت کھو چکا تھا، جس سبب بلیک کیٹس اور ریڈ فاکس والوں سے جی برادران کا آپس کا معاملہ ختم ہو گیا، نہ صرف یہ بلکہ اس روز جب میں دراب جی کے ٹھکانے پر پہنچا تو مجھے وہاں بلیک کیٹس اور ریڈ فاکس کے ٹاپ ایجنٹوں کی موجودگی کی خبر ملی۔ وہاں پہنچا تو سلیم چھالیا مجھے دیکھ کر ... گیا اور پھر را اور موساد (بلیک کیٹس اور ریڈ فاکس) کی ... گرفتاری کے سبب سلیم چھالیا، چودھری جی برادران کے زیر عتاب آ گیا۔ یہاں تک کہ وڈے چودھری شالا جی کو ... سیالکوٹ آنا پڑ گیا تاکہ سلیم کو اپنی نظروں کے سامنے ... سزا کے طور پر ہلاک کر ڈالے لیکن اب بھی بات صرف اتنی نہیں تھی۔

سلیم نے اس سے زیادہ سنسنی خیز انکشاف ... تھالی کا بینگن بنتے رہنے کے سبب وہ سب ہی کے ... گودوں میں گرتا رہا تھا۔ اسی لیے سب کی جانکاری وہ ... ہوئے تھا۔ وسیم اور بھانڈیل سائیں کا بومبورگا کے سلسلے میں گٹھ جوڑ تو تھا ہی اور ان دونوں مہاگروں کی خفیہ ’’ڈیلنگ‘‘ را اور موساد کے ساتھ تھی۔ میرے درمیان میں پڑنے یا الفاظ دیگر مجھ سے پنگا لینے کے سبب ان سب کے معاملات بری طرح کھٹائی میں پڑ گئے تھے۔

بہرکیف، سلیم چھالیا اب میرے لیے آخر میں وہ کھوٹا

سکہ ثابت ہونے لگا تھا جو کسی بھی وقت کام آجاتا ہے، لہٰذا اس نے جو آخر میں اور اہم انکشاف کیا تھا، وہ یہ تھا کہ وسیم چونکہ بھانڈیل سائیں کے ساتھ خفیہ طور پر ملا ہوا تھا، وہ بھی اس کی طرح کالی لہر یعنی میڈم پھپھی وغیرہ سے بددل اور ان کا دشمن تھا، پھپھی کو بے وقوف بنا کر وہ اس سے بومبورگا کا مجسمہ حاصل کر لینے کے بعد اسے را اور موساد کے ایجنٹوں کے حوالے کرنے والے تھے اور اس سے انہیں ایک خطیر رقم ملنے والی تھی۔ لہٰذا بھانڈیل سائیں کی اسکیم کے مطابق وسیم مجسمے کو اپنے قبضے میں رکھتے ہوئے پھپھی کو دھوکے سے مروانا چاہتا تو وسیم کو اچانک معلوم ہوا کہ پھپھی یہاں اکیلی نہ تھی بلکہ ترچاپلی کے اپنے ایک اہم "لنگی پوش" گروہ کے ساتھ یہاں وارد [illegible] اس کی نیت میں فتور آ گیا تھا۔

جیسا کہ بقول نگہت [illegible] وسیم ایک موقع پرست اور دغاباز انسان تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ کالی لہر کو بھانڈیل سائیں کی اس سازش (صرف پھپھی کو ہلاک کرنے والی اسکیم) سے آگاہ کر کے کالی لہر والوں کے دل میں اپنا اعتماد قائم کرے، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس کے بعد پھپھی اور اس کا سفاک اور درندہ صفت لنگی پوش گروہ بھانڈیل سائیں کو ہلاک کر ڈالیں گے۔ اس کا راستہ جیسے ہی صاف ہوگا، وہ را اور موساد والوں سے ڈیل کر کے پھپھی کو بھی موت کے گھاٹ اتار دے گا۔

بلاشبہ وسیم اپنے باپ راجا تیمور کی طرح ایک چالاک اور شاطر آدمی تھا۔ اس نے سانپ اور سیڑھی والا خطرناک کھیل شروع کر دیا۔ اب یہاں لامحالہ سوچنے والی بات یہ تھی کہ پھر میری قید میں را اور موساد کے ایجنٹوں سے وسیم نے کیوں غداری کی؟ وہ انہیں بھی ہاتھ دکھا رہا تھا۔ اس کی بڑی اہم وجہ تھی۔ یوں بات پھر وہی آ گئی، میرے درمیان میں پڑتے رہنے کے سبب وسیم کا بار بار یہ سانپ اور سیڑھی والا کھیل ہر طرف سے بری طرح ناکام ہوتا رہا۔ پھر ابھی چند روز قبل چک متراں والے کھنڈرات کے مکانوں اور نہر کنارے بنے کاٹیج میں جو جاں گسل واقعات ہوئے، جس میں نگہت بری طرح گھائل ہو کر مرتے مرتے بچی تھی، وسیم کا میں نے پول کھول دیا اور پھپھی کے ساتھ چلی ہوئی چال وسیم کی اس بری طرح سے میں نے ناکامی سے دوچار کر ڈالی کہ اسے بے نقاب ہونا پڑا۔ یہاں ایک دلچسپ کھیل.... تقدیر نے وسیم کے ساتھ کھیلا۔ بومبورگا جیسا ترپ کا پتا جسے اس نے اپنے سنہری مستقبل کے لیے چھپا رکھا تھا (میرے عین قیاس کے مطابق) وہ اس سے کوئی اور لے اڑا۔ وسیم کی حالت باؤلے کتے جیسی ہو گئی۔

وسیم کی مجبوری یہ تھی کہ وہ بومبورگا جیسے مجسمے کو زیادہ دیر اپنے پاس سنبھالے نہیں رکھ سکتا تھا۔ وجہ یہی تھی کہ اس کے حصول کے پیچھے را اور موساد سمیت اب وطن عزیز کے حساس ادارے بھی لگ چکے تھے تاکہ ملک دشمن عناصر اپنی ناپاک سازش میں کامیاب نہ ہونے پائیں۔

جیسا کہ مذکور ہو چکا، میں نے اس سلسلے میں بومبورگا یعنی بلیک اسٹون کی "خطرناکی" کے بارے میں خفیہ پولیس کے اہم افسر جوڑے انسپکٹر شیراز اور شاہینہ کمال سے ذکر کر ڈالا تھا اور حساس اداروں کو بومبورگا کے مجسمے سمیت را اور موساد کی اس میں دلچسپی اور حصول کے ناپاک مقصد سے بھی آگاہ کیا گیا۔

یہی وجہ تھی کہ وسیم کو اب خود بھی بومبورگا کے مجسمے کی حفاظت مشکل نظر آنے لگی تھی۔ اسے کسی ساتھی کی ضرورت تھی اور سجاد بیگ سے بڑھ کر اسے اپنا اور کوئی ساتھی نظر نہ آیا۔ تاہم یہ بھی اس کے چالاک ذہن میں بات تھی کہ سجاد بیگ کو اس اہم بات کے بارے میں آگاہ کرنے کا مطلب تھا شراکت داری، جو وسیم کے حلق سے مشکل ہی سے اترتی کیونکہ اسی لالچ کی خاطر تو اس نے بڑے دوستوں اور دشمنوں سے غداری کے ساتھ ٹکر بھی لی تھی۔ اب سجاد بیگ اس کے لیے مددگار بھی نظر آیا تو دوسری طرف شراکت دار بھی۔

لہٰذا اس نے بہت غور کیا کیونکہ وہ جن حالات کا شکار تھا، اس میں [illegible] سے بھی جاتا، یعنی اتنا رسک اٹھانے کے بعد بھی وہ [illegible] نہ رہ جائے، اس سے بہتر ہے کہ کسی سے مدد کی ڈیل کر کے وہ کم از کم آدھے کا ہی حصہ دار بن جائے۔ اسے پچھتاوا اپنی ہوا اپنی بدقسمتی پر کہ اس نے پھر بھانڈیل سائیں سے غداری کیوں کی؟ لیکن اب چڑیا کھیت چگ چکی تھیں، لہٰذا جب اور کوئی صورت نظر نہ آئی تو اس نے وہی کیا۔ مجبوراً ہی سہی، اس نے سجاد بیگ کو مدد کے لیے اس اہم راز سے آگاہ کر دیا۔

سجاد بیگ کو جب اس مجسمے کے بارے میں پتا چلا تو وہ جو پہلے ہی وسیم اور نگہت سے بددل ہو کر بیٹھ چکا تھا، حرکت میں آ گیا۔ اس نے وسیم کو یہی مشورہ دیا کہ اس اہم خزانے کو جس کے پیچھے بہت سے خطرناک لوگ پڑے ہوئے ہیں، کراچی منتقل کر دو لیکن وسیم کو اس کا یہ مشورہ پسند نہ آیا۔ اسے دھوکے اور فریب کی بو محسوس ہوئی اور بعد میں وہ اور بھی پچھتایا کہ اس نے سجاد بیگ سے اس مجسمے کا ذکر ہی کیوں کیا لیکن وہ کہتے ہیں نا کہ ایسے حالات میں بڑے سے بڑے

جگادر چالباز کی بھی عقل ماری جاتی ہے، وہی وسیم کے ساتھ ہوا۔ سجاد بیگ نے اسے ہاتھ دکھادیا اور مجسمہ اس سے لے اڑا۔ وسیم سمجھ گیا کہ یہ حرکت سجاد بیگ کے سوا اور کوئی نہیں کرسکتا تھا مگر وسیم، سجاد بیگ سے ٹکر لینے کی پوزیشن میں نہیں تھا، اس لیے کہ وہ خود اپنی جان بچاتا پھر رہا تھا۔

جی برادران سے اس کا کیسے رابطہ ہوا؟ بقول سلیم کے ہی، وڈا چودھری یعنی شالاجی، وسیم کے باپ کا بچپن کا دوست رہ چکا تھا۔ اس کی موت کے بعد وسیم نے اس سے کسی تعلق کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ چودھری شالاجی بہت اثر رسوخ والا آدمی تھا اور صادق آباد میں ایک بڑی جاگیر کا مالک تھا۔ اسے سخت پچھتاوا ہو [illegible] اس نے اس سے مدد کیوں نہ مانگ لی۔ وہ بڑے آرام [illegible] دور دراز جاگیر میں مجسمے کو چھپا کر رکھ سکتا تھا۔ نہ صرف [illegible] باپ کی دوستی کی خاطر وہ اس سے حصہ داری کا بھی تقاضا [illegible] کرتا۔

اس نے فوراً شالاجی [illegible] اس [illegible] میں رابطہ کیا اور شالاجی نے بھی راجا تیموز سے دوستی کا [illegible] رکھا اور اس کی مدد کے لیے بہ نفس نفیس خود ہی صادق آباد [illegible] یہاں [illegible] چلا آیا (اگرچہ اس کا ایک مقصد سلیم بھی تھا)۔

اصل بات جب چودھری جی برادران کو معلوم ہوئی تو وسیم کو انہوں نے بتایا کہ سجاد بیگ ان کا حلیف ہے۔ کیونکہ باس اقبال کے مرنے کے بعد سجاد بیگ نے جی برادران سے ناتا نہیں توڑا تھا۔

لہٰذا شالاجی نے وسیم کو تسلی دی کہ وہ اس سلسلے میں اس سے بات کریں گے، وغیرہ۔ تب تک وہ یعنی وسیم انہی کے ٹھکانے اور پناہ میں رہے، سلیم سے یہ سب باتیں چھپی نہیں رہی تھیں کیونکہ یہ بھی انہی کے چرنوں میں تو پڑا ہوا تھا مگر اسے کیا خبر تھی کہ پانچ ٹاپ ایجنٹوں کی حوالگی کے بعد وہ اچانک سے اپنے راتب نواز چودھری جی برادران کے زیر عتاب آجائے گا۔

یہ تھی ساری کہانی جو سلیم نے مجھے سنائی اور جسے سن کر میں کئی ثانیوں تک گم صم ہی رہ گیا تھا۔ اگرچہ سچی بات تو یہی تھی کہ سلیم چھالیا پر میں کم ہی اعتماد کرتا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے ہم دونوں قریب آگئے تھے مگر پھر بھی میں اس سے فاصلہ قائم رکھتا تھا۔ زخمی ہونے کے بعد میں اسے جوجی کے ٹھکانے پر بھی لے جاچکا تھا پھر صحت یابی کے بعد میں نے اسے چلتا کردیا تھا۔

یوں وہ بدستور میری دوستی کا دم بھرتا رہا جس کی وجہ اس کی سچائی ہو یا پھر راحیلہ۔ مجھے بہرحال سلیم میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ راحیلہ کا اس بارے میں کیا خیال تھا، اس کا مجھے سرِدست کوئی اندازہ نہیں ہوسکا تھا اب تک۔

ہاں، اب جو باتیں اس نے میرے گوش گزار کی تھیں، وہ غلط نہیں تھیں کیونکہ مجھے بھی پیش آمدہ حالات کے سبب ان سب باتوں کا ادراک بہرحال تھا۔

"کیا سوچنے لگے؟" مجھے کچھ سوچتا پاکر سلیم نے کہا۔ "اگر تمہیں میری باتوں پر اب بھی بھروسا نہیں ہے تو چلو ابھی میرے ساتھ، ثبوت کے طور پر میں تمہیں دراب جی کے ٹھکانے پر لیے چلتا ہوں۔ وہ وہیں پر موجود......"

"میرے لیے اب وسیم فی الحال اہم نہیں رہا ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر سوچنے کے انداز میں کہا۔

"کیا مطلب؟" سلیم سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ "ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ...... اوہ...... سمجھا۔" وہ رکا۔ "میرا خیال ہے اب تمہارے لیے سجاد بیگ اہم ہوگیا ہوگا؟"

"تمہارے خیال میں سجاد بیگ اب کہاں ہوگا؟ کہیں وہ مجسمہ وسیم سے ہتھیانے کے بعد کراچی تو نہیں دفع ہوگیا؟"

"پاگل ہوتم۔" سلیم ہنسا۔ "اتنی بھاری اور اہم شے وہ اتنی آسانی سے اور اتنی جلدی کراچی نہیں لے جاسکتا۔ یوں بھی میرے خیال میں اس نے جو ڈیلنگ کرنا ہوگی، اسی شہر سے [illegible] کی کوشش کرے گا۔"

"[illegible] وہ اس وقت ہے کہاں؟"

"یہ اہم [illegible] ہے۔" وہ سوچنے کے انداز میں بولا۔ "میرا خیال ہے یہ جی برادران ہی بتاسکتے ہیں۔"

"وسیم کیا ابھی تک [illegible] کے ٹھکانے پر چھپا بیٹھا ہے، یعنی پناہ میں ہے؟" میں نے کسی خیال کے تحت سوال کیا۔

"ہاں۔" سلیم کا جواب اثبات میں تھا۔ "پناہ میں بھی اور چونکہ شالاجی نے وسیم سے وعدہ کیا تھا کہ [illegible] بیگ کو ادھر ہی بلا کر دونوں کے آمنے سامنے بات کرے گا۔"

"سجاد بیگ مجسمے سے صاف مکر جائے گا۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"یہ بات بھی تمہاری غلط نہیں ہے۔"

"میرا خیال ہے پھر ان کے ٹھکانے کی ریکی کرنا ہوگی۔ سجاد بیگ ملا تو اسے یرغمال بنا کر استاد جوجی کے ٹھکانے پر لے جانا پڑے گا۔ وہاں ڈارک روم میں پرویز اس کے منہ سے مجسمے کے بارے میں بہ آسانی اگلوالے گا۔"

میری بات سن کر سلیم حیرت سے منہ کھولے میرا چہرہ تکنے لگا۔

"کیا ہوا، ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"کک..... کیا تم اب سجاد بیگ سے بھی ٹکر لو گے؟"

"کیوں.....؟ میں کیا ڈرتا ہوں اس سے۔" میں نے اسے گھورا۔ "میں تو کبھی اس تنظیم کے بانی اور اصل سربراہ باس اقبال سے نہیں ڈرا۔"

"یہ بات نہیں تھی۔" وہ بولا۔ "اپنے دشمن مت بناؤ بلکہ کوئی چال چلو۔ اگر سجاد بیگ کو فون کر کے اس سے [illegible] ٹنگ پر بات کی جائے، خواہ کسی گمنام تنظیم کے رکن کی حیثیت سے ہی سہی تو ممکن ہے تمہیں کامیابی ہو۔" میں نے غور کر [illegible] میں اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ بات اس کی [illegible] اس طرح کے بلف میں پہلے بھی، کم سہی مگر کامیابی سے [illegible] رہ چکا [illegible]

"لیکن ہمیں اس کا رابطہ [illegible] سے اور کیسے ملے گا؟"

"کیا تم بگ باس اقبال [illegible] والے بنگلے کو بھول گئے؟" سلیم نے اچانک جیسے [illegible] یاد دلاتے ہوئے کہا۔

"کیا.....؟ وہ..... بنگلا تو نگہت کی ملکیت [illegible]" میں نے حیرت سے چونک کر کہا۔ "کہیں اس بدبخت سجاد بیگ نے زبردستی وہاں قبضہ تو نہیں جمالیا؟ میرا تو اسی لیے اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔"

"نگہت اب تمہارے ساتھ ہے اور تمہیں معلوم ہی نہیں ہے کہ سجاد بیگ نے کورٹ میں کیس کر کے اس بنگلے کو اپنی ملکیت ڈکلیئر کر لیا ہے۔" سلیم نے جیسے ایک انکشاف کیا۔

"کمال ہے، اتنی بڑی بات نگہت نے مجھ سے کیوں چھپائی اب تک؟" کہتے ہوئے میں نے پرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ "تب تو پھر سجاد بیگ کو وہیں دیکھنا ہوگا ہمیں۔ ابھی چلو۔"

سلیم نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور میرے پیچھے سوار ہو گیا۔ میں نے بائیک آگے بڑھا دی۔

سرد شام جھکنے لگی تھی۔ ٹھنڈ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ جموں کی طرف سے آنے والی کاٹ دار ہوا خون کو برفاب بنائے دے رہی تھی۔ ہم نے اسی مناسبت سے گرم لباس زیب تن کر رکھا تھا۔

میں بائیک کو آندھی طوفان کی طرح اڑاتا ہوا اقبال چوک سے ایک موڑ کاٹ کر مطلوبہ بنگلے والے راستے پر آگیا۔ میرے دائیں جانب بنگلوں اور پختہ مکانوں کی قطار تھی اور بائیں جانب سڑک۔ اس سڑک کو چھوڑ کر میں دوسری سڑک پر آیا اور ایک ریسٹورنٹ کی پارکنگ پر بائیک کھڑی کی۔ اس کے ہینڈل پر ہیلمٹ لاک کیا اور ہینڈل کو بھی، اس کے بعد ہم دونوں پیدل چلتے ہوئے اس گلی میں گھوم گئے جو سیدھی بنگلے کے فرنٹ پر ختم ہوتی تھی۔

بنگلے کے باہر سناٹا تھا۔ گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے ذرا آگے گئے تو گیٹ پر بڑا سا تالا ہمارا منہ چڑا رہا تھا۔

"یہاں تو کوئی نہیں۔" میرے منہ سے جیسے خود کلامیہ بڑبڑاہٹ برآمد ہوئی۔ سلیم کچھ سوچنے لگا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ مردود چودھری جی برادران کے ٹھکانے پر گیا ہو؟"

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا لیکن اس سے پہلے ہمیں قریبی پی سی او سے بنگلے پر فون تو کھڑکا لینا چاہیے۔ کیا خبر اندر کوئی ہو۔ فریب کاری کے لیے باہر تالا لگایا گیا ہو۔"

"اگر ایسا ہے بھی تو پھر بھلا اندر موجود کوئی شخص ہمارا فون ہی کیوں اٹینڈ کرے گا؟" میں نے توجیہہ پیش کی۔

"فون کسی کا بھی ہو سکتا ہے۔ اندر موجود کوئی ہوگا تو فون ضرور اٹھائے گا۔" سلیم نے پرخیال لہجے میں کہا۔

ہم قریبی پی سی او گئے۔ سلیم نے ہی نمبر ڈائل کیا اور ریسیور کان سے لگا لیا۔ کسٹمر کے لیے لیڈیز اور جینٹس کے الگ الگ بوتھ بنے ہوئے تھے۔ میں بھی سلیم کے ساتھ اندر ہی موجود تھا۔ اس نے آواز بدل کر کسی فرضی نام سے بات کرنا تھی۔

میں [illegible] نظروں سے سلیم کے چہرے کی طرف تکتا رہا۔ اس نے دو ایک بار نمبر ڈائل کیے مگر دوسری جانب سے کسی نے بھی فون نہیں اٹھایا۔

ہم باہر آگئے۔ سلیم نے [illegible] دیا کہ قریبی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر انتظار کر لیتے ہیں۔ وہاں [illegible] پر بھی بہ آسانی نگاہ رکھ سکیں گے لیکن میرے نزدیک [illegible] اندھا جوا کھیلنے کے مترادف تھا اور وقت کا زیاں الگ تھا۔

"ہمیں چودھری جی برادران کے ٹھکانے [illegible] کرنا چاہیے۔ شاید سجاد بیگ وہیں ہو۔" میری بات پر [illegible] پریشان نظر آنے لگا۔ کیونکہ وہ ان کے چنگل سے بچ [illegible] میری وجہ سے اب دوبارہ ان کے شکنجے میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ لہٰذا اسے خاموش پا کر میں نے کہا۔

"تم ایسا کرو، استاد جو جی کے ٹھکانے کا رخ کرو۔ میں خود جی برادران کے نالا ڈیک والے ٹھکانے کی طرف نکلتا ہوں۔"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "میں بھی

تمہارے ساتھ جاؤں گا۔"

میں نے کندھے اُچکائے۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں ایک بار پھر بائیک پر سوار تھے۔

نالا ڈیک والی سڑک کے قدرے مضافاتی علاقے میں پہنچ کر ہم اپنے گردوپیش سے بہت محتاط ہو گئے مگر مطلوبہ ٹھکانے تک پہنچتے پہنچتے ہمیں کوئی مشکوک شخص نظر نہ آیا۔

سلیم نے چلتے ہوئے مفلر میں اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا جو میں نے ہی اتار کر سردی کی وجہ سے اسے دیا تھا، جبکہ خود میں نے بھی اپنی لیدر کی جیکٹ کے کالر کھڑے کر رکھے تھے۔

اس وقت ہم بری طرح چونکے جب وہاں بھی تالا لگا پایا۔

"یہ کیا معاملہ ہے؟ دونوں ہی اپنے اپنے ٹھکانوں پر موجود نہیں [illegible] تو گئے کہاں؟ کیا یہ لوگ تنہا ہیں یا پھر ایک ساتھ؟" میں نے [illegible] انداز میں کہا اور ہونٹ بھینچ لیے۔

"لگتا ایسا [illegible] کسی خاص جگہ پر میٹنگ میں مصروف ہیں۔" سلیم نے خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں تو ان کے یہاں اور بھی ٹھکانے معلوم ہوں گے۔ کہاں ہو سکتے ہیں یہ لوگ؟" میں نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ سوچنے لگا پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

"میں ان کے صرف اسی ٹھکانے سے واقف ہوں اور میرا نہیں خیال کہ ان کا کوئی اور اس شہر میں ٹھکانا ہوگا، یار دوستوں کی الگ بات ہے۔"

"یار، دوست! کیا مطلب؟ وہ کون ہیں، کیا تم جانتے ہو انہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے سر کو نفی میں جنبش دی۔ "یونہی ایک عام سا اندازہ تھا میرا۔"

میں نے ایک ہنکاری خارج کی اور بولا۔ "ٹھیک ہے سلیم! تم استاد جوجی کے ٹھکانے پر لوٹ جاؤ۔" وہ چونک کر میرا چہرہ تکنے لگا پھر پوچھا۔

"تم کدھر چلے اب؟"

"مجھے سجاد بیگ اور وسیم کو تلاش کرنا ہے۔ مجھے بومبورگا کا مجسمہ ہر صورت میں ان سے چھیننا ہے۔"

"بومبورگا کا مجسمہ تمہارے سر پر سوار ہو گیا ہے۔ بھاڑ میں ڈالو اسے یار! چلو، دونوں واپس چلتے ہیں۔" سلیم نے کہا۔

"تم نہیں جانتے بومبورگا کی اہمیت؟" میں نے اسے سوالیہ نظروں سے گھورا۔

"جانتا ہوں، تم نے ہی تو بتایا تھا۔" وہ بولا۔ "مگر یہ اونچے لیول کا معاملہ ہے، چھوڑو اسے۔ ہمیں کیا، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اب چھوڑو سب کچھ، بہت ہو گیا۔ سب واپس لوٹ چلتے ہیں کراچی۔ تم، بھابی فوزیہ میں اور راحیلہ۔"

"یہ ملک کی سلامتی کا معاملہ ہے سلیم!" میں نے مضبوط لہجے میں ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔ "بومبورگا کے مجسمے سے مجھے بھی کبھی دلچسپی نہیں رہی ہے۔ وہ میرے لیے ہمیشہ سے ہی منحوس ثابت ہوتا رہا ہے لیکن جب سے میں نے اس کی اصلیت جانی ہے اور اس کے پس پردہ ان تلخ حقائق کا پردہ چاک ہوا ہے، اس نے مجھے ایک عظیم فرض کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھ دیا ہے۔" میں جیسے ایک عزم سے کہتا چلا گیا۔

"ملک دشمن عناصر اس مجسمے کو پگھلا کر اس کے جوہر سے ایسے خطرناک کیمیائی اور ایٹمی ہتھیار بنانے کا ہولناک منصوبہ تیار کر رہے ہیں، جس کے سبب وہ وطنِ عزیز سمیت تمام اسلامی ممالک کو نقصان پہنچا سکتے ہیں بلکہ پوری عالمِ انسانیت بھی ان کے تباہ کن منصوبے کی زد میں آ سکتی ہے۔ شاید خدا نے اس عظیم ذمے داری کو بہ احسن و خوبی نبھانے کے لیے میرا ہی انتخاب کیا ہو۔ اسی لیے تو سب سے پہلے مجھ پر اس بھیانک حقیقت کا انکشاف ہوا ہے، ورنہ تو اس کے لیے بنگلا دیش کی دو عظیم خواتین نے بھی اپنی جان قربان کر ڈالی۔ میں ان کی صورتیں کیسے بھلا دوں، مرتے وقت جن کی آنکھوں میں امیدیں اور حسرتیں تھیں۔" کہتے ہوئے میری نظروں کے سامنے مائرہ مانجی کا معصوم چہرہ گردش کرنے لگا۔ جوشِ عزم تلے میری آواز مرتعش ہونے لگی تھی۔ سلیم متحیرانہ انداز میں میرا چہرہ تکتا رہا۔

"[illegible] سے کہہ رہا ہوں سلیم......! یہ تمہاری لائن نہیں۔ تم اگر کراچی [illegible] چاہتے ہو تو چلے جاؤ، تمہاری مرضی۔" کہتے ہوئے [illegible] اس طرف کی راہ لی جدھر ہم نے بائیک کھڑی کی تھی۔

سلیم بھی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا میرے عقب میں آنے لگا۔ بائیک کے قریب پہنچ کر میں نے اسے سائڈ اسٹینڈ سے ہٹایا اور سوار ہوا تو سلیم نے میرے [illegible] پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

وہ ابھی میرے پیچھے سوار نہیں ہوا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ بھی اب انتہائی سنجیدہ ہو رہا تھا۔ اسی لہجے میں بولا۔

"سہراب! تم ہمیشہ سے ہی خوش قسمت رہے ہو۔ کاش! میں سلیم سے سلیم چھالیا نہ بنتا...... راجو، راجو بوری نہ بنتا...... ماجد، ماجا نہ بنتا، تمہیں بھی لبو بنایا گیا مگر تم نے سہراب بنا ہی گوارا کیا۔ میں وہ وقت نہیں بھولتا جب ہم کراچی میں پاس

اقبال کی جرائم پیشہ تنظیم کے رکن بنا دیے گئے تھے اور ہمیں سیٹھ سکندر کی فیکٹری کو بھتا نہ ملنے پر آگ لگانے کا حکم ملا تھا لیکن تم پیچھے ہٹ گئے۔ تم نے خود کو سہراب ہی رہنے دیا، سہراب لبونہ بنایا۔ اپنی عاقبت ہی سنوارتے رہے جبکہ میں کیا بن گیا۔ مجرمانہ زندگی نے مجھے کیا دیا؟ دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہوا اور آخرت بھی خراب کی۔ یار! اب تو مجھے تھوڑا اسنوار لینے دے خود کو، تجھے بھی ثواب مل جائے گا۔"

"کہنا کیا چاہتا ہے تو؟" میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"یہی کہ مجھے اپنے اس نیک مقصد میں شامل رکھ۔ میں بھی اپنی عاقبت کمالوں یار! اللہ پتا نہیں کس بات پر مجھ سے خوش ہو جائے اور میری اب تک کی مجرمانہ زندگی کو بخش دے۔ میرا وعدہ ہے سائے کی طرح تیرے ساتھ رہوں گا، کبھی دھوکا نہیں دوں گا۔"

"یہ تو وقت بتائے گا۔" میں نے اس کی باتوں سے متاثر ہوئے بغیر کہا۔ "میں جانتا ہوں تو اتنا پارسا کیوں بن رہا ہے مگر دیکھ، تیرے دل میں اس کے بدلے میں کوئی لالچ ہے نا تو وہ نکال دے۔"

وہ میرا اشارہ سمجھ کر یکدم بدک گیا۔ لمحہ بھر کو اس کا چہرہ میرے طنز پر سرخ ہوا لیکن پھر سر جھٹک کر پھیکے انداز میں مسکرا دیا، بولا۔ "بہت کمینہ ہے تو۔ ابھی تک تو مجھ پر بھروسا نہیں کر رہا۔ تیری خاطر ہی تو میں آج چودھری جی برادران کے زیرِعتاب آیا تھا۔"

"میری خاطر......؟" میں نے اسے گھورا۔

"تو اور کیا۔ نہ تو اس روز اچانک نکے چودھری کے ٹھکانے پر آن ٹپکتا، نہ ہی ان پناہ گزین را اور موساد کے پانچ ایجنٹوں سے تیری مڈبھیڑ ہوتی اور نہ ہی وہ تیری مہم جوئی کے بعد گرفتار ہوتے۔ اس کا سارا نزلہ جی برادران نے مجھ پر اتارا کہ میں نے ہی جان بوجھ کر تیری دوستی کی خاطر یہ حرکت کی تھی۔"

میں خاموش رہا۔ وہ پھر بولا۔ "دیکھ، یہ ٹھیک ہے کہ مجھے راحیلہ سے بے حد محبت ہے۔ میں شاید کبھی تجھے اپنے دل کا حال نہ بتاتا مگر حقیقت یہی ہے میرے بچپن کے یار کہ راحیلہ کو تو میں اسی دن سے ہی پسند کرنے لگا تھا، جب ہم کراچی کے اس گندے سندے غریب سے محلے میں رہتے تھے۔ خیر، میں واقعی اب سدھرنے کی راہ پر گامزن ہوں۔ راحیلہ کا لالچ نہیں مجھے۔ یہ میرے اپنے ضمیر کی بات ہے۔"

مجھے اس کی باتوں سے آج پہلی بار سچائی کی بو آتی محسوس ہوئی تھی۔ تاہم میں نے زیادہ بات نہ کی اور بائیک کو کک مار کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

ایک بار پھر ہماری بائیک سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی۔ اب ہمارا رخ وسیم کی رہائش گاہ گرین سٹی کی طرف تھا۔ وہاں گل ہاؤس میں اس کے عالیشان بنگلے میں گھات لگانے کا میرا منصوبہ تھا۔ اس کے سوا میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں بچا تھا۔

شام کے دراز ہوتے سائے اب رات کی تاریکی میں ڈھلنے لگے تھے کہ اچانک سلیم نے پیچھے بیٹھے بیٹھے میرے کان میں سرسراتی سی سرگوشی کی۔ اگرچہ میں نے ہیلمٹ پہنا ہوا تھا بہر حال آواز تو مجھے سنائی دے گئی تھی۔

"مشتری ہوشیار باش!"

"کیا ہوا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"ہمارا تعاقب ہو رہا ہے۔" اس نے ایک سنسناتا ہوا انکشاف کیا۔ میں نے فوراً ہیلمٹ کے شفاف وائزر سے ہینڈل پر لگے عقبی منظر دکھانے والے آئینے پر نگاہ ڈالی۔ عقب میں بہت سی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس نظر آ رہی تھیں۔ میں نے کہا۔ "پیچھے تو بہت سی گاڑیاں ہیں، تمہیں کیسے شک ہوا؟"

"کسی ویران سی ذیلی سڑک میں بائیک گھما کر دیکھ لے۔" اس نے بے پروا انداز میں کہا۔ "ہم جیسے ہی روانہ ہوئے تھے، وہ سیاہ رنگ کی سیڈان ہمارے پیچھے لگ گئی تھی۔ میرا یقین کرنے کے بعد ہی میں نے کہا ہے۔"

میں اس کی بات جھٹلا نہیں سکتا تھا اور اس کی ہدایت کے مطابق بائیک ایک تنگ سی ذیلی سڑک پر موڑ لی، جو آگے مختصر سے رہائشی علاقے کے درمیان سے گزر کر میدانی جنگل میں داخل ہونے کے بعد دوبارہ گھوم کر ایک نالا کی طرف مڑ جاتی تھی۔

یہاں میں نے بائیک سلو کر لی۔ بیک ویو مرر پر میں دیکھتا رہا۔ سلیم نے غلط نہیں کہا تھا کیونکہ ذرا دیر بعد ہی میں نے ایک کار کی ہیڈ لائٹس کو اسی سڑک پر مڑتے دیکھا۔ یہ سیاہ رنگ کی ہی سیڈان تھی۔

"اب کیا کرنا ہے؟" سلیم نے سرسراتی سرگوشی میں کہا۔ اس کے لہجے سے کسی ڈر یا خوف کا شائبہ تک نہ تھا کیونکہ وہ بھی میری طرح پرانا کھلاڑی تھا۔

"آنے دو انہیں اور تم ذرا محتاط رہنا۔" کہتے ہوئے میں نے ایک ہاتھ سے بائیک کا ہینڈل پکڑے رکھا اور دوسرا جیکٹ کی کھلی زپ سے اندر ڈال کے پستول نکال لیا۔

"یہ سنبھال لو، کسی قسم کا خطرہ محسوس کرتے ہی فائر جھونک دینا۔"

اس نے فوراً پستول میرے ہاتھ سے لے لیا۔ میں نے بائیک کی رفتار کو بدستور دھیمے رکھا اور نظریں بیک ویو کا جائزہ لیتی رہیں۔ اس طرف سڑک سنسان تھی، روڈ لائٹ نہیں تھی۔ اریب قریب کے آباد پختہ مکانوں سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔

میری تھکی ہوئی سماعتوں نے یکدم عقب میں آتی کار کے انجن کو زور سے غراتے سنا۔ متعاقبین نے مڑتے ہی کار کی رفتار کو یکدم ''ایکسلریٹ'' کر دیا تھا۔ کار ہمیں تیزی سے اوور[illegible] کرتی ہوئی اچانک تھوڑا آگے جا کر سڑک کے بیچوں [illegible] کر رک گئی۔

[illegible] تیزی سے دھڑکنے لگا۔ سلیم محتاط ہو گیا۔ کار کے دونوں [illegible] دروازے کھلے اور میں نے تین سیاہ پوشوں کو اتر[illegible] تھے۔ صاف ظاہر ہوا کہ ان کے عزائم ٹھیک نہیں [illegible]۔

میں نے یکدم بائیک [illegible] گھروں کی طرف موڑ لی۔ انہوں نے ہم پر فائر [illegible] جس کی ہمیں پوری امید تھی۔ اسی باعث میں نے بائیک [illegible] تے ہی ایک تو اس کی رفتار یکایک تیز کر دی تھی [illegible] اسے زگ زیگ انداز میں دوڑانے لگا۔

گھروں کے درمیان سے بائیک دوڑاتا ہوا [illegible] دوسری گلی میں مڑا اور ایک میدانی سی جگہ میں بائیک روک لی۔ ہم دونوں بجلی کی سی تیزی سے اتر کر دائیں بائیں سرک گئے۔

ذرا ہی دیر بعد وہی کار قریب آتی دکھائی دی۔ اس کی رفتار اب دھیمی تھی۔ گھروں کے مکین سردی کے سبب اندر گرم بستروں میں دبکے ہوئے تھے، یوں بھی یہ شہر سے دور کا علاقہ تھا اور آبادی بھی مختصر تھی۔ مکان بھی ایک دوسرے سے بہت دور دور بنے ہوئے تھے۔

اس طرف جھاڑیوں اور درختوں کی بہتات سی تھی۔ درمیانی راستہ چھوڑ کر ہم اس کے دونوں کناروں پر واقع درختوں کے عقب میں جا چھپے۔ میرا پستول سلیم کے پاس ہی رہ گیا تھا اور میں اب نہتا تھا۔

کار کسی سانپ کی طرح رینگنے کے انداز میں چلتی ہوئی عین سڑک کے بیچ کھڑی ہو گئی۔ میرا دل اتھل پتھل کا شکار رہا، وجہ یہی تھی کہ انہیں یہاں کہیں ہماری موجودگی کا یقین کی حد تک شبہ ہو چکا تھا۔

میں بھی دم سادھے تنے کے پیچھے چھپا انہیں دیکھتا رہا۔ میری پہلی کوشش انہیں پہچاننے کی تھی کیونکہ ہمارے تعاقب اور ہم پر فائر جھونکنے کا مطلب یہ ہمارے دشمن ہی ہو سکتے تھے...... مگر کون؟

سلیم بھی دوسری سمت دبکا رہا۔ غالباً میری طرح پہلے وہ بھی انہیں پہچاننے کی کوشش میں تھا۔ گاڑی رکتے ہی اس کے اندر سے دوبارہ وہی تین مسلح افراد اترے۔ وہ سیاہ پوش تھے، سرتاپا۔ اسی لیے انہیں پہچان لیے جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

تینوں کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ اب خالی نظر آ رہی تھی جس کا مطلب تھا صرف یہی تین کار سوار تھے۔ ان میں سے ایک تو دوسری سمت کو محتاط روی سے بڑھنے لگا، جدھر سلیم چھپا بیٹھا تھا جبکہ باقی دو میری جانب بڑھنے لگے۔

میں متحیر رہ گیا تھا ان کی اس حرکت سے، کیونکہ ہماری موجودگی کی ٹھیک ٹھیک سمت بتا رہی تھی کہ یہ لوگ کوئی معمولی آدمی نہیں تھے۔ تو پھر کون تھے؟

یہی سوال آنکڑے کی طرح میرے حلق میں اٹک کر رہ گیا۔

اچانک میں نے دیکھا، دوسری جانب پلٹنے والے سیاہ پوش پر کسی نے حملہ کر دیا تھا۔ وہ سلیم ہی ہو سکتا تھا مگر اگلے ہی لمحے مجھے سلیم کی کراہتی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔

اس سیاہ پوش نے اسے پلک جھپکتے ہی اور نہ جانے کیسے [illegible] بس کر دیا تھا۔ میں اپنی جانب آنے والوں سے محتاط ہو [illegible] یا۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ یہ لوگ معمولی دشمن نہیں لگتے [illegible] ان دونوں نے مڑ کر یہ دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی تھی کہ ان [illegible] ایک [illegible] نے سلیم کو بے بس کر ڈالا تھا۔

وہ دونوں [illegible] ت آنے لگے۔ پستول ان کے ہاتھوں میں دبے ہو [illegible] یکلخت میرے اعصاب تن گئے اور میں نے سانپ [illegible] رینگ کر اپنی جگہ چھوڑ دی۔ پھر جیسے ہی ایک سیاہ پوش [illegible] کو بڑھا، میں نے اس کے دوسرے ساتھی پر جست لگا [illegible]

میں اسے رگیدتا ہوا زمین پر آ رہا لیکن مجھے دوسرا حملہ کرنے کا ایک ذرا سا موقع تک نہ مل سکا کیونکہ اگلے ہی لمحے اس مردار نے جانے کون سا داؤ کھیلا تھا کہ تڑپ کر میری گرفت سے نکلا اور پستول کے ٹھوس آہنی دستے سے میری کنپٹی پر وار کر دیا۔

مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

**معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں**

"تو تمہارا کہنا ہے کہ سر جمشید شرابی ہو کر دسویں منزل سے نیچے گرے اور ان کی موت واقع ہوگئی؟" انسپکٹر مارٹ نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔
سنڈرس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "جی ہاں، اس سے پہلے وہ فلیٹ کی سیڑھیوں سے نیچے گرے تھے اور ان کی پاؤں کی ہڈی ٹوٹتے ٹوٹتے بچی تھی۔ تب انہیں ایک مہینا اسپتال میں ایڈمٹ رہنا پڑا تھا اور جب صحت مند ہو کر فلیٹ واپس آئے تو یہ سانحہ رونما ہوگیا۔"

# چارۂ کار

**عمران قریشی**

**آنکھیں بہت بڑی نعمت ہیں... ان کے بغیر انسانی وجود ادھورا ہے... بینائی سے محرومی زندگی میں کسی دوسرے کی محتاجی کا سبب بنتی ہے۔ وہ بھی نابینا تھی... مگر نہایت حسین... حسن کی بدولت ہی وہ امیر شخص کی بیوی بنی... مگر اس کے مرنے کے بعد وہ تہی دست رہتی یا مالدار ہو جاتی... یہ تو آنے والا وقت ہی بتاتا۔**

**دولت کے لالچ میں جرم کرنے والی نابینا لڑکی کی مایوسی**



”فلیٹ کس کے نام ہے؟ میرے خیال میں تمہاری شادی کو تو صرف چھ ماہ ہی ہوئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے تمہارے نام کردیا ہو؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”مجھے کچھ نہیں معلوم۔ اگر کر بھی دیا ہے تو مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میری آنکھیں نہیں ہیں، میں بیڈ سے اتر کر کچن تک نہیں جاسکتی ہوں۔ کھانا کھانے کے لیے بھی مجھے کسی کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔“ سندس نے کاندھے اُچکائے۔

”آپ پیدائشی نابینا ہیں یا پھر کسی حادثے کے دوران آنکھیں چلی گئیں؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”میں پیدائشی اندھی ہوں۔ یہ پہلا دکھ بھرا پہاڑ تھا جو میرے سر پر ٹوٹا۔ ماں باپ کی وفات کے بعد مجھے یتیم خانے بھجوادیا گیا۔ میں نے تمام بچپن وہاں گزارا، جوانی بھی وہیں گزر جاتی اگر جمشید مجھ سے شادی نہ کرلیتے۔ وہ میرے محسن ہیں اور مجھے ان کی موت کا بہت افسوس ہے۔“ سندس نے افسردہ لہجے میں بتایا۔

”انہوں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ تم بہت خوبصورت ہو، کوئی بھی تم سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوسکتا تھا لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہورہی ہے کہ تم شادی کے لیے آمادہ کیسے ہوگئیں۔ وہ تم سے عمر میں تیس سال بڑے تو ضرور ہوں گے۔“ انسپکٹر نے اس کے سراپا کا جائزہ لیا۔

”اگر وہ میرے ہم عمر بھی ہوتے تو شاید مجھے خاص فرق نہیں پڑتا۔ میں انہیں دیکھ نہیں سکتی تھی۔ وہ میرے لیے ایک ہیولے کے مانند تھے جس کا وجود تو تھا لیکن خدوخال واضح نہیں تھے اس لیے عمر میرے لیے بے معنی تھی۔“ سندس بولی۔

”میرے خیال میں سر جمشید کی موت کے بعد ان کی تمام جائداد تمہارے نام منتقل ہوجائے گی پھر نوکروں کی فوج کے درمیان تم کسی شہزادی کی طرح عیش کروگی اور تمہیں کچھ بھی کرنا نہیں پڑے گا۔“ انسپکٹر مدعے پر آتے ہوئے بولا۔

سندس نے انکار میں سر ہلایا۔ ”نہیں۔ شاید میں واپس یتیم خانے چلی جاؤں گی۔ مجھے معذوری کی وجہ سے جائداد کے بجائے کوئی ذمے داری اٹھانے والا چاہیے۔ یتیم خانے والے مجھے اچھی طرح جانتے ہیں اور وہ مجھے دربدر نہیں ہونے دیں گے۔“

انسپکٹر کا دل پسیج کر رہ گیا اور وہ دلاسا دینے والے لہجے میں بولا۔ ”جب سر جمشید کی دولت تمہارے نام منتقل ہوجائے گی تو ذمے داری اٹھانے والوں کو تم رقم دے کر خرید سکوگی۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ ان کی جائداد کھربوں پر مشتمل ہے۔ جوتے بنانے کی دو فیکٹریاں ہیں جو مختلف شہروں میں واقع ہیں۔ ان سب کی تم اکیلی مالک ہوگی اور ان فیکٹریوں میں جتنے بھی ورکر ہیں، وہ تمہارے احکامات کے پابند ہوں گے۔“

سندس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انسپکٹر دوبارہ بولا۔

”تاہم جب تک تفتیش مکمل نہیں ہوتی، تم جہاں بھی جاؤ گی، ہمیں اس کے متعلق بتا کر جاؤ گی کیونکہ سر جمشید جس ریلنگ سے نیچے گرے ہیں، وہ کافی اونچی ہے اور انہیں وہاں سے گرانے کے لیے کسی کا دھکا دینا ضروری ہے۔ اس وقت تم پر شک کیا جارہا ہے کیونکہ تمام جائداد تمہارے نام منتقل ہونے کا اندیشہ لاحق ہے لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سب معمول کی کارروائی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم بے گناہ ہو۔“

”سر جمشید کی دونوں فیکٹریاں فیض آباد اور جہان آباد میں ہیں۔ میں شاید ان کا معائنہ کرنے کے لیے وہاں جاؤں اس لیے آپ کو پہلے ہی مطلع کیے دیتی ہوں۔ شاید اس میں مجھے دو دن لگ جائیں تاہم میں وقتاً فوقتاً آپ سے بات چیت کرتی رہوں گی۔“ سندس آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔ ”لیکن تم جاؤ گی کیسے؟ جہان آباد اور فیض آباد یہاں سے کافی دور ہیں۔ اگر کہتی ہو تو میں اپنا آدمی سادہ لباس میں تمہارے ساتھ بھجوا دیتا ہوں، وہ تمہاری مدد کرے گا۔“

سندس نے انکار میں سر ہلایا۔ ”نہیں۔ میں جہاز سے وہاں جاؤں گی۔ کارخانے کے عملے کے افراد کو میں جانتی ہوں، وہ مجھے ائرپورٹ پر لینے کے لیے آجائیں گے۔ اس کے بعد آفس لانا اور لے جانا ان کے فرائض میں شامل ہوگا۔“

انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”تو پھر میں چلتا ہوں۔ میں نے اپنا نمبر تمہارے موبائل میں محفوظ کردیا ہے، جب بھی میری ضرورت پڑے، کال کردینا، میں حاضر ہوجاؤں گا۔“ وہ کمرے سے باہر چلا گیا اور سندس نے بے چارگی کے عالم میں اپنا سر صوفے کے ساتھ ٹیک دیا۔

یہ حقیقت تھی کہ سر جمشید نے اس سے شادی اس کی مرضی کو مدِنظر رکھتے ہوئے کی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اس سے تیس سال بڑے تھے لیکن بہرحال اس کے لیے موزوں تھے۔ اس نے جوانی میں قدم رکھنے کے بعد دو دفعہ ٹھوکر

کمائی تھی۔ ایک دفعہ اپنے ہم عمر لڑکے سے جو یتیم خانے میں ہی رہتا تھا لیکن جیسے ہی اس نے ایم اے پاس کیا اور اسے نوکری ملی، تب وہ یتیم خانے کو چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلا گیا۔ دوسرا یتیم خانے کا کلرک تھا۔ وہ تین بچوں کا باپ تھا۔ اس نے سندس کو ہر طرح سے استعمال کیا اور جب سر جمشید نے شادی کرنے کے لیے اس سے بات چیت کی تب کلرک نے اسے انکار کرنے کے لیے کہا اور دھمکی دی کہ اگر اس نے شادی کی تو وہ اپنے اور سندس کے تعلقات کے متعلق سر جمشید کو سب کچھ بتادے گا۔ سندس اس کی دھمکیوں میں آنے والی نہیں تھی اس لیے اس نے بھی جواب میں اسے دھمکی دے دی کہ اگر اس نے سر جمشید کو کچھ بھی بتانے کی کوشش کی تو وہ اپنے ناجائز تعلقات کے متعلق کلرک کی بیوی اور بچوں کو سب کچھ بتادے گی۔ اگر اس کا گھر برباد ہوا تو سندس تباہ ہو گی، وہاں کلرک کا گھر بھی تباہ ہوگا۔ کلرک ڈر کر پیچھے ہٹ گیا اور سندس نے سر جمشید سے شادی کر لی۔

وہ کھرب پتی ہونے کے باوجود بھی بہت اچھے انسان تھے۔ انہوں نے اس کی دیکھ بھال کے لیے بوڑھی عورت رکھ لی جن کا نام مس شیریں تھا۔ وہ ایک ماں کی طرح سندس کو سنبھالتی تھیں۔ سر جمشید انہیں ان کی خدمات کا اچھا خاصا معاوضہ دیتے تھے لیکن ان کی ہلاکت کے بعد مس شیریں فلیٹ پر نہیں آئیں اور سندس تنہا رہ گئی۔

یتیم خانے والے اس کی قسمت پر رشک کرتے تھے لیکن جب سر جمشید ہلاک ہوئے تب انہوں نے افسوس کرنا شروع کر دیا۔ وہ اس پر ترس کھا رہے تھے۔ سر جمشید یتیم خانے کو سالانہ فنڈز دینے کے لیے یتیم خانے آتے تھے اور وہیں ان کی نظر سندس پر پڑی تھی۔ وہ اس کی خوبصورتی دیکھ کر گھائل ہو گئے۔ ان کی عمر اتنی زیادہ بھی نہیں تھی۔ وہ پینتالیس سے پچاس کے لگ بھگ تھے لیکن اچھی خوراک اور ورزش کی وجہ سے چالیس کے قریب دکھائی دیتے تھے اور سندس صرف بیس سال کی تھی۔ عمروں کے اس تضاد کی وجہ سے سر جمشید اس سے بہت محبت کرتے تھے اور وہ ان کے ساتھ بہت خوش تھی۔ اسے اگر کسی بات پر اعتراض تھا تو سر جمشید کی بے تحاشا شراب نوشی کی عادت پر تھا۔ وہ انہیں سمجھاتی بجھاتی تھی لیکن وہ نہیں مانتے تھے اور پھر سندس نے بھی شراب پینا شروع کر دی۔ تاہم وہ کبھی کبھار ویک اینڈ پر ہی پیتی تھی۔

دو دن پہلے اس کے سر میں شدید درد ہوا، تب وہ سر جمشید کے ساتھ شراب نوشی کے لیے فلیٹ کی چھت پر نہ جا سکی اور گولی کھا کر سونے کے لیے لیٹ گئی۔ سر جمشید کیسے دسویں منزل سے نیچے گر کر ہلاک ہوئے، اسے کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا۔ عمارت کے چوکیدار نے اسے فلیٹ میں آ کر جب ان کی ہلاکت کے متعلق بتایا تو وہ صدمے سے بے ہوش ہو گئی۔

اگلے دن سر جمشید کو دفنا دیا گیا۔ اب اگر کھربوں کی جائیداد اس کے نام منتقل ہو جاتی تو اسے اور کسی سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تنہا زندگی گزار سکتی تھی لیکن ابھی تک بہت سی مشکلات درمیان میں حائل تھیں جنہیں حل کرنے کے لیے اسے فیض آباد جانا تھا اور وہ بھی اکیلے۔ اس نے کبھی تنہا سفر نہیں کیا تھا لیکن اب اسے کرنا تھا۔ جب جیب میں تگڑی رقم موجود ہو تو خود اعتمادی پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ وہ تو اب کھرب پتی بننے والی تھی، ساری دنیا اس کے قدموں تلے بچھنے کے لیے تیار تھی۔ اس نے میز پر رکھے ہوئے انٹرکام کو اٹھایا اور دو کا ہندسہ دبا دیا۔ اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا، وہ یہ سب اندازے کے ساتھ کر رہی تھی۔ دوسری جانب ریسپشنسٹ نے کال ریسیو کی اور مؤدبانہ لہجے میں پوچھا۔

”میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”میرا کھانا فلیٹ میں بھجوا دو اور صبح کی فلائٹ میں فیض آباد کے لیے سیٹ بھی مختص کروا دو۔ یہ فرسٹ کلاس کی ہونی چاہیے۔ رقم میں منیجمنٹ کے اکاؤنٹ میں منتقل کروا دوں گی۔“ سندس نے نرم لہجے میں کہا۔

”میں جلد سیٹ مختص کروانے کے بعد آپ کو مطلع کر دوں گا اور کیا کھانے کے ساتھ شراب بھجوا دوں؟ جمشید صاحب ہمیشہ منگواتے تھے۔“ ریسپشنسٹ کی آواز سنائی دی۔

سندس شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ سر جمشید واقعی بوتل منگوایا کرتے تھے۔ وہ رات کو کھانے کے ساتھ پیتے تھے۔

سندس نے انکار کر دیا لیکن پھر کچھ سوچ کر اسے ایک جام بھجوانے کے لیے کہہ دیا۔ اب اسے وہ سب کرنا تھا جو سر جمشید اپنی زندگی میں کیا کرتے تھے۔ وہ کسی کو یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ اپنی معذوری کی وجہ سے پریشان ہے۔ اس لیے اس نے ریسپشنسٹ کو شراب بھجوانے کے لیے کہہ دیا تھا۔ پھر کچھ ہی دیر میں کھانا آ گیا۔ یہ صرف ایک ہی ڈش پر مشتمل تھا کیونکہ اسے دکھائی نہیں دیتا تھا اس لیے وہ مختلف ڈشز میں تمیز نہیں کر سکتی تھی۔ ایک ڈش سامنے ہوتی تھی تب وہ بہ آسانی کھا لیا کرتی تھی۔ یہ اس کی زندگی کی وہ مشکلات تھیں جن کی وہ عادی بن چکی تھی۔ تاہم یہ اچھا ہوا تھا کہ سر جمشید نے مرنے سے کچھ دن قبل اس کے اکاؤنٹ

میں اچھی خاصی رقم منتقل کر دی تھی ورنہ اسے مزید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا کیونکہ سر جمشید کی وفات کے بعد ان کے اکاؤنٹ سے رقم نکالنے کے لیے سندس کو کچھ عرصہ انتظار کرنا پڑتا۔ یہ قانونی کارروائیاں اسے پریشان کر سکتی تھیں لیکن وہ مطمئن تھی۔ اس کے اکاؤنٹ میں تگڑی رقم موجود تھی۔

اس نے خاموشی کے ساتھ کھانا کھایا اور ابھی شراب پینے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھالیا۔ اس کے حواسِ خمسہ عام لوگوں کی نسبت زیادہ طاقتور تھے، وہ آواز سن کر بہ آسانی سمت کا اندازہ لگالیا کرتی تھی۔ اس کی چھٹی حس بھی طاقتور تھی۔ صرف بینائی نہ ہونے کی وجہ سے اسے یہ تمام حسیں خدا کی جانب سے تحفے کے طور پر ملی تھیں اس لیے اس نے بہ آسانی ریسیور اٹھالیا۔ دوسری جانب سے ریسپشنسٹ کی آواز سنائی دی۔ اس نے بتایا کہ [illegible] بجے کی فلائٹ میں اس کی سیٹ ریزرو ہو چکی ہے اور [illegible] مینجمنٹ کی گاڑی کا انتظام کر دیا ہے جو اسے فلیٹ سے [illegible] ایئرپورٹ تک لے جائے گی۔

سندس نے اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد فون بند کر دیا اور شراب کے گھونٹ لینے لگی۔ اس کی زندگی میں پیدا ہونے والے اتار چڑھاؤ نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا اور شراب پینا اس کی کمزوری بن کر رہ گئی تھی۔ اب تو وہ ویسے بھی تنہا تھی، اسے غم غلط کرنے کے لیے اس کی ضرورت تھی۔

وہ گزرے دنوں کو یاد کرنے لگی۔ شادی کے بعد سر جمشید اسے گھمانے کے لیے بیرونِ ملک لے گئے تھے۔ وہ کچھ بھی دیکھ نہیں سکتی تھی لیکن خوشیوں کو محسوس ضرور کر سکتی تھی۔ سر جمشید نے اسے بہت گھمایا پھرایا پھر مایہ ناز ڈاکٹروں سے اس کی آنکھوں کا چیک اپ کرایا لیکن تمام ڈاکٹروں نے اسے لاعلاج قرار دے دیا۔ اس کی بینائی واپس آنا ممکن نہیں تھی اس لیے وہ ایک مہینا وہاں رہ کر واپس آ گئے۔

سندس کی بے نور آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ اس کی خوشیوں بھری ازدواجی زندگی صرف چھ مہینوں پر مشتمل تھی اور پھر نصیب نے اسے غموں کے اندھیروں کی جانب دھکیل دیا تھا۔ اس کے ساتھ تمام زندگی یہی ہوتا رہا تھا اور اب تو وہ اس کی عادی ہو چکی تھی۔ اب اسے یہ سب برا نہیں لگتا تھا کیونکہ وہ سر کو خم کرنا سیکھ گئی تھی۔

شراب پیتے پیتے جب وہ نڈھال ہو گئی تو لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ اپنے بیڈ کی طرف آ گئی۔ اسے سب اندازہ تھا کہ فلیٹ میں کون سی چیز کہاں پڑی ہے اور کون سی اٹھانے کے لیے اسے کچھ دور تک جانا ہے لیکن فلیٹ سے باہر کے متعلق اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا اور اسے معلوم کرنا تھا کیونکہ اب سر جمشید نہیں تھے۔ اسے سب کچھ اکیلے کرنا تھا اور وہ اس کے لیے اپنے اندر خود اعتمادی محسوس کر رہی تھی۔ بستر پر گرتے ہی وہ بے سدھ ہو گئی۔

☆☆☆

صبح سات بجے وہ سو کر اٹھی۔ اس نے غسل کیا اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد ناشتے کے لیے فون کر دیا۔ ریسپشنسٹ نے اسے بتایا کہ آٹھ بجے مینجمنٹ کی گاڑی عمارت کے سامنے آ جائے گی، اس سے پہلے اسے تیار ہونا ہوگا۔ اس نے ریسیور رکھ دیا۔

وہ تیار ہو چکی تھی۔ اس کے تمام کپڑے وارڈروب میں استری کر کے ہینگر پر لٹکے ہوئے تھے۔ اس نے ان میں سے دو کو ایک بیگ میں ڈالا اور ناشتے کا انتظار کرنے لگی۔ فلیٹ کی عمارت کے نیچے مینجمنٹ ریسٹورنٹ تھا اور تمام فلیٹ والوں کو ناشا وہیں سے بھجوایا جاتا تھا۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو آدمی ناشا لیے اندر آ گیا۔ اس نے ناشا میز پر لگا دیا اور سندس ناشا کرنے لگی۔ اس کے دماغ میں کوئی خاص لائحہ عمل نہیں تھا، وہ صرف دونوں فیکٹریوں کا وزٹ کرنا چاہتی تھی تاکہ وہاں کام کرنے والے ورکرز کو معلوم ہو جائے کہ سر جمشید کے بعد اب وہ کرتا دھرتا ہے اور انہیں اب اس کے احکامات کا پابند [illegible] تھا۔

اسے سر جمشید نے [illegible] مون کے دوران ایک جدید اور مخصوص موبائل خرید کر [illegible] نابینا افراد کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس موبائل میں سر جمشید کے علاوہ فیکٹری کے سرکردہ افراد کے نمبر محفوظ تھے۔ اس موبائل [illegible] نمبر ڈائل نہیں کرنا پڑتے تھے۔ وائس میسج کے ذریعے وہ خود نمبر ملا دیتا تھا۔ چونکہ سندس کو عموماً سر جمشید سے بات چیت کرنا ہوتی تھی اور سر جمشید کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ فیصل آباد میں ہیں یا جہان آباد میں ہیں، اس لیے انہوں نے فیکٹری کے [illegible] افراد کے نمبر بھی اس موبائل میں محفوظ کر دیے تھے۔

ناشتا کرنے کے بعد سندس نے فیصل آباد فیکٹری کے منیجر کا نمبر ملایا۔ اس کا نام احمد حبیب تھا، کال اس نے ہی ریسیو کی۔ سندس نے اپنا تعارف کروانے کے بعد اسے اپنی آمد کے متعلق بتا دیا۔ احمد نے اسے خوش آمدید کہا تو سندس نے کال منقطع کر دی۔

اب اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ وہاں جانے کے

بعد بہت کچھ کر سکتی تھی۔ پورے آٹھ بجے کمرے میں رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا تو ریسپشنسٹ نے اسے بتایا کہ عمارت کے کمپاؤنڈ میں گاڑی اس کی منتظر ہے۔ سندس نے ریسیور رکھا اور بیگ اٹھا کر اندازے سے چلتی ہوئی فلیٹ سے باہر آ گئی۔ راہداری کے آخر میں لفٹ موجود تھی۔ وہ جب اس میں داخل ہوئی تو لفٹ بوائے نے اس سے منزل کا نمبر دریافت کیا۔ سندس نے آخری منزل کے متعلق بتایا اور لفٹ نیچے کی جانب سفر کرنے لگی۔ جلد ہی لفٹ نے اسے پہلی منزل پر اتار دیا اور وہ باہر نکل آئی۔ وہاں ریسپشنسٹ اس کا منتظر تھا۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر عمارت کے کمپاؤنڈ میں کھڑی گاڑی کی طرف آ گئی۔ اس نے اسے گاڑی میں بٹھادیا اور گاڑی ایئرپورٹ کی طرف چل دی۔

ابھی وہ کچھ دور ہی گئی تھی کہ اسے موبائل پر کال موصول ہوئی۔ دوسری جانب انسپکٹر حارث تھا۔ اس نے سندس سے روانگی کے متعلق پوچھا تو سندس نے بتایا کہ وہ گاڑی میں ایئرپورٹ کی جانب جارہی ہے اور شاید اس کی واپسی دو دنوں کے بعد ہو۔ انسپکٹر نے اسے جلد واپس آنے کی تلقین کرتے ہوئے موبائل بند کر دیا۔

کچھ دیر بعد وہ ایئرپورٹ پر پہنچنے کے بعد گاڑی سے نیچے اتر آئی۔ کلرک نے اسے گاڑی میں بٹھاتے ہوئے ٹکٹ تھمادیا تھا جسے اس نے ہینڈ بیگ میں رکھ لیا۔ اب اسے ایئرپورٹ والوں میں سے کسی ایسے شخص کا انتخاب کرنا تھا جو اسے اس کی سیٹ پر بٹھادیتا اور یہ کچھ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ وہاں اس کی مدد کرنے والے بہت لوگ موجود تھے جنہوں نے جلد ہی اسے مختصر کارروائی کے بعد اس کی سیٹ پر بٹھادیا اور وہ گھنٹے بھر کے سفر کے بعد فیض آباد ایئرپورٹ پہنچنے میں کامیاب ہوگئی جہاں احمد اس کا منتظر تھا۔ اس نے اسے گاڑی میں بٹھانے کے بعد بتایا کہ سر جمشید جب بھی فیض آباد آتے تھے تو وہ سی ویو ہوٹل کے کمرا نمبر ایک سو پندرہ میں ٹھہرتے تھے۔ یہ کمرا ان کے نام پر مختص ہے۔ سندس نے اسے ہوٹل چلنے کے لیے کہا اور احمد پندرہ منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد اسے ہوٹل میں لے آیا۔

سندس کمرے کو نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن اسے معلوم ہوگیا کہ اس کے لگژری فلیٹ کی طرح کمرا بھی عالیشان ہی ہوگا۔ اس نے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے احمد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ وہ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اسے فون کر کے مطلع کر دے گی کہ فیکٹری کے ورکرز سے میٹنگ کب رکھی جائے گی۔

احمد نے اسے بتایا کہ فیکٹری کے اوقات کار صبح نو بجے سے شام پانچ بجے تک کے ہیں۔ وہ ان اوقات کے دوران کسی بھی وقت میٹنگ رکھ سکتی ہے۔

سندس نے اثبات میں سر ہلایا تو احمد رخصت ہوگیا۔ اس کے جانے کے بعد سندس صوفے پر بیٹھ کر سوچنے لگی۔

'سر جمشید نے اتنی جائداد ہونے کے باوجود بھی فیض آباد میں گھر نہیں لیا۔ اس کے پیچھے کیا وجہ تھی؟ یقیناً دال میں کچھ کالا تو تھا۔' شک اسے پہلے بھی تھا لیکن کوئی قابلِ قبول جواز موجود نہیں تھا تاہم اسے معلومات تو لینا ہی تھیں اس لیے اس نے ہاتھ بڑھا کر انٹرکام تلاش کیا اور نمبر ملا کر ویٹر کو اوپر بھیجنے کے لیے کہا۔ اسے اب بھی خدشہ لاحق تھا کہ کہیں سر جمشید کی جائداد ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ وہ اتنی سہولیات میں بہ آسانی بہت کچھ کر سکتی تھی لیکن اگر یہ سہولیات اس سے چھین لی جاتیں تو وہ اس پرندے کی طرح ہوجاتی جس کے پر اچانک ہی کاٹ دیے گئے ہوں۔

کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا، ویٹر اندر آگیا۔ سندس نے چند لمحے چپ رہنے کے بعد اس سے پوچھا۔

"تم سر جمشید کو اچھی طرح جانتے ہوگے۔ میں ان کی بیٹی ہوں اور ان کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے یہاں آئی ہوں کیونکہ کچھ دن پہلے ان کی موت واقع ہوچکی ہے۔"

سندس کو معلوم تھا کہ ویٹر کے چہرے پر حیرت بھرے تاثرات ابھر آئے ہوں گے جنہیں وہ دیکھ نہیں سکتی تھی لیکن حواسِ خمسہ مضبوط ہونے کی وجہ سے محسوس ضرور کر سکتی تھی۔

بہرحال ویٹر نے کچھ نہیں کہا تو سندس دوبارہ ہمکلام ہوئی۔

"تم مجھے ان کے یہاں رہنے کے دوران کی مصروفیات کے متعلق بتاؤ۔ وہ کہاں جاتے تھے اور ان سے ملنے کے لیے یہاں کون کون آتا تھا؟ مجھے سب کچھ تفصیل کے ساتھ بتاؤ۔"

کچھ دیر تک ویٹر کی آواز سنائی نہیں دی۔ شاید وہ کچھ سوچ رہا تھا پھر دھیمے لہجے میں بولا۔

"میں کچھ زیادہ نہیں جانتا ہوں تاہم اتنا بتا سکتا ہوں کہ ان سے ملنے کے لیے یہاں کوئی نہیں آتا تھا لیکن وہ ہوٹل کی گاڑی میں لارنس روڈ کی کوٹھی نمبر بیالیس ضرور جاتے تھے اور بعض اوقات رات بھی وہیں بسر کیا کرتے تھے۔ چونکہ ہوٹل کی گاڑی میرا چھوٹا بھائی چلاتا ہے اس لیے مجھے اس کے ذریعے معلوم ہوا ہے۔"

سندس نے بیگ میں سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر ویٹر

کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ وہ نوٹوں کو ان کے حجم کے ذریعے جانچ لیتی تھی اور انہیں پرس میں ایک ترتیب کے ساتھ رکھتی تھی اس لیے اسے دشواری محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اگر اسے باہر رہنا تھا تو ان طور طریقوں کو سیکھنا تھا کیونکہ اس کے اردگرد سب شکاری موجود تھے۔

ویٹر نے نوٹ اس کے ہاتھوں سے لے لیا۔ سندس دوبارہ بولی۔ ''میں لارنس روڈ والی کوٹھی تک جانا چاہتی ہوں۔ اپنے بھائی کو بتادو کہ مجھے وہاں لے جانے کے بعد واپس ہوٹل بھی لانا ہے اس لیے اسے وہاں کچھ دیر انتظار کرنا ہوگا۔''

''آپ نے وہاں کب جانا ہے تاکہ میں اپنے بھائی کو اس کے لیے تیار کرلوں؟'' ویٹر کی آواز سنائی دی۔

''ابھی اور اسی وقت۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے، میں کل یہاں سے روانہ ہوجاؤں گی۔'' سندس سنجیدہ لہجے میں بولی۔

ویٹر نے شاید اثبات میں سر ہلایا اور کوئی بھی جواب دیے بغیر کمرے سے باہر چلا گیا۔ سندس صوفے پر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی۔

سرجمشید لارنس روڈ جس سے ملنے کے لیے جارہے تھے، اسے اندازہ تھا کہ وہ کون تھا لیکن وہ تصدیق کرنا چاہتی تھی۔ تاہم اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ سی ویو ہوٹل میں ٹھہرتے تھے۔ بہرحال اسے اگلے دن جہان آباد جانا تھا اور اس سے پہلے فیض آباد کا کام نمٹانا تھا۔

ویٹر جلد ہی واپس آگیا اور اس نے بتایا کہ اس کا بھائی نیچے اس کا منتظر ہے۔ وہ اسے لارنس روڈ لے جائے گا بھی اور واپس بھی لائے گا۔

سندس اس کے ہمراہ ہوٹل سے نیچے آگئی۔ ویٹر نے اسے گاڑی میں بٹھادیا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔ سندس کی سوچیں بہتے پانی کی طرح رواں دواں ہونے لگیں۔ اس کے پاس شاید یہ آخری موقع تھا۔ وہ واپس یتیم خانے نہیں جانا چاہتی تھی اور باہر زندگی گزارنے کے لیے اس کے پاس سہولیات کا ہونا بہت ضروری تھا۔ وہ کافی حد تک مردوں سے مایوس ہوچکی تھی۔ انہوں نے اسے دھوکے کے علاوہ اور کچھ نہیں دیا تھا۔ سرجمشید کی بات علیحدہ تھی۔ انہوں نے اسے دھوکا تو نہیں دیا تھا لیکن اس کی مجبوری سے فائدہ ضرور اٹھایا تھا۔ وہ عمر کے لحاظ سے اس سے بڑے تھے۔ اگر سندس کی آنکھیں ہوتیں تو شاید ان سے کبھی بھی شادی نہ کرتی۔ اس نے سرجمشید کو دیکھا نہیں تھا لیکن یتیم خانے کے اسٹاف کی زبانی اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ انتہائی بدصورت تھے۔ اسے ان کی بدصورتی سے کوئی سروکار نہیں تھا لیکن مجبوری سے فائدہ اٹھانے والی بات قابلِ فہم نہیں تھی۔ اس لیے سندس کو ان سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ان کی حیثیت صرف کھربوں کی جائداد تک محدود تھی لیکن اسے وہ بھی ہاتھوں سے نکلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

گاڑی کی رفتار آہستہ ہونے لگی اور پھر وہ رک گئی۔ اس نے ڈرائیور سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''کوٹھی آگئی؟''

''جی ہاں۔'' ڈرائیور نے بتایا۔ ''اس کا گیٹ بالکل سامنے ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں گھنٹی بجادیتا ہوں۔''

سندس نے اثبات میں سر ہلایا تو ڈرائیور نے گاڑی سے نیچے اتر کر گھنٹی بجادی۔ سندس بھی نیچے اتر آئی۔ کچھ دیر بعد کوٹھی کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ نوکر باہر نکلا۔ ڈرائیور نے اسے بتایا کہ مسز جمشید کوٹھی کے رہائشیوں سے ملنا چاہتی ہیں۔ چونکہ وہ نابینا ہیں اس لیے خود اندر نہیں جاسکتیں، تم ہاتھ تھام کرلے جاؤ۔

نوکر نے اثبات میں سر ہلایا اور سندس کا ہاتھ تھام کر آگے چلنے لگا۔ اسے کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ وہ قریب ہی کہیں بندھا ہوا تھا۔ پھر دو سیڑھیاں چڑھ کر شاید وہ برآمدے میں داخل ہوگئی۔ اس کے بعد برآمدے کے دروازے میں سے ہوکر وہ سٹنگ روم میں آگئی۔ وہاں ایئرکنڈیشن تھا۔ اسے فرحت بخش ٹھنڈک کا احساس ہوا نوکر نے اسے صوفے پر بٹھادیا پھر خود باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ صوفے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی پھر دوبارہ خاموشی طاری ہوگئی۔ تاہم اسے سانس لینے کی ہلکی آواز سنائی دے رہی تھی۔ سٹنگ روم میں جو کوئی بھی تھا، اس کے سراپا کا متجسس نگاہوں سے جائزہ لے رہا تھا۔ اسے اس کی نگاہوں کی تپش اپنے جسم پر محسوس ہورہی تھی۔

پھر سریلی آواز سنائی دی۔ ''تو تم سندس ہو؟ میں تمہاری منتظر تھی بلکہ اگر یوں کہوں تو بے جا نہیں ہوگا کہ مجھے تم سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔''

سندس نے فوراً اندازہ لگالیا کہ آواز کسی جوان عورت کی تھی جس کی عمر پچیس سے تیس کے درمیان تھی اور یہ ممکن تھا کہ وہ اس کی طرح خوبصورت بھی ہو۔

''میرا نام حمیرا ہے اور میں سرجمشید کی دوسری بیوی ہوں۔'' آواز دوبارہ سنائی دی۔

سندس پر اس انکشاف کا رتی برابر بھی اثر نہیں ہوا۔

اسے سر جمشید نے مرنے سے قبل حمیرا کے متعلق بتا دیا تھا۔

حمیرا کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

''میں ایک دفعہ پھر اس بات پر زور دوں گی کہ میں سر جمشید کی دوسری بیوی ہوں اور تم تیسری ہو۔ تو پھر پہلی کون ہے؟ شاید تمہیں اس کے متعلق معلوم نہ ہو، میں تمہیں بتا دیتی ہوں۔ اس کا نام شاہین ہے اور وہ جہان آباد میں رہتی ہے۔ ہم دونوں کی کوئی اولاد نہیں ہے اس لیے چند دن پہلے ہمیں جائداد سے عاق کر دیا گیا ہے۔ وہ اکثر یہاں آیا کرتے تھے۔ ہمارے درمیان کبھی بھی کوئی ان بن نہیں ہوتی، لڑائی جھگڑا تو بہت دور کی بات ہے۔ اس کے باوجود بھی ہمیں صرف اس بات کا [..] کہ ہم انہیں اولاد نہیں دے سکے۔ میری شاہین سے بات [..]تی رہتی ہے۔ سر جمشید کو یہ بات بھی پسند نہیں تھی۔ وہ [..] ہم دونوں مل کر ان کے خلاف کوئی محاذ کھڑا کرنے [..] لیکن ایسی کوئی بھی بات نہیں تھی۔ ہم صرف ایک دوسر[..] دکھ شیئر کرتے تھے۔''

سندس کو خدشہ لاحق ہوا کہ اولاد تو وہ بھی [..] دے سکی تھی تاہم مرنے سے پہلے سر جمشید نے اسے [..] تھا کہ انہوں نے اپنی دونوں بیویوں کو جائداد سے عاق کر دیا ہے اس لیے اسے پوری امید تھی کہ اب جائداد کی مالک بننے سے اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ اسے دوبارہ حمیرا کی آواز سنائی دی۔

''انہیں کہاں دفنایا گیا؟ میں اور شاہین شاید انہیں دیکھنے کے لیے آتے لیکن چند دن پہلے ہونے والی بدمزگی کی وجہ سے ہم نے ارادہ منسوخ کر دیا۔ دراصل ہمارے درمیان سرد مہری کی دیوار بڑھتی چلی جا رہی تھی اور آخر میں اس دیوار نے نفرت کی صورت اختیار کر لی تھی۔''

''سر جمشید کو فلیٹوں کے قریب ہی واقع قبرستان میں دفن کیا گیا ہے اور کل صبح ان کے وکیل نے اطلاع دی کہ انہوں نے چند ماہ قبل وصیت نامہ لکھوا کر اس کے حوالے کیا تھا جنہیں وہ پولیس کی موجودگی میں کھول کر سب کو سنائیں گے۔ میرے یہاں آنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ آپ کل صبح فلیٹ پر آجائیے گا تاکہ آپ کی اور شاہین کی معیت میں وصیت نامے کو پڑھ کر سنایا جائے۔ مجھے امید ہے کہ سب کے حق میں بہتر ہوگا۔'' سندس نے اسے بتایا۔

اسے حمیرا کی طنزیہ آواز سنائی دی۔ ''سب کچھ تمہارے لیے بہتر ہوگا، ہمارے لیے وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ ہمیں جائداد سے عاق کر دیا گیا ہے پھر ہم وہاں آکر بھلا کیا کریں گے۔ ہمیں معلوم ہے کہ سب کچھ تمہارے نام ہو چکا ہے۔'' وہ کچھ دیر کے لیے چپ ہوئی پھر دوبارہ بولی۔

''وہ جب بھی یہاں آتے تھے تو تمہاری تعریفیں کرتے تھے۔ تم انہیں بہت اچھی لگتی تھیں حالانکہ اولاد جیسی نعمت تم بھی انہیں نہیں دے سکی تھیں لیکن وہ تمہاری خوبصورتی کے دیوانے ہو گئے تھے اور اس بات سے شاہین بھی واقف ہے کہ وہ حسن پرست تھے۔''

''ان سب باتوں کے باوجود بھی انہوں نے آپ

## بہ صد مسرت

ایک خاتون نے بیمہ کمپنی کے نام خط تحریر کیا۔

''میں آپ کو بصد مسرت یہ اطلاع دے رہی ہوں کہ میرے وہ شوہر جن کے بارے میں ایک عرصے سے یہ سمجھا جا رہا تھا کہ وہ لاپتا ہیں۔ ان کی موت کی مصدقہ اطلاع آگئی ہے۔ سرٹیفکیٹ ہمراہ منسلک ہے۔''

(مرسلہ: پرویز محمود، چنیوٹ)

## جوتا

یورپ کے معاشرے میں جوتے کو ہرگز وہ حیثیت حاصل نہیں جو ہمارے ہاں ہے۔ وہاں تو بس جوتا پہن لیا جاتا ہے، سردی یا پتھروں سے بچنے کے لیے۔ ہمارے ہاں پہنا جاتا ہے، گانٹھا جاتا ہے، مارا جاتا ہے، کھایا جاتا ہے، چٹخایا جاتا ہے اور دال بانٹنے کے برتن کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ سگھڑ بیبیاں اپنے سرتاجوں اور مجازی خدا کو جوتی کی نوک پر رکھتی ہیں۔ یورپ میں جوتی کی نوک بھی نہیں ہوتی لہٰذا اس سے یہ کام بھی نہیں لیا جاسکتا۔

(ابنِ انشا کی ایک تحریر سے اقتباس)

(مرسلہ: پرویز محمود، چنیوٹ)

## عطاالحق قاسمی کی ''جرم ظریفی'' سے انتخاب

ایک دفعہ روس کے ایک بڑے لیڈر نے چیکو سلوواکیہ کے ایک لیڈر سے [..] پیار بھرے انداز میں پوچھا کہ تم روسیوں کو اپنا دوست [..] بھائی؟

چیک لیڈر نے جواب دیا کہ روسی ہمارے بھائی ہیں کیونکہ دوست تو انسان مرضی سے بناتا ہے۔

(مرسلہ: عمران علی، [..])

دونوں کو طلاق نہیں دی۔ جائیداد سے عاق کرنا ایک علیحدہ بات ہے۔ میرے خیال میں آپ کو اور شاہین کو وصیت نامہ کھولنے کے دوران فلیٹ پر ضرور آنا چاہیے تاکہ معلوم ہو سکے کہ انہوں نے کس کے نام کیا، کیا ہے۔'' سندس دھیمے لہجے میں بولی۔

''اگر ہمیں آنا ہوتا تو ان کے جنازے میں نہ آتے؟ وہ چند دن پہلے سب کچھ ختم کر چکے تھے۔ اگر انہیں زندگی ... تو شاید ہمیں طلاق بھی دے دیتے۔ ہمیں ان کی جائیداد سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ جائیداد تمہیں مبارک ہو۔ ہمارے گھرانے کی حیثیت جمشید کے گھرانے سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔'' حمیرا کی آواز سنائی دی۔

سندس نے مزید بات چیت نہیں کی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دونوں ... تو پھر وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ کچھ دیر ... کے بعد واپس ہوٹل آ گئی۔ اب وہ مطمئن ہو گئی تھی ... سے زیادہ ان آسائشوں کی ضرورت تھی جنہیں خرید کر وہ اپنی زندگی کو آرام دہ بنا سکتی تھی جیسے کہ وہ اس وقت جہاز میں سفر کر کے ... فیض آباد آ گئی تھی۔ اگر اس کے پاس رقم نہ ہوتی ... یتیم خانے میں نہیں تھی تو پھر اس کے لیے باہر نکلنا دشوار ہو جاتا اور اسے کلرک جیسے بلیک میلروں کے مرہون منت ہو کر رہنا پڑتا۔ دوپہر کا کھانا اس نے روم سروس کے ذریعے کمرے میں منگوایا اور کھانے کے بعد انسپکٹر حارث کو فون کیا اور اسے بتایا کہ وہ کل صبح واپس آ رہی ہے اس لیے وکیل کو مطلع کر دیا جائے کہ وہ صبح بارہ بجے اس کے فلیٹ میں وصیت نامے کے ساتھ آ جائے تاکہ اسے کھولنے کے بعد سب کو پڑھ کر سنایا جا سکے کہ سر جمشید نے جائیداد کس کے نام کی ہے۔

''میں وصیت نامہ کھلنے سے پہلے ہی بتا سکتا ہوں کہ تمام جائیداد کی مالک آج سے تم ہو۔ مجھے فلائٹ کے متعلق بتا دینا، میں تمہیں لینے کے لیے ائرپورٹ آ جاؤں گا۔'' اسے انسپکٹر کی آواز سنائی دی۔

سندس نے اسے یقین دلایا کہ وہ ٹکٹ کروانے کے بعد اسے فون کر کے اپنی آمد کے متعلق ضرور بتائے گی۔ اس کے بعد اس نے کال منقطع کر دی اور مسکراتے ہوئے سوچنے لگی۔ دولت عیبوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ اسے مختصر بات چیت کے دوران معلوم ہو گیا تھا کہ انسپکٹر کا جھکاؤ یکلخت اس کی جانب صرف اس لیے ہو گیا تھا کیونکہ وہ کھربوں کی جائیداد کی اکلوتی وارث بننے والی تھی لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ انسپکٹر کس طرح کی شکل و صورت کا مالک تھا۔ آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی عمر پینتیس سے چالیس کے درمیان تھی اور لب و لہجہ مناسب تھا۔ تاہم فطرت کے متعلق وہ قبل از وقت کچھ کہہ نہیں سکتی تھی تاہم ابھی تک اس نے سنجیدگی کے ساتھ انسپکٹر کے متعلق کچھ سوچا نہیں تھا اور یہ وقت اس کے لیے مناسب بھی نہیں تھا۔ ابھی تو اسے جائیداد اپنے نام منتقل کروانی تھی۔

اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ ایاب میں سے بڑی شاہین اور حمیرا کی صورت میں نکل چکی تھی اور اب اسے جائیداد کا مالک بننے سے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ حمیرا اور شاہین کی نسبت سر جمشید اس کے ساتھ زیادہ سنجیدہ تھے۔ مرنے سے قبل انہوں نے بتایا تھا کہ وہ اسے مایوس نہیں کریں گے۔ ہر چند کہ سندس نے ان کی کوئی خدمت نہیں کی تھی لیکن ان کے ہر حکم کے سامنے سر کو خم ضرور کیا تھا اس لیے وہ اس سے کافی حد تک مطمئن تھے جبکہ شاہین اور حمیرا ہمیشہ ان کی نہ صرف حکم عدولی کرتی تھیں بلکہ منہ ماری بھی کیا کرتی تھیں۔

بہرحال سندس نے جہان آباد جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس نے فون کر کے احمد کو واپسی کی اطلاع دے دی۔ میٹنگ کے متعلق اس نے جلد بتانے کا کہہ کر موبائل بند کر دیا۔ ... شاہین سے ملنا ضروری نہیں تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ حمیرا کی طرح وہ بھی فلیٹ پر آنے سے انکار کر دے گی اس لیے جہان آباد جانا فضول تھا۔

اس نے انٹرکام اٹھایا اور نمبر ملا کر ریسپشنسٹ کو واپسی کا ٹکٹ کروانے کے لیے کہا پھر ریسیور رکھنے کے بعد آرام کی نیت سے بیڈ پر لیٹ گئی۔

سب کچھ حسب توقع ہو رہا تھا۔ اب صرف سر جمشید کا وصیت نامہ پڑھنا باقی رہ گیا تھا اور وہ انسپکٹر حارث کی موجودگی میں پڑھنا تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اگر انسپکٹر تھوڑی سی پیشرفت مزید کرتا تو شاید وہ انکار نہ کرتی۔ اسے کسی بھی مرد کے سہارے کی اشد ضرورت تھی۔ انسپکٹر کی صورت میں وہ مضبوط سہارے کی مالک بن جاتی تاہم یہ سوچ قبل از وقت تھی۔ آگے کیا ہونا تھا، اس کے متعلق اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔

☆☆☆

وہ شام کی فلائٹ سے شہر واپس آ گئی۔ ائرپورٹ پر انسپکٹر حارث موجود تھا۔ سندس نے اسے فون کر کے اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔ گاڑی میں زیادہ بات چیت نہیں ہوئی تاہم اس نے انسپکٹر کو حمیرا اور شاہین کے متعلق بتایا۔ انسپکٹر، سر جمشید کی ان دونوں شادیوں سے لاعلم تھا، اس نے حیرت کا

اظہار کیا۔ سندس نے اسے مزید بتایا کہ شاہین سے ملاقات نہیں ہوسکی اور حمیرا نے مختصر بات چیت کی ہے جس میں سر جمشید اور اس کی ان بن کے علاوہ اور کوئی خاص بات نہیں ہوسکی تھی۔ اس نے وکیل کے متعلق پوچھا تو انسپکٹر نے بتایا۔

''وہ صرف میری کال کا منتظر ہے۔ اگر چاہو تو اسے ابھی فلیٹ پر بلالیتا ہوں ورنہ صبح کا وقت میرے خیال میں بہتر رہے گا۔''

سندس نے انکار میں سر ہلایا۔ ''نہیں۔ اسے ابھی بلاؤ۔ میں صبح تک انتظار نہیں کرسکتی ہوں۔ زیادہ تجسس میرے دماغ کی چولیں ہلا دے گا۔''

شاید انسپکٹر کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی پھر اس نے موبائل پر نمبر ملا کر فون کر دیا۔ کچھ دیر بعد رابطہ ہوا تو اس نے رسمی بات چیت کے بعد اسے فوراً سر جمشید کے فلیٹ میں آنے کے لیے کہا اور پھر موبائل بند کر دیا۔ اس کے بعد مزید کوئی بات چیت نہیں ہوئی اور وہ خاموش بیٹھ گئے۔

اب صرف وکیل کا انتظار کرنا تھا اس لیے انسپکٹر قریبی صوفے پر بیٹھ گیا۔ سندس اس کی ہر حرکت کا اندازہ بخوبی لگا سکتی تھی، اس کے حواسِ خمسہ پوری طرح بیدار تھے۔

چند لمحے چپ رہنے کے بعد انسپکٹر بولا۔ ''مجھے یقین ہے کہ جلد ہی تمام جائداد تمہارے نام منتقل ہوجائے گی اور اس کے بعد تم عام لڑکی سے کھرب پتی بن جاؤ گی اور شاید مجھے پہچانو گی بھی نہیں تاہم میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ شادی کرلو، تمہارے لیے بہتر رہے گا۔''

''میں کسی مرد پر اعتبار نہیں کرسکتی اور جائداد منتقل ہونے کے بعد تو بالکل بھی نہیں۔ میں تین دفعہ دھوکا کھا چکی ہوں اور اب مزید دھوکا کھانے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔'' سندس نے جواب دیا پھر ٹھنڈی سانس بھری اور دوبارہ ہم کلام ہوئی۔

''مجھے سب کچھ اب اکیلے کرنا ہے۔ میں اسی لیے جہان آباد گئی تھی تاکہ اندازہ کرسکوں کہ مجھے کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے اور کیا میں ان کا سامنا کرسکوں گی۔''

''تو پھر تم نے کیا اندازہ لگایا؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''اگر رقم جیب میں ہو تو تمام دنیا قدموں میں جھک جاتی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ میں وہاں جاکر واپس آگئی اور مجھے کسی بھی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔'' سندس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

کمرے میں کچھ دیر کے لیے خاموشی طاری ہوگئی۔ صرف سانسوں کی آواز تھی جو سنائی دے رہی تھی۔ دونوں اپنی سوچوں میں گم تھے۔ انسپکٹر ترپ کا پتا پھینکنے کے متعلق سوچ رہا تھا اس لیے کچھ دیر بعد نرم گرم لہجے میں بولا۔

''میری شادی نہیں ہوئی، ماں لڑکی تلاش کررہی ہے لیکن کوئی بھی اس کے معیار پر پوری نہیں اتر رہی۔ اگر تم برا نہیں مانو تو ایک دفعہ ان سے مل لو۔ ان کی خواہش پوری ہوجائے گی اور ساتھ میں میری بھی۔''

دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ وکیل کباب میں ہڈی کے مانند وقت سے پہلے آگیا تھا۔ سندس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ یقیناً انسپکٹر کو وکیل کا جلدی آنا اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ جھٹکے کے ساتھ اٹھ کر دروازے کی طرف چلا گیا اور کچھ دیر بعد وکیل کو لیے کمرے میں داخل ہوا۔ سندس اسے دیکھ نہیں سکتی تھی اور اسے دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اسے جو چاہیے تھا، وہ یقیناً وکیل کے ہاتھوں میں تھا۔

انسپکٹر نے تعارف کرایا۔ ''یہ ایڈووکیٹ ہاشم ہیں۔ سر جمشید کے تمام قانونی معاملات انہی کے زیرِ نگرانی تکمیل پاتے تھے۔ آج سے چند ماہ قبل انہوں نے وصیت نامہ لکھوایا تھا، وہ ہاشم صاحب کے پاس محفوظ ہے۔ میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ وصیت نامے کو سنا کر ہمارے تجسس کا خاتمہ کریں تاکہ معلوم ہوسکے کہ جائداد کا وارث بننے کا شرف کسے حاصل ہوا ہے۔''

وکیل کی کرخت آواز سنائی دی۔ ''وصیت نامہ میرے پاس ہے۔ چونکہ مسز جمشید شہر سے باہر گئی ہوئی تھیں اس لیے اسے کھولنے میں کچھ تاخیر ہوئی ورنہ سر جمشید نے تاکید کی تھی کہ ان کی وفات کے فوراً بعد اسے کھول کر ان کی بیگمات کے سامنے پڑھ کر سنا دیا جائے۔ اب چونکہ ان میں سے کوئی بھی یہاں موجود نہیں سوائے محترمہ سندس کے...... اس لیے وصیت نامے کی کاپی انہیں ارسال کردی جائے گی۔ اگر انہیں اعتراض ہوا تو وہ خود عدالت سے رجوع کرلیں گی۔'' وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا۔

سندس کے کان اس کی آواز کو محسوس کرنے کے لیے بے تاب تھے اور اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اپنے بیگ سے وصیت نامے کو باہر نکال رہا تھا۔ پھر اسے لفافہ پھاڑنے کی آواز سنائی دی اور کمرے میں دوبارہ اس کی آواز گونجی۔

''تو وصیت نامہ میرے ہاتھوں میں موجود ہے اور میں اسے پڑھ کر سنانے لگا ہوں۔ انسپکٹر حارث اس کا معائنہ کرسکتے ہیں۔ اس پر مجسٹریٹ کی مہر موجود ہے اور یہ عدالت کے لفافے میں سربند ہے۔''

کچھ دیر کے لیے دوبارہ خاموشی طاری ہوئی۔ شاید انسپکٹر کاغذات کا معائنہ کر رہا تھا۔ پھر اس نے کاغذات دوبارہ وکیل کے ہاتھوں میں تھما دیے۔

وکیل کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ''انسپکٹر حارث کاغذات کا مطالعہ کر چکے ہیں اس لیے اب میں وصیت نامے کو پڑھنے لگا ہوں۔ یہ آج سے چھ ماہ قبل تحریر کیا گیا تھا۔ شاید انہی اوقات میں ان کی شادی محترمہ سندس کے ساتھ ہونا قرار پائی تھی۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا اس لیے سیدھے وصیت کی طرف آتا ہوں۔ آپ دونوں اسے غور سے سن سکتے ہیں۔''

''میں یعنی جمشید عالم اپنے ہوش وحواس میں وصیت نامہ تحریر کر رہا ہوں جس کی رو سے میری دونوں بیویاں حمیرا اور شاہین جنہیں میں نے چھ ماہ پہلے جائداد سے عاق کر دیا، وہ کسی بھی طرح جائداد کی حقدار نہیں ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے رویوں سے ثابت کر دیا کہ وہ میرے ساتھ سنجیدہ نہیں ہیں۔ ان دونوں سے شادی کرنا میری زندگی کی بہت بڑی غلطیوں میں شمار ہوتا ہے۔ میں ان دونوں کو طلاق نہیں دینا چاہتا اس لیے جائداد سے عاق کرتا ہوں۔ سندس سے شادی میں نے ان دونوں کو عاق کرنے کے بعد کی۔ مجھے کسی سہارے کی ضرورت تھی اور شاید نابینا ہونے کی وجہ سے اسے بھی تھی۔ وہ بہت اچھی رفیقہ حیات ثابت ہوئی۔ میں شاید تمام جائداد اس کے نام منتقل کر دیتا لیکن یہ میری پہلی بیوی سے زیادتی کے مترادف ہوتا۔ میں نے ابھی اس راز سے پردہ نہیں اٹھایا کہ میری پہلی بیوی سکینہ جمشید ہے، دوسری بیوی حمیرا اور تیسری شاہین ہے۔ سندس کا نمبر اس لحاظ سے چوتھا ہے۔ حمیرا اور شاہین سے میری اولاد نہیں ہوئی۔ سندس سے مجھے بہت سی توقعات وابستہ ہیں لیکن وہ بھی امید پر پوری نہیں اتری۔ سکینہ جمشید سے میری تین عدد لڑکیاں ہیں۔ مجھے لڑکے کی امید تھی جو مجھے چاروں بیویوں میں سے کوئی بھی نہیں دے پائی اس لیے میں اپنی تمام جائداد بہ ہوش وحواس سکینہ جمشید کے نام منتقل کرتا ہوں۔ حمیرا اور شاہین کو چونکہ میں عاق کر چکا ہوں اس لیے وہ جائداد کی کسی بھی لحاظ سے حقدار نہیں ہیں۔ سندس نے مجھے چند اچھے لمحات دیے ہیں اس لیے میں وہ فلیٹ اس کے نام کرتا ہوں جس میں وہ رہ رہی ہے۔ امید کرتا ہوں کہ کسی کو میری وصیت پر اعتراض نہیں ہوگا۔''

وکیل چپ ہوگیا اور سندس کو ایسے لگا جیسے اسے اندھیرے کنوئیں سے نکالنے کے بعد دوبارہ دھکیل دیا گیا ہو تاہم اب بھی اسے انسپکٹر حارث سے امید وابستہ تھی۔ اگر وہ اسے اپنا لیتا تو فلیٹ کی قیمت لاکھوں میں تھی، وہ دونوں وہاں آرام سے رہ سکتے تھے۔

''سر جمشید چھپے رستم ثابت ہوئے۔ اس بڑھاپے میں انہوں نے چار شادیاں کیں جبکہ میں نے صرف ایک ہی کی۔ یہ سب کھربوں کی جائداد کی وجہ سے ہے۔ اگر میرے پاس بھی جائداد ہوتی تو شاید میں دوسری شادی تو ضرور کرتا لیکن اب یہ ممکن نہیں۔ مجھے گھر واپس جانا ہے۔ بیوی بچے میرے منتظر ہوں گے۔'' انسپکٹر کی آواز سنائی دی۔

''مجھے بھی راستے میں ڈراپ کر دیجیے گا۔ میری گاڑی خراب ہوگئی تھی اس لیے مجھے آن لائن ٹیکسی کے ذریعے یہاں آنا پڑا۔'' وکیل کی آواز سنائی دی اور پھر وہ دونوں سندس سے کوئی بھی بات کیے بغیر فلیٹ سے باہر چلے گئے۔

سندس پتھر کا بت بن چکی تھی۔ اس کی ہمت نے جواب دے دیا۔ سب بنا بنایا کھیل نہ جانے کیسے بگڑ گیا تھا۔ اسے سر جمشید کو فلیٹ کی چھت سے نیچے دھکیلنا ہی نہیں چاہیے تھا لیکن اس میں قصور اس کا نہیں تھا۔ سر جمشید نے نشے میں مدہوش ہونے کے بعد اسے بتایا تھا کہ انہوں نے اپنی دونوں بیویوں کو عاق کر دیا تھا لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ ان کی ایک بیوی اور بھی ہے جس کی تین بیٹیاں بھی ہیں۔ اگر وہ پہلی بیوی کے متعلق اسے بتا دیتے تو سندس انہیں دسویں منزل سے نیچے نہیں دھکیلتی۔ اب اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ وہ واپس یتیم خانے چلی جاتی کیونکہ اس سے وہ خواہشات چھین لی گئی تھیں جن کے ذریعے وہ زندگی کے ساتھ آگے بڑھنے کے لیے تیار ہوئی تھی۔

اسے غصہ انسپکٹر حارث پر بھی آ رہا تھا جس نے دھڑلے کے ساتھ جھوٹ بولتے ہوئے اسے بتایا تھا کہ وہ غیر شادی شدہ تھا، ورنہ وہ اس کے جھانسے میں نہ آتی۔ تاہم اب تو سب کچھ ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ اس لیے اس نے وارڈروب سے کپڑے سمیٹنا شروع کر دیے اور پھر انٹر کام کے ذریعے ریسپشنسٹ کو فون کر کے اسے گاڑی تیار کرنے کے لیے کہا۔

''اسے ایڈریس کیا بتاؤں؟'' اس نے پوچھا۔

سندس نے رندھے ہوئے لہجے میں اسے یتیم خانے کا ایڈریس بتا دیا اور پھر جھٹکے کے ساتھ ریسیور رکھنے کے بعد پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

وہ ایک دفعہ پھر تنہا ہو گئی تھی۔

✱✱✱

جیسے ہی پروفیسر ایلیا شل مین پردے کے پیچھے سے بہت ہی جرأت مندانہ انداز سے اسٹیج کے وسط کی طرف بڑھے، ہال میں پھیلی ہوئی چہ مگوئیاں یکدم تھم گئیں۔ وہ اپنے سلیقے سے سلے ہوئے مارننگ کوٹ اور ریشمی واسکٹ میں نہایت پُرکشش لگ رہے تھے۔ ان کے گھٹنے تک اونچے چمکتے ہوئے بوٹ بھی ان کے شاندار لباس کا حصہ تھے۔ وہ ایک خوش شکل مرد تھے اور اس حقیقت سے بخوبی واقف بھی تھے۔ شل مین نے چند لمحوں کے لیے توقف کیا تاکہ سامعین خاموش ہو جائیں پھر انہوں نے اپنی بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''خواتین وحضرات! میں آپ کو گیٹس برگ میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ آج کے دن مجھے یہ اعزاز حاصل ہے بلکہ بہت بڑا اعزاز کہ میں آپ کے سامنے ہمارے شاندار متحدہ ریاست ہائے امریکا کے سولہویں صدر جناب ابراہام لنکن کو پیش کروں۔''

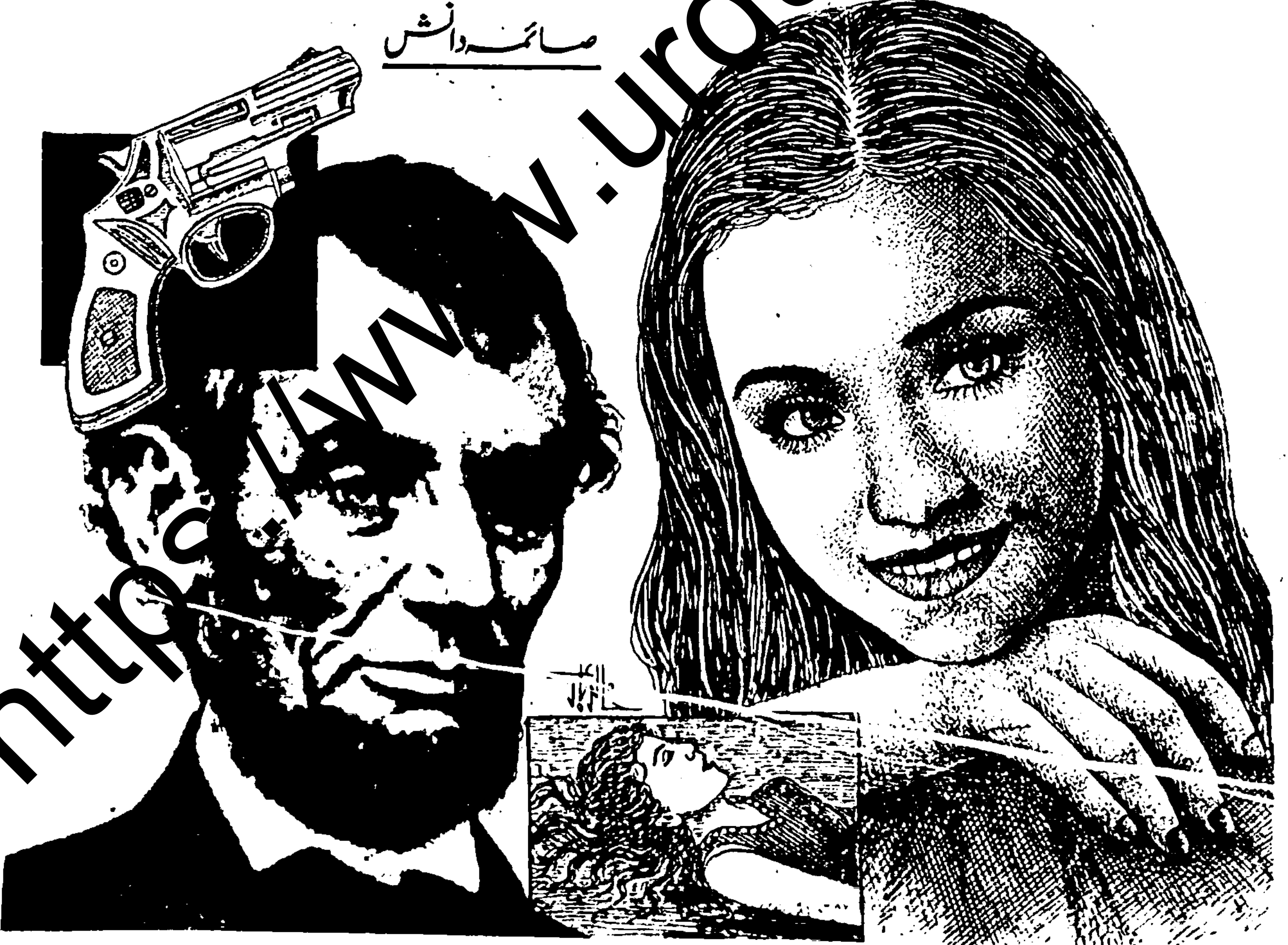
جیسے ہی میں شل مین کے ساتھ اسٹیج کے مرکز پر پہنچا، ہلکی پھلکی تالیاں بجنے لگیں۔ ہم نے مختصراً مصافحہ کیا پھر میں

## اپنے ساتھی سے انتقام لینے والے سابق سپاہی کی غلط فہمی

**زندگی میں کوئی واقعہ اتنا اچانک ہوتا ہے کہ جب تک پتا چلتا ہے تب تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے... وہ بھی اسٹیج پر پرفارم کررہے تھے... اداکاری کے جوہر دکھاتے انہیں اندازہ ہی نہ ہوا کہ ڈرامے کے دوران ایک بھیانک واردات ہوگئی ہے... مجرم کا سراغ پانا ناممکن لگ رہا تھا... مگر جب حقیقت کھلی تو سب کچھ واضح ہوگیا۔**

# عناد

صائمہ دانش



مجمعے کی طرف مڑا اور سر ہلا کر سلام کیا۔
مہذب انداز میں حمایت کے اظہار پر ''شکریہ'' ادا کیا۔ تقریباً پورا ہال بھرا ہوا لگ رہا تھا۔ زیادہ تر مقامی لوگ تھے، شہر سے آئے ہوئے اور ان کے ساتھ کچھ یونین فوجی، نیلے ڈریس یونیفارم میں ملبوس، چند ایک کے زخموں پر اب بھی خون آلود پٹیاں بندھی تھیں۔ یہ سپاہی اعزازی محافظ تھے جن کے پاس اسپرنگ فیلڈ کی بندوقیں یا گھڑسواروں والے کولٹ پستول تھے۔ یہ سنجیدہ سامعین ہوں گے جو ایک سنجیدہ تقریر کی توقع رکھتے تھے مگر سب سے زیادہ تعداد نوجوانوں کی تھی۔ مہم پر آئے ہوئے طلبہ اس مجمعے کا سب سے بڑا حصہ تھے اور انہیں متاثر کرنا سب سے مشکل ہوتا ہے۔
میں نے اپنے اسٹیج کوٹ کی جیب سے ایک مڑا تڑا لفافہ نکالا اور اس پر ایک تیز نظر ڈالی۔ میری تقریر انتخابی مہم کی تقریر کے مقابلے میں خاصی مختصر تھی لیکن نوجوان مجمعے کے سامنے مختصر تقریریں ہی بہتر ہوتی ہیں۔
میں گلا صاف کرنے کے لیے کھانسا پھر آغاز کیا۔
''ستاسی سال پہلے ہمارے باپ دادا نے اس براعظم پر ایک نئی قوم کو جنم دیا۔'' میں نے رک کر اپنے جملے کی گونج کو اثر انداز ہونے کا موقع دیا۔ اب ہال میں مکمل خاموشی چھا چکی تھی۔ بہت خوب...... میں نے جلدی سے ایک سانس اندر کھینچی اور سلسلۂ کلام جاری رکھا۔
''ایک نئی قوم جو آزادی کے اصول پر قائم ہوئی اور اس یقین کے ساتھ وقف تھی کہ...... برھرڑڑا!''
میں نے مائیکروفون میں ایک زوردار ڈکار ماردی۔ یہ اتنی گرجدار تھی کہ کچھ لوگوں کے ہاتھوں سے ان کے فون گر گئے۔
ایک لمحے کے لیے تو مکمل سناٹا چھا گیا پھر یکا یک ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ ایک چونکنے کی ہنسی اور ساتھ ہی ساتھ راحت کی۔
''ایماندار ابراہم'' کی شاندار تقریر بھول جائیے۔ ایک صحت مند ڈکار نوجوانوں کو جیتنے کا ہمیشہ مؤثر طریقہ ہے۔
میں نے پورا ایک منٹ توقف کیا۔ یہاں تک کہ ہال دوبارہ خاموش ہو گیا۔
''اوہ...... معذرت۔'' میں نے کہا جس پر ایک اور قہقہہ گونجا۔
''لیکن یہ برا بھی ہو سکتا تھا۔ آج صبح میں نے اپنے اعزازی محافظوں کے ساتھ دور کے مطابق ناشتا کیا تھا۔ آپ جانتے ہیں 1865ء میں ایک دور کے مطابق ناشتا کیا ہوتا تھا، حضرات؟''
''بینز!'' اعزازی محافظوں نے آواز میں آواز ملا کر کہا۔
''بینز...... بینز، یہ عجیب پھل ہیں، جتنا کھاؤ اتنا ہی بجاؤ۔''
وہ ہنسی کی ایک اور لہر کے رکنے کا انتظار کرتے رہے پھر میں نے کہانی کو دوبارہ سنبھالا۔
''فکر نہ کریں لوگو! یہ دوبارہ نہیں ہوگا، جب تک کہ میں کسی کو اونگھتا ہوا نہ دیکھ لوں۔''
مجھے پہلے ہی محسوس ہو رہا تھا کہ ہال کا ماحول پرسکون ہو چکا ہے۔ سب مطمئن تھے کہ یہ کوئی اسکول کی تاریخ کی لیکچر جیسی تقریر نہیں بلکہ زیادہ تر ''ابراہم لنکن: ویمپائر ہنٹر'' جیسی ہوگی۔
اب میں سامعین پر پوری طرح حاوی ہو چکا تھا، اس لیے میں آگے بڑھا۔
''خواتین و حضرات! گوگل کے مطابق آپ میں سے زیادہ تر لوگ ابراہم لنکن کا چہرہ اتنی بار دیکھ چکے ہیں، شاید اپنے قریبی رشتے داروں سے بھی زیادہ۔ فیس بک کہتی ہے کہ میرا چہرہ دنیا کے سب سے پہچانے جانے والے چہروں میں سے ایک ہے۔ یقیناً میں چاہتا کہ میری شکل بریڈ پٹ سے کچھ مشابہ ہوتی اور بورس کارلوف سے کم لیکن پھر بھی......''
میں نے ہنسی کے ختم ہونے کا انتظار کیا۔
''اب آپ سوچیں گے کہ ایک ایسی شکل والے آدمی کا خواتین پر کیا اثر ہو سکتا ہے لیکن آپ غلط سوچتے ہیں اور اس کا زندہ ثبوت پردے کے پیچھے انتظار کر رہا ہے۔ امریکا کی سب سے سنگی کرسٹ...... دوستو! تالیوں سے استقبال کیجیے...... محترمہ میری ٹوڈ لنکن۔''
پردہ میرے پیچھے کھل گیا لیکن جن تالیوں کی میں توقع کر رہا تھا، اس کی جگہ ایک زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی...... پھر ایک چیخ۔
میں مڑا تا کہ مریم کو دیکھ سکوں...... میرا مطلب ہے نہیں۔ یہ مریم نہیں تھی۔ میں اتنا شاکڈ رہ گیا تھا کہ اداکارہ کا نام بھی یاد نہ آیا۔
وہ فرش پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے بالوں میں خون کا ہالہ بن چکا تھا جو اس کے سر کے گرد اکٹھا ہو رہا تھا۔ ایک جنگلی آنکھوں والا آدمی لمبا کوٹ پہنے اس کے اوپر جھکا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ میں خون آلود خنجر، دوسرے میں پستول۔
''ب...... ب...... بوتھ؟'' میں ہکلا کر بولا۔ اب بھی سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے...... یہ سب کیا ہے؟"

"سک سیمپر ٹائرینس!" وہ چیخا۔

(یعنی: ظالموں کا ہمیشہ یہی انجام ہوتا ہے)

پھر اس نے اپنا پستول بلند کیا، سیدھا میری طرف نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔

اور سب کچھ رک گیا۔ ایک دم خاموشی چھا گئی۔

بعد میں ایک ایمبولینس والے نے مجھے بتایا کہ سیسے کی گولی صرف میری کنپٹی کو چھو کر گزری۔ صرف چھو کر؟

میرا سر یوں جھٹکا کھا گیا جیسے کسی نے بیس بال بیٹ سے وار کیا ہو۔

میں مکمل بہرا ہو چکا تھا، کسی آواز کا مفہوم سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ کانوں میں گھنٹیاں بج رہی تھیں جیسے آزادی کی گھنٹی (Liberty bell) ہو۔ میری ٹانگیں ربڑ جیسی ہو چکی تھیں۔ میں گھٹنے اور ہاتھوں کے بل جھکا مگر کسی طرح میں نے خود کو گرنے سے روکے رکھا، کسی طرح زمین پر نہیں بکھرا۔

اس کے بعد میں رینگتے ہوئے مریم اور اس پاگل آدمی کی طرف بڑھنے لگا جو اس کے اوپر جھکا ہوا تھا، ایک ہاتھ میں پستول، دوسرے میں خنجر لیے۔

لڑکھڑاتے ہوئے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ بمشکل سیدھا کھڑا رہ سکا، ہوا میں جھولتے بید کے درخت کی طرح۔

میں نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں مگر میرے اندر اتنی طاقت نہ تھی کہ ایک گھونسا بھی مار سکتا۔ میں صرف بوتھ کو دھکیلنے کی کوشش کر سکا تاکہ اسے مریم سے دور کر سکوں۔

اس نے میرے وار کو خنجر سے روک لیا جس سے میری بائیں کلائی کٹ گئی۔ میں نے خون کے بہاؤ کو محسوس کیا پھر دوبارہ گر گیا لیکن اس بار میں بندوق والے کے بازو کو پکڑتے ہوئے گرا تاکہ اسے بھی اپنے ساتھ نیچے گھسیٹ سکوں۔

ہم پستول پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے جو اب میرے خون سے پھسل رہا تھا مگر میں اسے تھام نہیں سکا اور جیسے ہی بوتھ نے پستول کو جھٹکے سے چھڑایا، دوسرا بیرل بھی چل گیا۔

اس نے مکمل طور پر پستول میرے ہاتھ سے نکال لیا اور پھر مجھے پسلیوں پر ایک زوردار لات ماری جس سے میں دہرا ہو گیا پھر وہ مڑا اور اسٹیج سے باہر کی طرف لڑکھڑاتا ہوا بھاگا۔

شاید میں نے اسے کچھ نقصان پہنچا دیا تھا کیونکہ وہ لنگڑا کر چل رہا تھا۔ وہ دروازے سے باہر نکلتے ہوئے پھسل گیا اور زینے پر زور سے گرا۔ گالیاں دیتے ہوئے وہ پھر اٹھا اور لنگڑاتا ہوا بھاگ نکلا۔ اب وہ بھی زخمی تھا مگر اس کے نکلنے کی رفتار تیز تھی۔

میں نے مریم کا خون آلود سر اپنی بانہوں میں لیا اور مڑ کر حیران وششدر سامعین کی طرف دیکھا۔

"خدا کے واسطے ہماری مدد کرو...... کوئی 911 کو فون کرو۔"

ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی پھر اچانک پورا ہجوم ایک ساتھ کھڑا ہو گیا جیسے سب روبوٹ ہوں۔ زور زور سے تالیاں بجائیں، مسکراتے ہوئے، شور مچاتے ہوئے، سیٹیاں بجاتے، ہمیں کھڑے ہو کر داد دے رہے تھے۔

ایک مکمل اسٹینڈنگ اوویشن۔

"اوے، ایب!"

سامنے والی صف میں بیٹھے ایک بچے نے آواز لگائی۔

"یہ تو یوٹیوب سے بھی زیادہ زبردست تھا۔"

☆☆☆

"جان ولکس بوتھ نے تم پر گولی چلائی۔" پولیس والی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

وہ لمبی اور دبلی پتلی تھی۔ اس کے سنہری بال لڑکوں جیسے چھوٹے تھے مگر اس میں کوئی سختی یا مردانگی نہ تھی، نہ طنز تھا، نہ ہی شک۔ اس کے لہجے میں کوئی حیرت بھی نہ تھی۔ وہ بس اس نام کو دہرا رہی تھی۔

ہم تھیٹر کی پہلی قطار میں بیٹھے تھے جبکہ ایک ای ایم ٹی میری بائیں کلائی پر پٹی باندھ رہی تھی۔ وہ پہلے ہی میرے کان کے اوپر ایک گاز پیڈ چپکا چکی تھی۔

"دیکھو، مجھے معلوم ہے کہ یہ سب سننے میں کتنا پاگل پن لگتا ہے" میں نے کہا۔ "اور مجھے پتا ہے کہ وہ اصلی بوتھ نہیں تھا جیسے کہ یہ بھی، مریم ٹوڈ نہیں ہے یا میں ابراہم لنکن نہیں ہوں۔ میں تو بس وہ بتا رہا ہوں جو میں نے دیکھا۔ وہ پستول بردار بالکل جان ولکس بوتھ جیسا بنایا گیا تھا۔ چلو، کم از کم سو لوگوں نے تو وہی منظر دیکھا جو میں نے دیکھا۔"

میں نے اپنی لنکن جیسی ڈاڑھی اتارنا شروع کی۔

"یہ بھیس یونہی رہنے دو۔" اس کی ساتھی نے کہا اور اپنے فون سے میری تصویر کھینچی۔

"تمہارا اصل نام کیا ہے، مسٹر لنکن؟"

"کوری ویلز اور یہ بھیس نہیں ہے، یہ میک اپ ہے۔ میں ایک اداکار ہوں۔"

"تکنیکی طور پر تم ری اینیکٹر ہو، ہے نا؟" اس عورت نے کہا۔

میں نے اس کا نیم ٹیگ دیکھا۔ سارجنٹ شین کوواکز۔

"اس میں فرق کیا ہے؟" اس کے ساتھی نے پوچھا۔

"اور اب تم اسکول کے بچوں کے لیے ابراہم لنکن بننے کا ڈراما کر رہے ہو؟" پولارڈ نے مزید دباؤ ڈالا۔

"یہ تو خاصی تنزلی ہوئی، ہے نا؟ میں نے پوچھا تھا، اس کے کتنے پیسے ملتے ہیں؟"

میں کچھ دیر ہچکچایا پھر سوچا۔ اب جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

"میرا حصہ پندرہ سو ڈالر ہے، ایک گھنٹے کے شو کے لیے۔ اگر میں اپنی ری اینیکٹر ٹیم ساتھ لاؤں تو دو ہزار۔ میں لنکن کی سالگرہ پر دو یا تین شو کرتا ہوں اور ہفتے کے دوران کلاس روم وزٹس بھی کرتا ہوں۔ ہر ایک کا پانچ سو ڈالرز ملتا ہے۔ ان سب کے لیے بھی مجھے کمیشن ملتا ہے۔ لابی میں جو کتابیں نمائش پر رکھی ہوتی ہیں، ان کا پرچار کرنے پر بھی مجھے کچھ فیصد ملتا ہے اور اگر میں اس وینیو میں ایجنسی کے دوسرے شوز بھی بک کرادوں تو ایک اور سو ڈالر کی رقم الگ۔"

"تو تم ہفتے میں تین بار لنکن کے شوز کرتے ہو؟" کوواکز نے ایک بھوں اٹھا کر پوچھا۔ "اور ہر شو کے پندرہ سو ڈالرز لیتے ہو؟"

"میں ہمیشہ لنکن نہیں ہوتا۔ میں یو ایس گرانٹ بھی کرتا ہوں، جنرل "ڈگ آؤٹ ڈگ" میک آرتھر، ونسٹن چرچل اور جولیس سیزر بھی۔ میں ایک زمانے میں رابرٹ ای لی کا بھی زبردست کردار ادا کرتا تھا جب تک کہ کچھ احمق احتجاجی مظاہرین میرے شوز کے باہر دھرنے نہ دینے لگے۔"

"[illegible] وہ احمق ہیں مگر ایک نسل پرست غلام مالک کو پیش کرنا تمہارے لیے کوئی مسئلہ نہیں؟" کوواکز نے پوچھا۔ اس کا لہجہ اب [illegible] غیر جانبدار تھا۔

"میں تاریخی شخصیات کو پیش کرتا ہوں محترمہ! میں انہیں زندگی بخشتا ہوں۔ [illegible] ایک لاجواب جولیس سیزر ادا کرتا ہوں اور کسی کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔"

"اعتراض کیوں ہو؟"

"کیونکہ سیزر نے ہزاروں غلام رکھے تھے۔ زیادہ تر گال (فرانس کے قدیم باشندے) جن سے ان کی زمینوں [illegible] کام کروایا جاتا مگر کچھ سپاہی بھی غلام تھے۔ ا[illegible] مظاہرین نے اس بات کو پکڑا نہیں اور شاید کبھی نہ پکڑیں۔ وہ تاریخ کو پڑھنے کے بجائے دوبارہ لکھنے میں زیادہ معروف ہیں۔"

"اور یہ بات تمہیں پریشان کرتی ہے؟"

"بالکل کرتی ہے۔ جب میں ری اینیکٹ نہیں کر رہا ہوتا تو، میں اے سی سی (ACC) میں اسسٹنٹ پروفیسر ہوں۔ میں ہفتے میں چھ گھنٹے لیکچر دیتا ہوں۔ زیادہ تر "تاریخ مغربی

"یہ تو بس ایک سستی ہائی اسکول پرفارمنس ہے، ہے نا؟"

وہ ایک بڑا آدمی تھا، ویسٹرن اسٹائل میں ملبوس، سرمئی ٹوئیڈ جیکٹ، کندھوں اور کہنیوں پر چمڑے کی پیچز۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا اور نیم ٹیگ پر لکھا تھا، پولارڈ۔

"اداکاری میرا فن ہے۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"اور ری اینیکٹمنٹ ایک پرفارمنس ہے۔"

"تو ابراہم لنکن بننے کا مطلب ہے یہ صرف ایک [illegible] ہے؟" پولارڈ نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "تمہیں اس [illegible] کے [illegible] پیسے بھی ملتے ہیں؟"

"[illegible] کوئی معقول پیسے ملتے ہیں۔"

"واقعی...... [illegible] ہے؟"

"تم سے [illegible] ہو تو۔ یہ لیکچر سیریز بورڈ آف ایجوکیشن فنڈ کرتا ہے۔"

"سچ میں؟ تو پھر اس کا [illegible] ہے؟"

"اس کا اس وقت کیا تعلق [illegible]"

"ہم طے کریں گے کہ کس بات کا تعلق [illegible] صاحب! بس سیدھا جواب دو۔"

"نرم پڑ جاؤ، بین!" لیڈی پولیس نے ہاتھ اٹھا کر اسے چپ کروایا۔

"مسٹر لنکن! میرا مطلب ہے مسٹر ویلز! یہ ایک تعاون کرنے والا گواہ ہے۔"

"اگر یہ تمہارا گڈ کوپ/ بیڈ کوپ ڈراما ہے تو تمہاری ایکٹنگ میں ابھی بہتری کی گنجائش ہے۔" میں نے کہا۔

"میں دیکھ رہی ہوں کہ تم پولیس کے طریقۂ کار سے خاصے واقف ہو، مسٹر ویلز!" کوواکز نے ہلکے مگر سنجیدہ انداز میں کہا۔ "کیا تمہیں کبھی گرفتار کیا گیا ہے؟"

"مجھے لگتا ہے تمہیں پہلے سے اس کا علم ہے۔ ہاں، میں گرفتار ہو چکا ہوں اور ہاں، میں نے سزا بھی کاٹی ہے۔ میں نے اس دوران پولیس کے کام کا مطالعہ کیا، اپنے کیریئر کے لیے۔ میں نے اکیڈمی کا فائنل امتحان بھی دیا تھا اور پورے نمبر لیے تھے۔"

"تم نے پولیس اکیڈمی میں پڑھائی کی؟" پولارڈ نے طنز کیا۔

"نہیں، صرف امتحان دیا، تحقیق کے لیے۔ انٹرنیٹ سے لے کر دیا تھا۔ میں نے ایک ٹی وی شو میں آدھے سیزن کے لیے پولیس آفیسر کا کردار ادا کیا تھا۔ شاید تم نے دیکھا ہو۔ مجھے آٹھویں قسط میں مار دیا گیا تھا لیکن میری موت کا سین اب بھی یوٹیوب پر آتا ہے۔"

تہذیب" پر۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "تم لوگ میرا وقت کیوں ضائع کر رہے ہو؟ میں نہ مجرم ہوں، نہ ہی مشتبہ۔ میرے پاس ایک مضبوط عذر ہے۔ میں اس وقت اسٹیج پر تھا، پانچ سو گواہوں کے سامنے، جب یہ پاگل پن شروع ہوا۔"

"دراصل تم اس وقت اسٹیج پر نہیں تھے۔" کوواکز نے کہا۔

"سی سی ٹی وی کیمروں میں صرف اسٹیج کا حصہ نظر آتا ہے۔ مریم ٹوڈ کا کردار ادا کرنے والی اداکارہ پر حملہ اس کے اسٹیج پر آنے سے پہلے ہوا۔ خون کا جو تالاب ملا، اس سے ایم ٹی کا خیال ہے کہ یہ حملہ غالباً تمہارے داخلے سے چند منٹ پہلے ہوا۔ تم اس وقت کہاں تھے؟"

"ہم...... میں بائیں طرف کے پردے کے پیچھے انتظار کر رہا تھا، خود کو سین کے لیے ذہنی طور پر تیار کر رہا تھا۔"

"کیا کوئی تمہاری گواہی دے سکتا ہے؟"

"مم...... میرے خیال میں نہیں۔ میں اکیلا تھا اور یہی تو اس مرحلے کا مقصد ہوتا ہے۔ کیا تم واقعی سوچ رہی ہو کہ میں نے یہ سب کیا؟"

"تمہیں ماننا پڑے گا کہ تم نے مرکزی کردار ادا کیا۔ یہ سب ڈرامائی تھا اور تم ظاہر ہے ڈراما پسند کرتے ہو اور چونکہ جس شخص کو تم نے مجرم کے طور پر پہچانا ہے، وہ ڈیڑھ سو سال پہلے مر چکا ہے۔"

"میں یہ نہیں کہہ رہا کہ بوث نے یہ کیا۔ میں کہہ رہا ہوں کہ وہ آدمی بوث جیسا بنایا گیا تھا۔ پیشہ ورانہ میک اپ کے ساتھ، بالکل ویسا جیسا میں ہوں۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"کیونکہ میں اس کے آر پار دیکھ ہی نہ سکا۔" میں جھنجلا گیا۔ "میں اتنا حیران ہوا کہ میرے لیے وہ صرف جان ولکس بوث تھا یا کم از کم اس کا ہم شکل۔ اس کے کپڑے بالکل اصلی لگ رہے تھے۔ اس کا چہرہ اور وہ مڑی ہوئی مونچھیں، یہ سب کمال کا تھا۔"

"تم نے کہا تھا، وہ ڈیڈ رنگر تھا؟"

"ہاں، تقریباً ویسا ہی۔ حتیٰ کہ اس کے ہتھیار بھی دور کے حساب سے بالکل موزوں تھے۔" میں ایک لمحے کو رکا۔

"دراصل، یہ پوری طرح سچ نہیں۔ خنجر ایک "آرکنساس ٹوتھ پک" تھا جو اس زمانے میں عام تھا لیکن پستول بالکل ٹھیک نہیں تھا۔ وہ "دور سے مطابقت رکھتا" تھا۔ یعنی اس وقت موجود تھا۔ لیکن اصل بوث نے لنکن کو ایک سنگل شاٹ ڈیرنجر سے مارا تھا جو "کیپ اینڈ بال" (بارود اور گولی) سسٹم پر کام کرتا تھا۔ ہمارے بوث کے پاس دو فائر والا رمنگٹن ڈیرنجر تھا جس میں دو بیرل ہوتے ہیں۔ وہ اس زمانے کے لحاظ سے درست تھا مگر پستول غلط تھا۔"

"اور تم نے یہ سب کچھ ایک کنویں والی لڑائی کے دوران پکڑ لیا؟" پولارڈ نے حیرت سے پوچھا۔

"خدا کی قسم! میں یہ قتل کا سین، پتا نہیں...... شاید سو بار کر چکا ہوں، بارہ مختلف بوث کے ساتھ۔"

اسی لمحے پولارڈ کے فون نے وائبریٹ کیا۔ وہ ایک طرف ہٹ کر کال لینے لگا۔

"کیا بوث نے کچھ کہا تھا؟" کوواکز نے پوچھا۔

"بس وہی جو ہمیشہ کہا جاتا ہے...... سک سیمپر ٹائرینس۔"

"اس کا مطلب کیا ہے؟"

"یہ لاطینی ہے۔ مطلب "ظالموں کا ہمیشہ یہی انجام ہوتا ہے" یہی وہ جملہ ہے جو اصل بوث نے لنکن کو گولی مارنے کے بعد چیخ کر کہا تھا۔ یعنی برے لوگوں کے ساتھ ہمیشہ برا ہی ہوتا ہے۔"

"بس، یہی امید کی جا سکتی ہے۔" اس نے کہا۔

"اور کبھی کبھار امید پوری بھی ہو جاتی ہے۔" پولارڈ نے فون جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "وہ پیٹرول والے تھے۔ انہوں نے مغربی طرف بوث کو پکڑ لیا ہے۔ چلو، چلتے ہیں۔"

"میں بھی ساتھ چلوں گا۔" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا، پھر تھوڑا ڈگمگایا۔ میں اب بھی کچھ ٹھیک حالت میں نہیں تھا۔

"بالکل نہیں۔" پولارڈ نے دوٹوک جواب دیا۔ "تکنیکی طور پر تم اب بھی ایک مشتبہ فرد ہو۔"

"میں واحد گواہ بھی ہوں جس نے اس کمبخت کو قریب سے دیکھا ہے۔ وہ میک اپ میں تھا لیکن مجھے میک اپ کی تربیت حاصل ہے۔ اس بار میں اس بھیس کے پار دیکھ سکوں گا۔ اس نے مجھے مارنے کی کوشش کی۔ خدا کی قسم اور [illegible] کو تو وہ تقریباً مار ہی چکا تھا۔ مجھے اس شخص سے بات کرنی ہے۔"

پولارڈ نے سوالیہ نظر اپنی ساتھی پر ڈالی جس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "لے چلتے ہیں۔"

"کیا تم اپنے ناظرین سے ذاتی طور پر بھی ملتے ہو؟" کوواکز نے پوچھا۔

ہم گشتی کار میں تھے، شہر کے اس پار جا رہے تھے۔ پولارڈ ڈرائیو کر رہا تھا، کوواکز اگلی سیٹ پر اور میں پچھلی سیٹ پر تھا۔ دونوں دروازے لاک تھے، جیسے قید خانہ۔

"شو کے بعد میں آٹوگراف دیتا ہوں، کوری ویلز بطور ابراہام لنکن۔ زیادہ تر لوگ مجھے ٹی وی سے یاد رکھتے ہیں۔ ایجنسی میرے ہر کردار کے لیے ایک ویب سائٹ چلاتی ہے۔ لوگ مجھے وہیں ای میل کرتے ہیں اور میں ان کا جواب کردار میں ہی دیتا ہوں۔"

"کبھی کوئی دھمکیاں ملی ہیں؟"

"ہاں، ضرور...... کچھ پاگل لوگ ان شوز کو بہت سنجیدگی سے لیتے ہیں اور کبھی کبھار کوئی ذہنی مریض دھمکیاں بھیج دیتا ہے۔ جب میں رابرٹ ای لی کا کردار کرتا تھا تو مجھے ...ن (KKK) اور ریب فلیگ ملیشیا کی طرف سے پرستاروں کے خط بھی ملتے تھے اور جب میں لنکن بنتا ہوں تو انہی گروہوں ... سے موت کی دھمکیاں بھی ملتی ہیں۔"

"موت کی ...... ریب ملیشیا سے؟" اس نے دہرایا۔

"کیا یہ ... نہیں کرتا؟"

"کرتا، اگر میں ... سنجیدگی سے لیتا۔ مجھے شک ہے کہ کوئی بھی اصلی ریب فلیگ ... میرے ایکٹنگ ایکٹ کو دیکھ چکا ہے۔ زیادہ امکان ہے ... کسی ہائی اسکول کے بچے کی ہوں اور ایک طرح سے میرے لیے یہ خوشی کی بات ہے جس کا مطلب ہے کہ میں واقعی اپنے ... رہا ہوں، چاہے وہ محض کسی نوعمر پاگل کی طرف سے ہو ... اپنی ماں کے بیسمنٹ سے مجھے دھمکیاں دے رہا ہو۔"

"اداکار!" پولارڈ نے ناک چڑھائی۔

"اور جز وقتی پروفیسر بھی۔" کوواکز نے پلٹ کر جواب دیا۔

"اور ایک سابق مجرم۔" پولارڈ نے فوراً چوٹ کی۔

میں خاموش رہا۔ دونوں ٹھیک کہہ رہے تھے۔

"ہم پہنچ گئے۔" پولارڈ نے گاڑی ایک ہائی اسکول کی پارکنگ میں روکتے ہوئے کہا۔ وہ ایک گشتی گاڑی کے ساتھ رکا جس کی لائٹس چمک رہی تھیں۔

جان ولکس بوث پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا، نقلی مونچھیں لگائے، سرمئی فراک کوٹ پہنے اور ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوا۔

کوواکز اور میں اس گشتی گاڑی کی طرف بڑھے جبکہ پولارڈ میری نگرانی کرتے ہوئے پیچھے پیچھے آیا۔ میں نے بوث پر گاڑی کی کھڑکی سے جھانکا۔ میرا خون کھول رہا تھا لیکن...... لعنت۔

میں نے دروازہ کھولنے کے لیے ہینڈل کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر کوواکز نے میری کلائی پکڑ لی۔

"تم کیا کر رہے ہو؟"

"مجھے اسے قریب سے دیکھنا ہے۔"

"کیوں؟"

"اپنا یقین کرنے کے لیے اور کیا۔ دروازہ کھولو، پلیز!"

اس نے ایک لمحے کے لیے مجھے گھورا جو کہ بہت ناخوشگوار احساس تھا پھر اس نے کندھے اچکا کر دروازہ کھول دیا۔

میں اسے قریب سے دیکھنے کے لیے آگے جھکا۔

"کیا ہوا تھا؟" میں نے بوث سے پوچھا۔

"یار! مجھے کیا پتا۔" اس نے کہا۔

"مجھے بک کیا گیا تھا کہ میں بوث کا کردار ادا کروں، ایب کو ماروں...... "سک سیمپر" چیخوں اور بھاگ جاؤں۔ میں آدھا گھنٹا پہلے اسکول پہنچا لیکن آڈیٹوریم خالی تھا اور ایک خاکروب نے بتایا کہ آج کوئی پرفارمنس شیڈول نہیں ہے۔ مجھے لگا کچھ گڑبڑ ہے پھر میں اپنی گاڑی کی طرف واپس جا رہا تھا کہ قیامت ٹوٹ پڑی۔"

اس نے اپنی ہتھکڑی لگی کلائیاں اٹھا کر دکھائیں۔

"تمہیں یہ شو کس نے دیا؟"

"ایک بکنگ ایجنسی سے کال آئی تھی۔ "اولڈ گولڈ" کسی بندے نے کہا کہ ان کے کچھ شوز چل رہے ہیں۔ میں پہلے بھی بوث کا کردار کر چکا ہوں۔"

"کیا انہوں نے تمہیں کوئی خاص ہدایات دیں...... کوئی ...نز یا......؟"

"بس وہی بڑی والی "سک سیمپر......"

"...نس۔" میں نے مکمل کیا۔ میں نے اپنی انگلیوں کے ... سے اس کی ٹھوڑی تھامی اور اس کا چہرہ ایک طرف موڑا۔

اس نے جھٹکے سے ... موڑتے ہوئے کہا۔ "کیا کر رہے ہو تم؟"

"اپنا شک دور کر رہا ہوں۔" میں نے آہ بھر کر کہا پھر کوواکز اور پولارڈ کی طرف مڑ گیا۔ "یہ وہ بندہ نہیں ہے جس سے میری جھڑپ ہوئی تھی۔ اس کی آواز وہ نہیں اور ... کی شکل...... بوث سے زیادہ مل رہی ہے۔"

"اس کا مطلب؟" پولارڈ نے پوچھا۔

"اصلی بوث اپنے وقت کا شو بزنس ہنک تھا۔ ابراہام لنکن کا خوبرو بھائی لگتا تھا۔ یہ والا بوث بھی کچھ کم نہیں، ... فٹ نو انچ ہے۔ زیادہ میک اپ کی ضرورت نہیں پڑتی لیکن جس سے میری لڑائی ہوئی، وہ لمبا تھا اور اس کے چہرے پر بہت زیادہ گریس پینٹ تھا۔ ممکن ہے عمر کی

جھریاں چھپانے کے لیے ایسا کیا گیا ہو اور اس نے جبڑے پر ایک پروتھیسز لگایا ہوا تھا تاکہ جبڑا لمبا لگے۔ وہ اتنا مشابہ نہیں تھا جتنا یہ ہے۔ اسی لیے اس پر زیادہ کام کیا گیا تھا۔ یہ وہ نہیں ہے۔"

"کیا تمہیں پورا یقین ہے؟" کوواکز نے پوچھا۔

"مجھے بالکل یقین ہے۔" میں نے اعتماد سے کہا۔

"دیکھو، خاتون! میں بھی چاہتا ہوں کہ کاش یہی بوٹ وہ [illegible] ہوتا مگر وہ نہیں ہے اور مزید یہ کہ......"

اسی لمحے اس کے فون نے وائبریٹ کیا۔ اس نے مجھے ہاتھ سے چپ کروایا اور پیچھے ہٹ کر کال سننے لگی پھر سن کر کہا۔ "ہم راستے میں ہیں۔" پھر میری طرف مڑی۔

"تمہاری [illegible] کا آپریشن مکمل ہو گیا ہے۔"

"مج......؟ کیا وہ [illegible] ہے؟"

"چلو، جا کر پتا کرتے ہیں۔" [illegible] نے گاڑی کا پنجرہ نما دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

میں جلدی سے اندر گھسا اور ہم ٹائروں کی چیخ کے ساتھ اسپتال کی طرف نکل پڑے۔

"کوئی دوسرے بوٹ کو کیوں ہائر کرے گا؟" اس نے پوچھا۔

"شاید اس نے کیا ہی نہ ہو۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟" پولارڈ نے جھٹ سے پوچھا۔ "تم نے تو ابھی اس سے بات کی ہے۔"

"میرا مطلب ہے، اس نے صرف دو نہیں، شاید پانچ چھ بندے بک کیے ہوں گے۔"

"کس لیے؟"

"تاکہ تم لوگ نقلی بوٹ کے پیچھے دوڑتے رہو جبکہ وہ خود کسی اور کا روپ دھارے آرام سے نکل جائے یا زیادہ امکان ہے کہ وہ اب دوبارہ اپنی اصل شکل میں آچکا ہو۔ بس ایک عام سا شخص، یہ چالاکی ہے۔ اپنے انداز میں شاندار۔ وہ ایک بھرے مجمعے کے سامنے جرم کرتا ہے اور ہر کسی کو صرف جان ولکس بوٹ کا چہرہ نظر آتا ہے، اصل قاتل کا نہیں۔"

"کیا اداکاری کے اسکول میں تمہیں یہ ساری جاسوسی والی بکواس سکھائی گئی تھی؟" پولارڈ نے طنز کیا۔

"نہیں، بیسک ٹریننگ کے بوٹ کیمپ 101 میں۔" میں نے کندھے اچکا کر جواب دیا۔ "اگر تم پر فائر ہو تو چڑیوں کی طرح بکھر جاؤ تاکہ دشمن الجھن میں پڑ جائے اور اس کے پاس ہدف زیادہ ہو جائیں۔"

میں لمحہ بھر کو رکا، پلکیں جھپکائیں۔ [illegible]

الفاظ۔" میں نے اضافہ کیا۔

"سن زو، دی آرٹ آف وار۔"

"یہ کیا تھا؟" کوواکز نے پوچھا۔

"کیا، کیا تھا؟"

"ابھی ایک سیکنڈ پہلے تمہارے دماغ میں کچھ آیا، جملے کے درمیان۔"

"نہیں۔"

"نہیں، آیا تھا......کیا تھا وہ؟"

"خدا کے واسطے خاتون! ابھی کسی نے میرے سر میں گولی ماری ہے۔"

اس نے مجھے عجیب انداز سے دیکھا۔

"اب کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"مجھے لگا ایک اداکار جھوٹ بولنے میں ماہر ہوگا۔"

جب ہم اسپتال کے پارکنگ لاٹ میں داخل ہوئے تو میں نے ایک گہری اور کانپتی ہوئی سانس لی۔

"کیا کوئی مسئلہ ہے؟" کوواکز نے پوچھا۔

"مجھے اسپتالوں سے شدید نفرت ہے۔" میں نے کہا۔ "میری زندگی میں اسپتال کا تجربہ کبھی خوشگوار نہیں رہا۔"

"کس اسپتال میں تھے تم؟" پولارڈ نے طعنہ مارا۔ "کسی پاگل خانے میں، یہ دعویٰ کرنے پر کہ تم ابراہم لنکن ہو؟"

میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کوئی جواب نہیں دیا۔

استقبالیہ پر کوواکز نے اپنا بیج دکھایا، مج کے کمرے کا نمبر لیا اور اس کی حالت کی [illegible] معلومات بھی۔

"نازک......[illegible]۔"

اس کا کمرا سفید تھا، سفید [illegible] سفید دیواریں، سفید مشینری جو ہلکی آواز میں گنگنا رہی تھی۔

اس کے بستر کے ساتھ ہی ایک مشین دھیمی آواز میں چل رہی تھی۔ مج عام طور پر تھوڑی سی گول مٹول ہے مگر اب وہ تقریباً خون سے خالی لگ رہی تھی، تکیے کے غلاف جیسی [illegible]

"ہیلو مج۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

وہ فوراً چونک کر جاگ گئی۔

"ہیلو، کوری!" اس نے آنکھیں جھپک کر مجھے دیکھنے کی کوشش کی۔ "یہ سب کیا بکواس ہے؟ کوئی بھی مجھے کچھ نہیں بتا رہا۔"

"پریشان مت ہو مج!" میں نے کہا۔ "اصل میں ہم تو یہی امید کر رہے تھے کہ شاید تم ہی ہمیں بتا سکو کہ کیا ہوا تھا۔"

"تم مذاق کر رہے ہو؟ یہ دوائیں مجھے آدھے چاند کی

طرف لے گئی ہیں۔ مجھے تو اپنا نام بھی بہ مشکل یاد ہے۔"

"بس، جو کچھ بھی تمہیں یاد ہو، وہ بتاؤ۔" کوواکز نے بستر کے کنارے گھٹنے ٹیک کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کوئی بھی چھوٹی بات جو مددگار ہو سکتی ہے۔"

"میرے پاس بس چھوٹی چھوٹی جھلکیاں ہی ہیں۔" مج نے کہا۔ "میں گہری سانسیں لے رہی تھی، اسٹیج پر آنے کی تیاری کر رہی تھی کہ کسی نے پیچھے سے پردہ چیر کر دھکا دے کر اندر قدم رکھا۔ میں مڑی تو دیکھا کہ بوش تھا، خدا کی قسم! میں نے سوچا، کیا چکر ہے؟ ہم گینٹسبرگ کر رہے ہیں، قتل نہیں۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"تو میں نے بوش سے پوچھا کہ کیا مسئلہ ہے لیکن اس نے مجھے ایک طرف دھکیل دیا اور پردے کے پاس جا کر ہال کی طرف جھانکا جو کسی بھی بیوقوف کو معلوم ہونا چاہیے کہ بدشگونی ہے۔ تب میں نے اس کا بازو پکڑا کہ پوچھوں کہ کیا کوئی تبدیلی ہوئی ہے؟ اور اس نے گھوم کر ہاتھ میں وہ منحوس چھری لیے میرے اوپر پل پڑا اور مجھے کاٹ دیا۔ چاہے ہم قتل کا سین بھی کر رہے ہوتے تب بھی چاقو رکھ کر ہم کو نہیں لگتا بلکہ میجر ہیم بون کو لگتا ہے۔"

"ریتھ بون۔" میں نے تصحیح کی۔

"جو بھی ہو۔" اس نے جھنجلا کر کہا۔ "بات یہ ہے کہ وہ جو بھی تھا، اسے چھری لگتی ہے، مجھے نہیں اور اس کے پاس اصلی چھری تھی، کوئی نقلی پروپ نہیں تو میں چیخی، پردہ اٹھتا ہے اور تم اندر کود پڑتے ہو، پھر دھماکا! وہ تمہیں گولی مار دیتا ہے، "سک سیمپر" چلاتا ہے اور بھاگ جاتا ہے۔ میں بے ہوش ہو گئی۔ کوری! تم نے وہ احمق کہاں سے ڈھونڈ نکالا؟"

"میں نے اسے ہائر نہیں کیا مج! میں......"

"معاف کیجیے گا۔" کوواکز نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ اس شخص کو پہچانتی ہیں جس نے آپ کو زخمی کیا...... کیا آپ نے اسے پہلے بھی دیکھا ہے؟"

"یقیناً دیکھا ہے۔" مج نے چڑ کر کہا۔ "سو بار دیکھا ہے۔ بندہ صحیح تھا، ڈراما غلط۔"

"معاف کیجیے گا، میں سمجھی نہیں۔"

"وہ جان ولکس بوٹھ تھا، مس! اپنے فون پر گوگل کر لیں، آپ کو اس کی مگ شاٹ مل جائے گی اور اگر آپ برا نہ منائیں تو میں اپنے دوست سے تنہائی میں بات کرنا چاہتی ہوں۔ یہ کچھ ذاتی بات ہے۔"

کوواکز نے ایک لمحے کو سوچا پھر بولی۔ "یقیناً۔ ہم باہر ہیں۔" اور مجھ پر ایک نظر ڈال کر وہ اور پولارڈ باہر چلے گئے۔

"کیا بات ہے ڈیئر؟" میں نے مج سے پوچھا۔ اس نے اشارے سے مجھے قریب بلایا۔

"بوش نے مجھ سے کچھ کہا۔" اس نے سرگوشی کی۔ "ایب کو بتانا کہ جو ہمیں مار نہیں پاتا، وہ ہمیں مضبوط بناتا ہے۔ سارجنٹ ویلز کو کہنا، بدلہ آرہا ہے۔ کوری! اس کا کیا مطلب ہے؟"

"مجھے کچھ اندازہ نہیں۔ وہ یقیناً پاگل ہوگا۔"

"اوہ، وہ یقیناً پاگل ہے۔" وہ میرا کالر پکڑ کر مجھے قریب کھینچتے ہوئے غصے سے بولی۔ "میں نے اس کی آنکھوں میں بہت قریب سے دیکھا۔ وہ پاگل تھا، جیسے کسی غلیظ کھڈے میں پلنے والا چوہا۔ لیکن وہ لاطینی بھی بولتا ہے اور نطشے کے اقوال بھی دہراتا ہے۔ تو وہ مکمل پاگل نہیں ہے، ہے نا؟ آخر وہ کس چیز کی بات کر رہا تھا کوری؟ اس نے تمہیں "سارجنٹ" کیوں کہا اور یہ بدلہ کس بات کا تھا؟"

میں نے جواب نہیں دیا کیونکہ میں اس سے جھوٹ نہیں بولنا چاہتا تھا مگر مج تو مج ہے، فوراً میری چال بھانپ گئی اور مجھے ایک پرانے اسکرپٹ کی طرح پڑھ لیا۔

"کمینے!" وہ تیز لہجے میں بولی۔ "تم اس پاگل کے بارے میں کچھ جانتے ہو، ہے نا؟"

مگر میں نے وضاحت نہ کی۔ "مجھے افسوس ہے، مج......!"

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ کوری! اس سے پہلے کہ اس بار تم واقعی میری جان لے لو۔" اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔ میں نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن میرے پاس کہنے کو کچھ تھا، کوئی مکالمہ نہیں اور کوئی جھوٹ گھڑنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ میں نے اس کے گال کو چھوا مگر اس نے پھر بھی منہ پھیر لیا۔

میں نے کچھ منٹ باتھ روم میں گزارے، چہرے پر صابن ملا، پانی سے دھویا اور اپنا لنکن والا میک اپ اتار دیا۔

دو پولیس والے باہر راہداری میں میرا انتظار کر رہے تھے۔ کوواکز نے مجھے دیکھا پھر چونک کر بڑے غور سے دوبارہ دیکھا۔

"واہ، تم واقعی ابراہام لنکن جیسے نہیں لگتے، ہے نا؟"

"بالکل نہیں۔ یہ اچھی بات ہے یا بری؟"

"نہیں، بس...... ذرا حیران کن ہے۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"سب خیریت ہے تمہاری گرل فرینڈ کے ساتھ، لوور بوائے؟" پولارڈ نے طنز کیا۔

"نہیں۔ لیکن مجھے نہیں لگتا کہ مج کو اکیلا چھوڑنا

چاہیے۔ وہ پہلا ہدف تھی اس پاگل کا۔ ہوسکتا ہے وہی اس کا اصل نشانہ ہو۔"

"مجھے لگتا ہے زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ محض اتفاق سے نشانہ بن گئی، مسٹر ویلز! پھر بھی میں گشتی پولیس کو کہوں گی کہ ایک سپاہی یہاں تعینات کردے۔ احتیاط بہتر ہے۔"

"شکریہ۔" میں نے کہا اور ان کے ساتھ گاڑی کی طرف قدم بڑھا دیے۔ "میں اس کی قدر کرتا ہوں۔"

"[illegible] یہ تمہارے لیے نہیں کر رہی، مسٹر ویلز! یہ تمہاری دوست کی حفاظت کے لیے ہے۔ اب تمہاری باری ہے۔"

"میری باری؟" میں نے کچھ حیرت سے کہا۔

"کچھ باتیں صاف کرنے کی۔ جب ہم انتظار کر رہے تھے تو میں نے جلدی سے تمہارا بیک گراؤنڈ کی چیکنگ کی، مسٹر ویلز! جو کچھ ملا، وہ میری توقع سے کہیں زیادہ تھا۔"

"جیسے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"یوں سمجھ لو کہ اتنا کچھ ملا کہ مجھے یقین ہو چلا ہے کہ تم نے اس معاملے کے بارے میں جتنا ہمیں بتایا ہے، تم اس سے زیادہ جانتے ہو۔"

"میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے، جو میں جانتا ہوں۔ تمہیں کیوں لگتا ہے کہ میں کچھ چھپا رہا ہوں؟"

"بوٹ نمبر ون تمہاری دوست کو آسانی سے مار سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ یہاں تک کہ ممکن ہے کہ اس پر حملہ جان بوجھ کر نہ ہو۔ شاید وہ اچانک آگئی، وہ گھوما، خنجر ہاتھ میں تھا اور چھری چل گئی۔ یعنی ہوسکتا ہے یہ حادثہ ہو لیکن اس نے تمہیں ضرور مارنے کی کوشش کی، وہ بھی گولی سے۔"

اس نے رک کر میرا ردِعمل دیکھا لیکن میں خاموش رہا۔

"قتل کے بنیادی محرکات ہوتے ہیں...... محبت، نفرت، حسد، دولت، منشیات یا ان کا کوئی امتزاج۔ کیا ان میں سے کوئی تمہارے معاملے پر لاگو ہوتا ہے مسٹر ویلز؟ کوئی تمہیں اتنے ڈرامائی انداز میں کیوں مارنا چاہے گا؟ محبت، شاید؟ کیا تمہارا مج کے ساتھ تعلق یا کسی اور کے ساتھ؟"

"نہیں...... اس وقت تو نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"پیسے کا مسئلہ ہوسکتا ہے۔" پولارڈ نے لقمہ دیا۔ "کیا تم پر کسی کا بڑا قرض ہے یا تمہیں جوئے کی لت ہے یا اسٹیج پر جانے سے پہلے تم کوئی لائن کھینچتے ہو؟"

"بالکل نہیں۔ اگر کسی پارٹی میں کوئی سگریٹ گھماتا ہے تو میں بس تہذیباً دکھاوا کر لیتا ہوں، بس وہی۔ نشے میں آکر میں سب کچھ گڑبڑ کر دیتا ہوں۔"

"کیسی گڑبڑ؟" کوواکز نے پوچھا۔

"چلو، تم نے تو میری ہسٹری چیک کی ہے نا۔ آج پہلی بار نہیں ہے کہ مجھ پر گولی چلی ہو۔ میں ہائی اسکول کے فوراً بعد افغانستان میں دو ٹورز کر چکا ہوں۔ وہاں کافی مار کھائی پھر میڈیکل ڈسچارج دے کر فارغ کر دیا گیا اور اسی کی مدد سے میں نے ڈراما اسکول جوائن کیا اور ہاں، میں نے پولیس آفیسر پر حملے کے الزام میں کاؤنٹی میں اسی دن گزارے۔"

"یہ بات واقعی ہماری توجہ کا مرکز بنی تھی۔" پولارڈ نے مانا۔ "تمہیں پولیس والوں سے کیا مسئلہ ہے ویلز؟ تمہیں پولیس والے پسند نہیں؟"

"مذاق کر رہے ہو؟ میں نے ٹی وی پر آٹھ اقساط میں پولیس والا کردار ادا کیا ہے۔ وہ کردار مجھے بہت پسند تھا۔"

"تو پھر حملہ کرنے کا الزام کہاں سے آیا؟" جیسے ہی ہم پیٹرول کار میں بیٹھے تو کوواکز نے پوچھا۔ اس بار وہ گاڑی چلا رہی تھی۔ پولارڈ سامنے بیٹھا اور میں اب بھی پچھلی سیٹ پر، مقفل۔

"یہ اس وقت کی بات ہے جب "موٹاؤن پی ڈی" کے پہلے سیزن کے اختتام پر ایک کاسٹیوم پارٹی تھی۔"

"مجھے تو لگا تھا کہ اس شو میں تمہیں مار دیا گیا تھا۔" پولارڈ نے کہا۔

"وہی تو شو بزنس ہے دوستو! میں ابراہام لنکن کے طور پر سو بار گولی کھا چکا ہوں، جولیس سیزر کے طور پر پچاس بار چاقو سے قتل ہوا۔ سمر اسٹاک کالج میں، میں ہفتے میں پانچ راتیں اگلا تھا [illegible] میں مرتا تھا۔ موت کے مناظر ڈرامائی ہوتے ہیں۔ "موٹاؤن پی ڈی" میں مجھے نیشنل ٹی وی پر ایک منٹ اور تیس سیکنڈ کے لیے مرنا پڑا اور اب بھی مجھے اس پر مداحوں کے خطوط آتے ہیں۔ ظاہر ہے مجھے شو چھوڑنے کا دکھ ضرور تھا مگر ہم خوشی منا رہے تھے۔"

"پھر ہوا کیا تھا؟" کوواکز نے پوچھا۔

"میں نشے میں دھت ہو گیا تھا۔ پارٹی کے بعد وردی پہن کر باہر نکلا۔ سڑک پر مجھے رائل اوک کے دو [illegible] پولیس والوں نے روک لیا۔ انہیں لگا کہ میں پولیس کی وردی میں ایکٹنگ کر رہا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ میں وہیں سڑک پر اپنی وردی اتار دوں۔ میں نے بہت مؤدبانہ انداز میں انکار کیا تو انہوں نے مجھے زبردستی پیٹنا شروع کر دیا۔ میں نشے میں تھا اس لیے برا مان گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے پولیس افسر پر حملے کے جرم میں اسی دن جیل جانا پڑا۔ اصل میں وہ دو افسر تھے مگر پلی بارگین میں یہ بات چھپ گئی۔"

"اور افغانستان؟" اس نے ٹٹولا۔ "کیا تم نے وہیں

سیکھا تھا کہ پولیس والوں کو اسپتال کیسے پہنچانا ہے؟''

''وہاں میں نے زیادہ تر یہ سیکھا کہ گولی سے بچنا کیسے ہے، میڈم!''

''تمہیں میڈیکل ڈسچارج ملا۔ تم زخمی ہوئے تھے؟''

''ہاں، بم سے اڑایا گیا۔ ہم دشمن کے گاؤں میں داخل ہو رہے تھے جب ہمارا امجاہد اسکاؤٹ، صدیق ایک تار پر پیر رکھ بیٹھا۔ اس نے بارودی مواد کو فوری طور پر نہیں پھاڑا مگر ہم دیکھ سکتے تھے کہ وہ تار سڑک کے کنارے ایک ڈبے تک جا رہا تھا۔ اگر وہ ہلتا بھی تو خود کو اور آدھی پلٹن کو اڑا دیتا۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''میں [illegible]ت کر کے ہماری ہموی کی ڈرائیور سیٹ پر جا بیٹھا [illegible] گاڑی کو [illegible] پر چڑھا دیا۔ گاڑی نے کچھ دھماکے کو جذب کر لیا مگر میری [illegible]ٹ کو باقی دھماکا لگا۔ یہی ایک راستہ تھا۔'' میں نے کندھے اچکا[illegible] ہوئے جواب دیا۔

''ہم میں سے کوئی [illegible] کرتا۔ میں قریب ترین تھا۔''

''تمہیں سلور اسٹار کے [illegible] نامزد کیا گیا تھا، اس کا کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔ جب میرا انٹرویو ہوا تو میں نے انفرادی تمغے کے بجائے یونٹ اسٹیشن کی درخواست کی [illegible] انہوں نے کہا کہ یہ ممکن نہیں مگر وہ اس پر غور کریں گے۔ بس [illegible] آخری بات تھی جو میں نے سنی۔''

''تم نے کبھی اس کے پیچھے جانے کی کوشش نہیں کی؟''

''میڈم! میں نے پانچ سال اس ملک کو سدھارنے میں ضائع کیے جسے سکندر اعظم بھی ٹھیک نہیں کر سکا۔ میں نے وہاں دوست کھوئے اور آخر میں دشمن جیت لیے۔ میں اسی دن فارغ ہو گیا تھا جب مجھے ڈسچارج پیپرز ملے۔ آپ یہ سب کیوں پوچھ رہی ہیں؟''

''میرے والد تیس سال میرین رہے اور ڈیزرٹ اسٹورم میں مارے گئے، تو مجھے پتا ہے کہ سلور اسٹار کی کتنی اہمیت ہوتی ہے۔ بس یہ جاننے کی کوشش کر رہی ہوں کہ تم کیسے انسان ہو۔ کیا تم نے اپنی پرانی یونٹ سے رابطہ رکھا؟''

''میں نے واپس آ کر کوشش کی تھی لیکن میرے ای میل بلاک ہو گئے اور ڈاک کے لفافے ''ڈیلیوری ممکن نہیں، یونٹ کی لوکیشن خفیہ ہے'' کی مہر کے ساتھ واپس آ گئے۔ کوئی خاص حیرت نہیں، ہماری زیادہ تر مہمات خفیہ تھیں۔ اگر آرمی کا بس چلتا تو وہ سنڈے کارٹونز کو بھی خفیہ کر دیتے۔''

''تمہیں پتا ہے کہ تمہاری یونٹ کا ایک رکن حال ہی میں مرا ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ''مجھے علم نہیں ہے۔ کون......؟''

''آخری نام بورٹوف۔ کیا تم اسے جانتے تھے؟''

میں چونکا اور منہ موڑ لیا۔ ''کمبخت! ہم اسے ''لعل جو'' کہتے تھے۔ وہ روک تھا، ہماری ٹیم کا سب سے نیا بندہ۔ اس کے ساتھ کیا ہوا؟''

''معاف کرنا، اس کی تفصیلات دستیاب نہیں لیکن میں اکثر یہ کوڈ دیکھتی ہوں جب سابق فوجیوں کا ذکر ہوتا ہے۔ زیادہ تر یہ خودکشی کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ غالب امکان ہے کہ اس نے خودکشی کی۔''

''یا خدا!'' میں کراہا۔

''کیا تم کچھ بتانا چاہتے ہو، مسٹر ویلز؟''

''کس بارے میں؟ ایک اور مردہ فوجی کے بارے میں یا اب میں بھی مشکوک ہوں؟ میں وہ آدمی ہوں جسے گولی لگی تھی، یاد ہے؟'' میں نے کہا۔

''یاد ہے اور تمہارے خیال میں ایسا کیوں ہوا؟''

''پہلی بات تو یہ کہ اس نے مجھے براہِ راست نہیں مارا، ہے نا؟ اس نے ابراہم لنکن کو گولی ماری۔''

''لیکن آج کل کے زمانے میں کوئی ابراہم لنکن کو کیوں مارے گا؟ وہ جنگ تو ڈیڑھ صدی پہلے ختم ہو چکی ہے۔''

''یہ جا کر ان مظاہرین سے کہو جو میرے رابرٹ ای لی کے شو پر احتجاج کرتے تھے۔''

''یہ انتخابی سال کی بات تھی اور ویسے بھی یہ معاملہ سیاسی نہیں لگتا، مسٹر ویلز! مجھے نہیں لگتا کہ جس نے تم پر گولی چلائی، وہ کوئی پاگل [illegible] تھا جو سمجھ رہا تھا کہ وہ اصل میں لنکن کو مار رہا ہے۔ وہ بہت چالاک [illegible] یہ سب پلان کر چکا تھا۔ وہ تمہیں مارنا چاہتا تھا، خاص طور [illegible] ایک ایسے منظر میں جہاں سو سے زیادہ لوگ موجود تھے اور [illegible] سب ایک ہی بات بولیں گے...... جان ولکس بوث! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ ایک شاندار چال تھی اور وہ تقریباً کامیاب ہو ہی گیا تھا۔''

''چاہے جتنی بھی منصوبہ بندی کر لے......'' پولارڈ نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔

دونوں میری طرف گھور رہے تھے۔ کوونز مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

''کسی کو بھی چالاک لوگ پسند نہیں آتے، پروفیسر!'' پولارڈ نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''سب کو پسند آتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''مقامی پب میں ٹریویا نائٹ پر تم ہمیشہ اپنی ٹیم میں مجھے ہی چننا چاہو گے۔''

"نہیں، میں نہیں چنوں گا۔ جیسا کہ میں نے کہا، کسی کو بھی چالاک لوگ پسند نہیں۔"

"حتیٰ کہ اگر......؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"کیا؟" اس نے بھویں سکیڑیں۔

"تم بروگن جوتے پہنے ہوئے ہو۔ پولیس افسر بننے سے پہلے تم فوج میں تھے؟" میں نے کہا۔

"درست ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"لیکن تم نے کبھی جنگ کا سامنا نہیں کیا۔" یہ سوال نہیں تھا۔

"میں...... نہیں، میں اوکیناوا میں ایم پی تھا، وولٹورز۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ آفیسر پولارڈ نے کبھی جنگ نہیں دیکھی؟" کوواکز نے پوچھا۔

"اس کی ٹریویا ٹیم سے۔ ایک جنگی یونٹ میں تمہیں دوست نہیں چاہیے ہوتے۔ تمہیں ایسا بندہ چاہیے ہوتا ہے جو دشمنوں کو مارنے میں ماہر ہو کیونکہ جتنے زیادہ وہ مارے گا، تمہارے بچنے کے امکانات اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔ لڑنا ہر کوئی سیکھ سکتا ہے۔ یہ سکھائی جانے والی صلاحیت ہے لیکن کچھ لوگ پیدائشی سپاہی ہوتے ہیں اور وہی بندہ تم اپنی ٹریویا ٹیم میں بھی چاہتے ہو۔ چاہے وہ چالاک ہو یا نہیں۔"

وہ دونوں مجھے اس طرح گھور رہے تھے جیسے میں پاگل ہو گیا ہوں اور شاید تھوڑا ہو بھی گیا تھا۔ میں تقریباً باقی بات زبان سے نکال ہی دیتا۔ مجھے لگتا ہے کوواکز نے محسوس کر لیا کہ میں ایک حد پر کھڑا ہوں لیکن میں ابھی وہاں تک نہیں پہنچا تھا۔

"معاف کیجیے گا میڈم!" میں نے کہا۔ "یہ سر پر لگی چوٹ اب واقعی مجھے تھکا رہی ہے۔ اگر آپ مجھے گرفتار کرنے کا ارادہ نہیں رکھتیں تو کیا آپ مجھے میرے اپارٹمنٹ پر چھوڑ سکتی ہیں؟"

"مجھے لگا تمہیں ہمارے ساتھ کیس پر کام کرنا پسند آ رہا ہے، آفیسر پیٹیلی!" کوواکز نے کہا۔

میری آنکھیں پھیل گئیں۔ "پیٹیلی تو میرا نام تھا، موٹاؤن پی ڈی میں۔ آپ نے وہ دیکھا؟"

"میں نے تمہارا مرنے کا سین گوگل کیا تھا۔ وہ متاثر کن تھا۔"

"اچھا لگا یہ جان کر۔"

"مسٹر ویلز! میں نے یہ نہیں کہا کہ مجھے پسند آیا لیکن تم نے وہ سین اچھا کیا تھا۔"

"شکریہ۔" میں نے کہا۔

کوواکز نے پولارڈ کو اسٹیشن پر اتار کر رمج کے لیے سیکیورٹی کا بندوبست کیا پھر مجھے میرے اپارٹمنٹ لے جانے لگی۔

وہ ڈرائیو کر رہی تھی اور میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا لیکن سفر آرام دہ نہیں تھا اور اس کی وجہ پولیس موبائل کی کھلی دار سیٹ نہیں تھی۔

اس کے بعد ہمارے درمیان کوئی چھوٹی موٹی بات نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ موسم پر بھی نہیں۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ کسی سوچ میں گم تھی جیسے کسی بات پر غور کر رہی ہو۔ مسکراہٹ کا نام ونشان تک نہ تھا اور تب مجھے یاد آیا کہ میں نے اسے ایک بار بھی مسکراتے نہیں دیکھا۔ چنانچہ یہ ایک نارمل بات تھی۔

"آخر کار تنہا ہو ہی گئے۔" میں نے کہا۔

"اور یہ کوئی اتفاق نہیں ہے، مسٹر ویلز! میں نے افسر پولارڈ کو اس لیے چھوڑا ہے کیونکہ اگر وہ سب کچھ سن لیتا جو تم مجھے ابھی بتانے والے ہو، تو وہ تمہیں ایک شریکِ جرم کے طور پر گرفتار کر لیتا...... اور تم یقیناً شریکِ جرم ہو بھی۔"

"اگر تمہارا یہی خیال ہے......"

"یہی ہے جو میں جانتی ہوں، مسٹر ویلز! میں اب تمہارے ساتھ لفظوں کا کھیل ختم کر رہی ہوں۔ واحد وجہ یہ ہے کہ میں تمہیں اس لیے گرفتار نہیں کر رہی۔ مجھے نہیں لگتا کہ اس سے مجھے سچائی ملے گی جو میں جاننا چاہتی ہوں اور دوسرا وہ سلور اسٹار جو تم نے جیتا لیکن تمہیں دیا نہیں گیا۔ میرے لیے ہر وہ شخص جو جنگی علاقے میں وردی پہنتا ہے، ہیرو ہے لیکن تمہارا یہ ہیرو اکاؤنٹ اب اوور ڈرا ہو چکا ہے۔ اب جو بھی بات تم کہو گے، وہ مکمل اور خالص سچی ہونی چاہیے۔ کیا تم جانتے ہو کہ تمہاری جان کا دشمن کون ہے؟"

"نہیں۔" اور یہ مکمل جھوٹ نہیں تھا۔ میں نہیں جانتا تھا۔

"لیکن تمہیں شدید شک ہے، ہے نا؟"

"یقیناً میرے پاس شکوک ہیں، میڈم! لیکن میں کسی کو صرف ایک اندازے کی بنیاد پر پھنسا نہیں سکتا۔ آنیسٹ ایب (ابراہام لنکن) بھی ایسا نہ کرتا۔"

"نہیں۔" اس نے گہری سانس لی۔ "میرا خیال ہے، وہ واقعی نہ کرتا۔"

اس کے بعد ہم پورے راستے خاموش رہے۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا، راہ چلتے لوگوں کو پرکھتا رہا، جان ولکس بوتھ کی تلاش میں...... یا کوئی بھی جو اس کی شکل کا ہو

لیکن یہ سب فضول تھا۔ آج کل ریٹرو ہی لک ایک فیشن ہے۔ ڈاڑھیاں عام ہیں۔ آدھے لوگ لمبے بال، موچھیں، سائڈ برن یا تین دن کی بڑھی ڈاڑھی لیے پھر رہے تھے یا ان سب کے ساتھ۔ میرا ''بوٹ'' ان سب میں گھل مل جائے گا، بالکل غائب۔ ہوسکتا ہے وہ میرے بلاک کے آس پاس گھوم رہا ہو یا میرے دروازے کے پاس کھڑا ہو لیکن وہ وہاں نہیں تھا۔

وہ میرے اپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر درمیانی منزل پر جیسے میرا انتظار کر رہا تھا۔ ہاتھ باندھے ہوئے، بائیں ہاتھ میں پستول آرام دہ انداز میں تھامے ہوئے۔ میں بھول گیا تھا کہ وہ بایاں ہاتھ استعمال کرتا ہے لیکن کئی سال گزر چکے تھے اور [illegible] شکل بہت بدل لی تھی۔ اسٹیج پر وہ جان ولکس بوٹ کی [illegible] لگتا تھا لیکن اب اس نے جبڑا بڑھانے والا پرو [illegible] وہ بندوقچیوں جیسی چھوٹی ڈاڑھی اتار دی تھی۔ اب [illegible] کے کسی ہی جیسا لگتا تھا۔ ہمارے دور کے لیے [illegible] اور بھیس بدلنا تو ویسے بھی اس کی مہارت تھی۔ ٹیری [illegible] ایک اسٹار تھا۔ اگر اسے تھوڑا سا میک اپ اور دو منٹ [illegible] تو خود کو کسی چٹان یا پھول کی جھاڑی میں بھی بدل سکتا تھا۔ یا [illegible] ولکس بوٹ میں۔

''ٹیری۔'' میں نے اس سے کچھ قدم نیچے رک کر [illegible] گردن ہلائی۔ ''مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ شاید تم ہی ہو گے۔''

''سارجنٹ ویلز؟''

''نہیں، میں تو بس یہ سوچ رہا تھا کہ میرے علاوہ کون اور اتنا پاگل ہوسکتا ہے کہ پانچ سو لوگوں کے سامنے قتل کی کوشش کرے۔''

''میں نے قتل مکمل نہیں کیا۔ میں چوک گیا۔'' اس نے پستول کی طرف اشارہ کیا۔

''زیادہ نہیں۔'' میں نے پیشانی پر بندھی پٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بس ایک یا دو انچ۔''

''ایک انچ کی چوک، ایک میل کے برابر ہوتی ہے۔'' اس نے ناک بھوں چڑھا کر کہا اور ننھا پستول ہلایا۔ ''یہ ہتھیار ہی فضول ہے۔ اسے تاش کی میز کے پار بندے کو مارنے کے لیے بنایا گیا تھا، تین یا چار فٹ، بس۔ نیا ہوتا تب بھی زیادہ ٹھیک نہیں تھا اور یہ تو ڈیڑھ سو سال پرانا ہے۔ یہ بائیں طرف جھول جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ تم آج مردہ نہیں ہو، ایب! پھر جب ہم گتھم گتھا ہو رہے تھے، تب ہی یہ چل گیا اور میری ٹانگ میں لگ گیا۔'' اس نے اپنی ران پر کولہے کے نیچے ہاتھ مارا اور چھو جانے سے خود ہی تکلیف سے کراہا۔ اب پستول کا رخ میری طرف نہیں تھا لیکن فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں نے اسے ہزار یارڈ دور سے ہدف گراتے دیکھا تھا۔ وہ اب کی بار نہیں چوکے گا۔

''دراصل تم خوش قسمت ہو کہ میں نے تمہیں گولی ماری۔'' کروکیٹ نے کہا۔ ''میں تو تمہیں زندہ چھوڑنے کا سوچ بھی نہیں رہا تھا۔''

''تمہیں ختم کر دینا چاہتا تھا۔ مجھے افسوس نہیں کہ تم بچ گئے۔ بعد میں، میں نے سوچا، شاید تمہیں تو ویسے مرنے میں مزہ ہی آتا، ایک بڑی تماش بین بھیڑ کے سامنے، اتنے ڈرامائی انداز میں۔ لوگ شاید سو سال بعد بھی وہ ویڈیو دیکھ رہے ہوتے۔ ابراہم لنکن دوبارہ مر گیا۔''

میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ ٹیری ہمیشہ سے آدھا پاگل رہا ہے اور ہم سب کو خوشی تھی کہ وہ ایسا ہی ہے لیکن اب؟

''ولفل جو مر گیا۔'' اس نے کہا۔ ''اس نے اپنے سیل میں پھندا لگا لیا۔ تمہیں پتا تھا؟''

میں نے سر ہلایا۔ ''آج ہی سنا، پولیس والوں نے بتایا۔''

''ہاں، تم اور تمہارے پولیس دوست۔ ہم ''موٹا ڈن لی ڈی'' دیکھا کرتے تھے جیل میں، دن کے وقت، میں اور لفل جو۔''

''جیل؟'' میں نے دہرایا۔ ''تم بند تھے...... کیوں؟''

''[illegible] سامنے یہ ایکٹنگ مت کرو کوری! تمہیں اچھی طرح [illegible] ہوں۔'' وہ ناگواری سے بولا۔

''خدا [illegible] نہیں پتا۔ دیکھو، مجھے ہلمند میں دھماکے میں اڑا دیا گیا تھا اور آج تم نے میرے سر میں گولی ماری۔ فرض کر لو اس [illegible] یادداشت تھوڑی سی متاثر ہوگئی ہے۔ اگر تم مجھے مار [illegible] ہو تو کم از کم اتنا بتا دو، کیوں؟'' میں نے کہا۔

''کیوں...... ؟ سنو پھر...... تم اور صدیق جب دھماکے میں اڑ گئے، تمہیں اعزازات [illegible] اور صدیق کو دفنا دیا گیا۔ اس کے جنازے پر اس کی ماں میرے پاس آئی۔ اس کے گاؤں کے لوگ جانتے تھے کہ وہ ہمارے ساتھ کام کر رہا تھا اور جب دشمن قبضہ کریں گے، جو ہونے ہی والا تھا، تو وہ اس کے پورے خاندان کو ذبح کر دیں گے۔ اس کی ماں نے مجھ سے منت کی کہ میں اگلے مشن پر انہیں اپنے ملک لے جاؤں اور بچا لوں۔''

''اور تم لے گئے؟''

''وہ صدیق کی ماں تھی، یار! اس کا بیٹا ہمارے لیے لڑتے ہوئے مرا تھا۔ میں انکار کیسے کرتا؟''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ انکار نہیں کرسکتا تھا اور میں بھی یہی کرتا۔

''پھر کیا ہوا؟''

''اگلے مشن پر صدیق کی ماں اور درجن بھر رشتے دار آگئے، اپنے دنیا بھر کے سامان کے ساتھ، ٹوکریوں میں بچے، بکریاں اور گھر کی بنی ہوئی افیون۔ میں نے نہیں پوچھا کہ کیا لائے تھے۔ وہی ان کے پاس تھا۔ تم سمجھتے ہو؟''

میں سمجھتا تھا۔

''دلارام سے ... کلومیٹر دور ہماری پہلی گاڑی بارودی سرنگ سے ٹکرائی ... مکمل اڑ گیا۔ گھات لگا کر حملہ ہوا۔ ہم سارا دن ... صدیق کے لوگ بکھر گئے، جان بچانے کے لیے بھاگے، اپنا سامان ہماری گاڑیوں میں چھوڑ گئے۔ جب ... ٹیم ہمیں واپس گھسیٹ کر لائی تو انہوں نے میری گاڑی سے ... ہیروئن نکالی۔ ہم سب پر افیون اسمگل کرنے کا الزام لگا دیا گیا، تمہاری مہربانی سے۔''

''میری وجہ سے؟'' میں حیران ہوا۔

''چھوڑو، کوری! بکواس مت کرو۔ ایم پیز نے ہمیں تمہاری تصویریں دکھائیں۔ تم بستر میں پڑے کسی بڑے افسر سے ہاتھ ملا رہے تھے، ہمیں نیچے کچل کر خود باہر نکلنے کے لیے۔ میں نے تصویریں خود دیکھی ہیں، ہم سب نے دیکھی تھیں۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ تم نے کیا کہا تھا۔''

''میں نے......؟ میں نے ایک بار کچھ افسران سے بات کی تھی لیکن اس کا افیون سے کوئی تعلق نہ تھا۔''

''پھر کیا بات کی تھی؟'' اس نے سوال کیا۔

''بات ایک تمغے کی تھی۔'' اور جیسے ہی میں نے یہ کہا، مجھے خود محسوس ہوا کہ یہ کتنی بے معنی سی بات لگ رہی ہے۔

''کون سا تمغہ؟ دکھاؤ مجھے۔'' اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''مجھے نہیں ملا، ٹیری! میں نے یونٹ اسٹیشن کی درخواست کی تھی۔ انہوں نے کہا کہ یہ ممکن نہیں۔ اب سمجھ آیا کیوں۔''

''اوہ، تو یہی ہے تمہاری کہانی؟ ایک تمغہ جو تمہیں نہیں ملا؟ ایک فنکار آدمی ہو۔ تم سے کچھ بہتر کی امید تھی لیکن اگر یہی کچھ ہے تمہارے پاس؟'' اس نے پستول اٹھایا۔

میں ان جڑواں نالیوں کی طرف دیکھ رہا تھا جو مجھے ریلوے سرنگوں جتنی بڑی لگ رہی تھیں۔

''اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو یہ کبھی نہ کرتی۔'' کوواکز نے کہا جو سیڑھیوں کے اوپر اندھیرے سے نکلتی ہوئی آرہی تھی۔ ''گن نیچے رکھ دو۔''

''اوہ، بالکل نہیں۔'' ٹیری نے گن میرے ماتھے کے بیچوں بیچ رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں ایسا کیوں کروں، بے بی؟''

''کیونکہ میری گن میں تمہاری دو گولیوں کے مقابلے میں چودہ ہیں۔'' اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ''حساب لگالو۔''

''کوئی ضرورت نہیں۔ میرے پاس ایک گولی ہے ''آنرسٹ ایب'' کے لیے اور دوسری تمہارے لیے، جب تک تم مجھے پہلے نہ ماردو۔ بات یوں ہے، چاہے جو بھی ہو، تمہارے پاس کتنی بھی ہوں، فرق نہیں پڑتا، ہے نا؟''

''ایب کو مارنا غلطی ہوگی۔ اس نے تمہیں دھوکا نہیں دیا، مسٹر کروکیٹ! شاید پہلے بھی نہیں اور آج تو بالکل بھی نہیں۔''

''یہ کہہ رہی ہے اس کی پولیس والی دوست جس کی گن میرے سر پر ہے۔ کیا اس نے تمہیں یہاں پلانٹ کیا ہے؟''

''میں یہاں ہوں کیونکہ میں اپنے کام میں ماہر ہوں، مسٹر کروکیٹ! جہاں تک مسٹر ولیز کا تعلق ہے، مجھے پورا یقین ہے کہ اس نے چند گھنٹے پہلے ہی پہچان لیا تھا کہ تم کون ہو لیکن اس نے تمہارا بھانڈا نہیں پھوڑا۔ تم نے اس پر حملہ کیا، اس کی دوست کو زخمی کیا پھر بھی اس نے مجھے اشارہ تک نہ دیا۔ مجھے چاہیے تھا کہ اسے شریک جرم مان کر گرفتار کرلیتی لیکن میں نے اسے ... دیا تاکہ تم پکڑے جاؤ اور لو، تم آگئے۔''

''زیادہ دیر کے لیے نہیں۔'' ٹیری نے تکلیف سے کراہتے ہوئے کہا، جیسے ہی وہ کھڑا ہوا۔ ''میں تمہیں نقصان نہیں پہنچانا چاہتا، ... میں مزید قید نہیں کاٹنے والا۔ تو اگر تم مجھے ابھی یہیں ... تو میں جا رہا ہوں۔'' وہ ہر قدم پر منہ بگاڑتا سیڑھیوں ... جانے لگا۔

''رک جاؤ ورنہ میں گولی ماردوں گی۔'' کوواکز نے اس کے پیچھے آتے ہوئے کہا۔

''نہیں، گولی مت چلانا۔'' جیسے ہی وہ میرے ... اس سے گزرا، میں نے اس کی کلائی پکڑلی اور اسے ... روک دیا۔ ''تمہارے پاس اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں اور میں گواہی نہیں دوں گا۔''

''وہ خطرناک ہے، مسٹر ولیز!'' اس نے میری طرف دیکھا۔

''وہ افغانستان میں بھی خطرناک تھا اور انہیں اسی پر تمغے دیے گئے اور ہم باقی سب ہر رات خدا کا شکر ادا کرتے تھے کہ وہ خطرناک ہے کیونکہ وہ جتنے دشمن مارتا، ہماری ایک اور دن جینے کی امید بڑھ جاتی۔''

''اس نے تمہاری دوست کو زخمی کیا اور تمہیں گولی

ماری۔'' اس نے جیسے یاد دلایا۔

''پہلا حادثہ تھا، دوسرا غلط فہمی۔ جنگ کی دھند سمجھ لو۔ اصلی جان ولکس بوث ایک جھوٹا اداکار تھا، میری طرح۔ ٹیری ایک سپاہی ہے، بہترین سپاہی۔ تم نے کہا تمہارے والد ایک کامبیٹ میرین تھے۔ وہ ٹیری کو سمجھ جاتے۔ اس آدمی سے غلطی ہوگئی۔ اسے اس سے آزاد ہونے دو، پلیز!'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''یہ میرا فیصلہ نہیں ہے۔'' وہ ہچکچائی۔

''بالکل تمہارا فیصلہ ہے۔ تم نے یہ فیصلہ اس وقت کرلیا تھا جب تم نے مجھے یہاں اتارا۔ تم نے مجھے چارا بنایا۔ تم نے اندازہ لگالیا کہ وہ شاید مجھے یہاں تک فالو کرے گا اور وہ آیا اور تم [illegible] انتظار میں تھیں۔ تم اتنی جلدی یہاں کیسے پہنچ گئیں، فار [illegible]؟''

اس نے اس [illegible] انکار نہیں کیا۔

''دیکھو، اس نے پہلے [illegible] فوجی سروس کی، پھر جیل کاٹ لی۔ بس بہت ہوگیا۔ اسے جانے دو۔ اسے اپنا راستہ خود ڈھونڈنے دو۔''

اچانک ایک جھٹکے سے اس نے میری گرفت سے اپنی گن چھڑوالی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے لگا کہ وہ [illegible] گولی ماردے گی مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے [illegible] سانس لی اور پوری طرح مجھ پر نظریں گاڑے رکھیں پھر آہستہ آہستہ اپنا پستول نیچے کرلیا اور ٹیری کو سیڑھیاں اترتے ہوئے دیکھتی رہی۔

''آپ کی ٹانگ سے خون بہہ رہا ہے، مسٹر بوث!'' اس نے پیچھے سے پکارا۔ ''آپ کو اسپتال جانے کی ضرورت ہے۔''

''اسپتال والے گولی لگنے کے مریضوں کی رپورٹ کرتے ہیں، مس! میں کابل کے ایک میڈک کو جانتا ہوں۔ وہ میرا بندوبست کردے گا۔'' اس نے جواب دیا۔

''پاگل۔'' اس نے سرہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم دونوں۔''

''ہم نے افغانستان میں سروس کے لیے خود کو رضاکارانہ طور پر پیش کیا تھا۔'' میں نے کندھے اُچکائے۔ ''ہم کتنے ہوش مند ہوسکتے تھے؟''

ٹیری دروازے سے باہر نکلا اور ہجوم میں غائب ہوگیا۔ وہ اب بوث نہیں تھا، بس ایک اور عام آدمی جو دن بھر کی مشقت کے بعد گھر جارہا تھا۔ وہ غائب ہونے کا ماہر تھا اور باقی سب میں اس سے بھی بہتر اور میں ہمیشہ اس کے لیے شکرگزار رہوں گا۔

''میں ضرور پاگل ہوگئی ہوں۔'' کوواکز نے کہا..... لیکن بغیر مجھے گولی مارے اس نے اپنا پستول ہولسٹر میں ڈال لیا۔

''شکریہ۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے ایک درست کام کیا۔''

''مجھے اس کا یقین نہیں۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔ ''میری مدد کرو، ایک بات بتاؤ۔ اصلی جان ولکس بوث کا کیا ہوا تھا؟''

''اسے ورجینیا میں ایک جلتے ہوئے کھیت کی جھونپڑی میں بارہ دن بعد گولی ماردی گئی تھی۔ کیا میں ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟ تم نے کہا تھا کہ تمہیں میرا موت کا سین پسند نہیں آیا، اس میں کیا خرابی تھی؟'' میں نے اس کی طرف رخ موڑا۔

''سچ پوچھو تو تم بہت...... خوبصورتی سے مرے۔'' اس نے کہا۔ ''مرتے وقت بات کرنے کی کوشش کرتے ہوئے۔ ایک لمحے کو تم نے مجھے واقعی یقین دلادیا تھا۔ دل ٹوٹ سا گیا تھا۔ خیر، تھوڑا سا ہی۔''

''واہ، لگتا ہے کہ اس میں کہیں نہ کہیں تعریف چھپی ہوئی تھی۔ کیا میں ایک احسان مانگ سکتا ہوں؟''

''اپنے لیے یا اس ہم شکل کے لیے جو ابھی گیا؟ اس کا نام کیا تھا، ویسے؟ مجھے یاد نہیں آرہا۔''

''مجھے بھی نہیں۔ شکریہ۔''

''اوہ، احسان مفت نہیں ہوتے، مسٹر ویلز! ڈی کینڈر پر ایک پولیس والوں کا بار ہے ''ہوگنز ہیروز......'' کیا تم اسے جانتے ہو؟''

''بس [illegible] گزرا ہوں وہاں سے، شاید۔ کیوں؟''

''[illegible] رات [illegible] مقابلہ ہے، پریسنکٹ کا ٹریویا فائنل اور میری ٹیم ایک بندے کی کمی کا شکار ہے۔''

''میں نے سنا [illegible] ہوشیار بننے والے لوگ پسند نہیں؟''

''میرے پارٹنر کو نہیں [illegible] وہ میری ٹیم میں نہیں ہے۔ میں واقعی چاہتی ہوں کہ آج [illegible] یہ مقابلہ جیتا جائے اور میرا تم پر بہت بڑا احسان واجب ہوچکا ہے کیونکہ میں نے تمہارے ہم شکل کو جانے دیا۔ تو...... کیا [illegible] کہتے ہو؟''

''لوئی......!'' میں نے اپنی بھرائی ہوئی آواز [illegible] ہمفری بوگارٹ کی نقل کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں یہ ایک خوبصورت دوستی کی شروعات ہے۔''

ٹھیک ہے، شاید یہ بوگارٹ کی سب سے اچھی نقل نہیں تھی لیکن اس سے مجھے ایک مسکراہٹ ضرور ملی۔

یہ پہلا موقع تھا جب میں نے واقعی کوواکز کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔

✻✻✻



# کھٹا سورج

نعمان اسحاق

عورت کو کھلونا سمجھ کر برتنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ اسے آگے کن کن مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے... اور اگر اس سے اولاد بھی ہوجائے اور وہ بھی لڑکی تو مصائب انہیں بری طرح شکنجے میں کس لیتے ہیں... وہ صاحب حیثیت باپ کی اولاد ہوتے ہوئے بھی دربدر تھی... پھر حالات نے اس سے کچھ ایسا عمل کرادیا جس کا اس نے سوچا بھی نہ تھا۔

## خوشیوں سے محروم ایک لڑکی کی دکھ بھری داستان

سہ پہر شام میں بدلنے کو تیار تھی۔ موسم کی خنکی بڑھتی جارہی تھی۔ دروازے پر نظریں لگائے مریم کی نگاہیں اب تھکنے لگی تھیں مگر جلیل نے وعدہ کیا تھا کہ وہ آج آئے گا اور ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ جلیل نے وعدہ وفا نہ کیا ہو۔

''اندر آجاؤ۔ آج نہیں آتے تمہارے ابا۔'' نسیم نے رسوئی سے جھانک کر کہا مگر مریم نے ماں کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ نسیم یوں بھی بہت زیادہ یاسیت کا شکار رہتی۔ مثبت باتوں کا اگر کبھی اس کی زندگی میں گزر ہوا بھی تھا تو وہ ماضی کی باتیں تھیں۔ اب وہ خود بھی مایوس رہتی اور مریم کو بھی شاید مایوس دیکھنا چاہتی تھی۔ یوں ہی دروازہ دیکھتے دیکھتے آج کی ٹیوشن پر جو کچھ ہوا، ایک یاد کی طرح سے اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا۔ یوں بھی تو کہا جاتا ہے، واقعہ ایک دفعہ رونما ہوتا ہے مگر یاد بن کر کئی دفعہ آنکھوں کے سامنے سے گزرتا ہے۔ مگر یہ واقعہ تو اس قدر رونما ہوا کہ مریم کو نشر مکرر لگتا۔ ہاں البتہ تکلیف اب بھی نئی دے جاتا۔ اس زمانے میں اسکول عام نہیں تھے۔ بچے پڑھی لکھی بیبیوں

سے کچھ پڑھنا لکھنا سیکھ جاتے۔ ان کے محلے میں بچے باجی فضیلہ کے پاس پڑھتے تھے۔ آج بھی پچھلی کئی دفعہ کی طرح ہونٹ گھما گھما کر نصرو اسے دیکھتے ہوئے کہہ دیتی۔ ضبط کی انتہا کو چھوتے ہوئے اس نے باجی سے کہہ دیا۔

"باجی! نصرو مجھے گالی دے رہی ہے۔"

"نصرت! تجھے کتنی دفعہ کہا ہے۔ کیوں زبان کالی کرتی ہے۔ میں کہے دیتی ہوں، یہ زبان ایک دن تجھے جہنم پہنچا کر دم لے گی۔" باجی فضیلہ اکتائی ہوئی تھیں۔

"باجی! میں نے تو کچھ نہیں کہا۔ یہ مریم کے کان بجتے ہیں۔" نصرو کھی کھی کر کے ہنسنے لگی۔ باجی فضیلہ بڑبڑا کر خاموش ہو گئیں اور نصرو جو پہلے محض ہونٹوں کو ہلا ہلا کر بے آواز کہہ رہی تھی، اب دوبارہ اس نے مریم کے کان میں گھس کر کہا۔

"حرام زادی۔" مریم ہمیشہ کی طرح سکتہ زدہ ہو گئی۔

"یہ گالی نہیں، حقیقت ہے...... کھی کھی کھی۔" کہہ کر نصرو ہل ہل کر اپنا سبق دہرانے لگی۔

دروازے پر کھٹکا ہوا تو مریم اپنے خیالات سے چونکی۔ آنے والا جلیل تھا۔ باپ کو دیکھتے ہی مریم سرشار ہو گئی۔

"ابا!" وہ دوڑ کر گئی۔ جلیل نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ تبدیلی بھی اب کی تھی۔ پہلے جلیل اس کو گلے لگاتا اور چومتا مگر اب جب مریم بڑی ہو گئی تھی تو محبت کا اظہار تبدیل ہو گیا تھا۔ جلیل حسب معمول دو ہفتے بعد آیا تھا اور مریم کے لیے کئی کھانے کی چیزیں لایا تھا اور چونکہ مریم اب بڑی ہو چکی تھی اس لیے محض کھانے کی چیزوں سے خوش نہ ہوتی۔ چوڑیوں، پونی کلپ کا بھی تقاضا کرتی۔ جلیل کے لائے ہوئے سامان میں یہ چیزیں بھی تھیں اور بدلتے موسم کے تناظر میں نسیم کے لیے گرم شال بھی۔ جسے ایک نظر دیکھنے کے بعد نسیم نے بے رخی سے کرسی کی جانب اچھال دیا۔

"چائے پلا دو۔" جلیل نے کہا تو نسیم پانی کا گلاس لے آئی۔

"دودھ ختم ہو گیا ہے۔" نسیم کی بے رخی برقرار تھی اور یہ تھا بھی جھوٹ۔ رسوئی میں کلو بھر دودھ موجود تھا۔

"مجھے...... پندرھویں سالگرہ پر آپ اپنے ساتھ ڈھاکا لے چلیے گا۔" مریم باپ سے لاڈ کرنے لگی۔

"وہاں کے حالات بہت خراب ہیں۔ آزادی کے متوالے اب مغرب کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے۔ یوں لگتا ہے الگ ملک لے کر رہیں گے۔" جلیل اسے بہلانے لگا۔

نسیم کے لبوں پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ ابھری۔ حالات بھی محض مریم کے لیے خراب تھے۔

"آپ مجھے نہ لے گئے تو میں خود آ جاؤں گی۔" مریم ضد سے کہنے لگی۔

"خبردار! جو تم خود سے گئیں، میرا مرا ہوا منہ دیکھو گی۔" نسیم نے تیزی سے اسے ٹوکا۔ یہ تو معمول تھا۔ جب بھی مریم ڈھاکا باپ کے گھر جانے کی ضد کرتی تو وہ اپنے مرنے کو درمیان میں لے آتی۔ مریم منہ بسور کر رہ گئی۔ جاتے جاتے جلیل نے کچھ رقم نسیم کی ہتھیلی پر رکھی۔ مریم کو کسی کام کے بہانے اندر بھیج کر نسیم جلیل سے گویا ہوئی۔

"محض پیسے باپ کا بدل نہیں ہو سکتے۔ مریم بڑی ہو رہی ہے۔ ان پیسوں اور دو ہفتے بعد ایک ملاقات سے کچھ زیادہ کا سوچیں۔" نسیم کے لہجے کی کڑواہٹ برقرار تھی۔

☆☆☆

مریم اور نسیم دونوں ماں بیٹی میر پور میں قیام پذیر تھے۔ تب ڈھاکا آج کے ڈھاکا کی طرح بے انتہا پھیلا ہوا نہ تھا۔ میر پور کو مضافات سمجھا جاتا۔ مریم کی زندگی اسی چھوٹے سے گھر اور آس پاس کے چند گھروں میں کھیلتے کودتے گزری تھی مگر وقت کے ساتھ اپنے بارے میں تضحیک آمیز باتیں سن کر اس کا آس پاس کے گھروں میں جانا کم ہوتا گیا۔ ایک باجی فضیلہ تھیں جو اس سے محبت رکھتیں۔ وہ ایک نیک سیرت بیوہ خاتون تھیں۔ سلائی کر کے اور علاقے کے بچوں کو پڑھا کر گزر بسر کرتیں۔ نسیم اور جلیل کے بعد اگر کوئی تیسرا شخص اس کی زندگی میں اہمیت کا حامل تھا تو وہ فضیلہ باجی تھیں۔ وہ خود بھی باجی کی پسندیدہ تھی۔ ایک دفعہ باجی نے اسے تحفے میں سنہری غلاف والا قرآن پاک دیا۔ مریم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بہت خوشحال زندگی تو جلیل کے ہر دو ہفتوں بعد آنے والے پیسوں سے وہ بھی نہیں گزار رہے تھے مگر باجی کی زندگی تو بالکل کسمپرسی کی مثال تھی اور اس پر وہ قانع اور شکر گزار تھیں۔ یہ قرآن انہوں نے کیسے لیا ہوگا، مریم کو اندازہ تھا۔

"اپنے جہیز میں رکھنا۔" آنکھوں میں نمی لیے وہ جھینپ گئی۔ چہرہ گلال ہو گیا۔ یہ پچھلے سال کی بات تھی جب وہ چودہ سال کی تھی اور آج وہ پندرہ سال کی ہو گئی تھی۔ نیا سال، نئی زندگی اور نئی خوشیاں...... نئی خوشیوں کو کشید کرنے کے لیے ہی وہ ڈھاکا چل دی۔ اسے بڑی سڑک پر جا کر بس لینا پڑی۔ بس میں اس کا دل بڑے زور سے دھڑک رہا تھا۔ نسیم کا اپنا مرا ہوا منہ دیکھنے کی باتیں بازگشت کی طرح گونجتی رہیں مگر وہ اپنی ماں کی مایوس فطرت سے واقف تھی۔ وہ غصہ ہو گی مگر آخر ماں ہے، ڈانٹ ڈپٹ یا شاید ایک آدھ تھپڑ کے

بعد پہلے سی ہو جائے گی۔ بس نے اس کی ایما پر اسے متی جھیل اتارا۔ وہ ایک راہ گیر سے اپنے باپ کے گھر کا پتا پوچھنے لگی۔ جلیل اتنا بڑا سیٹھ تھا کہ راہ گیر بھی جانتا تھا کہ اس کا گھر کہاں ہے۔ اور جب مریم راہگزر کی بتائی ہوئی گلیاں اور دوراہے پار کر کے اس گھر تک پہنچی تو جیسے اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ وہ گھر نہیں، بنگلا تھا جس کے باہر ایک گارڈ بیٹھا تھا جس نے اسے اندر ہی نہ جانے دیا۔

''میں ان کی بیٹی ہوں۔'' اسے تعارف کروانا پڑا۔

''پاگل سمجھ رکھا ہے؟'' گارڈ نے مریم کو پاگل جانا۔

''آپ پوچھ لیں بے شک۔'' جب مریم ضد کرنے لگی تو گارڈ نے اندر پیغام پہنچا دیا۔ کچھ دیر بعد لمحے بھر کے لیے بالائی منزل کے کمرے کا پردہ ہلا اور دروازے پر کھڑی مریم نے کھڑکی میں جلیل کو کھڑا پایا۔ پردہ دوبارہ برابر ہو گیا اور اندر سے ملازم پیغام لایا۔

''سیٹھ صاحب کہہ رہے ہیں یہ لڑکی دیوانی محسوس ہوتی ہے۔ یہ پیسے بھیجے ہیں اور کہا ہے اس لڑکی کو چلتا کرو۔'' گارڈ نے نخوت سے پیسے مریم کے ہاتھ میں تھما دیے۔ اندر بالائی کمرے کے پردے کے پار زبیدہ جو سیٹھ جلیل کی بیوی تھی، گھٹی گھٹی آواز میں چلا رہی تھی۔

''دروازے پر آ گئی ہے تمہاری ناجائز اولاد۔ اب جا کر اسے سینے سے لگاؤ اور اس گھر میں حصہ بھی دو۔''

''خبردار! جو تم نے آواز اونچی کی۔ ابھی کھڑے کھڑے طلاق دے دوں گا۔'' جواباً جلیل نے گرج کر کہا۔

''کیا کمی تھی مجھ میں جو تم اس بنگالن نوکرانی نسیم کے ساتھ رنگ رلیاں منانے چلے گئے اور بچہ بھی کر لیا...... ہونہہ ......حرام زادی ماں، حرام زادی بیٹی......!'' زبیدہ بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے چلی آئی۔ یہاں رکتی تو کیا پتا کیا کہہ دیتی اور مرد ذات کا کیا بھروسا۔ جو نوکرانی کے ساتھ گل کھلا سکتا ہے، وہ واقعی کھڑے کھڑے طلاق بھی دے سکتا ہے۔

مریم نے واپسی کا سفر پیدل طے کیا۔ میرپور، متی جھیل سے میلوں فاصلے پر تھا۔ وہ روتی رہی اور چلتی رہی۔ وہ ناجائز تھی پھر کیونکر جائز محبت کی دعویدار بن گئی اور ملا کیا؟ یہ پیسے۔ اس نے مٹھی کھول کر پیسے دیکھے اور یونہی ہوا کے سپرد کر دیے۔ چار گھنٹے چل کر جب وہ اپنے گھر کے دروازے تک پہنچی تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ آگے پردہ حائل تھا۔ وہاں جلیل نے خود سے پردہ ہٹا کر اسے دیکھا تھا اور پھر برابر کر دیا تھا۔ باپ کو پردے کے پار دیکھ کر اس کے دل سے آہ نکلی تھی۔ یہاں تیز ہوا چلی اور پردہ لمحے بھر کو سرکا اور پھر دوبارہ برابر ہو گیا۔ پردے کے پار جو کچھ اس نے دیکھا تو اس کی جان ہی نکل گئی۔ نسیم پھندا لگائے دالان کے بیچوں بیچ لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا کہا سچ کر دکھایا تھا۔ ادھر وہ ڈھاکا کی اور گئی، ادھر نسیم کا مرا ہوا منہ دیکھنے کو ملا۔

☆☆☆

اور پھر وہ ہوا جس کی مریم نے ہمیشہ خواہش کی تھی۔ وہ جلیل کے ساتھ اس کے گھر میں رہنے لگی۔ وہ گھر کیا تھا، ایک عالیشان بنگلا تھا۔ بہت بڑا اور پرتعیش۔ مگر وہ کیا ہے نا، انسان اپنے نفع نقصان کو پہچان نہیں پاتا اور ان خواہشوں میں وقت گزار دیتا ہے جن کے ملنے پر ہی احساس ہوتا ہے کہ وہ تو محض ایک سراب تھیں۔ ماں کو تو وہ کھو ہی چکی تھی، باپ کا بھی اس نے ساتھ کھو دیا۔ جلیل جو پندرہ دن بعد سہی مگر باپ بن کر ملتا، اب ایک اجنبی بن کر رہتا۔ اسے یوں نظر انداز کرتا جیسے وہ منظر میں ہے ہی نہیں۔ چند سال پہلے تک مریم کی بڑی تمنا تھی کہ اس کے ہاتھ سلیمانی ٹوپی لگ جائے اور وہ حاضر ہو کر بھی غائب رہے۔ اب تو سلیمانی ٹوپی کے بغیر ہی وہ حاضر ہو کر بھی غائب ہوتی مگر دل تھا کہ کٹتا جاتا۔ اتنا بڑا عالیشان بنگلا تھا اور تھا بھی اس کے باپ کا مگر اس پر تنگ تھا۔ زبیدہ کا سلوک اس سے ملازموں سے بھی بدتر تھا اور وہ بند کمرے میں شوہر کے ساتھ تسلسل سے لڑتی رہتی۔ خود کو آئینے میں دیکھتی اور ششدر رہ جاتی۔ زبیدہ بنگالن نہیں تھی اور خوب گوری چٹی تھی مگر پھر بھی کیسے اس کا مرد ایک کالی بنگالن کی زلفوں کے نیچے وقت گزارتا رہا۔ وہ خود تو مر گئی، مریم نامی تحفہ چھوڑ گئی۔ اس کا بھی گلا گھونٹ دیتی۔

جلیل خود لوگوں سے چھپنے لگا۔ مریم کے کالے چہرے پر جلیل جیسی آنکھیں دیکھ کر اس کے ماتحتوں کو چہ میگوئیوں پر اکساتیں۔ اس سب کا صحیح حل زبیدہ نے ڈھونڈا۔ تیس سالہ نصیر اس کا دور کا رشتے دار تھا۔ رنڈوا تھا اور اوپر سے غریب۔ شادی کے لیے کوئی لڑکی یا عورت میسر نہ تھی۔ مغرب کے سب سے بڑے شہر کراچی کے کسی گنجان علاقے میں رہتا تھا جس کا نام بھی زبیدہ کو یاد نہ تھا۔ زبیدہ نے تار بھیج کر نصیر کو بلایا۔ کاروبار کے لیے خطیر رقم دی اور پندرہ سال کی مریم کا تیس سالہ نصیر سے نکاح پڑھوا دیا۔ نکاح کی تقریب میں فضیلہ باجی بھی آئیں۔ انہوں نے نیگ میں جو پیسے دیے، وہ مریم انہی کے دیے سنہری غلاف والے قرآن میں رکھ کر کراچی آ پہنچی۔ چند ماہ ہی گزرے تھے کہ پاکستان دولخت ہو گیا۔ مشرقی بنگلا دیش بن گیا مگر بنگالن مریم پاکستانی ٹھہری۔ ملک کے اس اسقاط پر زبیدہ نے

سکون کا سانس لیا۔ اب مریم دوسرے ملک کی شہری تھی۔ ابھی تو مابعد جنگ اور تسلیم کے مسائل تھے۔ یہ حل ہو گئے تو بھی آنا جانا پاسپورٹ اور ویزے کا پابند ہوگا۔ اب یہ نجس دوبارہ سے ایک دن اچانک ان کی زندگی پلید کرنے نہیں آسکے گی۔ خس کم جہاں پاک۔

☆☆☆

مریم یہ خیال لے کر کراچی آئی تھی کہ ایک دن نسیم کی طرح ہمت کر کے پنکھے سے لٹک جائے گی مگر اس کی ازدواجی زندگی اتنی حسین ہوگی، یہ اس کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا۔ میر پور میں اس کی ساری زندگی کونے کھدروں میں "ناجائز، ناجائز" سنتے گزری تھی اور متی جھیل میں جلیل کے گھر بیٹھے رہنا تو جہنم میں رہنے جیسا تھا مگر یہاں اس کا تعارف نصیر کی بیوی تھا اور وہ آس پڑوس سب میں عزت کی مستحق ٹھہری تھی۔ نصیر کی اپنی دوسری شادی بڑی دقتوں سے ہوئی تھی اور اس شادی نے اسے اتنا مالا مال کیا تھا کہ اب اس کی اپنی جوتوں کی دکان تھی۔ اس کے پیسے کالا ہونے کے باوجود نصیر کا التفات اس کا نصیب ٹھہرا۔ وہ خوش رہنے لگی اور خوشی تب بڑھی جب اس کا پاؤں بھاری ہوا۔ پڑوس میں عمر صاحب کی بیوی ثریا رہتی تھی۔ وہ مریم کی اچھی سہیلی بن گئی۔ ثریا کے پہلے سے دو بیٹے تھے اور اب مریم سے چار مہینے پہلے کا حمل تھا۔ جس دن ثریا نے گول مٹول سی لیلیٰ کو جنم دیا، مریم خوش خوش بچی کو دیکھنے گئی۔ ننھی بچی کو گود میں لے کر وہ خوش کن تصورات میں کھوئی رہی، جب اس کا اپنا بچہ اس کی گود میں ہوگا۔ گھر آئی تو ایک بڑا حادثہ ہو گیا اور اس کا حمل ضائع ہو گیا۔

سال گزرتے گئے۔ مریم ہر دوسرے سال حاملہ ہوتی اور چند ماہ بعد حمل ضائع ہو جاتا۔ یہ عمل پندرہ سال میں سات دفعہ ہوا۔ وہ لیلیٰ جو اس کی آنکھوں کے سامنے پیدا ہوئی، اب ننھی کلی سے کھلتا ہوا گلاب بن چکی تھی۔ لیلیٰ جو پولیو زدہ ٹانگ والے طارق کے ساتھ کھیلا کرتی، اب اس کے لیے نرم جذبات رکھنے لگی۔ مریم کی کوکھ ویسے ہی سونی رہی اور اس سونے پن نے اسے گہنا دیا۔ وہ سوکھنے لگی اور بھولنے لگی۔ ایک دن کی بات ہے، دروازے پر دستک ہوئی۔ دودھ والا دودھ دے کے جا چکا تھا، اب کون ہوگا؟ اسی کشمکش میں وہ دروازے پر پہنچی۔

"کون؟" اس نے پوچھا۔

"جلیل۔" طویل خاموشی کے بعد جواب آیا۔

"کون جلیل؟" اس نے دروازے کی درز سے جھانکا اور ساکت ہو گئی۔ پندرہ سال بعد اس کا باپ دروازے پر موجود تھا۔

وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر اندر چلی آئی۔ کچھ کشمکش کے بعد جلیل بھی اس کے پیچھے اندر چلا آیا۔ مریم اب پندرہ سال سے تیس کی ہو چکی تھی۔ جلیل کے بھی کندھے ڈھلک چکے تھے۔

"کیسی ہو؟"

مریم کے پاس جواب نہ تھا۔

"کہنے کی ہمت تو نہیں، کیا کبھی مجھے معاف کر سکو گی؟"

مریم نے اس کا بھی جواب نہ دیا۔ خاموش بیٹھی رہی۔

"یہ کچھ پیسے رکھ لو۔" آج بھی جلیل کے پاس اسے دینے کے لیے پیسے تھے۔

"اگر آپ کچھ آرام کرنا چاہیں تو بستر لگا دیتی ہوں، چائے کا کہتے ہیں تو چائے بنا لاتی ہوں اور اگر دونوں چیزوں کی طلب نہیں تو چلے جائیں۔ رابطے آپ نے ختم کیے تھے، انہیں اب ختم ہی رکھیں۔"

جب جلیل دہلیز پار کر رہا تھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور دروازے کی دوسری طرف مریم کی آنکھیں بھی نم تھیں۔

"تم نے چچا کو نامراد لوٹا دیا۔ دوسرے ملک سے آئے تھے، اسی بات کا لحاظ کر لیتیں۔" رات کے کھانے کے بعد نصیر کہہ رہا تھا۔ گزرے سال اور بے اولادی نصیر اور مریم کے رشتے میں بے رخی اور اکتاہٹ لے آئے تھے۔ کبھی کبھار نصیر زیادہ غصے میں ہوتا تو تھپڑ بھی جڑ دیتا۔

"بھی..."

"پیسے تو لے لیتیں، پتا تو ہے کاروبار نقصان میں جا رہا ہے۔"

اس بار مریم کا کچھ کہنے کا دل بھی نہ کیا۔

"گونگی دیوار ہی بن جاؤ۔" تبھی چاول کے لقمے میں ایک کنکر نصیر کے دانتوں کے نیچے چرچرایا اور اس نے تھوک کر اگل دیا۔

"جاہل عورت! پتھر پکا کے رکھ دیے ہیں۔ کنگلن ہو کر بھی چاول پکانے نہ آئے۔"

مریم کو ساتھ میں تھپڑ کی توقع تھی مگر بکتا جھکتا نصیر باہر چلا گیا مگر جلد ہی واپس آگیا۔ اس کے ہاتھ میں چند کنکر تھے۔

"یہ لو، مجھے پتھر پکا کے کھلاتی ہو، آج ذرا خود بھی کھاؤ۔ پتا تو چلے۔" نصیر نے پتھر زبردستی مریم کے منہ میں ٹھونس دیے۔

"چباؤ۔" نصیر دہاڑا۔ آنکھوں میں امڈتے آنسوؤں کو پیتے ہوئے اس نے منہ ہلایا۔ کڑک کڑک کی آواز آئی

اور مریم کے چند دانت ٹوٹ گئے۔

☆☆☆

وہ لیلیٰ جو چھپ چھپ کر طارق سے ملتی رہتی، اس کے دونوں بھائی ان تنظیموں کے لیے کام کرتے تھے جو اندرونِ خانہ جہاد کے لیے سرگرداں تھیں۔ جذبۂ ایمانی کے تحت دونوں بھائی جہاد کے لیے گئے۔ پیچھے ثریا دونوں بیٹوں کو یاد کر کر کے آہیں بھرا کرتی۔ دن مہینوں میں بدل گئے اور پھر ایک دن خبر آئی، دونوں جوان جامِ شہادت نوش فرما چکے ہیں۔ ثریا ہوش وحواس کھو بیٹھی۔ رو رو کر بے ہوش ہو جاتی۔ لیلیٰ ماں کو سنبھال سنبھال کر تھک جاتی مگر ناکام ہی رہتی۔ والد الگ گم صم رہتے۔ انہی غموں کو بھلانے کے لیے وہ چھپ چھپ کر طارق کی آغوش میں پناہ لیتی۔ طارق خود پولیو زدہ تھا۔ نوکری ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ آخر کسی نے مشورہ دیا پنجاب چلا جائے۔ کراچی میں قسمت ساتھ نہیں دے رہی تو کیا پتا پنجاب میں کوئی سبب بن جائے۔ رات کی تاریکی میں طارق اور لیلیٰ پارک کے جھنڈ میں چھپے بیٹھے تھے۔ لیلیٰ بھائیوں کی موت اور ماں کی بگڑی حالت پہ افسردہ تھی۔ طارق پولیو زدہ ٹانگ لے کر پردیس جانے کے غم میں مبتلا تھا۔ دونوں محبت کھیلتے کھیلتے ایک دوسرے کا غم غلط کر رہے تھے۔ دونوں جانتے تھے اس کے بعد مدتوں ملاقات نہ ہو سکے گی۔ کب بات بوس وکنار سے بڑھی، دو مہینے بعد لیلیٰ کو خبر ہوئی کہ وہ حاملہ ہے۔ خبر کیا تھی، لیلیٰ پر بجلی آن گری تھی۔ انہی دنوں کراچی شہر نسلی فساد کے جھمیلوں میں آن پھنسا۔ فساد اتنے بڑھے کہ شر پسند بلوائی عام شہریوں کے گھروں کو جلاتے پھرتے۔ ایک رات کچھ لوگ لیلیٰ کا گھر بھی جلا گئے۔ لیلیٰ تو اپنی جان بچا کر باہر آ گئی۔ ماں باپ نہ نکل پائے اور جل کر خاکستر ہو گئے۔ نہ بھائی رہے، نہ ماں باپ۔ فون عام نہیں تھا، سو طارق سے بھی رابطہ نہیں تھا۔ وہ تو اکیلی رہ گئی۔ روتی بلکتی لیلیٰ کو مریم اپنے گھر لے آئی۔ نصیر کی اپنی پریشانیاں تھیں۔ اس کی دکان بھی جل کر خاکستر ہو گئی تھی۔ پیسوں کے بغیر آدمی کس کام کا۔ وہ دن رات پریشان رہتا مگر پھر اس پریشانی میں بھی تازہ ہوا کا جھونکا آیا، بہاروں نے پھول کھلائے اور مریم کے مشورے اور لیلیٰ کے ایما پر اس کا نکاح لیلیٰ سے کیا گیا۔ یوں وہ تیسری بار دولہا بنا۔ مریم نے لیلیٰ کو رازداری سے بتا دیا تھا کہ لیلیٰ کو ایسا کیا کرنا ہے کہ نصیر کو کسی قسم کا شک نہ ہو۔ ٹھیک سات مہینے بعد لیلیٰ نے ایک صحت مند بچی کو جنم دیا۔ سعدیہ...... یہ نام مریم نے تجویز کیا اور یوں مریم نے ایک اور لڑکی کا نصیب اپنے جیسا نہ ہونے دیا۔

☆☆☆

مریم سوچتی کہ اگر اس کا پہلا حمل ضائع نہ ہوتا اور اس کی پہلی اولاد بیٹی ہوتی تو وہ لیلیٰ کی عمر کی ہوتی۔ تھی تو لیلیٰ، مریم کی سوتن مگر وہ اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتی جیسے اس کی بیٹی ہو اور سعدیہ اس کی نواسی۔ نصیر بھی خوش رہتا مگر اسے بیٹے کی تمنا تھی۔ چنانچہ لیلیٰ چند ماہ بعد دوبارہ حاملہ ہو گئی۔ سعدیہ کی ہر نئی حرکت پر مریم یوں نہال ہوتی جیسے پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ وہ بات بات پر میرپور میں گزرے سالوں کا تذکرہ کرتی۔ اتنے سالوں بعد لیلیٰ کی شکل میں سامع میسر آیا تھا۔ سامع بھی ایسا جو ایک ہی باتیں ہر مرتبہ نئے جوش سے سنتا۔ ماں کے علاوہ وہ باجی فضیلہ کا تذکرہ بڑی خوشی سے کرتی اور پھر اچانک اداس ہو جاتی۔ جانے باجی فضیلہ اب حیات بھی ہوں گی کہ نہیں۔

## کردار

ایک ساس نے اپنی بہو سے کہا۔ ”میں اپنے زمانے میں کالج کی خوبصورت ترین لڑکی تھی اور میں نے ایک مرتبہ ڈراما ”ملکۂ حسن قلوپطرہ اور زہریلی ناگن“ میں کام کیا تھا۔“

بہو فوراً بولی۔ ”اور ملکۂ حسن قلوپطرہ کا کردار کس نے کیا تھا؟“

(مرسلہ: پرویز محمود، چنیوٹ)

## چارلی چپلن

مشہور اداکار چارلی چپلن جب شوٹنگ سے واپس آتا تو جب تک وہ اپنے کتے کے ساتھ اچھل کود نہ کر لیتا اسے نیند نہ آتی تھی۔ جب اس کا کتا مر گیا تو اس کی نیند غائب ہو گئی۔ چنانچہ اس نے اپنے ماہرِ نفسیات کے مشورے پر ایک اور کتا پال لیا اور یوں اس کی نیند واپس آئی۔

## تھیوڈور روز ویلٹ

امریکا کے سابق صدر تھیوڈور روز ویلٹ مصافحہ کرنے کے عالمی ریکارڈ کے مالک ہیں۔ یکم جنوری 1907ء کو انہوں نے وہائٹ ہاؤس میں سالِ نو کی تقریب کے موقع پر 8513 افراد سے ہاتھ ملائے تھے۔

(”گینیز بک آف ورلڈ ریکارڈز“ سے)

(مرسلہ: عمران علی، فیصل آباد)

"کسی دن ضرور بنگلا دیش میر پور جاؤں گی۔ سارا محلہ گھوموں گی اور باجی فضیلہ سے بھی ملوں گی۔ اگر وہ حیات ہوئیں تو......" کہتے ہوئے وہ پھر سے اداس ہوگئی۔

نصیر کا کاروبار بھی دوبارہ سے اپنے قدموں پر کھڑا ہونے لگا تو وہ بھی مطمئن دکھائی دیتا۔ کچھ زیادہ پیسے آئے تو اس کو خیال آیا مریم کے ٹوٹے ہوئے دانتوں کی جگہ مصنوعی دانت لگوا لے اور جب اس نے مریم سے ذکر کیا تو وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

"اب عادت ہوگئی ہے۔ اب ضرورت نہیں۔" نصیر کندھے اچکا کر رہ گیا۔

چند دن بعد کی بات ہے۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ لیلیٰ کی ڈیلیوری قریب تھی مگر مریم بیت الخلا میں تھی چنانچہ خود کو سنبھالتی وہ دروازے تک پہنچی۔ دودھ والا تو دودھ دے کر جا چکا تھا اور نصیر اس وقت گھر نہیں آتا تھا۔ پھر کون ہوگا؟ اس نے دروازہ وا کیا۔

سامنے طارق کھڑا تھا۔ وقت ضرور تھم جاتا اگر اس کی نظریں لیلیٰ کے بڑھے ہوئے پیٹ پر نہ جاتیں۔ وہ ادھر سے ہی پلٹ جاتا مگر لیلیٰ کے اصرار پر بیٹھک میں آ بیٹھا۔ باتیں کیا ہی کرتے، خاموش ہی بیٹھے رہے۔ جب مریم کو دیکھا تو ایک نظر لیلیٰ کو دیکھا۔ لیلیٰ تب بھی کچھ نہ بولی مگر طارق پھر بھی جان گیا۔ مکدر ہوتے دل کے ساتھ وہ اپنی پولیو زدہ ٹانگ گھسیٹتا چلا گیا۔ ابھی گھنٹا ہی گزرا ہوگا کہ تن فن کرتا نصیر آیا اور لیلیٰ کو گردن سے دبوچ لیا۔

"کیا میں نہیں جانتا یہ کس کی اولاد ہے اور اب پھر تیرے عاشق گھر میں گھستے چلے آرہے ہیں۔ سچ سچ بتا، اب کی بار پیٹ میں کس کا بچہ ہے؟" لیلیٰ کی آنکھیں ابلنے کو تھیں۔ سانس کی جگہ خرخر کی آواز نے لے لی۔ مریم دوڑتی ہوئی آئی اور چھڑوانے کی کوشش کی۔ آگے غصے سے بھرا مرد تھا۔ وہ ایک ہاتھ جھٹکتا اور مریم دور جا گرتی۔ پیٹ میں بچہ زور زور سے ہلنے لگا اور پھر یکدم ساکت ہوگیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ لیلیٰ جان گئی کہ اب وہ جان سے گئی۔ وہ کلمے کے الفاظ یاد کرنے لگی۔ مریم جوان کوششوں سے تھک گئی تھی، دور پڑا کدال لے آئی۔ جسم کی پوری طاقت بانہوں میں بھرتے ہوئے اس نے ہاتھ چلائے۔ تڑخنے کی آواز آئی۔ ضرب کھوپڑی پر پڑی تھی۔ نصیر بے سدھ ہو کر فرش پر گرا اور تڑپے بغیر اللہ کو پیارا ہوگیا۔

☆☆☆

جیل کی سلاخوں کے پیچھے بہت ساری دوسری قیدیوں کے ساتھ مریم بھی قید تھی۔ وہ کالی بنگالن جو کئی سال پہلے یہاں دلہن بن کر آئی تھی اور کب یہ سال گزرے، ایسے لگتا کہ ایک پلک جھپکی ہے اور یہ سترہ سال گزر گئے۔ سترہ یا اٹھارہ؟ مریم گننے لگتی مگر شمار نہ کر پاتی۔ لیلیٰ، طارق کے ساتھ ملنے آئی۔ اس کا بیٹا ہوا تھا۔ چونکہ ملاقات کے لیے اتنے چھوٹے بچوں کی اجازت نہیں تھی اس لیے بچے وہ ایک ہمسائی کے سپرد کر آتی۔

"ہم کوشش کررہے ہیں آپ کو کم سے کم سزا ہو۔" طارق کہتا۔ وہ طارق جو اب لیلیٰ کا شوہر تھا۔

کم سے کم سزا بھی سالوں کی قید تھی۔ جیل میں گزرے مہینوں میں وہ اندازہ لگا چکی تھی۔ وہ طارق سے کہنا چاہتی تھی کہ اسے کم سزا نہیں چاہیے مگر خاموش ہی رہتی۔

آدھی رات کا وقت تھا۔ فضا بوجھل تھی۔ نیند مریم کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کا دل چاہا کسی کو کیا ہی فرق پڑے گا اگر اس کا دل رک جائے۔ ہاں، کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تبھی دل میں درد ہونے لگا۔ گزری ہوئی زندگی اس کے سامنے پانی کی طرح بہنے لگی۔ مایوس سی نیم، وہ ماں سے کہے گی، اتنی یا سیت اچھی نہیں۔ میرپور کی گلیاں، وہ چھوٹا سا گھر جہاں وہ پل بڑھ کر جوان ہوئی، جلیل کا ہر پندرہ دن بعد ملنے آنا، جلیل کے گھر گزارے جلتے ہوئے دن۔ دل کرتا کہ کاش جلیل سے اس وقت باپ کا سایہ ملتا جب ضرورت تھی۔ پیاری سی فضیلہ باجی اور ان کا تحفے میں دیا سنہری غلاف میں لپٹا قرآن مجید۔ یہاں کراچی میں گزاری گئی آدھی سے زیادہ زندگی میں وہ چند ناغوں کے سوا روزانہ قرآن کے اسی نسخے سے تلاوت کرتی۔

اس کا زندگی کا ساتھی نصیر، جس نے ابتدائی سالوں میں اسے رانی کی طرح رکھا اور پھر وہ نوکرانی کا درجہ پاتی گئی۔ اس کے ٹوٹے دانت جن کے لیے اس نے نصیر کو معاف کیا۔ ہاں، وہ نصیر سے معافی بھی مانگے گی۔ اس نے جان سے مار ڈالنے کی نیت سے کدال نہیں چلائی تھی۔ اس کے وہ ساتوں بچے جن میں سے ایک نے بھی دنیا میں سانس نہیں لیا، ساتوں کے سات اس کی کوکھ میں ہی دم توڑ گئے۔ بیٹیوں جیسی لیلیٰ اور ننھی دلاری سعدیہ۔ واقعات چلتے رہے، دل کا درد بڑھتا گیا اور دھڑکن کمزور ہوتے ہوتے رک گئی۔ صبح صادق ہی ساتھی قیدی اس کے مردہ ہونے سے واقف ہوگئے اور سورج کے ڈھلنے سے پہلے نصیر کے پہلو میں اسے سپردِ خاک کردیا گیا۔

⌘⌘⌘

بلخ اس اعتبار سے خاص شہرت رکھتا ہے کہ یہ قبل از اسلام پارسیوں کا مقدس شہر تھا۔ یہاں آتش کدے تھے جو صدیوں سے روشن تھے۔ جب یہ شہر اسلام کے سایۂ عاطفت میں آگیا تو اس سرزمین سے مولانا جلال الدین رومیؒ جن کی

# ابو علی شفیق بلخی علیہ رحمۃ اللہ

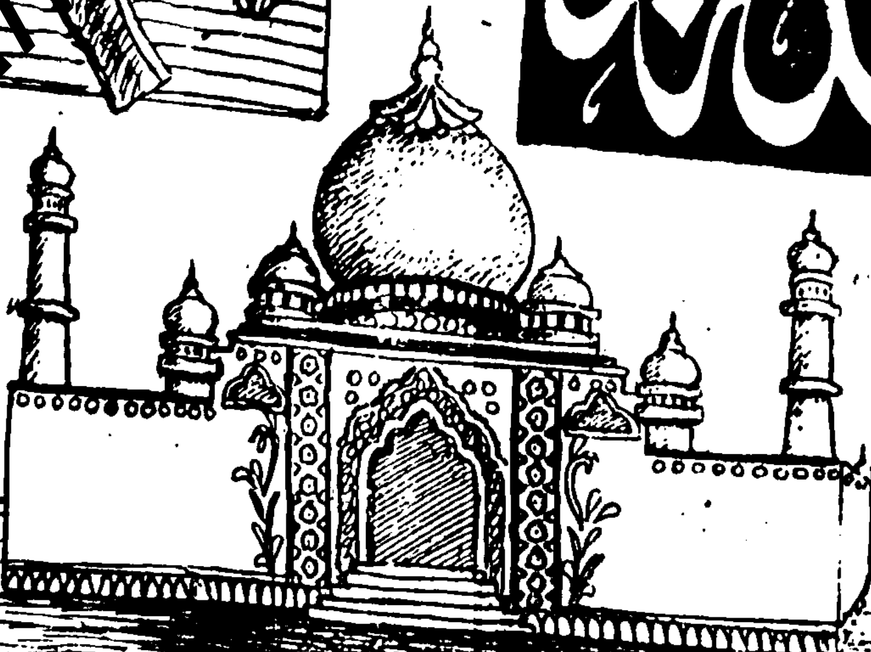
ضیا تسنیم بلگرامی

دوسری صدی ہجری کے نامور صوفی۔ یہ صوفیوں کے مقتدا تھے۔ توکل ان پر ختم تھا۔ اپنی محنت سے ان کو جو کچھ مل جاتا اس پر توکل اختیار کرتے۔ وہ درباروں سے کوئی واسطہ نہ رکھتے تھے اس لیے بادشاہوں یا خلفائے وقت سے ڈرتے بھی نہ تھے۔ وہ عالموں کے علم سے اس لیے خوفزدہ نہ ہوتے کہ عالم مصلحت اندیش اور درباری سرکاری نمک خوار تھے۔ آپ باعمل صوفی تھے۔ آپ نے جہاد میں بھی حصہ لیا اور پھر جنگ کرتے ہوئے شہادت پاگئے۔ ان کی غیرت بیدار تھی اور یہ غیرت زندگی بھر بیدار رہی رہی۔

عظمت کے مینار حجرہ کی روشنی سے ایک جہان منور ہوا







مثنوی معنوی نے بقائے دوام حاصل کی، دنیائے تصوف کے بادشاہ ابراہیم بن ادہم اسی خاکِ پاک سے تعلق رکھتے تھے۔ ابوعلی شقیق بھی اسی بحر کے موتی تھے۔ گراں مایہ موتی، آبدار موتی۔ ابراہیم بن ادہم کے ہم عصر اور توکل میں ان سے بہت آگے۔

دوسری صدی ہجری کے اوائل میں جب آپ پیدا ہوئے ہوں گے تو آپ کے والدین کو یہ نہیں معلوم ہوگا کہ ان کا بیٹا مقتدائے تصوف ٹھہرے گا۔ ہر بڑے آدمی کی طرح آپ کے صغرسنی کے حالات اور واقعات پردۂ اخفا میں ہیں۔ آپ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اور پھر ہوش سنبھالا، اس کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ وہ صوفیوں کا زمانہ تھا۔ ہر طرف ان کا چرچا تھا، حکومتیں بھی بگڑ رہی تھیں، تباہی کا سلسلہ جاری تھا۔ انسان بے چینی اور بے یقینی کا شکار تھا۔ ہر طرف ہنگامے جاری تھے۔ جہاں سکون تھا، وہاں بھی عمال اور حکام رعایا کو تنگ کر رہے تھے۔ ان حالات اور اس ماحول میں انسان دنیا سے بیزار اور اللہ کی طرف راغب تھا۔ ابوعلی شقیق بھی اسی ماحول میں پیدا ہوئے تھے۔

جب ہوش سنبھالا تو مروجہ تعلیم حاصل کی اور اس میں مذہبی علوم سرفہرست تھے۔ بلخ میں امام زخر کو خاص شہرت حاصل تھی۔ ان سے تعلیم حاصل کرنا فخر کی بات تھی۔ ابوعلی شقیق بھی ان کے حلقۂ درس میں بیٹھ گئے۔ امام زخر کی باتوں میں بڑی کشش تھی۔ ان کی باتیں آپ انہیں غور سے سنتے اور اس پر خلوصِ نیت سے عمل کرتے۔

جب نوجوانی میں قدم رکھا تو وہ غور و فکر کے عادی ہو چکے تھے۔ وہ دنیا، آخرت، انسان، اس کے اعمال اور فطرت کے مشاہدات میں مستغرق رہتے تھے۔ دنیا میں رہتے تھے مگر دنیا سے بیزار اور نفور تھے۔

زندہ رہنے کے لیے انسان جو کچھ کر رہا تھا، آپ اس سے متفق نہیں تھے۔ آپ کے سامنے بہت سے پیشے تھے۔ آپ کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آخر کون سا پیشہ اختیار کریں۔

استاد امام زخر نے مشورہ دیا۔ ''تجارت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بھی ہے اور معزز پیشہ بھی، اسی کو تم بھی اختیار کرو۔''

آپ کو استاد کا مشورہ پسند آیا اور تجارت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ اس سلسلے میں کبھی تو آپ شام چلے جاتے اور کبھی ترکی کا رخ کرتے۔ دیانت داری آپ کا شعار تھا اور یہی آپ کا طرۂ امتیاز تھا۔ برسوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ کم نفع اور کم سے کم اخراجات۔ دوسرے تاجر آپ کی دیانت داری سے پریشان ہو گئے تو وہ آپ سے کہتے۔ ''حضرت! ہم تو آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہمارے ساتھ تو لمبے چوڑے اخراجات ہیں، بڑا کنبہ ہے اور دوسرے لوگ بھی ہیں۔ جس نفع کو سامنے رکھ کر آپ کاروبار کرتے ہیں، ہم نہیں کر سکتے۔''

آپ فرماتے۔ ''میں مجبور ہوں۔ میں زیادہ نفع لے کر کاروبار نہیں کر سکتا۔ مجھے اس کا کسی کو حساب کتاب بھی تو دینا ہے۔''

آپ سے پوچھا گیا۔ ''کیا آپ کے کاروبار میں کسی کی رقم لگی ہوئی ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''نہیں، میرے کاروبار میں کسی کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اس میں ساری میری رقم لگی ہے۔''

ساتھیوں نے پوچھا۔ ''پھر آپ حساب کس کو دیں گے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''اپنے اللہ کو۔ وہ زیادہ نفع کو پسند نہیں کرتا۔''

آپ دور دراز ملکوں میں جاتے تو وہاں اپنی نظریں کھلی رکھتے۔ پیشانی کے نیچے کی آنکھیں بھی اور دل کی آنکھیں بھی۔ وہ لوگوں اور قوموں کے رسم و رواج بھی دیکھتے اور ان کے دین کو سمجھنے کی کوشش کرتے۔ نیز ان کی خوشحالی اور تنگدستی کے اسباب و علل پر بھی تفکر فرماتے۔

ایک بار آپ ترکی تشریف لے گئے اور وہاں اپنی اشیا فروخت فرماتے رہے۔ جب ادھر سے فارغ ہوئے تو ایک مقامی تاجر سے پوچھا۔ ''یہاں کی سب سے زیادہ قابلِ دید شے کیا ہے؟''

تاجر نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے یہاں کا ایک بت کدہ سب سے زیادہ نادر اور عجیب شے ہے۔ کم از کم میرے اپنے خیال میں تو۔''

آپ نے فرمایا۔ ''جب تم کہہ رہے ہو کہ وہ بت کدہ ہے تو یہ کافروں کی عبادت گاہ ہوگی۔ اس میں بہت سارے بت رکھے ہوں گے اور ان بتوں کی عبادت کی جاتی ہوگی۔''

تاجر نے جواب دیا۔ ”بے شک آپ کا خیال درست ہے۔ پجاری اور دوسرے لوگ بتوں کی عبادت کرتے ہیں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”وہی تو میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟“

ترک تاجر نے جواب دیا۔ ”اس میں حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ لوگ بتوں سے مانگتے ہیں اور انہیں جو کچھ مل جاتا ہے اس کو بتوں کی دین سمجھ کر خوش اور مطمئن رہتے ہیں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”تب پھر تم مجھے وہاں لے چلو، میں ان سے بات کروں گا۔“

ترک تاجر آپ کو بتوں کی عبادت گاہ میں لے گیا۔ آپ نے اس کے پجاری سے پوچھا۔ ”کیا تو ان بتوں سے خوش اور مطمئن ہے؟“

پجاری نے کہا۔ ”ہاں۔ اگر میں ان سے خوش اور مطمئن نہ ہوتا تو تیری طرح مسلمان ہوتا۔ یہ ذرا سی بات تیری سمجھ میں نہیں آئی۔“

آپ نے کہا۔ ”یہ بت تجھ کو کیا دیں گے؟ قادر و قیوم اللہ کو نظر انداز کر کے بتوں کو اللہ کا درجہ اور مقام دینا کیا جہالت نہیں ہے؟“

پجاری ہنسنے لگا، پوچھا۔ ”تو اور کچھ کہنا چاہتا ہے یا بس؟“

آپ نے فرمایا۔ ”میں یہ پوچھوں گا کہ تو جو کچھ کر رہا ہے اس پر شرمندگی محسوس ہوتی ہے یا نہیں؟“

پجاری نے جواب دیا۔ ”میں ذرا بھی شرمندہ نہیں۔ نادم اور شرمندہ تو تجھے ہونا چاہیے۔“

آپ نے تعجب سے پوچھا۔ ”وہ کیوں؟“

پجاری نے جواب دیا۔ ”وہ اس لیے کہ میں بتوں کو پوجتا ہوں اور رزق کے لیے مارا مارا نہیں پھرتا اور تو ہے کہ ایک اللہ کی عبادت کرتا ہے اور رزق کی خاطر دنیا کی خاک چھان رہا ہے گویا تجھ کو اپنے اللہ پر بھروسا نہیں۔“

آپ لاجواب ہو گئے۔ کچھ دیر بعد فرمایا۔ ”میں اللہ سے اسی طرح روزی چاہتا ہوں اور یہ طے ہے کہ جس طرح روزی مانگی جائے گی، وہ دے گا۔“

پجاری نے کہا۔ ”اچھا اب تو میرے کہنے سے کسی اور طرح مانگ۔ اس طرح کہ تجھے اپنے اللہ سے گھر بیٹھے بیٹھے روزی ملے پھر میں دیکھوں گا کہ وہ تجھ کو کس طرح روزی دیتا ہے۔“

آپ کو ایسا لگا جیسے اچانک پجاری کے ذریعے انہیں ایک ایسی بات معلوم ہو گئی ہے جو پہلے بصیرت سے اوجھل تھی۔ انہوں نے سوچا، کیا اللہ اس پر قادر نہیں کہ انہیں ان کا رزق گھومے پھرے بغیر حاصل ہو جائے اور اس سوال کا جواب بھی انہیں یہ ملا کہ ایسا ممکن ہی نہیں، یقینی ہے۔

آپ وہاں سے گھر واپس ہوئے تو راستے میں آذربائیجان کے ایک شخص نے آپ سے پوچھا۔ ”آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ترکی سے۔“

اس نے پوچھا۔ ”آپ کا وطن؟“

جواب دیا۔ ”خراسان، بلخ۔“

اس نے پھر سوال کیا۔ ”آپ کا وطن بلخ ہے، آپ ترکی سے آ رہے ہیں۔ وہاں کیا لینے گئے تھے آپ؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں تجارت کرتا ہوں اور اسی سلسلے میں کبھی شام چلا جاتا ہوں، کبھی ترکی اور کبھی عراق۔“

وہ شخص ہنسنے لگا۔ ”خوب، تو گویا آپ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ اللہ آپ کو بلخ میں رزق نہیں دے سکتا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”نہیں تو، میں تو یہ یقین رکھتا ہوں کہ اللہ جو چاہے کرے۔ وہ بلخ میں بھی رزق مہیا کر سکتا ہے اور یہ کہ پورا بلخ تو تجارت نہیں کرتا اور نہ ہی اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا ہے۔“

وہ شخص معلوم نہیں کون تھا۔ ہنسنے لگا۔ ”تب پھر اس کا مطلب ہوا کہ خود آپ کو یہ یقین نہیں کہ اللہ قادرِ مطلق ہے اور وہ چاہے بھی تو بلخ میں رزق نہیں دے سکتا۔“

آپ نے اس شخص کو غور سے دیکھا، سوچا کیا یہ پجاری ہے؟ لیکن نہیں، وہ تو مسلمان نظر آ رہا تھا۔

آپ کو خاموش، غلطاں و پیچاں دیکھ کر وہ یہ کہتا ہوا چلا گیا۔ ”میں نے جو کچھ کہا ہے، اس پر غور ضرور کرنا۔“
وہ شخص غائب ہو گیا اور آپ کے دل و دماغ میں ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا۔
آپ اپنے وطن میں جیسے ہی داخل ہوئے تو دیکھا پورا شہر پریشان ہے اور ہر طرف افراتفری مچی ہوئی ہے۔
آپ نے ایک پریشان حال شخص سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ یہ سارے شہری پریشان کیوں نظر آ رہے ہیں؟“
اس نے جواب دیا۔ ”حاکمِ شہر کا کتا گم ہو گیا ہے۔ وہ گھر گھر کی تلاشی لے رہا ہے۔ بس اسی سے لوگ پریشان ہو رہے ہیں۔“
آپ کو بڑی حیرت ہوئی کہ حاکمِ شہر کے کتے نے پورے شہر کو ہلکان کر رکھا ہے۔
اسی عالم میں آپ اپنے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کا پڑوسی چوری کے شبہے میں گرفتار کر لیا گیا ہے اور پڑوسی کے متعلقین رو رو رہے ہیں۔
آپ پڑوسی کے گھر گئے اور اس کی بیوی سے پوچھا۔ ”تیرے شوہر کو گرفتار کیوں کر لیا گیا؟“
اس نے روتے ہوئے جواب دیا۔ ”کتے کی چوری کے شبہے میں۔“
آپ نے فرمایا۔ ”خوب! تو لوگوں کو کسی تحقیق اور تصدیق کے بغیر محض شبہے میں بھی پکڑا جا سکتا ہے؟“
پڑوسی کی بیوی نے بیزار ہو کر کہا۔ ”اب آپ باتیں بناتے رہیں، اس سے کیا فائدہ؟ آپ میرے شوہر کو آزادی تو دلا نہیں سکتے۔“
آپ نے فرمایا۔ ”میں ایسا بھی کر سکتا ہوں۔“
پڑوسی کی بیوی نے حیرت سے پوچھا۔ ”وہ کس طرح؟“
آپ نے فرمایا۔ ”یہ مت پوچھ۔ میں تیرے شوہر کو آج ہی چھڑا لاؤں گا۔ تو اطمینان رکھ۔“
گھر کے کسی فرد کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ ابوعلی شفیق اس کے شوہر کو آزاد کیونکر کرائیں گے؟
آپ سیدھے حاکمِ شہر کے پاس پہنچے اور اپنا تعارف کرایا۔ ”میں ابوعلی شفیق بلخی ہوں، اسی شہر کا باشندہ۔“
حاکمِ شہر نے پوچھا۔ ”پھر میں کیا کروں؟“
آپ نے فرمایا۔ ”آپ نے میرے پڑوسی کو محض شبہے میں گرفتار کر لیا ہے۔ اس کو رہا کریں۔“
حاکمِ شہر نے آپ کو ذرا غور سے دیکھا۔ ”تو آپ اس چور کے پڑوسی ہیں؟“
آپ نے دلیری سے جواب دیا۔ ”ہاں۔ میں اس کا پڑوسی ہوں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ چور نہیں ہے۔“
حاکم نے پوچھا۔ ”آپ یہ کس بنیاد پر کہہ رہے ہیں کہ آپ کا ہمسایہ چور نہیں ہے اور اس نے میرا کتا چوری نہیں کیا ہے؟“
آپ نے فرمایا۔ ”میں اپنے ہمسائے سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اس لیے آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا ہمسایہ چور نہیں ہے۔“
حاکم آپ کی باتوں سے عاجز آ گیا، پوچھا۔ ”اچھا جناب! آپ یہ بتائیں کہ مجھ سے چاہتے کیا ہیں؟“
آپ نے فرمایا۔ ”میرے ہمسائے کو چھوڑ دیا جائے۔“
حاکم نے جواب دیا۔ ”میرا کتا مجھے دلوا دیں، میں آپ کے ہمسائے کو چھوڑ دوں گا۔“
آپ نے اسے یقین دلایا۔ ”میں تجھ کو یقین دلاتا ہوں کہ تیرا کتا تین دن کے اندر تجھ کو مل جائے گا۔“
حاکم نے محسوس کیا کہ آپ کا لہجہ بدل چکا ہے اور اب آپ بزرگانہ اعتماد سے بات کر رہے تھے۔ اس نے پوچھا۔ ”یہ تین دن کی بات آپ کیوں کر رہے ہیں؟“
آپ نے فرمایا۔ ”اس لیے کہ اس طرح میں اپنے اللہ کے بارے میں جان لوں گا کہ وہ اپنے ایک عاجز بندے کا کہاں تک مان رکھتا ہے۔“
حاکمِ شہر نے معلوم نہیں کیوں آپ پر اعتبار کر لیا اور آپ کے پڑوسی کو رہا کر دیا۔ پڑوسی آپ کا شکر گزار تھا اور اس کے گھر والے آپ کے احسان مند۔ رہا ہونے والے کو جب یہ معلوم ہوا کہ آپ نے یہ وعدہ کر لیا ہے کہ تیسرے دن حاکم کا کتا اس کو مل جائے گا تو اس نے آپ سے پوچھا۔ ”آپ نے ایسا مہمل فیصلہ کیوں کیا؟“

آپ نے پُراعتماد جواب دیا۔ ’’مجھ کو یقین ہے کہ مذکورہ کتا تین دن میں ضرور مل جائے گا۔‘‘

دن گزرنے لگے۔ ایک دن، دو دن اور تین دن۔ پڑوسی پریشان تھا کہ اگر کتا نہ ملا تو شاید اس کو پھر گرفتار کرلیا جائے گا۔

شام کو حاکمِ شہر آپ کے گھر آ گیا اور کہا۔ ’’کیا آپ میرے ساتھ میرے گھر تک چلنا گوارا فرمائیں گے؟‘‘

آپ نے جواب دیا۔ ’’کیوں نہیں۔‘‘

حاکمِ شہر نے کہا۔ ’’اپنے پڑوسی کو بھی ساتھ لے لیں۔‘‘

آپ نے پڑوسی کو بلوایا۔ اس نے اپنے سامنے حاکمِ شہر کو دیکھا تو اس کی جان نکل گئی اور اپنے گھر واپس گیا۔ اپنی بیوی سے کہا۔ ’’شاید میں دوبارہ گرفتار کیا جا رہا ہوں کیونکہ حاکمِ شہر مجھ کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔‘‘

بیوی رونے لگی اور ابوعلی شفیق کے بارے میں کہا۔ ’’آخر انہوں نے تین دن کا وعدہ ہی کیوں کرلیا تھا؟‘‘

شوہر نے کہا۔ ’’شاید میرے ساتھ وہ بھی لے جائے جا رہے ہیں۔‘‘

حاکمِ شہر ان دونوں کو اپنے ساتھ اپنے محل لے گیا اور وہاں ابوعلی شفیق سے پوچھا۔ ’’اب آپ مجھ کو یہ بتائیں کہ کتا چرانے والے کو آپ کس طرح جانتے ہیں؟‘‘

آپ نے جواب دیا۔ ’’تیرا سوال مہمل ہے۔ میں اس سے ذرا بھی واقف نہیں۔‘‘

حاکم نے کہا۔ ’’یہ بڑی حیرت کی بات ہے۔ آج چار ساعت پہلے چور میرا کتا لے کر میرے پاس آ گیا اور مجھ سے معافی مانگنے لگا۔‘‘

اس خبر سے پڑوسی کو بڑی حیرت ہوئی۔ حاکمِ شہر نے چور کو کتے سمیت ان دونوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ چور ابوعلی کے قدموں میں جھک گیا۔ ’’واللہ! یہی وہ شخص ہے جس نے مجھے خوابوں میں مستقل ڈانٹا ہے۔ میں عاجز آ کے کتا لے آیا۔‘‘

حاکمِ شہر نے آپ کے پڑوسی سے کہا۔ ’’تو خوش قسمت ہے جو تجھے آپ جیسا پڑوسی ملا۔ میں تو ان کا مرید ہو چکا ہوں۔‘‘

آپ بھی اسی وقت سجدے میں گر گئے اور گریہ وزاری کرنے لگے۔ ’’اے اللہ! میں نے تجھ پر بھروسا کیا اور تو نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ میں کس طرح تیرا شکر ادا کروں۔‘‘

حاکمِ شہر نے چور سے پوچھا۔ ’’بتا تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟‘‘

اس نے جواب دیا۔ ’’میں ہر سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔‘‘

آپ نے اس کی بھی سفارش کی۔ ’’آپ اس بار اس کو بھی معاف کر دیں۔ یہ آئندہ چوری نہیں کرے گا۔‘‘

حاکمِ شہر نے اس کو معاف کر دیا اور آپ کو کچھ دینا چاہا۔ انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ اب حاکمِ شہر اور پڑوسی آپ کے واقعی مرید ہو چکے تھے اور ان دونوں کے ساتھ وہ چور بھی۔

☆☆☆

آپ نے عبادت اور ریاضت میں خود کو مشغول کرلیا۔ تجارت ان کا پیشہ تھا لیکن اب وہ سفر پر نہیں جا رہے تھے۔ انہی دنوں بلخ اور اس کے آس پاس کا علاقہ قحط سالی کی زد میں آ گیا۔ لوگ اتنے پریشان ہوئے کہ نقل مکانی پر مجبور ہو گئے۔ آپ شہریوں کے حال کا اندازہ لگانے کے لیے باہر نکلے اور ہر طرف اداسی اور ویرانی دیکھ کر خود پریشان ہو گئے۔

حاکمِ شہر نے آپ کو بازار میں دیکھ کر کہا۔ ’’آپ شہریوں کو نقل مکانی سے روکیے۔‘‘

آپ نے جواب دیا۔ ’’بھاگنے والے اپنی زندگی بچانے کے لیے بھاگ رہے ہیں۔ اس لیے ان کو روکنا کسی طرح مناسب نہیں۔‘‘

حاکمِ شہر کے چلے جانے کے بعد بازار میں ایک ایسا آدمی ملا جو بشاش اور مطمئن تھا۔

آپ نے اس سے پوچھا۔ ’’تو اسی شہر کا باشندہ ہے؟‘‘

اس نے جواب دیا۔ ’’ہاں۔ آپ مجھ کو نہیں جانتے؟ میں حاکمِ شہر کا غلام ہوں۔‘‘

آپ نے فرمایا۔ ’’خوب۔ پھر تو خوش کیوں ہے؟ کیا تو نہیں جانتا کہ ہم سب قحط زدہ علاقے میں رہتے ہیں؟‘‘

غلام نے جواب دیا۔ ”میں جانتا ہوں، خوب جانتا ہوں کہ لوگ نقل مکانی کیوں کر رہے ہیں؟“

آپ نے فرمایا۔ ”پھر تو خوش کیوں ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”میں غلام ہوں مگر آج کل ان آزاد شہریوں سے زیادہ خوش قسمت ہوں۔ میری اس خوش قسمتی نے مجھ کو بشاش اور مطمئن کر رکھا ہے۔“

آپ نے کہا۔ ”خوش قسمتی اور بشاشت کا سبب؟“

اس نے جواب دیا۔ ”میرے مالک کے پاس غلّے کے ذخائر موجود ہیں اور میں یہ جانتا ہوں کہ میں بھوکا نہیں رکھا جاؤں گا۔“

آپ کے شعور اور احساس کو چوٹ سی لگی اور دل میں کہا۔ ”اے ابوعلی! تجھ سے زیادہ متوکل اور بے نیاز تو یہ غلام ہے۔“

اس کے بعد آپ نے اور زیادہ توکّل اختیار کیا۔ آپ لوگوں سے فخر یہ کہا کرتے تھے کہ میری توکّل میں میرا استاد اور میرا مرشد ایک غلام انسان ہے۔

آپ کا شہرہ بڑھتا گیا اور آپ کے پاس ارادت مند آنے لگے۔ انہی میں ایک ایسا نوجوان بھی شامل ہوگیا جس کا نام حاتم تھا۔

آپ نے اس سے کہا۔ ”تو بہرا ہے لیکن ساتھ ہی بہرا بھی اور تیرا بہراپن ہی تیرا ایک اعزاز ہے۔ تو زندگی بھر اسی اعزاز سے بزرگ کہلائے گا۔“

حاتم نے کہا۔ ”میرا بہراپن کیسا، میں بہرا نہیں ہوں۔ میں اپنے دونوں کانوں سے سن سکتا ہوں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں کہتا ہوں کہ تو بہرا ہے اور تیرا بہراپن ہی تیرا سب سے بڑا اعزاز ہے۔“

حاتم کو آپ کی باتوں سے دکھ پہنچ رہا تھا۔ ”لیکن اے پیر مرشد! مجھ کو بہرا کون کہے گا؟“

آپ نے فرمایا۔ ”تو خود اپنے آپ کو بہرا کہے گا اور تو اپنے بہرے پن پر اصرار بھی کرے گا اور پھر وہ زمانہ بھی آجائے گا کہ تجھ کو سبھی بہرا کہنے لگیں گے اور پھر تیرا یہی بہراپن تیرے نام کا ایک جزو بن جائے گا۔ میں معلوم نہیں کیا کچھ تجھ میں دیکھ رہا ہوں۔“

حاتم نے سکوت اختیار کیا۔ ایک دن اسی حاتم نے آپ سے پوچھا۔ ”پیر و مرشد! کیا آپ جہاد پر یقین رکھتے ہیں؟“

آپ نے فرمایا۔ ”یقین رکھنا کیا معنی۔ جہاد تو میرا جزوِ ایمان ہے۔“

حاتم نے کہا۔ ”یہاں میری اطلاع کے مطابق کفار حملہ آور ہونے والے ہیں۔ آپ کو اس میں حصہ لینا ہوگا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”میں اس میں عملاً حصہ لوں گا اور اللہ نے چاہا تو ذاتی طور پر میں جنگ میں بھی اپنے توکل پر قائم رہوں گا۔“

مشرکوں سے جنگ کا آغاز ہوا اور آپ نے اپنے مرید حاتم کے ساتھ جہاد میں حصہ لیا۔ دن بھر ہنگامۂ کارزار برپا رہا۔ رات کو دونوں فوجیں اپنے اپنے خیموں میں واپس گئیں۔ آپ نے اپنے لیے دونوں فوجوں کے درمیان آرام فرمانا پسند کیا۔ آپ کے ساتھ آپ کی گدڑی تھی۔ آپ یہ گدڑی اوڑھ کر سو گئے۔

دشمنوں کو کسی نے خبر دی کہ ایک مسلمان اپنی فوج سے دور گدڑی اوڑھے سو رہا ہے۔ ان کے چار آدمی یہ منظر دیکھنے آئے۔ وہ آپ کی طمانیتِ قلبی سے بہت متاثر ہوئے اور اپنے آدمیوں کو منع کیا کہ ان کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے۔ جنگ میں مسلمانوں نے فتح حاصل کی اور دشمنوں میں سے کئی نے آپ کے توکل سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرلیا۔

باقی ماندہ کافروں نے اپنی شکست کا بدلہ لینے کا منصوبہ بنایا اور تیاری کر کے دوبارہ حملہ کر دیا۔ مسلمانوں نے خوش عقیدگی کے پیشِ نظر آپ کو اپنا امیر بنالیا۔ جنگ چھڑ گئی اور آپ نے اپنے ہاتھ میں تلوار کی جگہ پھول لے لیا اور اس کی خوشبو سے لطف اندوز ہونے لگے۔

مسلمانوں نے آگے بڑھ کر ایسا حملہ کیا کہ کافروں کے قدم اکھڑ گئے اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

آپ کے ایک حاسد نے شکایت کی۔ ”وہ منظر بھی کیا خوب تھا کہ فوجیں تو آپس میں مصروفِ پیکار تھیں اور مسلمانوں کا امیر پھول سونگھنے میں مشغول تھا۔“

آپ نے سنا تو فرمایا۔ ''مگر اس نے یہ نہیں دیکھا کہ جنگ اتنی جلدی کس طرح ختم ہو گئی۔''

مسلمانوں نے اس حاسد کو خوب برا بھلا کہا۔

☆☆☆

آپ نے اکلِ حلال کے پیشِ نظر بلخ کے بازاروں میں محنت مزدوری شروع کر دی تھی۔ دور دور سے آپ کی شہرت سن کر آنے والے جب آپ کو محنت مزدوری کرتے دیکھتے تو پوچھتے۔ ''یہی وہ نامی گرامی متوکل درویش ہے جس کا نام ابوعلی شفیق ہے؟''

لوگ کہتے۔ ''ہاں، یہی ابوعلی شفیق ہیں۔''

بلخ والوں کو شرم آتی کہ ان کا مشہور صوفی بازاروں میں محنت مزدوری کر کے انہیں شرمندہ کر رہا ہے۔

شہر کا ایک دولت مند آپ کے پاس آیا اور آپ کی خدمت میں اشرفیاں پیش کیں اور کہا۔ ''آپ یہ قبول فرمائیں اور بازاروں میں مزدوری نہ کریں۔''

آپ نے اشرفیاں واپس کر دیں اور فرمایا۔ ''مزدوری تو میری آن، میری شان ہے۔ میں ان اشرفیوں کے عوض اپنی آن، اپنی شان بیچ دوں؟''

متمول لاجواب ہو گیا مگر باز نہیں آیا۔ کہنے لگا۔ ''حضرت! آپ ہماری عزت، ہماری آبرو ہیں۔ آپ ہمیں شرمندگی سے بچائیں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''شرمندگی تو اس میں ہے کہ میں مزدوری نہ کروں اور دوسروں کا دستِ نگر بن جاؤں۔''

متمول نے اصرار کیا۔ ''حضرت! آپ ایک بلند پایہ عالم اور بے مثل صوفی ہیں۔ اس لیے مزدوری جیسا معمولی کام نہ کریں اور میں بخلوص آپ کو جو پیش کر رہا ہوں، قبول فرمائیں۔''

آپ نے پھر انکار کر دیا۔ ''افسوس کہ میں تیری پیشکش قبول نہیں کر سکتا۔''

رئیس نے سوال کیا۔ ''اگر آپ اپنے انکار کے سلسلے میں کوئی خاص عذر بیان فرما دیں تو میں خاموشی سے واپس چلا جاؤں گا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''تو ایک عذر کی بات کر رہا ہے، میں پانچ وجوہ بیان کر سکتا ہوں۔''

رئیس نے پوچھا۔ ''پانچ کون کون سی؟''

آپ نے فرمایا۔ ''لے سن۔ اوّل یہ کہ تو مجھ کو جو کچھ دے گا، اس سے تیری دولت میں کمی ہو جائے گی۔ دوم یہ کہ تو مجھے جو کچھ دے گا، وہ میرے پاس سے چوری ہو سکتا ہے۔ سوم یہ کہ تو مجھے کسی وقتی جذبے کے زیرِ اثر دے تو دے گا مگر بعد میں اپنے اس فعل پر شرمندہ بھی ہو سکتا ہے۔ چہارم یہ کہ بعد میں تو مجھ میں کوئی عیب تلاش کر لے جس سے تیرے دل سے میری وقعت گر جائے یا کم ہو جائے اور تو اپنی رقم واپس مانگے اور میں واپس نہ کر سکوں۔ پنجم یہ کہ میری زندگی ہی میں تیری موت واقع ہو جائے اور میں تیرے آسرے اور امید پر سب خرچ کر کے بھکاری بن جاؤں اور بقیہ زندگی عسرت اور تنگدستی کے عذاب میں بسر کروں۔''

رئیس لاجواب ہو کر واپس چلا گیا اور آپ اس کی احسان مندی سے بال بال بچ گئے۔

آپ نے اپنے معاصرین میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا تھا لیکن اس کے باوجود جہاں سے کچھ ملنے کی امید ہوتی، آپ وہاں بے دریغ پہنچ جاتے۔ اسی طرح آپ نے اپنے بقول ایک ہزار سات سو اساتذہ سے کچھ نہ کچھ حاصل کیا۔ ان کے مریدِ خاص حاتم نے اس سلسلے میں آپ سے پوچھا۔ ''حضرت! آپ نے سترہ سو اساتذہ سے مل کر کیا اخذ کیا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''صرف یہ کہ اللہ کی رضا صرف چار چیزوں پر منحصر ہے۔''

بے قرار مرید نے فوراً سوال کیا۔ ''چار کون کون سی؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''اوّل یہ کہ روزی کی طرف سے سکون میسّر ہو۔ دوم یہ کہ دل سے ریا نکال کر خلوص سے پیش آنا۔ سوم یہ کہ ابلیس ہمارا دشمن ہے۔ اس خیال کو یقین کی حد تک دل میں جگہ دینا اور چہارم یہ کہ ہم جو کچھ کریں اس کا حاصل توشۂ آخرت ہو۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہو جائیں گے تو دین اور دنیا میں سرخرو ہوں گے ورنہ ذلیل و خوار ہو جائیں

گے۔''

حاتم کے دل پر ان باتوں کا اتنا اثر ہوا کہ اس کے دونوں رخسار آنسوؤں سے تر بتر ہو گئے۔

آپ اپنے وعظ میں جو کچھ فرماتے تھے، وہ سننے والوں کے دلوں میں اتر جاتا تھا اور پھر وہ دلوں سے نکالا نہیں جا سکتا تھا۔

آپ کے پاس آنے والے طرح طرح کے سوال لے کر آتے اور ان کا خاطر خواہ، معقول اور بھرپور جواب پا کر الٹے قدموں واپس چلے جاتے۔

ایک شخص آپ کی باتوں کو تصنع قرار دیتا تھا۔ اس نے حاتم سے کہا۔ ''تم لوگوں نے اپنے پیر کو معلوم نہیں کیا بنا رکھا ہے۔ میں ان سے ایک ہی سوال کروں گا اور وہ اس کا جواب نہیں دے سکیں گے۔''

حاتم نے جواب دیا۔ ''ہو سکتا ہے، لیکن میں یقین نہیں کروں گا۔''

اس شخص نے کہا۔ ''پھر آپ چلیں میرے ساتھ۔ میں ان سے بات کروں گا اور آپ ان کی باتوں سے خود ہی اندازہ لگا لیں گے۔''

حاتم ساتھ جانے پر رضامند ہو گئے۔

وہ شخص آپ کے پاس پہنچا اور عرض کیا۔ ''حضرت! میں آپ کے پاس ایک خاص سوال کرنے آیا ہوں۔ آپ اس کا جواب مرحمت فرمائیں گے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''[illegible] ہے کہ تو میرا امتحان لے رہا ہے۔''

اس شخص نے عاجزانہ عرض کیا۔ ''ایسی بات نہیں ہے بلکہ میں پیاسا ہوں اور آپ کنواں۔ میں آپ کے پاس ایک خاص معاملے میں اجازت حاصل کرنے آیا ہوں۔''

آپ نے اجازت دے دی۔ ''پوچھ کیا پوچھنا چاہتا ہے؟''

اس نے کہا۔ ''میں حج پر جانا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں آپ کی اجازت اور نصیحت کا طالب ہوں۔''

حاتم پریشان تھے کہ کہیں پیر و مرشد کوئی معمولی بات نہ کر دیں جو سبکی ہو جائے۔

آپ نے فرمایا۔ ''پہلے یہ بتا کہ تو زادِ سفر میں اپنے ساتھ کیا لے جائے گا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''پانچ چیزیں۔''

آپ نے پوچھا۔ ''کون کون سی؟''

اس نے جواب دیا۔ ''اوّل یہ کہ میں اپنی روزی کو دوسروں کی نسبت زیادہ قریب پاتا ہوں۔ دوم یہ کہ میں اس پر یقینِ کامل رکھتا ہوں کہ میرے رزق میں دوسرا کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ سوم یہ کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے اور وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ چہارم یہ کہ اللہ میری نیک و بد حالت اور میرے ظاہر و باطن سے پوری طرح واقف ہے۔''

اس کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ آپ نے پوچھا۔ ''پنجم؟''

اس نے ذہن اور حافظے پر زور دیا۔ ''پانچویں بات یاد نہیں آ رہی۔'' اس نے جواب دیا۔

آپ نے فرمایا۔ ''پنجم یہ کہ تیرا ہر عمل فی سبیل اللہ ہے، اللہ کے لیے، اللہ کی رضا تیری رضا اور اللہ کی خوشنودی میں تیری خوشنودی۔''

اس شخص نے آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور حاتم خود کو کامیاب اور سرخرو پا کر آنسوؤں سے رونے لگے۔

آپ نے اس شخص کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔ ''بہرحال تو کامیاب ہے۔ تیرے زادِ سفر سے بہتر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تیرا حج قبول فرمائے۔''

(جاری ہے)

**مضمون کے مآخذ**

نفحات الانس، مولانا عبدالرحمٰن جامی۔ تذکرۃ الاولیاء، شیخ فرید الدین عطار۔ الطبقات الکبریٰ، علامہ عبدالوہاب اشعری۔ حکایات شیریں، مرتبہ: مجلہ آئینہ لاہور

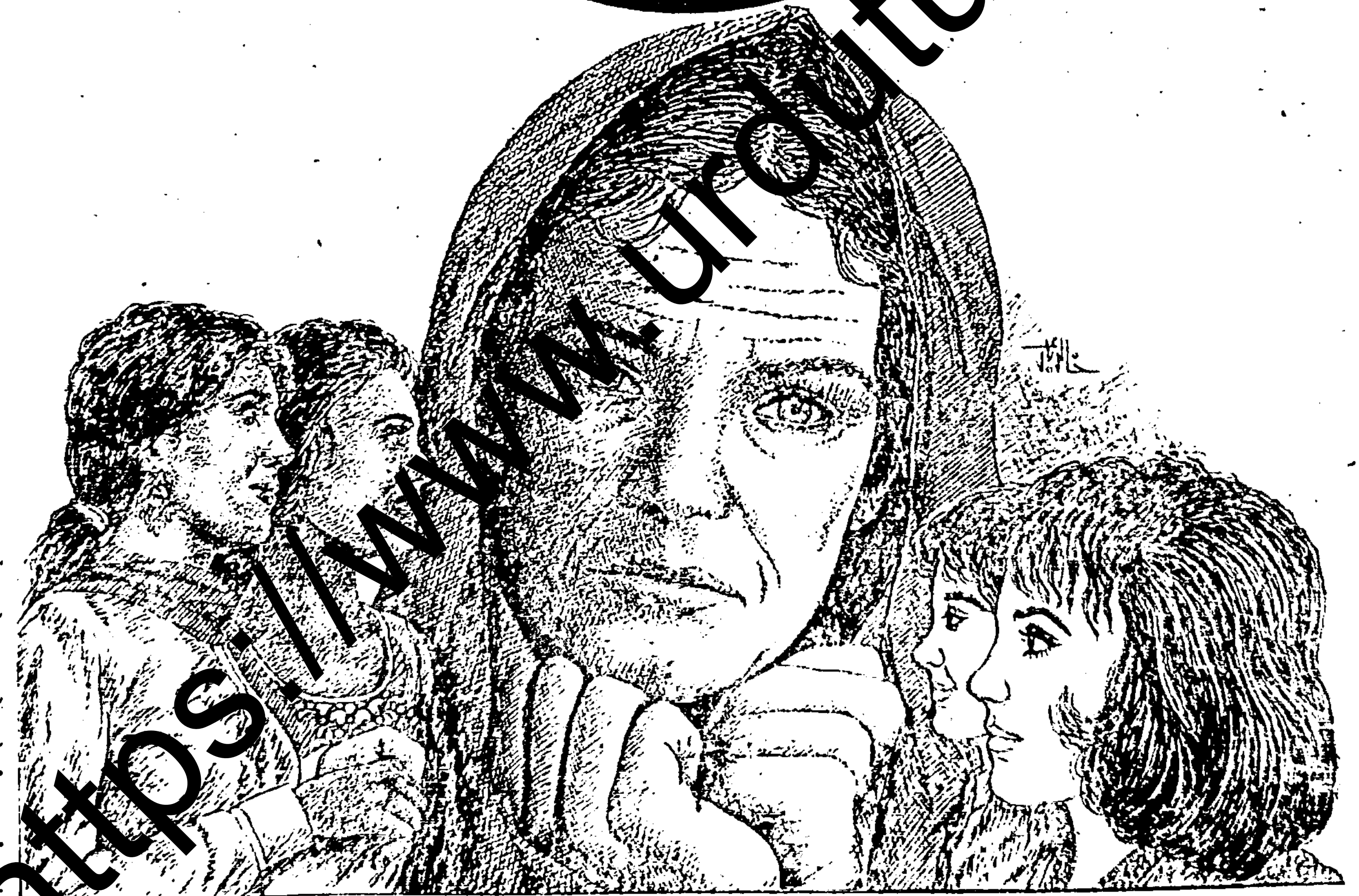
# بدلا دسمبر

عیوق بخاری

زمین و جائداد کا ہمیشہ سے ہی جھگڑا رہا ہے... یہ دلوں میں فرق ڈالنے کا سبب بنتا ہے... پل بھر میں اپنے، پرائے ہوجاتے ہیں اور یہ تک بھول جاتے ہیں کہ رشتوں کی اصل اہمیت کیا ہے... اولاد جائداد کی خاطر ماں باپ کے سامنے کھڑی ہوجاتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے خوشحال گھرانا بے سکونی کی نذر ہوجاتا ہے۔

رشتوں کی اہمیت کو اجاگر کرتی ایک

دلگداز تحریر



"یہ اس وقت کی بات ہے جب سردیوں کی شامیں گلابی ہوتی تھیں اور صبحیں چمکیلی۔ موسم اور ماحول بھی شفاف تھے اور دل بھی۔ ایک گھر میں ساگ کو تڑکا لگتا تو پورے محلے کے گھروں میں خوشبو جاتی اور پھر اس ایک گھر کا ساگ برتن بھر بھر کر محلے کے گھروں میں بانٹا جاتا۔ بڑی پیاری سردیاں ہوتی تھیں۔ سرمئی بادلوں اور سردی بڑھاتی بارش کا منظر بڑا دلچسپ ہوتا۔ بڑے بڑے رنگین پایوں والی چارپائیوں پر لحافوں میں گھس کر نانی، دادی سے پریوں،

شہزادیوں کی کہانیاں سنتے۔ رشتے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے، مشترکہ خاندانی نظام خامیوں کی نذر نہیں ہوا تھا۔ شام ہوتے ہی گھر میں رونق ہو جاتی۔ گھر کے مرد سارا دن کام کرنے کے بعد گھر کی راحت میں آچکے ہوتے۔ مٹی کے بڑے سے چبوترے پر بنے ہوئے مٹی کے چولہوں پر کھانوں کے پتیلے چڑھے ہوتے۔ ایک جگہ بیٹھ کر پورا خاندان سادہ لیکن صحت بخش غذا کھاتا۔ گھر، خاندان، رشتے دار تو کیا، محلے اور گاؤں کے لوگوں میں بھی گہرا رشتہ تھا۔ جھوٹ سے بچے تھے، لالچ کا پتا تک نہ تھا۔ تھوڑے سے میں اپنے گھر کے خوش ہونے والے ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے۔ پوری قوم ایک تھی۔ سب اچھا چل رہا تھا کہ اچانک کسی کی نظر لگ گئی اور دنوں میں سکون بے سکونی، امن بدامنی اور خوشی دکھ میں بدل گئی...... آہ......!"

طویل بات کرنے کے بعد زیب النساء بیگم سرد آہ بھر کر چپ سی ہو گئیں، ان کی آنکھوں میں ایک دکھ اتر آیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے اپنے پوتے، پوتیوں اور دو بہوؤں عمرانہ اور نورین کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"دادی امی! کس کی نظر لگ گئی، کچھ کیا ہوا بتائیں۔" نہم کے اسٹوڈنٹ عاشر نے دادی کو چپ دیکھ کر سوال کیا۔

"بس بیٹا! جو بدخواہ تھے، ان کی نظر لگ گئی۔ پھر یہ تیرا...... یہ میرا...... ساگ تیرا...... پٹ سن میری...... کہا جانے لگا۔ بھائی کو بھائی پر غصہ آنے لگا، اتنا کہ ماں یعنی دھرتی ماں کا بھی خیال نہ رہا...... میں جو مانگ رہا ہوں دے دو ورنہ...... سب بگڑنے لگا تھا۔" زیب النساء بولیں۔

"مانگا...... کیا مانگا تھا دادو؟" دوسرے پوتے ظہیر نے قریب ہو کر سوال کیا۔

"مانگا تو حق ہی تھا...... لیکن بیٹا! بات کرنے اور حق مانگنے کا طریقہ بہت خوفناک تھا۔ اس بات کے بھیانک اثرات نکلنے والے تھے۔" زیب النساء نے دکھی لہجے میں کہا۔ ان کی دونوں بہوئیں خاموش بیٹھی تھیں۔

"دادو! یہ کب کی بات ہے، کس کی کہانی ہے؟" پوتے نے سوال کیا۔

"بیٹا! برسوں پہلے کی بات ہے اور یہ کہانی سب کی سچی کہانی ہے، جس کے بارے میں تم بچوں نے کتابوں میں چند جملے یا صفحے پڑھے ہیں لیکن پوری حقیقت کیا ہے، یہ تم بچوں کو نہیں معلوم...... اور آج میں تمہیں یہ کہانی سناؤں گی تاکہ تمہیں بھی برسوں پہلے کا اپنوں کا دیا گیا درد اور زخمی ہونے کی تکلیف کا پتا چلے اور پھر یہ بھی احساس ہو کہ اپنے آپ کو تکلیف سے بچانے کے لیے کون سی کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔" زیب النساء کو پوتے پوتیوں کا اشتیاق وانہماک دیکھ کر سکون سا ہوا کہ ان کی بات توجہ سے سنی جائے گی۔

☆☆☆

زیب النساء بیگم کا تعلق ایک زمیندار اور نیک دل خاندان سے تھا۔ ان کی شادی عزیز احمد سے ہوئی تو انہیں ادراک ہوا کہ خدا نے سسرال بھی خاندانی اور وضع دار دیا ہے۔ "گھر سے کوئی بھوکا نہ جائے۔" یہ ان کے ساس سسر کی ہدایت تھی۔ آئے گئے کی خاطر کرنا، غریبوں کی مدد کرنا، عید، شب برات پر تحائف تقسیم کرنا ان کی روایت تھی۔ میکے کی تربیت یافتہ زیب النساء کے انداز واطوار ایسے تھے کہ لوگ تعریف کرتے نہ تھکتے۔

ساس سسر کے انتقال کے بعد انہوں نے اپنا آبائی گھر چھوڑنے کے بجائے وہیں رہائش رکھی۔ عزیز احمد کی ایک بہن تھی، خالدہ۔ اسے اس کا شرعی حق دے کر سب کچھ عزیز احمد کا تھا۔ خدا نے ان کو سات اولادوں سے نوازا۔ چار بیٹیاں صائمہ، رضوانہ، طیبہ اور سعدیہ۔ تین بیٹے ثاقب، واصف اور بابر۔ خاندانی زمین تھی، مالٹے کے باغات تھے۔ باپ بیٹوں نے مل کر شوروم کھول لیا۔ روپے پیسے کی ریل پیل تھی۔ زیب النساء بیگم نے اپنی ساس والی روایت برقرار رکھی تھی۔ غریبوں کا حق نکال کر پھر گھر کا سوچنا۔ انہوں نے جب بیٹوں کی شادیاں کیں تو اپنی ساس کی طرح خود بھی شفیق اور مہربان بن کر بہوؤں کے ساتھ رہیں۔

بڑے بیٹے ثاقب کی شادی شمائلہ نامی پڑھی لکھی لڑکی سے کی تو کچھ ہی عرصے بعد زیب النساء کو شمائلہ کی چھوٹی بہن عمرانہ منجھلے بیٹے واصف کے لیے بھا گئی۔ چند دن لگے، دونوں گھرانوں کی رضامندی سے یہ رشتہ بھی طے پا گیا اور پھر چھوٹے اور آخری بیٹے بابر کے لیے جلدی جلدی رشتہ ڈھونڈا گیا تاکہ دونوں بیٹوں کی اکٹھے شادی کر دی جائے۔ یہ کام بھی ہو گیا اور عمرانہ اور نورین، واصف اور بابر کی دلہن بن کر آ گئیں۔ دو بیٹیوں صائمہ اور رضوانہ کی شادی بڑے بھائی ثاقب سے پہلے ہو گئی تھی جبکہ ثاقب کی شادی کے سال بعد طیبہ، سعدیہ بھی اپنے گھر کی ہو گئیں اور پھر واصف اور بابر بھی شادی شدہ ہو گئے۔

سال پر لگا کر اڑنے لگے۔ نواسے، نواسیاں، پوتے، پوتیاں آ گئے۔ گھر میں خوب رونق ہو گئی تھی۔ پھر اس رونق کو نظر لگ گئی۔ ہوا یہ کہ عزیز احمد اور زیب النساء بیگم نے

بیٹیوں کو جائداد میں سے ان کا شرعی حصہ دے دیا۔ بیٹیوں کا حق غصب کرنے والے معاشرے میں یہ بات کافی حیران کن تھی اور اس بات پر بڑی بہو شائلہ تو اچھی خاصی سیخ پا ہوگئی۔

''اتنا بھاری جہیز دیا۔ اب ان کا ہماری جائداد میں حصہ کیوں؟'' اس نے بڑے غصے سے کہا تھا۔ اس وقت ساس، سسر پاس نہیں تھے اس لیے ثاقب پر غصہ اتارا جارہا تھا۔

''جہیز جتنا بھی دو، زمین، دکان میں تو اسلام کے مطابق حصہ بنتا ہے نا اس لیے......'' ثاقب نے بڑی نرمی سے دفاع کرنا چاہا۔

''اسلام......؟ اسلام میں بھاری جہیز کی اجازت ہے کیا؟ [illegible] دے دیا اور اب ہمارے بچوں کا حق بیٹیوں میں بانٹ [illegible]'' شائلہ نے شوہر کی بات کاٹی۔

''اور اگر [illegible] بھی تو تھوڑا بہت دے دیتے۔ کوئی ایک آدھ [illegible] گن گن کر ساری چیزیں کیوں دی گئیں؟'' شائلہ کی آواز اونچی ہو رہی تھی جو لاؤنج کے قریب کمرا ہونے کی وجہ سے لاؤنج میں [illegible] زیب النساء تک پہنچ گئی۔ وہ خاموشی سے سنتی رہیں۔ انہیں دکھ ہو رہا تھا۔

کچھ دیر اونچی آوازیں سننے کے بعد انہوں نے ثاقب اور شائلہ کو بلایا اور ان کے آتے ہی تمہید باندھے بغیر بولیں۔

''یہ گھر، دکانیں، شوروم، زرعی زمین و باغات سب کچھ میرا اور میرے شوہر عزیز احمد کا ہے جو ہم نے قرآن وسنت کی تعلیمات کی روشنی میں اپنا حصہ رکھ کر بچوں میں تقسیم کردیا ہے، بیٹیوں کو دے دیا ہے۔ چند دن میں تینوں بیٹوں کے نام بھی ہوجائے گا۔ میری ذاتی جائداد اور میری بیٹیوں کو اس میں سے حصہ دینے کے بارے میں کسی کو بات کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔ جب کسی کا حق غصب ہوا ہی نہیں تو کوئی اس بارے میں نہ بولے۔ میں اور میرا شوہر ان لوگوں میں سے نہیں جو بیٹوں کو خوب مالدار کرنے کے لیے بیٹیوں کا حصہ ہڑپ کر جاتے ہیں۔ سب لوگ گھر کے سکون چین کو برقرار رکھنے میں میرے ساتھ تعاون کریں۔'' انہوں نے بات ختم کرکے اپنی توجہ میتھی چننے پر لگادی۔

''لیکن امی......! وہ داماد تو پرائے ہوتے ہیں۔ اب ابا جی اور آپ کی جائداد پر پرائے عیش کریں گے۔ مجھے تو یہ مناسب نہیں لگ رہا۔'' شائلہ نے ذرا نیچی آواز میں اپنا مؤقف بیان کیا۔

''جب میں تفصیل سے بتا چکی ہوں تو تمہارا ''لیکن'' کہنا اس وقت سب سے زیادہ نامناسب ہے۔ کیا کہا تم نے، داماد پرائے ہوتے ہیں؟'' زیب النساء نے شائلہ اور ثاقب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بہو کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

''جی امی! پرائے ہی ہیں، کسی اور کی اولاد۔ ہماری بیٹیوں سے شادی کے بعد اب انہیں مال و دولت دے دیں؟'' شائلہ نے بڑا زور دے کر بات کی۔

''اچھا تو...... بیٹا جی! اس طرح تو بہوئیں بھی اور گھر سے آتی ہیں، کسی اور کی اولاد...... اس طرح تو وہ بھی پرائی ہوئیں۔ ہمارے بیٹوں سے شادی کے بعد کیا انہیں مال و دولت دینا مناسب ہے؟'' زیب النساء بیگم نے وہ بات کہہ دی جو اس سے پہلے یقیناً کسی نے نہیں کہی تھی۔ وہ شائلہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے یہ بات کہہ کر چپ ہوکر بیٹھ گئیں۔ دونوں میاں بیوی ساکت سے بیٹھے رہ گئے کیونکہ اس بات کا کوئی جواب ہی نہ تھا۔

''رب نے سب انسان برابر بنائے ہیں اس لیے اس نے بیٹے اور بیٹی دونوں کا حصہ رکھا ہے۔ میری بات پوری ہوگئی ہے۔ جاؤ، اب تم اپنے اپنے کام پر لگو۔'' زیب النساء نے بڑی سنجیدگی سے کہا اور کچن کی جانب چل دیں۔

شائلہ نے کچھ دیر نظریں قالین پر جمائے رکھیں پھر شوہر کی طرف دیکھا۔

''میں اب اس گھر میں نہیں رہوں گی، جلدی انتظام کرو۔'' اس نے نہایت غصے سے کہا۔ ثاقب حیران پریشان بیوی کو دیکھ رہا تھا۔

''[illegible] میں جو ہمارا حصہ بنتا ہے، وہ لو...... اسے فروخت کرو [illegible] خریدو۔'' شائلہ نے یوں کہا جیسے برگر، سینڈوچ خریدنے کی بات ہو۔

''اتنی جلدی تو نہیں ہوسکتا......!'' ثاقب نے بولنا چاہا لیکن شائلہ کچھ سننے کو تیار نہ تھی۔ [illegible] کا حصہ ہڑپ کرنے میں ناکامی نے اسے مشتعل کردیا تھا۔ یہ بات ساس، سسر تک بھی پہنچ گئی۔

''بہو! خاندانی گھر میں سے ایک حصہ کسی [illegible] کو فروخت کرسکتے ہیں۔ تینوں بیٹوں کا پورشن الگ [illegible] جاسکتا ہے۔ تمہیں ہم سے نفرت محسوس ہو رہی ہے تو دیواریں کھڑی کرلو لیکن ذرا سمجھ سے کام لو کہ یہ گھر ٹکڑے ٹکڑے کرکے بیچنا ناممکن ہے۔'' عزیز احمد نے سمجھایا۔ وہ کافی دکھی دکھائی دے رہے تھے۔

''ہمارا حصہ ہے۔ اس میں رہیں یا فروخت کریں، ہمارا حق، ہماری مرضی۔ آپ مت روکیں۔'' شائلہ نے

بدتمیزی سے کہا۔ ثاقب نے بیوی کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن دبے لفظوں میں، اور ان لفظوں کا بیوی پر ذرا اثر نہ ہوا۔

''ہمیں دو تین ماہ کا وقت دو۔ ہم تمہارے حصّے کے برابر رقم دے دیتے ہیں۔'' شریف النفس عزیز احمد نے حل پیش کیا لیکن شائلہ غصے میں گھر کو توڑنے کے درپے تھی۔

بات باہر تک پہنچ گئی۔ میکے والے تو بیٹی کے ساتھ تھے ہی، محلے والوں، واقف لوگوں نے بھی دخل اندازی شروع کر دی۔ عزیز احمد اور زیب النساء بیگم کے آشیانے [illegible] کی خبر نے ان کے بدخواہوں کو موقع دے دیا۔ شائلہ کو حمایتی میسر آ گئے۔

''اپنا حق ہی تو مانگ رہی ہے۔'' بڑے نرم لہجے میں کہتے ہوئے [illegible]، بھڑکایا جاتا اور زیب النساء اور عزیز احمد خواب [illegible] اور شائلہ کو اس کا پورا حق دینے کے لیے کوشاں تھے۔

گھر میں لڑائی ہونے [illegible] ثاقب بھی بیوی کی زبان بولنے لگا تھا۔ عمرانہ بظاہر تو چپ تھی لیکن [illegible] کی دلی ہمدردیاں بڑی بہن شائلہ اور بہنوئی ثاقب [illegible] تھیں۔ وہ بھی کھل کر سامنے آسکتی تھی لیکن اس کا شوہر [illegible] طور پر اپنے والدین کے حق میں تھا اس لیے وہ خاموش رہنے پر مجبور تھی۔ گھر کے افراد کی سوچ بدلنے اور باہر کے لوگوں کی آشیرباد سے دنوں میں یہ ہوا کہ ثاقب نے کرائے پر الگ گھر لے لیا اور بیوی بچوں کو لے کر وہاں چلا گیا۔

برسوں جس چھت کے نیچے گزارے، اسے پل بھر میں چھوڑ کر جب بیٹا اور بہو چلے گئے تو زیب النساء اور عزیز احمد کا دل کرب سے بھر گیا۔ روایتی ماؤں کی طرح رونا دھونا کرنے کے بجائے زیب النساء خاموش ہو گئی تھیں۔ اچھی بھلی پرسکون زندگی درہم برہم ہو گئی تھی۔

زیب النساء اکثر سوچتیں کہ کیسے حالات سدھارے جائیں۔

☆☆☆

''مما! دادو آئی ہیں۔'' گیٹ کھولتے ہی زیب النساء کو دیکھ کر اسامہ حیرت و خوشی سے بولا۔

ثاقب کی چھوٹی بیٹی کو دو تین روز سے تیز بخار تھا۔ زیب النساء کو پتا چلا تو ساری ناراضگی بھول کر خیریت دریافت کرنے بیٹے کے گھر جا پہنچیں۔

''السلام علیکم امی!'' شائلہ نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے سلام کیا۔ اس کے چہرے پر ساس کو دیکھ کر حیرانی تھی۔ سلام کا جواب دیتے ہوئے زیب النساء بہو کا پیار لینے کے لیے بڑھا سر نظرانداز کر کے کمرے میں چلی گئیں جہاں ان کی بیمار پوتی موجود تھی۔

''امی! آپ بیٹھیں، میں چائے بناتی ہوں۔'' شائلہ بڑا ادب و احترام دکھا رہی تھی۔

''نہیں...... اس کی ضرورت نہیں۔ میں بس ابھی چلی جاؤں گی۔'' انہوں نے آہستگی سے بچی کو لٹاتے ہوئے جواب دیا لیکن شائلہ پھر بھی کچن میں چلی گئی۔ اسامہ دادی کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ زیب النساء اس سے باتیں کرنے لگیں۔ اسی دوران شائلہ چائے لے آئی۔

''دادو! پتا ہے کل کیا ہوا؟ میں دوسرے محلے میں کھیلنے چلا گیا اور کھیلنے میں کافی دیر لگا دی۔ جب میں واپس آیا تو مما رو رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے بہت ڈانٹا۔ یہ مجھے محلے بھر میں تلاش کرتی پھر رہی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا ہے کہ آئندہ کبھی بھی دور نہیں جانا۔'' اسامہ نے بات مکمل کی۔

''اور کیا امی! اتنا پریشان کیا اس نے، میں تو جوتے مارنے کا سوچ رہی تھی لیکن کئی گھنٹوں کے بعد بیٹے کو دیکھا تو غصہ بھول کر اسے سینے سے لگا کر پیار کرنے لگی۔'' کپ میں چائے ڈالتی شائلہ نے بیٹے کو گھورتے ہوئے بتایا۔

''بری بات بیٹا! آئندہ ایسا کبھی بھی نہ کرنا۔ یاد رکھو، جب بیٹا، ماں سے دور ہو جائے تو ماں روتی ہی ہے۔'' زیب النساء نے پوتے کو سمجھایا تو شائلہ یکدم چپ سی ہو کر [illegible] کو دیکھنے لگی۔ ان الفاظ میں شائلہ کے لیے ایک واضح پیغام تھا۔

''وہ...... [illegible] اس وقت گھر پر نہیں ہوتے...... آپ کہیں تو فون کر [illegible]'' وہ گڑبڑائی ہوئی تھی۔

''مجھے پتا ہے [illegible] اس وقت گھر پر نہیں ہوتا۔'' زیب النساء نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''اری شمو...... او شمو...... [illegible] باہر نکل، دیکھ میں تیرے لیے کیا لائی ہوں۔'' اچانک ایک آواز آئی۔ شائلہ تیزی سے باہر نکلی۔ زیب النساء بیگم حیران تھیں کہ یوں ''شمو، شمو'' کرنے والی بے تکلف عورت کون ہے؟ چائے کا خالی کپ رکھ کر وہ بھی باہر نکل آئیں۔ باہر آتے ہی [illegible] نظر لاؤنج میں رکھی ٹیبل پر پڑی جہاں چند ریڈی میڈ لیڈیز سوٹ اور میک اپ کا سامان پڑا تھا۔ وہ قریب آ گئیں۔ صوفے پر ٹانگیں اوپر کر کے ایک عورت بیٹھی تھی۔ وہ شکل سے تیز طرار لگ رہی تھی۔

''شمیے! یہ ساری چیزیں تجھے اتنی سستی دوں گی کہ تو حیران رہ جائے گی۔ اچھا، وہ تھوڑے سے بسکٹ اور چائے

تو لے آ۔ بھوک لگ رہی ہے۔ ارے آپا! آپ کون ہیں؟" تیز طرار عورت نے تیز تیز بولتے ہوئے زیب النساء کو دیکھ کر بڑی بے تکلفی سے مسکرا کر سوال کیا۔

"میں تمہاری "شمیمے" کی ساس ہوں۔" زیب النساء نے دھیرے سے جواب دیا۔ وہ غور سے اس عورت کو دیکھ رہی تھیں جو سستے اور گھٹیا سامان کے ساتھ ان کی بہو کو یقیناً لوٹنے آئی تھی۔ شائلہ کو شاپنگ کرنا بہت بڑی مصیبت لگتا تھا۔

"اوہ، اچھا...... میں اسی محلے میں رہتی ہوں۔ شمو اس محلے میں آئی تو میں اسے ملنے آئی، باتوں باتوں میں پتا چلا کہ یہ خود خریداری کرنا پسند نہیں کرتی۔ میں نے کہا تم آج سے میری سہیلی ہو اور سہیلی کا سارا کام میں کروں گی۔ میرا نام شریفاں بی بی ہے۔ لوگوں کے کام آنا میرے لیے خوشی کی بات ہے۔" شریفاں بی بی نے "شمیمے" کی ساس کو اپنا سوشل ورکر ہونا بتایا۔

"اور "شمو" "شمیمے" نام بھی میں نے رکھے ہیں۔" چائے بسکٹ آنے تک شریفاں بی بی نے مزید بتایا۔ شریفاں بی بی کی "شرافت" اس کے انداز گفتگو سے ٹپک رہی تھی۔ دونوں "سہیلیوں" کو گپ شپ کرتا چھوڑ کر وہ واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ چند دن اور گزرے شائلہ اب بھی اپنی ضد پر قائم تھی۔ وہ کہتی تھی کہ آبائی گھر کے تین حصے کروا کے وہ اپنا حصہ فروخت کر کے الگ گھر لے گی۔

☆☆☆

"میں نے سوچا ہے کہ ثاقب کے گھر کے حصے کی رقم اسے دے دوں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ شاید وہ واپس آجائیں اور خاندان اکٹھا ہو جائے لیکن اب شائلہ نہیں مان رہی تو ہماری طرف سے دیر کرنا ان کی حق تلفی ہوگی۔ مجھے یہ سب ہرگز پسند نہیں کہ میرے آبائی گھر کے ٹکڑے ہوں اور کوئی غیر آ کر رہے...... اور ظاہر ہے حق داروں کو حق بھی دینا ہے اس لیے ہم ہی خرید لیتے ہیں۔" شام کی چائے پیتے ہوئے عزیز احمد نے بیوی سے بات کرتے ہوئے کہا تو زیب النساء نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

یکدم آنے والی بارش نے سردی بڑھا دی تھی۔ ایک تو سردی، اوپر سے دسمبر کا مہینا، ماحول ٹھٹھر گیا تھا۔ زیب النساء نے شام کی چائے اپنے کمرے میں پینے کا ارادہ کیا۔ لاؤنج میں وہ اسی وقت چائے پیتی تھیں جب کنبہ پورا تھا اور جب عزیز احمد ہوتے تھے۔ عزیز احمد چند دنوں کے لیے زمینوں کا کام دیکھنے کے لیے گاؤں گئے ہوئے تھے۔ اپنے کمرے میں چائے منگواتے ہوئے انہوں نے ملازمہ سے کہا کہ دونوں بہوؤں اور پوتے پوتیوں کو بھی ان کے کمرے میں بھیج دو، ضروری بات کرنی ہے۔ تھوڑی دیر میں سب وہاں جمع تھے۔ پوتے پوتیاں تو دادی کے پاس بڑے سے کمبل میں بیٹھ گئے اور بڑے بیڈ پر مکمل قبضہ کر لیا۔ بہوئیں بیڈ کے قریب پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ سب ہمہ تن گوش تھے کہ کیا ضروری بات کرنی ہے۔

"چھوٹے بچوں کو باہر لے جاؤ، یہ شور کریں گے اور بات نہیں کرنے دیں گے۔" زیب النساء نے ملازم سے کہہ کر چھوٹے دو بچے باہر بھجوا دیے اور اب ان کے پاس ان کے دو پوتے عاشر، شبر اور پوتی طوبیٰ بیٹھی تھی اور دونوں بہوئیں عمرانہ اور نورین۔ زیب النساء نوٹ کر رہی تھیں کہ شائلہ اور ثاقب کو رقم بھجوانے کے بعد گھر کے ماحول میں مزید تبدیلی آئی ہے۔ عمرانہ تو شائلہ کی بہن تھی، اس کی راہ پر چل سکتی تھی لیکن اب تو نورین بھی آنکھیں بدل رہی تھی۔ دونوں بہوؤں کے بدلے تیور و انداز کو وہ مسلسل دیکھ رہی تھیں اور دکھی ہو رہی تھیں۔

انہوں نے چہرے پر بشاشت لاتے ہوئے کہا۔ "ضروری بات یہ ہے جو شاید تمہارے لیے کچھ خاص نہ ہو لیکن میرے لیے بہت خاص ہے۔ آج دسمبر کی ٹھنڈک میں کچھ تلخ یادیں دہرانے کو جی چاہا تو سوچا اپنے بچوں کے ساتھ دہراؤں اور انہیں ایک سچی کہانی سناؤں۔ کیا خیال ہے عمرانہ، نورین! تمہارے پاس وقت ہے میری ایک سچی کہانی سننے کا؟" زیب النساء نے بات کرتے کرتے سوال کیا۔

"جی امی! کیوں نہیں، رات کا کھانا ملازم تیار کر رہے ہیں، ہم فارغ ہی ہیں۔" نورین نے جواب دیا۔

"ہمارے پاس وقت ہو نہ ہو لیکن آپ کی بات تو ہم ضرور سنیں گے۔ آخر آپ ہماری ساس ہیں۔" عمرانہ نے اس انداز میں کہا جو زیب النساء کو ہرگز پسند نہیں آیا۔

زیب النساء نے چند سیکنڈ کے لیے آنکھیں بند کیں اور پھر کھول لیں۔ اسی قلیل سے وقت میں ان کے ذہن میں ایک دردناک فلم کے جھماکے سے ہوئے تھے۔ اسی دردناک فلم کے بارے میں اپنے بچوں کو کچھ سنا کر ایک آخری کوشش کرنا چاہ رہی تھیں...... اور یہ کوشش تھی اپنا گھر اور شیرازہ بکھرنے سے بچانے کی۔ انہوں نے بولنا شروع کیا۔

"یہ اس وقت کی بات ہے جب سردیوں کی شامیں گلابی ہوتی تھیں......!" کہانی سناتے سناتے جب انہوں

نے نظر بد لگنے، زخمی ہونے اور کٹنے کی بات کی تو عاشر، شبر اور طوبیٰ انتہائی متجسس ہو کر ان کے قریب ہو گئے۔

’’واہ دا! کون کٹا تھا، کون کون زخمی ہوا تھا؟‘‘ شبر نے دادی کے چہرے پر کرب کے تاثرات کو غور سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

’’بیٹا! 1971ء سے پہلے پاکستان کا نقشہ اور قوم دونوں اور تھے۔ عام انتخابات ہوئے، نتائج آئے، اقتدار کی رسہ کشی شروع ہو گئی۔ حق دو، حق غصب ہو رہا ہے، یہ تیرا، وہ میرا...... کہا جانے لگا۔ بھائی نے بھائی کو دشمن سمجھ لیا، اتحاد نفاق میں بدل گیا۔ جب بھائیوں نے آپس میں لڑنا شروع کر دیا تو پرائے لوگوں نے جلتی پر تیل ڈالنا شروع کر دیا۔ تعصب کی آگ پر دشمن کی چالبازی کا تیل پڑا تو شعلوں نے آشیانہ جلا ڈالا۔ آدھا ملک کٹ گیا۔ آپس کے جھگڑے اور غلط انداز میں چلنے کا نتیجہ جگ ہنسائی کی صورت میں نکلا۔ جناح کا پاکستان ٹوٹ گیا، اقبال کی بنائی ہوئی تصویر پر اس لہو کے چھینٹے پڑ گئے جو ان معصوم لوگوں کا تھا۔ جس شاخ پر بیٹھے تھے، نادان اسی پر کلہاڑی چلا رہے تھے اور پھر...... اس درخت کو کاٹ ڈالا جس کی چھاؤں میں محفوظ بیٹھے تھے۔ درخت بھی کٹا اور خود بھی بری طرح گرے۔ اس سارے معاملے میں دشمن نے بھرپور حصہ ڈالتے ہوئے اپنوں کو اپنوں کے خلاف بھڑکایا۔ پاکستان کے دو ٹکڑے ہو گئے، بے شمار قربانیاں دے کر حاصل کیا جانے والا وطن محض اس وجہ سے دو حصوں میں بٹ گیا کہ ہمیں ہمارا حق ہماری شرائط پر دو۔ جو بھی دل رکھتا ہے، ذی شعور ہے اور اس نے اس سانحے کو دیکھا یا سنا اور پڑھا، اس کی روح آج بھی زخمی ہے...... اپنے چمن اجڑنے کا غم آج بھی تازہ ہے۔‘‘ زیب النساء بیگم کی آواز بھرا گئی۔ کمرے میں سوگواری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

’’میں اس وقت چھوٹی سی تھی لیکن اتنی ہوش والی کہ سارے غم کے پل محسوس کیے۔ اپنے ابا جی اور اماں جی کو پاکستان ٹوٹنے کی خبر سن کر زار و قطار روتے دیکھا۔ بچو! جب یہ دردناک سانحہ ہوا، دسمبر کا مہینا تھا۔ میں نے جب بھی دل کی آنکھ سے اس منحوس شام کو دیکھا، مجھے لگا کہ گلابی شام، سرخ ہو گئی ہو۔ یہ سرخی ان شہیدوں کے ورثاء کی آنکھوں کی تھی جنہوں نے اپنے پیارے اس وطن کو بنانے اور پھر قائم رکھنے کے لیے قربان کیے تھے۔ یہ سرخی ان معصوموں کے لہو کی تھی جو سیاست، حکومت، اقتدار کے بارے میں جانتے تک نہ تھے لیکن چھینا جھپٹی کے فسادات کی نذر ہو گئے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ جنہوں نے وطن توڑ کر کرسی کی جنگ جیتی، کچھ ہی عرصہ اقتدار میں رہ سکے۔ قدرت کی لاٹھی نے ایسا وار کیا کہ کرسی رہی نہ کرسی والے۔‘‘ زیب النساء کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ نہم، دہم کے اسٹوڈنٹ، پوتے پوتی بھی جذباتی دکھائی دے رہے تھے۔

’’بچو! کہتے ہیں کہ اگر کسی ہاتھ سے انگلی کٹ جائے تو انگلی کو نہیں، ہاتھ کو درد محسوس ہوتا ہے۔ اپنے وطن کے ٹوٹ جانے پر میں اپنے آپ کو وہ زخمی ہاتھ محسوس کرتی ہوں جس سے انگلی کٹ جائے اور اس سے خون رس رہا ہو اور اذیت دے رہا ہو۔ میں ہمیشہ اپنی دعاؤں میں ایسے درد سے بچنے کی دعا کرتی ہوں۔ اس المیے سے میں نے اور مجھ جیسے بہت سے لوگوں نے سبق سیکھا ہے لیکن کچھ ہیں جو اب بھی نہیں سنبھلے، تعصب کی بات کرتے ہیں۔ میں ان کو عقل مل جانے کی دعا کرتی ہوں۔ اللہ میرے پیارے پاکستان کو ہمیشہ ایسے کسی بھی سانحے سے بچائے، آمین۔‘‘ زیب النساء بیگم دعا کرتے کرتے رو دی تھیں۔ بچے بھی بھیگی آنکھوں کو صاف کر رہے تھے۔ عمرانہ اور نورین کو پتا بھی نہ چلا کہ ان کے چہرے بھی آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ اپنی سنائی ہوئی باتوں کا اثر دیکھ کر زیب النساء رونا بھول گئیں۔

’’امی جی! آپ جیسوں کی دعاؤں کا اثر ضرور ہوگا۔ رب کریم ہمارے وطن کو ہمیشہ سلامت رکھے گا۔‘‘ نورین نے ساس کے قریب بیڈ پر بیٹھتے ہوئے امید دلائی۔

’’اب دوبارہ ایسا نہیں ہوگا کہ ہم اپنی آنکھوں سے اپنے گلشن کو برباد ہوتے دیکھیں یا خود کو ٹوٹا محسوس کریں۔‘‘ عمرانہ نے بڑے جذبے سے کہتے ہوئے اپنی آنکھوں کی نمی کو صاف کیا۔ زیب النساء نے بڑے غور سے بہوؤں کی طرف دیکھا۔

☆☆☆

’’یہ جو تمہاری شریفاں ہے نا، یہ اس کی ’’شرافت‘‘ لگ رہی ہے مجھے...... خوب بے وقوف بنا رہی ہے۔ اچھا سنو......!‘‘ موبائل فون کان سے لگائے عمرانہ بڑے [illegible] لہجے میں بات کر رہی تھی کہ زیب النساء کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ یکدم چپ ہو گئی۔

’’جی امی! کوئی کام ہے مجھ سے؟‘‘ اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا جو زیب النساء کو خوشگوار لگا۔ کل شام کی سنائی گئی سقوطِ ڈھاکا کی کہانی کا اثر لگ رہا تھا۔

’’کچھ سامان لینے جا رہی تھی، سوچا تمہیں پوچھ لوں۔ اگر کچھ خریداری کرنی ہے تو چلو میرے ساتھ۔‘‘ زیب

النساء بولیں۔

''جی...... جانا تو چاہتی ہوں لیکن آپ میری ایک بات سنیں گی؟'' عمرانہ نے نظریں جھکاتے ہوئے پوچھا۔

''بہو! ایسی کون سی بات ہے جو تم یوں جھجک رہی ہو؟'' زیب النساء نے حیران ہو کر سوال کیا۔

''بیٹھیں امی جی!'' عمرانہ نے ساس کو کہا اور موبائل پر جو گفتگو کر رہی تھی، وہ سنانے لگی۔ زیب النساء بیگم سنتے ہوئے تاسف سے سر ہلا رہی تھیں۔ عمرانہ کی بتائی گئی باتوں کا لب لباب یہ تھا کہ شائلہ کو نیا گھر اور محلہ بالکل راس نہیں آیا۔ ماحول بالکل اچھا نہیں، بچے چند دنوں میں آپس میں لڑتے ہوئے گالیاں دینے لگے ہیں۔ ثاقب کے سارا دن باہر ہونے کی وجہ سے اکیلی شائلہ بچوں کو سنبھالنے میں ہلکان ہو رہی ہے اور اس کے علاوہ گھر سے دو سونے کی انگوٹھیاں، ایک چاندی کی [illegible] چکی ہے۔ وقتاً فوقتاً پیسے بھی غائب ہو رہے ہیں۔''

''بہت افسوس اور دکھ کی بات ہے کہ ہمارے بچے گالیاں سیکھ رہے ہیں اور ان کا معاشی نقصان بھی ہو رہا ہے۔'' زیب النساء بیگم بڑے کرب سے بولیں۔

''جی...... اور سنیں ذرا میری بے وقوف بہن کی بات...... کہہ رہی ہے، آپا شریفاں نے کہا ہے کہ کوئی جادو آسیب کا اثر لگتا ہے، کسی پیر، بابا کا پتا کرتی ہوں۔'' عمرانہ بتانے لگی۔

''ارے کیا......؟ روکو اسے...... ان چکروں میں نہ پڑ جائے۔'' زیب النساء بیگم گھبرا کر بولیں۔

''میں اسے یہی سمجھا رہی تھی۔ میں نے تو صاف کہہ دیا ہے کہ یہ سب اس شریفاں کا ہی کیا دھرا ہے۔ کیسے مددگار بن کر وارداتیں کر رہی ہے...... مجھے تو وہ شکل سے فراڈ عورت لگتی ہے۔'' عمرانہ نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''کیا کہہ سکتے ہیں...... کیا کر سکتے ہیں؟ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے اور اپنی خوشی سے اس جاہل، اجڈ اور فراڈ عورت کی ''شمو، شمیے'' بنی ہے۔'' زیب النساء بیگم ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔

''صحیح کہہ رہی ہیں امی!'' عمرانہ دکھی دکھائی دے رہی تھی۔

☆☆☆

''عزیز صاحب! دیکھیں تو، یہ ثاقب اور شائلہ ہی ہیں نا؟'' زیب النساء نے شوہر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے بیرونی گیٹ کی جانب دیکھ رہی تھیں جہاں سے ثاقب، شائلہ اور بچے اندر داخل ہو رہے تھے۔ چائے پیتے عزیز احمد چونکے اور آ کر کھڑکی سے دیکھنے لگے۔ وہ کچھ بولے نہیں تھے، بس جذباتی سے انداز میں پوتے پوتیوں کو دیکھ رہے تھے۔

''امی جی، السلام علیکم! کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟'' شائلہ نے بڑے احترام سے پوچھا۔ زیب النساء بیگم نے دیکھا، یکدم باغی ہو جانے والی شائلہ کے چہرے پر تھکن اور شرمندگی سی نظر آ رہی تھی۔

''آؤ بیٹا آؤ، تمہارا اپنا گھر ہے۔'' عزیز احمد نے پیار سے کہا۔ واقعی ان کا دل بہت بڑا تھا۔ شائلہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی آئی اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

''زیادہ بولنا نہیں آ رہا اور بولا جا بھی نہیں رہا...... بس اتنا کہہ رہی ہوں کہ......!'' شائلہ کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ یوں خاموش ہو گئی جیسے بولنا بھول گئی ہو۔

''بولو بہو! ہم بڑے ہیں...... ہمارا ظرف بڑا ہے۔ تم اس گھر کی بڑی بہو ہو۔ جو کہنا ہے کہو، ہم سنیں گے۔'' زیب النساء بیگم نے شائلہ کی جانب دیکھے بغیر کہا۔

''میں...... کچھ سنانے نہیں، آپ کو منانے آئی ہوں...... پلیز! مان جائیں...... میں بہت شرمندہ ہوں۔'' شائلہ یکدم آگے بڑھ کر ساس سے لپٹ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو برس رہے تھے۔ زیب النساء بیگم اور عزیز احمد حیرت آمیز خوشی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ثاقب بھی خاموش سا، شرمندہ سا کھڑا تھا۔ گھر کے سبھی افراد اس کمرے میں آ چکے تھے۔ عمرانہ اس آمد کے بارے میں جانتی تھی۔ اس سے بات کرتے ہوئے شائلہ نے [illegible] آ جانے کا کہا تھا۔ جواباً عمرانہ نے کہا تھا کہ اسے دیر نہیں کرنی چاہیے۔ شائلہ کو بہن کی زبانی جب پتا چلا کہ ساس [illegible] شائلہ اور ثاقب کی طرف سے فکرمند رہتی ہے۔ جیسے اس کی نظریں ثاقب اور اس کے بچوں کو ڈھونڈتی ہیں تو اس نے اس نئے گھر کو خیرباد کہنے میں دیر نہ لگائی جس میں آنے کے چند دنوں بعد ہی وہ مسائل کا شکار ہو گئی تھی لیکن جھجک رہی تھی کہ جن کو باتیں سنا کر آئی ہے ان کا دوبارہ سامنا کیسے کرے۔ اب اسے عمرانہ سے گفتگو کے بعد حوصلہ ہوا تھا اور اب [illegible] میں کھڑی تھی جہاں وہ دلہن بن کر آئی تھی۔

''نہیں بیٹا! میں ناراض نہیں ہوں، بس بہت دکھی تھی کہ بچے گھر کی چھاؤں اور مجھ سے دور ہو گئے ہیں۔ تمہیں احساس ہو گیا ہے، یہی کافی ہے۔ شرمندہ ہونے

کی ضرورت نہیں ہے۔'' زیب النساء نے ایک پل لگایا تھا اسے معاف کرنے میں۔ وہ خوش تھیں کہ گھرانا پھر سے مکمل ہوگیا ہے۔ اس خوشی میں شکوے، شکایتیں سب کہیں دور چلی گئی تھیں۔ ثاقب بھی نادم ساماں باپ سے مل رہا تھا۔ اس نے بھی کم برا نہیں کیا تھا۔ عزیز احمد اسے گلے لگاتے ہوئے آبدیدہ ہوگئے۔ سب کی آنکھوں میں پانی تھا لیکن اس میں دکھ یا جلن والی کوئی بات نہیں تھی۔ یہ پانی کدورتیں، نفرت، غصہ، گلے، شکوے دھو دینے کی والا ... تھا۔

''... گئی ہو تو جاؤ اور دوپہر کی روٹی کے ساتھ اپنے ہاتھ کی کڑی بنا کر کھلاؤ...... شمو!'' زیب النساء نے یکدم ماحول بدلا اور ''...'' ... دیا۔ سب کے چہروں پر مسکراہٹ رینگنے لگی۔ ا... انے والوں میں شریفاں کی ''شرافت'' کا شکار ہونے والی ... بھی۔

☆☆☆

ساری رات مسلسل ہونے والی بارش نے سردی تو خوب بڑھا دی تھی لیکن صبح اٹھتے ہی ایک خوشخبری ... ملی۔ وہ یہ کہ کئی دنوں سے بادل، دھند میں چھپا سورج پوری آب و تاب سے طلوع ہوا تھا۔ آسمان دھل کر نیلا اور درخت نکھر گئے تھے۔ وسیع صحن میں عزیز احمد اور زیب النساء سمیت گھر کے افراد چھٹی والے دن نکلی دھوپ کی حرارت میں گپ شپ کر رہے تھے۔ پورے گھر میں خوشیوں بھرے قہقہے گونج رہے تھے۔ دسمبر کی سرد ہوا کی ٹھنڈک تھی لیکن سورج کی کرنوں نے ٹھنڈے دن کو چمکیلا اور حرارت بخش بنا دیا تھا۔

''لان کے پودوں کی حالت کافی خراب ہوگئی ہے۔'' شمائلہ نے کچھ پتیاں توڑتے ہوئے کہا۔

''گھر کی بڑی بہو کی سرپرستی سے جو محروم رہے ہیں۔'' زیب بیگم نے بڑے مان سے اسے اس کا عہدہ یاد دلایا۔ شمائلہ کو لگا جیسے اسے عزت و وقار سے نوازا گیا ہو۔ تائیدی انداز میں سر ہلا کر وہ کچن کی طرف بڑھی۔

☆☆☆

''عزیز صاحب! آپ نے 71ء کی جنگ اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے نا؟'' زیب النساء نے شوہر سے سوال کیا۔ شام کا وقت تھا، شال کو اچھی طرح اپنے اوپر لپیٹ کر زیب النساء بیگم کھڑکی سے اس شام کا نظارہ کر رہی تھیں جسے چھٹی والے دن نکلنے والے سورج نے خوبصورت بنا دیا تھا۔

''ارے کہاں...... میری عمر آپ جتنی نہیں ہے۔ کسی بزرگ سے ایسے سوال کریں۔'' سارا دن مکمل کنبے کے ساتھ گزارنے کے بعد عزیز احمد شوخ سے ہوگئے تھے۔

زیب النساء بے اختیار مسکرا دیں۔

''عزیز صاحب! آج بڑے عرصے بعد سردیوں کی شام گلابی لگ رہی ہے۔ لگ رہا ہے اچھے دن پھر سے آگئے ہیں۔ 71ء کے سانحے کے بعد یہ پہلا دسمبر ہے جس میں مجھے شام بدلی ہوئی اور خوبصورت لگی ورنہ ''وچھوڑے'' کے عذاب اور دسمبر میں ٹوٹنے کے دکھ نے کچھ اچھا دیکھنے لائق ہی نہیں چھوڑا تھا۔'' زیب النساء مسلسل کھڑکی سے دسمبر کی بدلی شام کا نظارہ کر رہی تھیں۔

''بیگم صاحبہ! دل کا موسم اچھا ہونے سے سب اچھا لگ رہا ہے۔'' عزیز احمد بھی پاس آ کھڑے ہوئے۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ صرف میرے گھر کا ہی نہیں، میرے وطن کا بھی دسمبر خوشیوں والا ہوگا۔ سقوطِ ڈھاکا کی تلخ یادیں سن کر میری بہوؤں میں تبدیلی آگئی اور انہوں نے آئندہ غلطیاں نہ دہرانے کا عہد کرلیا۔ اب مجھے یہ بھی امید ہونے لگی ہے کہ انہی تلخ یادوں سے میری قوم بھی ضرور جذباتی ہوکر سبق سیکھ جائے گی اور آئندہ تعصب اور ٹوٹنے سے بچے گی، ان شاء اللہ!'' زیب النساء بیگم کے چہرے پر نئی امیدوں کے چراغ جل رہے تھے۔

ان شاء اللہ!'' عزیز احمد نے پیارے پاکستان کی ایک پیاری شام ... ہوئے بڑے جذب سے کہا۔ انہیں کچھ بچھڑے دوست یاد آئے، پٹ سن کی خوشبو بھی یاد آئی لیکن...... امید کی زمین ... والے پھولوں کی خوشبوؤں نے ایک مسحور کن سا احساس دیا۔

''مجھے لگتا تھا دسمبر جدائی کا مہینا ہے لیکن اس بار برعکس ہوا ہے۔'' لاؤنج میں کھیلتے پوتے پوتیوں کو دیکھ کر عزیز احمد مسکرائے۔

''چمکتے دنوں اور گلابی شاموں کا یقین کرلیں عزیز صاحب! کیونکہ اس بار دسمبر بدلا ہے...... بچھڑنے کی ... نے ملن کا رواج ڈالنا شروع کردیا ہے...... یہ رواج میرے گھر ہی نہیں، پورے وطن میں رائج ہوگا۔ اے خدا میری یہ دعا قبول کرنا، آمین۔''

سخت سردی میں ''ٹوٹے وجود'' کی چوٹ اور تکلیف سہنے والے عزیز احمد نے دل کی گہرائیوں سے آمین کہا۔

⌘⌘⌘

# بندھن

عائشہ نصیر

مشکلات کسی سے پوچھ کر زندگی میں نہیں آتیں... انہیں اپنا اثر دکھانے کے لیے لمحوں کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر انسان ایک ایسی دلدل میں اترتا چلا جاتا ہے جس سے بچنا اسے ناممکن لگتا ہے... مگر رشتے سچے ہوں اور محبت باقی ہو تو ہر مشکل آسان ہو ہی جاتی ہے۔

ناگہانی مشکل میں پھنسے ایک شخص کی

پریشانی





رات [illegible] بجے [illegible] ولائی کا ایک [illegible] نام [illegible] دن، سال [illegible] 19 ء میں شدید گرمی اور حبس سے گھبرا کر اپنے گھر کی بالکونی [illegible] آیا تھا [illegible] اس امید پر کہ شاید کھلی فضا میں طبیعت تھوڑی بہتر ہو۔ یہ گرمیوں کی ان بے آرام راتوں میں سے ایک رات تھی، جب موسم قدرے ٹھنڈا تو ہو جاتا ہے مگر سکون نہیں ملتا۔ اطراف میں موجود ہر چیز میلی اور بوجھل تھی، دل چاہ رہا تھا کہ کوئی تیز ہوا یا بارش آ کر سب کچھ صاف کر دے لیکن آج میری یہ خواہش پوری ہوتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

میں ریلنگ پر ٹکا کھڑا رہا اور اردگرد کی خوشبوئیں اپنے اندر اتارتا رہا۔ کٹی ہوئی گھاس کی نمی، گرم زمین کی مہک اور کہیں دور سے اٹھتی اسٹیک کی بھینی سی خوشبو۔ اس سارے امتزاج کو کچرے میں سڑتے مچھلی کے سروں کی بدبو نے کڑوا سا رنگ دے رکھا تھا۔ جنگ کے دنوں میں ہمیں چوکس رہنا پڑتا تھا، مبادا دشمن ہماری پوزیشن بھانپ لے مگر جنگ سے سیکھی ہوئی بیشتر باتیں عام زندگی میں بے معنی ہیں۔

میں نے سکون سے سگریٹ سلگایا اور یوں ہی پیتا رہا جب تک آخری سلگتا ٹکڑا انگلیوں میں نہ رہ گیا، پھر اندر آیا اور بیوی سے [illegible] کہا۔ ''میں جلد ہی تمہیں [illegible] دینے کی کوئی نہ کوئی وجہ ڈھونڈ لوں گا۔''

میری بیوی ہماری شادی کے وقت ایک نہایت حسین لڑکی تھی اور آج [illegible] برس کی عمر میں دو بچوں کی ماں ہو کر بھی اس میں کچھ خاص فرق نہیں آیا۔ وہ ایک خوبصورت عورت ہے۔

''میں کل ٹام سے بات کروں گا۔'' میں نے اسے بتایا۔ ٹام میرا کولیگ تھا۔ ''اگر اسے [illegible] پتا ہو تو وہ کسی ایسے کو ضرور جانتا ہوگا جو مدد کر سکے۔''

اس نے بس سر ہلایا پھر آہستہ سے بولی ''یہ سب بہت بھدا لگتا ہے۔''

میرے دل میں آیا کہ کہہ دوں، ظاہر ہے طلاق [illegible] پہلے ہی بھدا ہوتا ہے۔ اگر اسے یہ سب گراں گزرتا ہے تو اسے طلاق کی بات کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔ اس کی یہ عادت مجھے بہت کھٹکتی ہے۔ ایک ساتھ دو بالکل متضاد باتوں کو تسلیم کر لینا۔ ایک طرف کہتی ہے کہ طلاق ہمارے طبقے کے لوگوں کے لیے بڑی عامیانہ چیز ہے اور دوسری طرف یہ بھی کہ اسے فوراً طلاق چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ میری ناخوشگوار عادتوں کے بارے میں بھی اس کے پاس ایسی ہی ایک لمبی فہرست ہوگی۔

اگرچہ طلاق پر ہم دونوں متفق ہیں، مسئلہ طریقہ کار کا ہے۔ ہماری ریاست کے قانون کے مطابق کوئی جوڑا صرف اس لیے طلاق نہیں لے سکتا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ خوش نہیں۔ عدالت کو ایک ٹھوس وجہ چاہیے ہوتی ہے، ایسی وجہ جو یا تو بے وفائی سے جڑی ہو یا پھر اس بات سے کہ شوہر یا بیوی میں سے کوئی ایک طویل عرصے تک گھر سے غائب رہے۔ یہ قانون بظاہر شادی کو بچانے کے لیے بنایا گیا تھا مگر حقیقت میں میاں بیوی کو سزا دینے کے مترادف تھا۔

ہیلن کا کہنا تھا کہ ترکِ تعلق والا راستہ بہت لمبا اور مہنگا ہے اور بچوں کے لیے بڑی مصیبت بن جائے گا۔ ہمارے بچے، سوزن اور بیٹی، اس وقت اپ اسٹیٹ کے ایک کیمپ میں ہیں۔ میں دل سے دعا کرتا ہوں کہ وہاں وہ صاف ہوا میں سانس لے رہے ہوں، اس لیے ہمارے پاس صرف بدکاری کا راستہ بچتا ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ ہم دونوں میں سے کسی نے کبھی کوئی چھوٹا موٹا افیئر تک نہیں چلایا۔

صبح میں آٹھ بج کر تیس منٹ والی ٹرین سے شہر گیا۔ سڑکیں سنسان اور بوجھل تھیں۔ ''ٹرائی اسٹیٹ لائف اینڈ میوچوئل'' کے دفتر پہنچ کر لگا جیسے ساری گرمی اور سست روی وہیں جمع ہو گئی ہو۔ میں اسی انشورنس کمپنی میں کام کرتا ہوں۔

ٹام اپنی میز پر بیٹھا تھا، ٹائی پہلے ہی اتار چکا تھا اور سیٹی بجاتے ہوئے کاغذوں میں الجھا ہوا تھا مگر اس کی سرخ آنکھیں صاف بتا رہی تھیں کہ اس کی رات بھی سکون سے نہیں گزری۔ میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے ایک میلا سا ریس کارڈ میری طرف اچھال دیا۔

وہ گھوڑوں پر داؤ لگانے کا شوقین ہے مگر مجھے جوا بالکل پسند نہیں اور وہ یہ بات جانتا ہے۔ میں نے بس اتنا کہا۔ ''کیا تم نے حال ہی میں جیک اوکس کو دیکھا ہے؟''

وہ چونک کر اوپر دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر وہی معصومیت آ گئی جس کی وجہ سے بوڑھی عورتیں اس سے پالیسی خرید لیتی ہیں۔ ''نہیں...... کیوں؟''

''بس کل رات یونہی مجھے اس کا خیال آیا تھا۔ اس کے [illegible] کے بارے میں......'' میں نے بات روک کر اسے دیکھا۔ ''اس کی بھی کچھ دن پہلے طلاق ہوئی ہے نا؟ تم نے بتایا تھا۔ خیر، بعد میں بات کرتے ہیں۔'' میں اپنی میز پر جا بیٹھا اور چند منٹ بعد وہ بھی میرے پیچھے آ گیا جیسا کہ مجھے یقین تھا کہ وہ آئے گا۔

''گھر میں کوئی [illegible] لڑکے؟'' وہ غور سے میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

''ہاں، ہے تو...... مگر یہ تمہارا کام [illegible]'' میں نے [illegible] کھولی۔

''لیکن تمہیں مدد چاہیے۔ میں محسوس کر سکتا ہوں۔'' وہ میری میز کے کنارے پر آ کر بیٹھ گیا۔ ''چلو، ڈیڈی کو بتاؤ۔ شاباش!''

میں اسے گھورنے لگا۔ ''ہاں، مجھے ہوائی میں [illegible] چاہیے، مجھے ایک فراری کار چاہیے، مجھے دنیا میں امن چاہیے اور میں چاہتا ہوں کہ میرے بچے خوش رہیں۔''

وہ برا مان گیا۔ اسی وقت ہمارے شعبے کے سربراہ کمرے میں آ گئے اور ٹام واپس اپنی میز پر چلا گیا۔ میں نے [illegible] بات نہیں کی، یہاں تک کہ لنچ کے وقت وہ جاتے ہوئے خود میرے پاس آیا اور ایک کارڈ تھما گیا جس پر ایک نام اور پتا درج تھا۔

''یہ وہ شخص ہے جس نے جیک اوکس کا مسئلہ حل کیا تھا۔''

اس نے کہا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ وکیل ہے۔"

"گڈ!" میں نے کہا۔ اسی دن چار بجے میں نے ہیلن کو فون کیا اور اسے بتایا کہ میں آج گھر دیر سے آؤں گا اور پھر ٹیکسی پکڑ کر ویسٹ فورٹیز کی طرف نکل گیا۔ راستے میں بینک کی ایک برانچ پر رکا اور اپنے نام ایک بڑی رقم کا چیک کیش کرایا۔

اس وکیل کا نام ولیم پروسر تھا، اس قسم کے وکیل جو کسی پرانی عمارت کی اوپری منزل پر ایک میلا سا دفتر کرائے پر لیتے ہیں۔ میں نے اسے اپنا نام بتایا اور کہا کہ میں اور میری بیوی ایک دوسرے کے ساتھ خوش نہیں ہیں اور طلاق پر غور کر رہے ہیں۔

اس نے اپنے نوٹ پیڈ پر یہ لکھا جو کہیں کسی مشروب سے گیلا ہو کر خراب ہو گیا تھا۔

"کیا آپ کو شک ہے کہ آپ کی بیوی آپ کے ساتھ بے وفائی کر رہی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "اس کی پرورش ایک کانوینٹ میں ننوں نے کی تھی۔"

"اور آپ نے کبھی بے وفائی کی؟" اس نے ابرو سکیڑے۔

میں نے سر ہلایا۔ "نہیں، میری پرورش بھی کانوینٹ کی ننوں نے کی تھی۔"

اس نے ایک لمبی سانس لی۔ "مسٹر بارٹن! ذرا سوچیے، آپ ایک جج ہیں۔" وہ بولا۔ "روز آپ کے سامنے ایک ہی طرح کا مقدمہ آتا ہے۔ بیوی کو شک ہوتا ہے کہ شوہر کسی اور کے ساتھ ہے۔ بیوی جاسوس رکھتی ہے، جاسوس شوہر کا پیچھا کرتا ہے اور اس کی کسی عورت کے ساتھ تصویریں لے آتا ہے پھر بیوی یہ ثبوت جج کو دکھاتی ہے اور جج طلاق دے دیتا ہے۔ یہ بالکل سیدھا معاملہ ہے لیکن کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ زیادہ چالاک ہیں تو اس جھنجٹ سے نکلنے کے لیے کسی لڑکی کی مدد سے اپنی ہی تصویریں بنوا لیتے ہیں۔ اسے "ملی بھگت" اور "جعلی ثبوت" کہتے ہیں۔ عدالت ایسے کام کو بالکل پسند نہیں کرتی۔ اگر جج کو ذرا سا بھی شبہ ہو جائے کہ یہ سب ڈراما ہے تو وہ طلاق نہیں دے گا...... سمجھ گئے؟"

میں سمجھا نہیں تھا اس لیے پوچھا۔ "تو مطلب، وہ چالاک لوگ ہم ہوں گے؟"

"بالکل۔" اس نے زور سے گردن ہلائی۔ "ہم یہی طریقہ کار اختیار کریں گے۔ اب چونکہ میں نے آپ کو قانون سمجھا دیا ہے اور آپ سمجھ گئے ہیں تو میری تجویز یہ ہے کہ آپ کونے والے بار میں جائیں، ایک مشروب منگوائیں، تھوڑی دیر بیٹھیں اور اپنی پریشانی بھول جائیں۔ مجھے یقین ہے آپ جلد بہتر محسوس کریں گے۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا، فیس دی اور تین منزلیں اتر کر سڑک پر آگیا۔ دن بھر کی تپش اب بھی فرش سے بھاپ کی طرح اٹھ رہی تھی۔ میں اس بار کے دروازے تک پہنچا جس کی سفارش پروسر نے کی تھی۔ یہ ایک سستا اور گھٹیا سا بار تھا۔ میں نے مشروب منگوایا، وہ بھی نیم گرم اور پانی ملا ہوا آیا۔ میں پچھلی طرف کے کونے میں جا بیٹھا اور سوچنے لگا...... آخر میں یہاں کیا کر رہا ہوں بجائے اس کے کہ اپنے گھر کے لان میں گھاس کاٹ رہا ہوتا۔

اچانک بارٹینڈر نے میرا نام پکارا تو میں چونک گیا۔

"تم بارٹن ہو؟"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "ہاں۔"

"تمہارے لیے فون ہے۔" اس نے کاؤنٹر پر رکھے ٹیلی فون سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے جا کر وہ چکنا سا ریسیور اٹھایا۔

"مسٹر بارٹن!" آواز عورت کی تھی، ناک سے بولنے والے مڈویسٹرن لہجے کے ساتھ۔ "ہمارے مشترکہ دوست ولیم پروسر نے بتایا کہ آپ شہر میں ہیں۔ میں سوچ رہی تھی کیا آپ میرے ساتھ ایک ڈرنک پینا چاہیں گے؟"

اس نے جس بار کا نام لیا، وہاں پہنچنے میں مجھے دس منٹ لگنے تھے اور اس نے کہا کہ وہ مزید پانچ منٹ بعد آئے گی، زرد رنگ کے لباس میں۔

میں اپنی نشست سے اٹھا اور اس نئے بار کی طرف چل دیا۔ یہ پہلی جگہ سے کچھ بہتر تھا اور وہاں زیادہ تر جو لوگ تھے، ان کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ان کا تعلق تھیٹر سے ہے۔ زرد لباس والی لڑکی بیس منٹ بعد پہنچی۔ یہ بالکل ویسی ہی تھی جیسی میں نے فون پر اس کی آواز سے اندازہ لگایا تھا۔ بیس کے قریب عمر، نیلی آنکھوں اور سنہری بالوں والی ایسی لڑکیاں جیسی کینساس یا نیبراسکا کے کھیتوں کے بیچوں بیچ ملتی ہیں۔ گرمی کے باوجود وہ خوش وضع دستانے پہنے ہوئے تھی، ایک فیشن ایبل ہیٹ لگائے اور چہرے پر تھکن کی لہر، جیسے کسی چینی گڑیا پر جمی ہوئی گرد۔

"میں اپریل ہوں۔" اس نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔

"اپریل مے۔"

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" میں نے دل میں یہ سوال دبا لیا کہ کہیں اس کی کوئی کزن "جون، جولائی" تو نہیں مگر اس نے میرے چہرے سے ہی پڑھ لیا۔

"یہ میرا اسٹیج نیم ہے۔" اس نے وضاحت کی۔ "ایجنٹ کا آئیڈیا تھا۔"

اس نے اپنے لیے ڈرنک منگوائی اور گلاس کے پیچھے سے مجھے غور سے دیکھنے لگی۔ "میں اندازہ لگاؤں گی...... دو بچے، نو

جرسی اور میوچوئل فنڈز۔‘‘ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’قریب قریب۔‘‘ میں نے جواب دیا۔ ’’انشورنس اور لانگ آئی لینڈ...... لیکن ہاں، دو بچے ہیں۔‘‘

’’لڑکے یا لڑکیاں؟‘‘

’’لڑکیاں۔‘‘ میں نے ان کے نام اور عمریں بھی بتادیں۔

’’میں ہمیشہ بچوں کے بارے میں پوچھتی ہوں۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’اس سے صحیح تاثر قائم ہوتا ہے۔‘‘

’’تو تم اکثر ایسا کرتی ہو؟‘‘ میں نے ذرا پُرشوق لہجے میں پوچھا۔

’’اسٹیج کے کام کے بیچ بیچ۔‘‘ اس نے بالکل سیدھے لہجے میں جواب دیا۔

’’کیا [illegible] نے تمہیں کسی ڈرامے میں دیکھا ہے؟‘‘ میرا لہجہ ایسے لگ رہا تھا جیسے چودہ سال کا لڑکا بات کر رہا ہو۔

’’اگر آپ اسٹیج [illegible] کے شوقین نہیں تو شاید نہیں۔‘‘ اس نے ٹھنڈی سانس لی اور لگتا تھا فیصلہ کرلیا کہ میں ٹھیک بندہ ہوں۔

’’تو ہم پہلے ایک ڈرنک کریں گے، پھر ڈنر، پھر ایک کلب اور پھر ہوٹل جائیں گے۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’فرینک جو کہ ڈیٹکٹیو ہے، ہمارے پیچھے [illegible] تصویریں بنائے گا۔ میں تمہیں نہیں بتاؤں گی کہ وہ کون [illegible] اگر بتادوں گی تو تم ساری شام اسے ہی گھورتے رہو گے۔ سب یہی کرتے ہیں۔‘‘

میں نے اب بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ کمانڈ اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ پہلے بھی یہ کر چکی تھی تو یقیناً اسے بہتر پتا ہوگا۔

’’ہوٹل میں، میں مسز بارٹن ہوں گی۔ ایک انگوٹھی ہے میرے پاس، وہ پہن لوں گی۔ فرینک نے ہوٹل کے سیکیورٹی والے سے بات کر رکھی ہے۔ وہ ہمیں اشارہ دے گا، ہم ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے اور وہ تصویر کھینچ لے گا...... اور بس یہیں تک۔‘‘

’’یقیناً۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا۔‘‘

اس نے اپنی خراش زدہ نیل پالش والی انگلی اٹھا کر روکا۔

’’مجھے پتا ہے، تم نے نہیں سوچا۔ تم اچھے آدمی لگتے ہو۔ زیادہ تر ہوتے بھی ایسے ہی ہیں۔ کچھ بدتمیز بھی ملتے ہیں مگر زیادہ تر تو صرف گھبرائے ہوئے ہوتے ہیں۔ بس ایک بات، ساری شام معافیاں مانگنے میں ضائع نہ کرنا، وہ بورنگ لگتا ہے۔ یاد رکھو، میں ایک اداکارہ ہوں۔ اپنا فنکارانہ رعب جھاڑنے کے بعد اس نے تجویز دی کہ ڈرنکس کا بل میں ادا کروں اور ہم ڈنر کے لیے چلیں۔

بار سے نکلتے ہوئے میں نے پیچھے مڑ کر اس ڈیٹکٹیو فرینک کو ڈھونڈنے کی کوشش کی جو ہماری نگرانی پر مامور تھا مگر ناکامی ہوئی۔ اس وقت تک میرا موڈ بہتر ہو چکا تھا۔ ایک تو گرمی کچھ کم ہو گئی تھی اور دوسری وجہ اس نیلی آنکھوں والی حسینہ کی قربت تھی۔ وہ اچھی لڑکی تھی۔ لگتا تھا یہ کسی عورت کے ساتھ میری سب سے پرسکون شام ثابت ہوگی۔ میں نے سوچا، شاید طلاق کے بعد میں اس روایت کو جاری رکھوں۔

میں اسے سینٹرل سے چند بلاک دور ایک ریستوران لے گیا جہاں کے گوشت کے پکوان مشہور تھے۔ میں نے اسے اپنی زندگی کے بارے میں مختصراً بتایا، اس نے مجھے اپنی کہانی سنائی۔ ڈیزرٹ کے آنے تک ہم دونوں کافی پرسکون اور بے تکلف ہو چکے تھے۔

کلب کا انتخاب میں نے اس پر چھوڑ دیا۔ یہ بھی براڈوے کے اُبھرتے فنکاروں سے بھرا ہوا تھا مگر اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ بینڈ اچھا تھا۔ چھت پر کھجور کے پتوں جیسے پنکھے جھومتے ہوئے ڈانس فلور پر خوشگوار ہوا دے رہے تھے۔ ابھی ہم دوسرا ڈانس کر ہی رہے تھے کہ اچانک تیل سے چمکتے بالوں والا ایک آدمی درمیان میں کود پڑا۔

’’ہیلو دوست! میرا نام ٹیڈ ہے۔ مداخلت کرنے کا کوئی ارادہ نہیں لیکن یہ لیڈی میری کافی پرانی دوست ہے اور بہت عرصے بعد نظر آئی ہے۔ ہے نا، ڈیئر؟‘‘

میری آنکھوں میں اس کے تیل کی خوشبو سے پانی بھر آیا تھا ورنہ میں دیکھ لیتا کہ اپریل کے چہرے پر دوستی سے زیادہ بیزاری جھلک رہی تھی۔

وہ دونوں میرے سامنے سے ڈانس کرتے ہوئے ہٹ گئے۔ ہر بار جب وہ [illegible] کرتے جوڑوں کے بیچ مجھے نظر آتے، چکنے بالوں والا مسلسل باتیں [illegible] ہوتا...... نرم لہجے میں، مسکراتے ہوئے لیکن ضدی انداز میں۔ اپریل نے پہلے چھوٹے جواب دیے پھر صرف نفی میں سر ہلایا اور [illegible] کر کے اس سے الگ ہو کر سیدھی میری طرف پلٹ آئی۔

وہ میز پر واپس آئی اور بیٹھتے ہی سگریٹ سلگالیا۔

’’کوئی مسئلہ ہے؟‘‘ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

’’میرا نہیں۔‘‘ وہ بولی۔

’’کیا میں کچھ مدد کروں؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ اس نے ایک لمحے کو میری طرف دیکھا۔ ’’میرا مطلب ہے شکریہ، تم اچھے ہو مگر یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔‘‘

ہم دونوں اجنبیوں کی طرح خاموش بیٹھے رہے۔ چکنے بالوں والا ٹیڈ کہیں غائب ہو چکا تھا۔

’’دیکھو، ابھی تو وقت ہے لیکن برا نہ مانو تو ہوٹل چلتے ہیں۔

میرا دل چاہ رہا ہے تھوڑا آرام کروں۔" اس نے ذرا جھجک کر کہا۔

"بالکل۔" میں فوراً بول اٹھا۔ "ہم ٹیکسی لے لیں گے۔"

"فرینک......!" اسے اچانک ہی یاد آیا اور اس کے ماتھے پر بل پڑے۔ "ہم مقررہ وقت سے پہلے کلب سے نکلتے تو وہ کنفیوژ ہو سکتا تھا۔" "اچھا، وہ جانتا ہے ہم کہاں جا رہے ہیں۔ آ ہی جائے گا۔ چلو ذرا اپنے آپ کو ریلیکس کریں۔"

"چاہو تو میں لیموزین منگوا لیتا ہوں۔" میں نے آفر کی۔

وہ دھیرے سے ہنس کر بولی۔ "اوہ نہیں جناب! میں نے سن رکھا ہے لیموزین میں لڑکیوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔"

یوں ہم اچھے موڈ میں کلب سے نکلے اور ٹیکسی پکڑ کر ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔ ویسے بھی کوئی معقول لیموزین ہمیں اس جگہ لے کر نہ جاتی [illegible] بالکل ایک سستی سی گندی جگہ تھا اور وہاں مسٹر اینڈ مسز [illegible] کرنا محض ایک بور اور ذلت آمیز کارروائی تھی۔ ریسیپشن کلرک کی آنکھوں میں طنزیہ مسکراہٹ جھلک رہی تھی۔ اس نے کمرے کی چابی [illegible] تھمائی اور ہم دو منزلہ سیڑھیاں چڑھ کر ایک ایسے کمرے میں پہنچے جو سبز رنگ سے رنگا ہوا تھا اور وہ بھی سب سے غیر رومانوی [illegible] بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی یہاں واقعی رومانس کرنے کا سوچ [illegible]

اپریل مے کرسی پر بیٹھ گئی، ہیٹ اور جوتے اتارے اور لمبی سانس بھری۔ "تمہیں گھبراہٹ تو نہیں ہو رہی؟" اس نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔" میں نے قطعیت سے سر ہلایا مگر حقیقت تو یہ تھی کہ مجھے شدید گھبراہٹ سے واش روم جانے کی حاجت ہو رہی تھی۔ بالآخر میں اس چھوٹے سے سبز باتھ روم میں گھس گیا تا کہ اپنا مسئلہ نمٹا سکوں۔ ابھی میں نکل ہی رہا تھا جب کمرے کا فون بجنے لگا۔

'فرینک!' میں نے سوچا۔ 'وقت پر پہنچ گیا۔' ہاتھ خشک کرتے ہوئے میں نے دروازہ کھولا۔ لڑکی فون پکڑے کھڑی تھی، چہرے پر جھنجلاہٹ تھی۔

"ایک اور مسئلہ۔" اس نے کہا۔

"کیا مطلب؟" میں چونکا۔

"کل رات ایک کام کیا تھا، کچھ اسی طرح کا لیکن اس میں اداکاری زیادہ کرنا پڑی تھی اور یقین کرو میں نے پوری پرفارمنس دی تھی لیکن ان گاہکوں کو وہم ہو گیا ہے کہ میں نے انہیں دھوکا دیا۔ پروڈیوسر نے ہی ان لوگوں کو بتایا کہ میں کہاں ملوں گی، وہ کمینہ......!" اس نے ذرا رک کر تلخ لہجے میں پروڈیوسر کو گالی دی پھر کہا۔ "ان میں سے ایک ابھی گلی کے کونے پر فون بوتھ سے کال کر رہا ہے۔ کہتا ہے اسے مجھ سے ملنا ہے فوراً۔ دیکھو، برا نہ مانو تو چند منٹ کے لیے کمرے سے باہر جا سکتے ہو، بس اتنا وقت چاہیے کہ میں اس بے وقوف کو صاف صاف بات سمجھا دوں۔" وہ التجائیہ نظروں سے میری سمت دیکھ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے، میں کونے کے اسٹال سے سگریٹ لے آتا ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ مسکرائی۔ "تم بہت اچھے ہو۔"

میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ ریسیپشن کلرک کی طنزیہ نظریں دوبارہ سہوں اس لیے میں پچھلی سیڑھیوں سے نیچے اترا اور سروس والے دروازے سے باہر نکل آیا۔ سامنے کوئی نہیں تھا۔ رات کے اس پہر ٹھنڈی ہوا چل پڑی تھی جس سے میرا پسینا خشک ہونے لگا۔ میں نے نیوز اسٹینڈ سے ایک سگریٹ کا پیکٹ اور ایک رسالہ خریدا۔ تازہ سرخیاں دیکھیں اور سوچنے لگا کہ اپریل کو کتنا وقت درکار ہو گا اپنے کل رات والے گاہک کو سمجھانے میں؟ دکاندار نے بقایا دیتے ہوئے میری طرف نظر تک نہ اٹھائی اور مجھے ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہوا۔

پندرہ بیس منٹ تک اِدھر اُدھر ٹہل کر میں آہستگی سے چلتے ہوئے واپس ہوٹل کی طرف آیا۔ اسی پچھلے راستے سے اندر گیا جس سے نکلا تھا۔ لابی ویسی ہی سنسان ملی۔ کمرے کا تالا کھولا اور اندر قدم رکھا۔

وہ لیٹی ہوئی تھی، اس سستے، میلے سے بیڈ پر۔

"معاف کرنا، مجھے دستک دینی چاہیے تھی۔" میں کہنے لگا کہ اچانک جیسے کوئی فولادی کیل میرے دماغ کو چھید کر پاؤں تک اتر گئی۔

وہ [illegible]

جنگ میں یہ منظر [illegible] دیکھ چکا تھا کہ غلطی کی گنجائش ہی نہ تھی۔ خالی آنکھیں، ڈھیلا [illegible] بکھرے ہوئے ہاتھ پاؤں اور اس کے علاوہ وہ زرد لباس کے سامنے [illegible] طرف پھیلا ہوا گہرا سرخ دھبا۔ تین گولیاں بالکل بٹنوں کی طرح [illegible] ترتیب میں سینے کے عین اوپر۔ چھوٹے کیلیبر کی گولیاں، قریب سے چلائی گئی تھیں۔ ہر سوراخ کے گرد بارود کے سیاہ دائرے نمایاں [illegible]

اپریل مے کے ناراض گاہکوں نے اس کی اداکاری کو [illegible] دیا تھا جس سے واپسی ممکن نہ تھی۔

صدمہ اور جھٹکا شدید ہو تو لوگ عجیب حرکتیں کرتے ہیں۔ میں بھی کرسی کی طرف گیا جہاں وہ سب سے پہلے بیٹھی تھی اور اس کے جوتے اٹھا کر سیدھے رکھ دیے۔ عام سے سیاہ جوتے تھے، کافی پرانے، خراشوں کو اس نے سیاہی سے ڈھانپنے کی کوشش کی تھی، پھر میرا جی الٹنے لگا۔ دکھ، غصہ، خوف، بے بسی اور جانے کون کون سے جذبات ایک ساتھ یلغار کرنے لگے۔ میں کرسی پر گر گیا

اورصرف سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

جب طبیعت تھوڑی سنبھلی تو منظر بدلا نہیں تھا۔ جوتے وہیں تھے۔ وہ اب بھی مر چکی تھی اور میں اب بھی یہ سوچ رہا تھا کہ کیا کروں؟

اگر میں وہی سیدھا سادہ شریف شہری ہوتا جیسا کہ ہمیشہ خود کو سمجھتا آیا تھا تو فوراً نیچے جا کر پولیس بلواتا، ریسیپشن کلرک کو کہتا کہ فون کرے مگر وہ پولیس کو یہ بھی بتا سکتا تھا کہ میں اسی لڑکی کے ساتھ آیا تھا اور اسی کے ساتھ کمرا بک کرایا تھا۔ اس کے خیال میں میں سارا وقت وہیں تھا۔ کسی نے مجھے باہر جاتے یا واپس آتے نہیں دیکھا تھا۔ رجسٹر پر میرا اصلی نام موجود تھا اور ساتھ ایک عورت کا نام جو یقینی طور پر میری بیوی نہیں تھی۔

پولیس کو پوری کہانی بتانے کی کوشش بھی کرتا تو کیا بتاتا؟ وہ فون کال جس کا سراغ لگانا ناممکن تھا، وہ "کلائنٹس" جنہیں میں جانتا تک نہیں تھا اور نہ ہی کبھی دیکھا تھا۔ شاید کلرک نے انہیں دیکھا ہو لیکن اس کی زبان پر کسے بھروسا تھا۔ وہ تو عادتاً "کچھ نہیں دیکھا" ہی کہتا۔ میرے پاس اپنی غیر موجودگی ثابت کرنے کو صرف وہ سگریٹ اور رسالے تھے جو کسی بھی جگہ، کسی بھی وقت خریدے جا سکتے تھے۔

ہاں، ایک چھوٹا سا امکان ضرور تھا کہ میری بات مانی جاتی مگر قتل کے الزام سے بچنے کے لیے مجھے اپریل کے ساتھ اپنے تعلق کی پوری حقیقت بتانی پڑتی۔ جھوٹی بے وفائی، جعلی ثبوت، پھر میری اور ہیلن کی طلاق بھی نہ ہو پاتی۔ محلے والے بات جان جاتے اور ہمیں ٹینس کورٹ پر دیکھ کر منہ موڑ لیتے۔ پیٹھ پیچھے باتیں ہوتیں اور بچوں کا اسکول میں جینا دوبھر ہو جاتا۔ یوں بھی مجھے ہر حال میں ڈوبنا ہی تھا اسی لیے میں نے فون اٹھایا اور بیوی کو کال ملا دی۔

"ہیلو، ڈیئر!" اس نے کہا۔ "ابھی تک کام میں ہی پھنسے ہو؟"

"ہیلن!" میری آواز کی لرزش نے فوراً اسے چونکا دیا۔

"کیا ہوا؟"

میں نے سب کہہ ڈالا، ایک ایک بات، رکے بغیر۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے اندر کوئی لاوا پھٹ پڑا ہو۔ رکنے کی سکت ہی نہ تھی۔ مجھے یہ پروا بھی نہ رہی کہ وہ سنے گی یا نہیں۔ مجھے بس کسی اپنے کے سامنے بوجھ اتارنا تھا، اس سے پہلے کہ میرا حساب کتاب غیروں کی شک بھری نظروں کے حوالے ہو جاتا۔ ہزار اختلافات کے باوجود وہ اب بھی میری بیوی تھی اور مجھے سب سے زیادہ جانتی تھی۔

شاید اسی لیے وہ سنتی رہی۔ زیادہ تر خاموش، کبھی کبھار وضاحت مانگ لیتی جب میں باتوں میں بہک جاتا۔ آخرکار جب میں تھما تو اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ بس ہلکی آواز میں پوچھا۔ "اب تم کیا کرو گے؟"

"مجھے نہیں پتا۔" اچانک پچھتاوا سا ہوا۔ "اوہ میرے خدا، ہیلن! مجھے تمہیں فون نہیں کرنا چاہیے تھا، دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ جو کچھ کہا، بھول جاؤ۔"

"بھول جاؤں؟" اس کا لہجہ فون کے اس پار چابک کی طرح پڑا۔ "میں سب کچھ سن چکی ہوں اور اب تم کہتے ہو بھول جاؤ؟"

"میرا مطلب ہے، یہ تمہارا مسئلہ نہیں۔ اگر پولیس گھر پہنچ گئی تو بس اتنا کہنا کہ تم کچھ نہیں جانتیں...... ٹھیک ہے؟"

مگر اس نے کہا۔ "میں وہیں آ رہی ہوں۔"

"کیا......؟ نہیں، بالکل نہیں۔" میں بوکھلا گیا۔ "اس سب سے دور رہو، میں خود نمٹ لوں گا۔"

"بکواس بند کرو۔" وہ غرائی۔ "تمہاری حالت دیکھ کر لگتا ہے کہ تم کچھ بھی سنبھال سکتے ہو؟ یہ پہلا موقع تو نہیں جب مجھے تمہاری گند صاف کرنا پڑ رہی ہو۔"

"یہ زیادتی ہے۔ معاملہ بہت سنگین ہے، تمہیں لڑکیوں کے بارے میں سوچنا چاہیے۔" میری آواز دھیمی پڑی۔

"میں انہی کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔" اس نے کہا اور کال کاٹ دی۔

میں نے سر پکڑ لیا، گالیاں بکتے ہوئے سوچنے کی کوشش کی، کوئی راہ نکالنے کی۔ ایک شوہر کے طور پر چاہے میں جتنا بھی ناکام رہا ہوں، اتنا نہیں گر سکتا کہ اپنی بیوی کو قتل کے معاملے میں ہی شریک جرم بنا دوں۔ بدقسمتی سے وقت کی تیزی نے میرے دماغ کو کسی کارآمد خیال سے محروم رکھا۔

پھر اچانک باہر سے قدموں کی آہٹ اور ایک ہلکی سی کھانسی ابھری۔ دماغ میں ایک نام کوندا...... فرینک!

میں نے دروازہ کھولا۔ سامنے لمبے بالوں والا، بھاری جسم والا آدمی کھڑا تھا۔ میں نے جھٹ سے اس کے گلے میں لٹکتی کیمرے کی پٹی پکڑ کر اسے اندر گھسیٹ لیا۔

"سنو۔" میں نے کہا۔ "مجھے پروسر سے ملنا ہے۔"

مگر اس کی نظریں بستر پر جا کر جم گئیں۔ لڑکی کو دیکھ کر اس کا رنگ اڑ گیا اور وہ بڑبڑانے لگا۔

"یہ تم نے کیا، کیا؟ کیوں مار ڈالا اسے؟ کیوں، آخر کیوں؟"

وہ ہذیانی کیفیت میں تھا اور اسے دیکھ کر میں بھی اسے جھنجوڑتے ہوئے دہرانے لگا۔

"میں نے نہیں کیا، کسی اور نے کیا ہے۔ مجھے پروسر سے بات کرنا ہے۔ بس وہی میری مدد کر سکتا ہے۔"

اگر اس کا جسیم وجود واقعی کسی کام کا ہوتا تو شاید وہ مجھ سے اپنا آپ چھڑا کر بھاگ جاتا مگر اس کی بے ڈھنگی ہاتھ پاؤں مارنے کی کوششیں آخرکار دم توڑ گئیں اور وہ میرے بکھرے ہوئے لفظوں میں اٹک اٹک کر کہی گئی پوری کہانی سننے لگا۔

"ہاں..... بارود کی بو نہیں آ رہی تم سے۔" اس نے سر ہلایا [illegible]ٹ سے میرا دایاں ہاتھ پکڑ کر الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کے بعد [illegible] تیز قدموں سے بستر کی طرف گیا اور لاش پر کسی نیم ادھورے تفتیشی عمل میں لگ گیا۔ یہ مضحکہ خیز منظر تھا، گویا کوئی مزاحیہ اداکار شرلاک ہومز بننے کی کوشش کر رہا ہو۔

"اسے [illegible] یا تھا۔" میں نے اسے بتایا۔ "اس نے مجھے کمرے سے باہر [illegible] سے بات صاف کرے گی۔ تم ہماری نگرانی کر رہے [illegible] ہوگا کتنے لوگ ہوٹل میں ہمارے بعد آئے تھے؟"

"پتا نہیں۔" اس نے بڑبڑاتے [illegible] جواب دیا۔ جب وہ جھک کر لاش کا معائنہ کر رہا تھا تو اس کی [illegible] جیب [illegible] شراب کی بوتل کا ابھار صاف نظر آ رہا تھا۔

"خدا کی قسم! میں نے اسے قتل نہیں کیا۔ اگر پ[illegible] بات ہو جائے تو سب صاف ہو جائے گا۔"

"نہیں۔" اس نے گردن ہلا دی۔ "پروسر تمہیں بھیڑیوں کے آگے پھینک دے گا بلکہ میں بھی تمہیں بھیڑیوں کے آگے ڈال سکتا ہوں۔ تم کیا اب یہ مصیبت ہمارے گلے ڈالو گے؟"

"ہاں، کیونکہ اگر میں زبان کھول دوں تو تمہاری سب جعلسازیاں پولیس کے سامنے آ جائیں گی۔ وہ تمہارے لائسنس چھین سکتے ہیں وکالت کے، تفتیش کے۔"

میں نے دیکھا یہ بات آہستہ آہستہ اس کے دماغ میں اتر رہی تھی۔

آخرکار اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے، میں کچھ کالز کرتا ہوں۔ کچھ لوگ ہیں، شاید کوئی پرانا احسان لوٹا دیں۔ تم یہیں رہو۔" اس نے سختی کے ساتھ تاکید کی۔ "جب تک میں نہ کہوں، کچھ مت کرنا۔"

وہ چلا گیا اور میں رک گیا۔ اور کرتا بھی کیا؟ جیسے طوفان کے بعد کچھ لمحوں کو سکون آ جاتا ہے، ویسا ہی ایک عجیب سکوت چھا گیا تھا۔ میں جانتا تھا یہ زیادہ دیر کا نہیں مگر فی الحال ایک لمحے کی ڈھارس تھی۔ میں نے غسل خانے سے تولیا لا کر لاش پر ڈال دیا پھر کرسی پر بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ اب تقدیر کیا موڑ دکھائے گی۔

کچھ وقت یوں ہی گزر گیا۔ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی، میں بالکل پرسکون اٹھا۔ دل کی دھڑکن تیز نہیں ہوئی، بس ہلکا سا تجسس تھا کہ اب کون ہو سکتا ہے..... فرینک، پولیس یا شاید نوکرانی؟

لیکن وہ ہیلن تھی۔ میں تو تقریباً اسے بھول ہی گیا تھا۔

ہم دونوں ایک لمحہ خاموش کھڑے رہے۔ اس نے اپنا لینن کا سوٹ پہن رکھا تھا اور بال سنوار رکھے تھے، گویا جنگ کے لیے تیار ہو۔ وہ آہستہ سے میرے پاس سے گزر کر کمرے میں داخل ہوئی اور دروازہ بند کر دیا۔

"کیا وہ......؟" اس کی نظر بستر کی طرف گئی۔

"ہاں۔" میں نے کہا۔ میں کچھ اور کہہ بھی نہیں سکا کہ وہ تیزی سے آگے بڑھی اور تولیا ہٹا کر چہرہ دیکھ لیا۔ میں نے اسے روکا نہیں۔ موت کی اپنی ایک عجیب کشش ہوتی ہے۔ اگر میری بیوی کسی قتل شدہ مرد کے ساتھ اکیلی بیٹھی ہوتی تو شاید میں بھی چہرہ دیکھنے پر بضد ہوتا۔

وہ سیدھی ہوئی تو اس کا چہرہ اور بھی زرد پڑ گیا تھا مگر پھر بھی وہ قابو میں تھی۔ ہیلن ہمیشہ سے مضبوط رہی تھی۔ بس اتنا بولی۔ "یہ تو بہت چھوٹی لگ رہی ہے۔"

"وہ محض ایک بچی تھی۔" میں نے کہا۔ "نہیں جانتی تھی کہ وہ [illegible]ن ہے، نہ یہ کہ کہاں جا رہی ہے مگر اسے یہاں یوں ختم نہیں [illegible]نا چاہیے تھا۔"

ہیلن نے ایک لمحے کی خاموشی کے ساتھ اس بات کو مانا۔ میرے تجربے [illegible] مطابق عورتیں اپنی صنف کے لیے مردوں سے زیادہ سخت [illegible] لیکن پھر بھی اس نے کوئی عامیانہ بات نہیں کی، جیسے "ایس[illegible] انجام ہوتا ہے"۔ شاید اس نے سوچ لیا تھا کہ اپریل [illegible] چکی ہے اس لیے مقابلہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس نے پوچھا۔ "اس نے ان [illegible] میں کچھ اور تو نہیں کہا، کون تھے، کیا چاہتے تھے؟"

"نہیں۔" میں نے اسے پہلے ہی فون پر چکنے بالوں والے شخص کے بارے میں بتایا تھا جو میری نظر میں پہلی [illegible] مگر اس کی صرف دھندلی سی شکل ہی مجھے یاد تھی۔ اب میں نے اسے فرینک اور اس کے مبہم وعدوں کے بارے میں بتایا۔ اسے یہ سن کر بالکل خوشی نہیں ہوئی۔ اس نے کہا کہ مجھے اس شخص کے بارے میں کچھ بھی نہیں پتا اور میں نے کہا کہ مجھے یہ بات معلوم ہے مگر میرے پاس کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں۔ اس نے کہا کہ مجھے حالات کا ہوشمندی سے جائزہ لینا چاہیے اور میں نے جواب دیا کہ میں کب سے یہی کر رہا ہوں۔ لگ رہا تھا کہ اب یہ عام سا

میاں بیوی کا جھگڑا بننے والا ہے۔ بس فرق یہ تھا کہ درمیان میں ایک لاش رکھی تھی کہ اتنے میں دروازے پر ایک اور دستک ہوئی۔

اس بار وہ فرینک تھا۔ اس کے ساتھ دو اطالوی نظر آنے والے آدمی تھے، ایک ہوٹل کی ملازمہ اور اس کی لانڈری کی گاڑی۔ ہیلن کو دیکھ کر وہ ذرا چونکا مگر جب میں نے تعارف کروایا کہ یہ میری بیوی ہے تو فوراً سنبھل گیا۔

"بہت اچھا، بہت اچھا!" اس نے سب کو اندر بلاتے ہوئے کہا۔ "یہ چل جائے گا۔"

اس نے بتایا کہ یہ دونوں آدمی لاش کو لانڈری کارٹ میں ڈال کر باہر لے جائیں گے۔ ملازمہ نے اپریل ے کا ہیٹ پہن کر ریسپشن [illegible] سے میرے ساتھ گزرنا تھا۔

"میرے دماغ میں خیال آیا۔" فرینک نے ملازمہ کے زرد یونیفارم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "سوچا، ایک لڑکا اور لڑکی اندر آئے تھے، ایک لڑکا اور لڑکی باہر نکلتے ہیں۔ ان کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے۔"

وہ اپنے منصوبے پر فخر محسوس کر رہا تھا۔ ہیلن کے آنے سے اس کے لیے اور بھی آسانی ہوگئی تھی۔ اب وہ اپریل کا ہیٹ پہن کر میرے ساتھ باہر جا سکتی تھی اور ملازمہ کارٹ کے ساتھ جائے گی جو زیادہ فطری لگے گا۔ اگر سب ٹھیک رہا تو ہیلن اور میں ہوٹل سے نکل کر سیدھا ٹیکسی لے لیں گے اور اپریل کی لاش کو کسی اندھیری گلی یا پارک کی بینچ پر چھوڑ دیا جائے گا جہاں کوئی راہگیر اسے ڈھونڈ کر شہر کے مردہ خانے پہنچا دے گا۔ یوں پروسر کو بھی پریشانی نہیں ہوگی اور مجھے بھی نہیں۔

اس سارے منصوبے کو چلانے کے لیے فرینک نے میرے بٹوے میں بچے ہوئے سارے پیسے جھپٹ لیے۔

ہیلن کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس منصوبے سے زیادہ خوش نہیں مگر اس نے کچھ نہیں کہا۔ ادھر وہ آدمی بڑی بے دردی سے لاش کو لانڈری کارٹ میں رکھ رہے تھے جیسے کوئی انسانی وجود نہیں، سامان ہو۔

ہیلن نے زرد یونیفارم پہن لیا اور اپنے بال اپریل کے ہیٹ میں چھپا لیے۔ فرینک نے راہداری میں جھانکا۔

"ہاں، سب ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔

میں نے ہیلن کا بازو تھاما اور ہم زینے کی طرف بڑھنے لگے۔ پیچھے سے ہمیں لانڈری کارٹ کے دھکیلنے کی آواز سنائی دے رہی تھی مگر ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ فرینک کچھ دیر بعد آ جاتا۔ باقی دونوں آدمی پہلے ہی پیچھے کی سیڑھیوں سے نیچے اتر گئے تھے تاکہ تہ خانے میں ملازمہ سے مل سکیں۔ مجھے پسینا آ رہا تھا مگر یہ ٹھنڈا پسینا تھا۔

کسی طرح ہم لابی تک پہنچ گئے۔ میں نے کاؤنٹر پر کھڑے کلرک سے کہا کہ ہماری بے بی سٹر نے فون کیا ہے، بچہ بیمار ہے اس لیے ہمیں فوراً جانا ہے۔ اس نے یقین نہیں کیا مگر اسے پروا بھی نہیں تھی۔ اس نے کہا کہ پیسے واپس نہیں ملیں گے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے، کمرے کی چابی واپس کی اور رسید پر دستخط کر دیے۔ ہیلن میرے کندھے کے پیچھے کھڑی رہی، چہرہ چھپائے۔ رسمی کارروائی ختم ہوئی تو ہم نے یوں لابی پار کی جیسے یہ چالیس میل اور نو گھنٹے کی مسافت ہو۔ آخرکار ہم باہر نکل آئے۔

اس وقت تک موسم نم ہو گیا تھا اور لگتا تھا طوفان آنے والا ہے۔ میں بے چینی سے ٹیکسی کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک بڑی اور بھدی سی گاڑی اسی طرف سڑک کنارے کھڑی تھی۔ میں نے ہیلن کا ہاتھ چھوڑا تا کہ تھوڑا آگے جا کر دیکھ سکوں۔ اتنے میں اس کی دبی ہوئی چیخ نے مجھے مڑنے پر مجبور کیا۔ دو آدمیوں نے اس کے بازو پکڑ رکھے تھے اور اسے زبردستی گاڑی کی پچھلی سیٹ کی طرف گھسیٹ رہے تھے۔

"ارے!" میں چلایا۔ "یہ میری بیوی ہے۔"

"ہاں، بالکل۔" ایک غنڈے نے جواب دیا۔ "ہمیں اس سے بات کرنا ہے۔"

"تم غلطی کر رہے ہو۔" میں نے کہا مگر وہ پروا نہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ میں جھپٹا اور گاڑی کا دروازہ پکڑ لیا۔ [illegible] والے غنڈے نے میری طرف دیکھا، چہرے پر کوئی [illegible] نہیں تھا۔ اس نے مجھے گردے کے پاس ایک زور کا مکا مارا۔ دنیا چند لمحوں کے لیے چمک اٹھی اور میں لڑھکتا ہوا گاڑی کے اندر جا گرا۔ دروازہ [illegible] سے بند ہوا، گاڑی جھٹکے سے آگے بڑھی اور مین ہٹن کی سڑکوں پر دوڑنے لگی۔

"ایڈ......!" ہیلن نے چلاتے ہوئے کہا۔ وہ سامنے والی سیٹ پر بیٹھی تھی اور ایک غنڈا اس کی کلائی تھامے بیٹھا تھا۔ جس نے مجھے مارا تھا، وہ اس کے ساتھ تھا اور میں ان دونوں کے بیچ فرش پر پڑا تھا۔ دل میں خیال آیا کہ آخر کار لیموزین میں بیٹھ ہی گیا ہوں اور یہ سوچ کر ہنسی آنے لگی۔

"ایڈ!" ہیلن پھر بولی۔

"فکر نہ کرو ڈیئر!" میں نے لہجہ مضبوط بنانے کی کوشش کی۔ "ہوٹل والے نے سب کچھ دیکھا ہے۔ وہ ابھی پولیس کو فون کر رہا ہوگا۔"

دونوں غنڈے خاموش بیٹھے رہے۔

"پلیز!" میں نے کہا۔ "میرے اور میری بیوی کے پاس کوئی نقدی نہیں ہے اور نہ کوئی دوسری قیمتی چیز۔"

"شٹ اپ۔" دوسرے غنڈے نے درشتی سے کہا تو مجھے

خاموش ہونا پڑا۔ تقریباً آٹھ بلاک کے بعد گاڑی ایک احاطے میں مڑ گئی۔ ہمیں ایک چھوٹے سے کمرے میں لے جایا گیا جہاں کوئی کھڑکی نہیں تھی اور ہر طرف بکھری چیزوں کا ایسا حال تھا جیسا کباڑ خانے میں ہوتا ہے۔ ایک غنڈا دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا، دوسرا اندر والے دروازے کی طرف گیا جو غالباً باقی عمارت سے جڑا ہوا تھا۔ اس دروازے سے جو شخص اندر آیا، وہ وہی چکنے بالوں والا ٹیڈ تھا۔

میرے منہ سے ایک عجیب سی آواز نکلی۔ اس نے مجھے دیکھ کر دانت [illegible] سے۔

"یہ کیا بکواس ہے؟" وہ ہیلن پر نظر پڑتے ہی بری طرح بگڑ بیٹھا مگر اس کا غصہ ہمارے لیے نہیں ان دونوں غنڈوں کے لیے تھا۔

"آپ نے کہا تھا کہ اگر وہ ہیرو بننے کی کوشش کرے تو گاہک کو بھی ساتھ لے آنا۔" غنڈے نمبر دو نے گھبراہٹ زدہ انداز میں کہا۔

"کہا تو تھا۔" اس نے ایک بوسیدہ گھومنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن جس چیز کی میں نے سب سے زیادہ تاکید کی تھی، وہ یہ تھی کہ عورت کو لا دو اور اس معاملے میں تم نے مجھے سخت مایوس کیا ہے۔"

دونوں غنڈے ہکا بکا رہ گئے۔

"یہ......" اس نے ہیلن کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ عورت نہیں ہے جو مجھے چاہیے۔"

"یہ میری بیوی ہے۔" میں بیچ میں بول اٹھا۔

ٹیڈ نے اپنی نظریں مجھ پر مرکوز کیں۔ "اور تم کون ہو؟"

"ایڈ بارٹن!" میں نے کہا۔ "ایڈ اور ہیلن، گارڈن سٹی سے۔"

وہ دوبارہ غنڈوں کی طرف مڑا۔ "دیکھ رہے ہو؟"

غنڈے اب مزید الجھ گئے تھے۔ "لیکن اس نے تو یلو ڈریس پہنا ہے نا۔"

ٹیڈ نے گہری سانس لی اور میری طرف رخ کیا۔ "میں کچھ کاروباری حضرات کی نمائندگی کرتا ہوں۔ ہم اس لڑکی سے بات کرنا چاہتے ہیں جو آج شام تمہارے ساتھ تھی۔ معاملہ کچھ رقم ہڑپ کرنے کا ہے۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ مجھے اس لڑکی کے بارے میں بتا دو۔"

"مجھے نہیں معلوم۔" میں نے کہا۔ "میں تو بس اسے اس کے ہوٹل چھوڑنے جا رہا تھا۔ اس کے بعد اپنی بیوی کے ساتھ ایک شو دیکھنے کا ارادہ تھا۔ اس لڑکی کی فیملی سے میرے پرانے تعلقات ہیں۔"

"ایسا ہے کیا؟" ٹیڈ کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ آئی۔ "تو پھر یہ جان کر تمہیں افسوس ہوگا کہ وہ لڑکی اپنے "وقت" کی قیمت وصول کرتی تھی اور اس کے گاہک زیادہ تر شادی شدہ تھے۔"

"یہ سب میرے لیے تھا۔" ہیلن یکدم بول اٹھی۔ "میں نے طلاق مانگی تھی۔ وہ اس لڑکی سے مل رہا تھا تو صرف میری وجہ سے۔"

ٹیڈ نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔ "یہ اچھی بات ہے۔ مجھے اچھا لگا کہ تم نے اپنے شوہر کے لیے آواز بلند کی ورنہ آج کل بہت سی عورتیں اپنے مردوں کی عزت ہی نہیں کرتیں۔ یہ سوچ کر مجھے اکثر سماج کی فکر ہونے لگتی ہے۔" وہ کرسی پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست کر کے۔ ایسا انداز میں نے صرف فلموں میں دیکھا تھا۔

"لیکن مجھے اب بھی یہی سوال پریشان کر رہا ہے کہ وہ منحوس لڑکی آخر گئی کہاں؟"

"ہمیں نہیں معلوم، وہ اسے لے گئے ہیں۔ وہ مر چکی تھی۔" پھٹ پڑنے والے انداز میں کہتے ہوئے ہیلن کے آنسو بہہ نکلے۔

کمرے پر ایک لمحے کے لیے بوجھل سکوت چھا گیا۔ میں نے اپنی بیوی کو دلاسا دینے کی کوشش کی۔ وہ کام جس میں امریکی مرد ہمیشہ ناکام ثابت ہوتے ہیں۔

ٹیڈ کی آنکھوں سے اس سخت گیری کا نقاب ذرا سا کھسک گیا۔ "سب بتاؤ۔" اس نے کہا۔

اب چھپانے کو کچھ نہ تھا۔ میں نے ساری کہانی اسے سنا دی، ٹھیک ویسے ہی جیسے ہیلن اور فرینک کو سنائی تھی۔ تیسری بار بتانا آسان تھا۔ جب میں گولی کے زخموں تک پہنچا تو دونوں غنڈے پرجوش ہو گئے

"باس، یہ تو بالکل کنسیلا کی خاص گن لگتی ہے، سائلنسر کے ساتھ۔"

ٹیڈ نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں چپ کرا دیا لیکن تب تک میں ایک سرا پکڑ چکا تھا۔

"کنسیلا؟" میں نے دہرایا۔ "کیا یہ نام مس اپریل کے پچھلے کلائنٹ کا ہے؟"

ٹیڈ نے ایک خونخوار نظر مجھ پر ڈالی۔ "سوال تمہیں نہیں، مجھے کرنے ہیں۔"

"اگر وہی اس کا قاتل ہے تو یہ میرا ہی معاملہ ہے۔" میں نے بھڑک کر کہا۔

غنڈا نمبر دو بے ساختہ بول پڑا۔ "باس! آپ جانتے ہیں نا وہ آرش کتنا پاگل ہے۔"

"میں نے کہا تھا تم میں سے کوئی اور زبان نہ کھولے؟ کہا تھا نا؟" ٹیڈ اسی پر الٹ پڑا۔

میں نے اس کے غصے پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔ میرے ذہن میں پچھلے جمعے کی یاد لوٹ آئی۔ دفتر میں ٹام اور باقی لوگ ریڈیو کے گرد جمع تھے۔ میڈیسن اسکوائر میں ہونے والے فائٹ میچ کی براہِ راست کمنٹری چل رہی تھی۔ شور، چیخیں، بددعائیں۔ سب کے سب حیران تھے کہ مشہور ہیوی ویٹ چیمپئن کنسیلا ایک نئے باکسر سے ہار کیسے گیا۔

میں نے کہا۔ "کہیں یہ کنسیلا وہی ہیوی ویٹ باکسر تو نہیں جو پچھلے جمعے ایک نوآموز سے میچ ہار گیا؟ بہت لوگوں نے اس میچ پر جوا لگایا تھا اور سب کہہ رہے ہیں میچ فکس تھا۔"

ٹیڈ نے آہستہ سے کہا۔ "لوگوں کو شک بہت جلدی ہو جاتا ہے، ہر جگہ سازش نظر آتی ہے۔ اسی لیے ہمیں کنسیلا کو پیسے دیتے وقت احتیاط کرنا پڑی۔"

میں اچھل پڑا۔ یعنی وہ مان رہا تھا کہ میچ فکس تھا۔ "تو تم لوگوں نے پیسے دینے کے لیے اس لڑکی کو بیچ میں ڈالا؟"

وہ ہنسا۔ "واہ، بڑے سمجھدار ہو۔"

میں نے بات آگے بڑھائی۔ "تم نے اسے رقم دی تا کہ وہ کنسیلا تک پہنچا دے لیکن کچھ گڑبڑ ہو گئی۔ کنسیلا کو اس کا حصہ نہیں ملا۔ اس نے لڑکی کو ذمے دار ٹھہرایا اور غصے میں آ کر اس کا خون کر دیا۔"

میرے دماغ میں جیسے نئی توانائی آ گئی تھی۔ کسی اور کا مسئلہ سلجھانے میں عجیب سکون تھا۔ "لیکن یہ سوچو، وہ لڑکی اتنی بیوقوف تو نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی رقم غائب ہونے پر سب سے پہلا شک اسی پر آئے گا پھر وہ یہ دھوکا دہی کیوں کرتی؟"

ٹیڈ نے کرسی کے ہتھے پر انگلیاں بجائیں۔ پریشانی اس کے چہرے پر بھی تھی۔ شاید وہ بھی چاہ رہا تھا کہ کسی عقل مند آدمی سے بات کر لے۔

میں نے کہا۔ "کلب میں ہمارے ڈانس کے دوران جب تم آئے، تم نے دیکھا ہوگا وہ گھبرائی ہوئی نہیں تھی۔ اگر وہ واقعی تمہارے پیسے لے اڑتی تو ڈری سہمی ہوتی لیکن وہ تو بس جھنجلاہٹ میں تھی۔"

آخرکار وہ بولا۔ "کنسیلا نے میچ ہارنے کے چھ ہزار مانگے تھے۔ سب کیش، چھوٹے نوٹ۔ یہ سب لے جانا مشکل بھی تھا اور ہمارے پیچھے نظر رکھنے والے بھی تھے۔ تب ہمارے ایک وکیل نے یہ چال سوچی۔"

وہ ذرا آگے کو جھکا اور تفصیل بتانے لگا۔

"کل رات تم سے ملنے سے پہلے اپریل میرے ساتھ ایک ریسٹورنٹ گئی۔ کنسیلا بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہیں موجود تھا۔ کھانے کے دوران لڑکی بہانہ کر کے ریسٹ روم گئی، واپسی پر ایک ویٹر اس سے ٹکرا گیا۔ وہ فرش پر گر گئی، اس کا پرس بھی گرا۔ سارے گاہک اس منظر پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ اسی لمحے کنسیلا کی میز سے ایک آدمی آیا اور اپریل کا پرس اٹھا کر اسے تھما دیا۔"

وہ ذرا مسکرایا پھر کہا۔ "تم کچھ سمجھے؟ اس نے اپریل کا پرس نہیں لوٹایا بلکہ اسے اپنے کوٹ کے اندر چھپا لیا اور اپنی جیب سے دوسرا پرس نکال کر اسے دے دیا اور پھر ہم نے آرام سے اپنا کھانا ختم کیا۔"

"تو رقم اپریل کے پرس میں تھی۔" میں بڑبڑایا۔

"ظاہر ہے۔" ٹیڈ نے کندھے اُچکائے۔ "اسی کام کے لیے تو میں نے اسے ہائر کیا تھا لیکن جب کنسیلا گھر پہنچا اور اس نے دیکھا تو پیسے غائب تھے، بالکل غائب۔ ہر ایک نوٹ۔ جیسے کوئی جادو ہوا ہو۔ وہ رقم اسی وقت غائب ہو سکتی تھی جب اپریل ریسٹ روم گئی تھی۔ شاید تب ہی اس نے بیگ سے پیسے نکال کر اپنے کپڑوں میں چھپا لیے ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتی؟ میں بھی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ یہ بہت بڑی بیوقوفی ہوتی۔" ٹیڈ اب خود بھی میری بات سے قائل ہو گیا تھا۔

"لیکن وہ آدمی جس نے پرس بدلا تھا؟" ہیلن نے روکے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ کہا۔ "تم اسے کیوں شک کے دائرے سے باہر سمجھتے ہو؟"

"وہ ہماری نظروں کے سامنے تھا۔ اسے موقع ہی نہیں ملا کچھ کرنے کا۔"

"ہو سکتا ہے اس سے غلطی ہوئی ہو اور اس نے اصل والا پرس ہی واپس دے دیا ہو اور اپنا نقلی پرس ہی اپنے پاس واپس رکھ لیا ہو۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

جواب میں ٹیڈ نے دراز کھولی اور دو پرس نکالے، دونوں کالے پیٹنٹ لیدر کے۔ دونوں کو میز پر الٹ دیا۔ ایک بالکل خالی تھا، دوسرے سے لپ اسٹک، رومال، کچھ چھوٹے سکے اور قلم گر پڑے۔

اس نے کہا۔ "یہی بیگ کنسیلا کے پاس پہنچا تھا۔"

ہم سب خاموشی سے اس ڈھیر کو دیکھتے رہے۔

"ظاہر ہے اس کے بعد کنسیلا اپنے غنڈوں سمیت فوراً یہاں پہنچا، وہ دھمکیاں دیتا رہا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ رقم شاید لڑکی لے اڑی۔ اس وقت میری سمجھ میں یہی آ رہا تھا۔ شاید یہ میری غلطی تھی کیونکہ وہ پھر خود ہی اس کے پیچھے پڑ گیا اور اسے

تمہارے ہوٹل میں ڈھونڈ کر مار ڈالا۔ وہ تو ویسے ہی گھونسے کھا کھا کر دماغی توازن کھو چکا ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ نہ اس کے پاس پیسے ہیں، نہ ہمارے پاس۔ اگر کنسیلا کو رقم نہ ملی تو وہ خوش نہیں ہوگا۔ اگر میرا گروہ دوبارہ رقم دے تو وہ بھی خوش نہیں ہوگا اور اگر تم نے جواب نہ دیا تو میں بھی خوش نہیں ہوں گا۔"

میں کوئی طنزیہ جملہ بولنے ہی والا تھا مگر دماغ نے بروقت روک دیا۔ اتنے میں ہیلن نے پوچھا۔ "کیا وہ لڑکی اپریل واقعی تھیٹر میں کام کرتی تھی؟"

"ہاں، وہ ایک اداکارہ تھی۔" میں نے کہا۔

"پھر اس کے بیگ میں لیڈیز گارمنٹ ورکرز یونین کا بیج کیوں تھا؟" ہیلن نے بیگ سے نکلا ہوا دھاتی بٹن اوپر اٹھا کر دکھایا۔

میں نے دل ہی دل میں اس کے ساتھ کوئی ربط جوڑنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اتنے میں ہیلن نے بیگز کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا یہ بیگ تمہارے

"ایک بیگ لڑکی کا تھا، دوسرا میری ... نے خریدا اور کنسیلا کے ٹرینر کی بیوی کو دیا لیکن اس ... پڑتا ہے؟" اس کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

"بات یہ ہے کہ میرے پاس بھی ایک ایسا ہی بیگ ہے۔" ہیلن نے دونوں بیگ پلٹتے ہوئے کہا۔ "شاید ریسٹوران ... عورتوں کے پاس ہوتا ہوگا۔ یہ ریسٹوران کتنا مہنگا تھا جہاں آپ نے یہ ڈراما رچایا؟"

مجھے یقین تھا ٹیڈ شادی شدہ نہیں ہے۔ عورتوں کے دماغی موڑ سمجھنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

"سیونتھ ایونیو پر ایک تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "اب سنو....."

"کیا یہ ایسا ریسٹورنٹ تھا جہاں کوئی ملاح اپنی گرل فرینڈ کو لے جاسکتا ہو؟" ہیلن نے اس کی بات کاٹی۔ اس کے ہاتھ میں سامان والے بیگ سے نکلا اخبار کا ایک تراشہ تھا، ایک خبر کی کٹنگ جس میں ایک بحری جہاز کے بندرگاہ پر پہنچنے کی خبر چھپی تھی۔ اس خبر کو سرخ روشنائی سے دل بنا کر نشان زدہ کیا گیا تھا۔ میں نے وہ پرچی ٹیڈ کو تھما دی۔

"میں بتاتی ہوں کہ تمہارے پیسے کے ساتھ کیا ہوا۔" ہیلن نے کہا۔ "وہ لڑکی اپریل جب ریسٹ روم گئی تو اس نے بیگ کہیں رکھ دیا ہوگا۔ واپس آتے ہوئے وہ گھبراہٹ میں غلط بیگ اٹھا لائی جو شاید اس وقت وہاں موجود کسی دوسری عورت کا تھا۔ تم سوچو، اتنی بڑی رقم اٹھائے پھرنا اپریل جیسی لڑکی کے لیے چھوٹی بات نہیں ہوگی۔ ایسے میں یہ غلطی ہونا ممکن ہے اور اسے معلوم بھی تھا کہ بیگ آگے جا کر کنسیلا کے آدمی کے حوالے ہونا ہے تو وہ اپنے ذاتی سامان کو اندر کیوں چھوڑتی؟"

ٹیڈ نے ہاتھ پھیلائے جیسے کہہ رہا ہو "اب عورتوں کے دماغ کو کون سمجھے۔"

ہیلن نے ایک گہری سانس کھینچی۔ "میں یقین سے کہتی ہوں کہ یہ کسی اور کا بیگ تھا جو وہ باہر لے آئی اور اس کا اصل بیگ جس میں تمہارے پیسے تھے، وہ اس اجنبی عورت کے ساتھ گھر چلا گیا۔"

ٹیڈ نے یہ سن کر غور کیا۔ "تو تم چاہتی ہو میں اپنے ساتھیوں کو بتاؤں کہ ان کے پیسے کوئی اجنبی لے اڑا؟"

"یہی ایک قابلِ یقین وضاحت ہے۔" ہیلن نے کہا۔

"یہی وضاحت ایک بند گلی بھی ہے۔" ٹیڈ نے زور سے کہا۔

"بیگ میں کوئی چیز نہیں جس پر نام یا پتا لکھا ہو؟ خط، یا بٹوے میں ڈرائیونگ لائسنس؟" میں نے مداخلت کی۔

"بٹوا تو ہے ہی نہیں اور اس شہر میں ڈرائیونگ کون کرتا ہے؟ اگر کوئی پتا ہوتا تو کنسیلا اب تک وہاں پہنچ چکا ہوتا۔" ٹیڈ نے بیزاری سے کہا۔

"کیا ریسٹوران میں کسٹمرز کی کوئی لسٹ نہیں ہوگی؟" ہیلن نے سوال کیا۔

"اگر وہ اتنی نفیس جگہ ہوتی تو ہم اسے استعمال ہی نہ کرتے۔"

فضا میں لمحے بھر کو خاموشی چھا گئی پھر ہیلن نے ہی وہ خاموشی توڑی۔

"ایک عورت کا بیگ اس کے فنگر پرنٹس کی طرح منفرد ہوتا ہے۔ تھوڑی عقل استعمال کرو تو تم پتا لگا سکتے ہو کہ یہ بیگ کس کا ہے۔"

"ایسا کیا؟" ٹیڈ نے اسے طنزیہ نظروں سے گھورا۔

"بالکل ایسا ہی ہے۔" ہیلن میز کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ وہ بظاہر پرسکون لگ رہی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ وہ گھبرا رہی تھی۔ "ہم جانتے ہیں وہ گارمنٹس ... ہے۔ ہمیں پتا ہے اس کا ایک ملاح سے تعلق ہے۔" ہیلن نے اخبار کی کٹنگ دیکھی۔ "شاید شوہر نہیں، عاشق ہے۔ شوہر ... جوش پیدا نہیں کرتے۔"

اس بات پر ٹیڈ نے ایک جتاتی نگاہ میری سمت ڈالی مگر میں نے نظر انداز کر دیا۔

"وہ کیتھولک اور آئرش ہے۔" ہیلن نے اگلا ثبوت میز پر رکھا۔ سینٹ بریجڈ کی تصویر والا دعا کا کارڈ۔

"اس شہر میں ہزاروں آئرش ہیں۔" اس کے لہجے میں پھر تمسخر آیا۔

ہیلن نے پروا نہ کی۔ "وہ مجھ سے بڑی ہے۔ شاید پینتالیس برس کے قریب۔ یہ دونوں لپ اسٹکس کے شیڈ دیکھو۔ پہلے تو عمر لڑکیوں والا شیڈ لگاتی تھی لیکن کافی عرصے سے نہیں لگایا۔ اب وہ ہلکا گلابی استعمال کر رہی ہے، بڑی عمر کی جلد کے لیے زیادہ موزوں۔ اس کے بال بھی سفید ہو رہے ہیں۔" ہیلن نے کنگھی میں الجھے بال دکھائے۔ "اور غالباً تھوڑی بھاری بھر کم بھی ہے۔" اس کے ساتھ میں ایک بروشر تھا کسی وزن کم کرنے والے کلب سے متعلق۔

اب ٹیڈ پوری طرح متوجہ ہو چکا تھا۔

"یہ ٹکٹ کس بارے میں؟" اس نے اشارہ کیا۔

"رو کسی تھیٹر جو ساؤتھ سیونتھ اسٹریٹ پر ہے۔ ہفتے کی صبح کا شو۔" ہیلن نے فلم کا نام بتایا۔ ساتھ ہی ایک ماچس کی ڈبیا بھی تھی جس پر موریز پب کا نام تھا، وہ بھی سیونتھ اسٹریٹ پر ہی تھا لیکن ہیلن کی زیادہ دلچسپی ان کاغذوں میں تھی جو کسی سبزی والے کی تھیں۔ آخر میں ہیلن نے سب سے آخری چیز نکالی۔ کوچ لائن کا اسٹوڈنٹ بس پاس۔ "ہولی کراس اکیڈمی کا ساتویں کلاس کا طالب علم۔ ساتویں کلاس مطلب تیرہ سال کا بچہ۔"

ٹیڈ دیر تک ثبوت دیکھتا رہا پھر غنڈے نمبر ایک کو آواز دی۔

"گریگ! تمہارے سالے کی ڈیوٹی کیا اب بھی اسی علاقے میں ہے؟"

اس نے بنا کچھ کہے گردن ہلائی۔

"اسے فون کرو، پتا کرو کسی درمیانی عمر کی عورت کے بارے میں، بیوہ یا طلاق یافتہ، موٹی تازی، بال رنگے ہوئے، گارمنٹس میں کام کرتی ہے، یونین ممبر ہے، ایک ٹین ایجر بچہ ہولی کراس اسکول میں ہے۔ ایک ملاح کے ساتھ وقت گزارتی ہے، ففتھ میں کہیں رہتی ہے، موریز پب میں جاتی ہے اور کیری گرانٹ کی فلمیں پسند کرتی ہے۔"

وہ سر ہلا کر باہر گیا اور کچھ دیر بعد ایک کاغذ لے کر واپس آیا۔ ٹیڈ نے وہ کاغذ پڑھا۔

"وہ مسئلہ نہیں چاہتا۔" گریگ دھیرے سے بولا۔

"شاندار۔" ٹیڈ کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ جھلکی۔ "ہم بھی نہیں چاہتے۔" پھر اس نے نظریں اٹھا کر ہماری طرف دیکھا۔ "گاڑی نکالو، ہم سب چلتے ہیں۔"

یوں ہم دوبارہ لیموزین میں سوار ہوئے مگر اس بار گریگ ڈرائیور کے ساتھ آگے بیٹھا اور ٹیڈ، ہیلن کے ساتھ پیچھے۔ ہیلن کے ہاتھ میں وہ بیگ تھا جس میں سارے ثبوت دوبارہ رکھ دیے گئے تھے۔ راستے بھر خاموشی چھائی رہی۔ باہر ٹائمز اسکوائر کی روشنیاں جھلملانے لگیں۔ آخر کار ہم ایک ایسی عمارت کے سامنے رکے جو باقی سب جیسی ہی تھی۔ تیسری منزل پر جالی کے پردوں کے پیچھے روشنی جل رہی تھی۔

گاڑی سے اتر کر عمارت کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہم یوں لگ رہے تھے جیسے پمفلٹ بانٹنے نکلے ہوں۔ دروازہ ایک بڑے توند والے آدمی نے کھولا جس کا گنجا سر پسینے سے چمک رہا تھا۔ اس نے پولیس کی وردی کی پینٹ پہن رکھی تھی اور اوپر ایسی شرٹ جو پسینے سے بھیگی ہوئی تھی۔ یہ شاید بلکہ یقیناً گریگ کا سالا تھا۔

اندر جاتے ہی مدھم بلب کی روشنی میں ایک آدمی نظر آیا جس نے بنیان پہنی ہوئی تھی اور بازوؤں پر جہازوں کے ٹیٹو بنے تھے۔ اس کے ہاتھ میں اسی قسم کا کالا بیگ تھا۔ ٹیڈ اسے یوں گھورنے لگا جیسے ابھی جھپٹ لے گا۔

"سب کچھ ہے اندر، گن لو۔" پولیس والا بولا۔

پرس کا تبادلہ ہوا، گریگ نے نوٹ گننے شروع کیے۔

پیچھے ایک عورت کھڑی تھی، پھولدار لباس پہنے، بازو سینے پر لپیٹے ہوئے۔ اس کے بال تانبے جیسے لال تھے، گرمی سے بکھرے ہوئے اور چہرے پر وہ تھکن چھائی تھی جو بتاتی تھی کہ مردوں کی دنیا میں اب اسے کسی بات پر حیرت نہیں ہوتی۔ ہیلن نے اس کی طرف سامان والا پرس بڑھایا۔ ایک لمحے کے لیے ان کی آنکھیں ملیں پھر عورت تیزی سے آگے آئی اور پرس جھپٹ لیا۔

"آپ سے معذرت خواہ ہوں، اس ناخوشگوار واقعے پر۔" ہیلن نے ذرا جھک کر کہا۔

"جیسے ہی پیسے دیکھے، ہمیں پتا چل گیا تھا کہ یہ ایک غلطی ہے۔" ملاح بولا۔ اس کی آواز میں بیلفاسٹ کا لہجہ صاف جھلک رہا تھا۔ "میو کہہ رہی تھی کہ ہم اسے اپنے پاس رکھ لیں، اتنے پیسے ایک ساتھ کبھی نہیں دیکھے لیکن میں نے کہا یہ مصیبت ہے۔ ہم دوسروں کے کاموں میں نہیں پڑتے۔"

"ہم آپ کی اخلاقی سوچ کی قدر کرتے ہیں۔" ٹیڈ نے کہتے ہوئے نوٹوں کی گڈی پرس سے نکال کر اپنی جیکٹ میں رکھ لی۔

"جو لینے آئے تھے، لے لیا۔" پولیس والے نے کہا۔

"اب جا سکتے ہو۔"

ٹیڈ ہلکا سا مسکرایا اور جانے کو پلٹا مگر تب حیران رہ گیا جب دیکھا کہ میں اور ہیلن اب بھی اس کے پیچھے کھڑے ہیں۔

"کیا مجھے وہ دوسرا پرس مل سکتا ہے؟" ہیلن نے کہا۔

"اوہ...... تمہارے لیے تو کچھ بھی۔" ٹیڈ نے فوراً اپریل والا پرانا داغدار پرس اس کے حوالے کر دیا۔

"گرینڈ سینٹرل تک لفٹ مل سکتی ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے فراخ دلی سے ہاتھ ہلایا جیسے ہم بہت خاص

لوگ ہوں۔

"لیکن سنو، ہمیں تمہارے جیسے دماغوں کی ضرورت ہے ورنہ یہاں ایسے بددماغ ہیں جو صحیح کام کرنے بھی نکلیں تو غلط ہی کر جاتے ہیں۔ کیا تمہیں واقعی دلچسپی نہیں ہے؟"

وہ ہمیں اپنے ساتھ کام کرنے کی آفر دے رہا تھا۔ میں نے حیران ہو کر پلکیں جھپکائیں۔ "نہیں، ہمیں بس لفٹ چاہیے، شکریہ۔"

راستے بھر ٹیڈ باتیں کرتا رہا۔ "ایسا کمال تو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ تمہاری بیوی جینئس ہے، صرف ایک پرس سے ہی ہمیں سیدھا ان کے دروازے تک پہنچا دیا۔ اگر میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتا تو کبھی یقین نہ کرتا۔ تم تو اس ٹیلنٹ سے اسٹیج پر جا سکتی ہو۔" ہم براڈوے کے پاس کر رہے تھے جب وہ یہ کہہ رہا تھا۔

"سوائے اس بات کے کہ قاتل بچ کر نکل گیا۔" ہیلن نے دھیرے سے کہا۔

ٹیڈ کی آنکھیں سکڑ گئیں اور پہلی بار اس کی شکل واقعی خطرناک لگی۔

"ایسا مت سوچو۔" اس نے کہا۔ "اگر تم ایسا سوچو گی تو مجھے برا لگے گا۔ دیکھو، قسمت ہوتی ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ آنکھ کے بدلے آنکھ۔ کوئی بھی قسمت سے بچ نہیں سکتا۔ مجھ پر بھروسا کرو۔"

انہوں نے ہمیں اسٹیشن کے باہر اتارا۔ ٹفنی کلاک پر ایک بج کر پندرہ منٹ ہو رہے تھے۔ اسی پل بجلی چمکی۔ گرمی کی لہر کو ایک نیا ٹھنڈا طوفان للکار رہا تھا۔

"اس کا مطلب کیا تھا؟" ہیلن نے پوچھا۔ "جو وہ قسمت کے بارے میں کہہ رہا تھا؟"

"مکافاتِ عمل...... کنسیلا نے جو بویا، وہ ایک دن ضرور کاٹے گا۔" میں نے اسے ایک بینچ پر بٹھایا اور جا کر ٹرین کے حالات معلوم کرنے لگا۔ جب واپس آیا تو ہیلن پرس کھولے بیٹھی تھی۔

"میں نے سوچا شاید اس نے اندر کچھ چھوڑا ہو۔" ہیلن نے کہا۔ "لیکن نہیں۔"

میں نے پوچھا بھی نہیں کہ "اس" سے اس کی مراد ٹیڈ تھا یا اپریل۔ میں نے اپریل کے ساتھ ڈنر پر ہوئی اپنی گفتگو کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں بہت کم بتایا تھا۔

"وہ کچھ لڑکیوں کے ساتھ اپارٹمنٹ شیئر کرتی تھی، باڈری کے علاقے میں۔ میرا خیال ہے وہ لوگ اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کردیں گے، لاش کی شناخت کریں گے اور اس کی تدفین ہو جائے گی۔ مجھے نہیں لگتا اس کا کوئی خاندان تھا۔ اس نے بتایا تھا وہ ایک یتیم خانے میں پلی بڑھی اور سولہ سال کی عمر میں ہی نیویارک آ گئی تھی۔"

ہیلن نے آہستگی سے پرس بند کر دیا۔ "دو لوگ ہمیشہ اسے یاد رکھیں گے۔" اس نے کہا۔ "تم اور میں، اپنی ساری زندگی کے لیے۔ ایسی بات بھلائی نہیں جاتی۔"

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ کبھی بھلائی نہیں جائے گی۔"

ایک ایکسپریس ٹرین پلیٹ فارم پر آ کر رکی جس کے دھیمے جھونکے وہاں کھڑے لوگوں میں ہلچل پیدا کر رہے تھے۔

"جانتی ہو؟" میں نے کہا۔ "تم نے وہاں کمال کر دیا تھا۔"

اس کے چہرے پر شرمندہ سی مسکراہٹ ابھری۔ "یہ تو بس کامن سینس کی بات تھی۔"

ڈیپارچر بورڈ پر حروف کھٹاک سے بدلے۔

"اس کے بعد والی ٹرین تمہاری ہے۔" میں نے کہا۔

"اور تم؟" اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"سچ پوچھو تو میں نے ابھی یہ سوچا ہی نہیں۔ دفتر کے قریب کمرا لے سکتا ہوں۔ کرایہ دینا پڑے گا لیکن سفر کا وقت بچے گا۔ ویک اینڈ پر بچوں کو دیکھنے جا سکتا ہوں۔"

اس کے چہرے کا رنگ بدلا۔ "کیا تم یہی چاہتے ہو؟"

اس سوال کا میں بھلا کیا جواب دیتا۔ خاموش ہی رہا۔

"آج رات تو گھر ہی چلو۔" ہیلن نے کہا۔

"اور کل؟"

"پتا نہیں، ایڈ!" وہ بولی۔ اچانک اٹھی اور پرس تھامے مسافروں کے بیچ سے گزرتی چلی گئی۔ میں نے اسے جاتے دیکھا۔ اگلی ٹرین ایک پرانی، چرچراتی لوکل تھی۔ نرسیں، ویٹرز اور نائٹ واچ مین اپنی اپنی شفٹ کے بعد چڑھتے اور اترتے رہے۔ میں نے آنکھیں موند لیں۔

پھر وہ واپس آئی۔ "میں نے اسے لاپتا سامان کے دفتر میں جمع کرا دیا ہے۔"

"پرس؟"

"ہاں۔"

میں نے سوچا، ساری دنیا ہی ایک لاپتا سامان کا دفتر ہے۔ ہم سب کسی نہ کسی جگہ کھوئے ہوئے ہیں اور کوئی ہمیں لینے نہیں آتا۔ ریل کی پٹڑیوں سے ہلکی سی ہوا کا دباؤ اور دھیمی سی لرزش اٹھنے لگی، کسی نئی ٹرین کی آمد کا اشارہ۔

ٹکٹکی باندھے میں نے دیکھا، ٹرین کی چمکتی ہوئی چاندی جیسی بوگیاں پلیٹ فارم کے ستونوں کے بیچ سے لپک کر گزریں۔ ہیلن نے میرا ہاتھ تھامنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میں نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

***

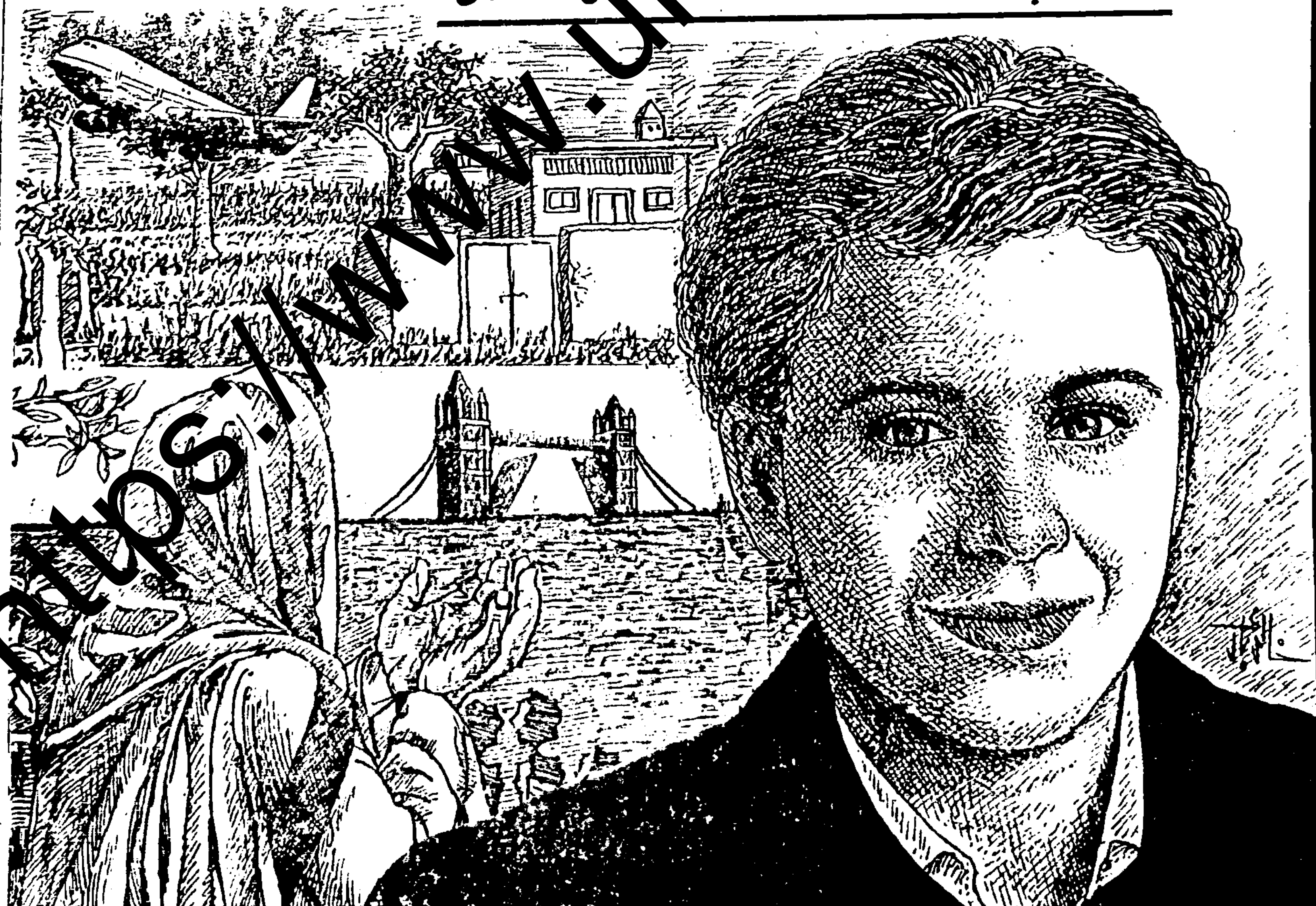
# دیس پردیس

ناہید سلطانہ اختر

## تیسرا حصہ

دنیا ایک ایسی قیام گاہ جس میں بسے انسان اپنی اپنی خواہشوں کے اسیر ہیں... کوئی حالات کی سختی کا شکار... تو کوئی سب کچھ مل جانے پر شاداں و فرحاں... کچھ ایسے جنہیں زمانے سے جھڑکیاں اور لعن طعن ہی ملتی ہے... سونے پہ سہاگا غربت بھی ان کے ہم رکاب رہتی ہے... ایسے میں جب منزل کا تعین نہ ہو تو وہ آسمان میں بھٹکتے پنچھیوں کی طرح عازمِ سفر ہوجاتا ہے... بہتر مستقبل، آسودہ زندگی اور دولت کمانے کی چاہ اسے وطن سے دور نگر نگر گھومنے پر مجبور کردیتی ہے اور وہ پردیس میں قسمت آزمانے چل پڑتا ہے... وہ سمجھتا ہے کہ وہاں کی سڑکیں شیشے کی ہوتی ہیں اور نوٹ اس پر بکھرے پڑے رہتے ہیں جنہیں جتنا مرضی اٹھالو... مگر یہ اس کی خام خیالی.... ہوتی ہے... کیونکہ اپنا دیس اپنا ہی ہوتا ہے... وہاں صعوبتیں اٹھاتے اٹھاتے شدت سے وطن سے دوری اور اپنوں کے نہ ہونے کا احساس ہوتا ہے... اور یہی کلفتیں سہتے بالآخر زندگی کی شام ہوجاتی ہے... مگر مسافر اپنی منزل سے کوسوں دور ہی ہوتا ہے۔

**دلوں میں امنگ، آنکھوں میں سہانے خواب**
**سجائے پردیس میں قسمت آزمانے والوں کی داستان**



نشاط کہنے کو تو رجب علی کے گھرانے کے مقابلے میں ایک ذی حیثیت گھر سے تھی مگر برطانیہ پہنچنے پر اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ پردیس میں دستیاب سہولتوں اور آسائشوں کے مقابلے میں پاکستان میں اس کا گھرانا کچھ بھی نہ تھا۔ رجب علی اسے لندن کی سیر کرانے لے گیا تو لندن کی چکاچوند نے اس کی آنکھیں خیرہ کردیں۔ گوروں کی انگریزی سے اس کا دس جماعتیں پاس کر چکنے کا زعم پارہ پارہ ہوگیا۔ یہ تو دنیا ہی اور تھی...... گٹ پٹ کرتی، کھٹ پٹ چلتی...... کیا عورتیں، کیا مرد...... جسے دیکھو لپکا چلا جاتا۔ مشینی زندگی تھی......کام، کام اور کام۔

رجب علی نے آتے ہی کام شروع کردیا تھا۔ بیچلرز میں اس کی اچھی کارکردگی کے باعث اسے دوبارہ اسی فیکٹری میں ملازمت ملنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی بلکہ اس نے چارج ہینڈ کو بتا کر کہ وہ اپنی نوبیاہتا بیوی کے اکیلے پن کی وجہ سے رات کی شفٹ میں کام کرنے سے قاصر تھا، دن کی شفٹ میں ڈیوٹی لے لی تھی۔

نشاط اس کی زندگی میں بہار بن کر آئی تھی۔ رجب علی کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے گھر کے آنگن کے پھول ایسی دلکش اور پُرادا لڑکی کے ساتھ کھلیں گے۔ نشاط بلا کی خوش لباس، خوش زیب، غضب کی پھرتیلی اور غیر معمولی ملنسار تھی۔ ذرا سی دیر کی ملاقات میں غیروں کو اپنا بنا لیتی۔ اس سے شادی کے بعد رجب علی کو اپنا آپ اہم محسوس ہونے لگا تھا۔ کچھ تو بات تھی اس میں بھی جو نشاط کے گھر والوں نے حد درجہ معاشرتی تفاوت کے باوجود اسے اپنی بیٹی دے دی تھی۔ شادی شدہ ہونے کے بعد رجب نے اپنے اوپر خود ساختہ بردباری طاری کرلی تھی۔ اکبر علی کے گھر میں وہ اور نشاط واحد شادی شدہ جوڑا تھے۔ انگریز کرایہ دار لڑکی ابنا بھی غیر شادی شدہ تھی۔

رجب علی خود کو نشاط کی زوجیت کا اہل ثابت کرنے اور اسے خوش رکھنے کی پوری کوشش کرتا۔ اب اسے اپنے روزمرہ لباس اور جوتوں کا خاص خیال رہنے لگا تھا۔ کام سے واپس آنے کے بعد وہ اکثر نشاط کو ساتھ لے کر باہر گھومنے نکل جاتا۔ ویک اینڈ پر دونوں مل جل کر ہفتہ بھر کے لیے خریداری کرتے۔ رجب علی ویک اینڈ پر نشاط کو کہیں نہ کہیں سیر و تفریح کے لیے بھی لے جاتا۔ کبھی پائے نہاری کھلانے کے لیے ساؤتھ آل تو کبھی مادام تساؤ کا مومی عجائب خانہ دکھانے لندن، کبھی برٹش میوزیم، ٹریفلگر اسکوائر، لندن برج، دریائے ٹیمز تو کبھی بکنگھم پیلس کا نظارہ کرانے تو کبھی ہلکی پھلکی خریداری کے لیے گرین اسٹریٹ۔

وہ دونوں جب بھی اکٹھے باہر نکلتے تو اکثر مقامی افراد انہیں پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے اور انہیں ایک حسین ایشیائی جوڑا قرار دینے میں ذرا بخل نہ دکھاتے۔ نشاط اپنی خود پسند فطرت کے باعث اپنے غیر معمولی دراز سیاہ بالوں کی تعریف سن کر پھولے نہ سماتی۔ ایک روز ایک بوڑھی انگریز عورت نے ان دونوں کو سرِراہ روک کر نشاط کے بال چھوتے ہوئے کہا۔ ”کاش! میرے بھی اتنے خوبصورت بال ہوتے۔ تم ان بالوں کے ساتھ شہزادی لگتی ہو۔“

بعد کے دنوں میں نشاط نے بار بار رجب علی کو جتایا۔ ”آپ نے سنا، اس عورت نے کیا کہا تھا؟“

رجب علی اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے کر کہتا۔ ”ہاں، تم شہزادی ہی تو ہو مگر صرف میری۔“

چند ہفتوں میں جب وہ نشاط کو اِدھر اُدھر کافی گھما پھرا چکا تو نشاط کا زیادہ وقت گھر ہی میں گزرنے لگا۔ رجب علی اسے بیشتر ایشیائی تارکین وطن عورتوں کی طرح فیکٹریوں میں کام پر نہیں لگانا چاہتا تھا، سو اس نے کہہ دیا کہ گھر میں رہ کر وہ جو جی چاہے کرے، جتنا چاہے آرام کرے، جتنی دیر چاہے سوئے، جب مرضی ہو باہر جائے، شاپنگ کرے، گھومے پھرے، کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں۔

نشاط پر زیادہ روک ٹوک پاکستان میں اس کے اپنے گھر میں بھی نہیں تھی۔ ناز و نعم میں پلی بڑھی اور لاڈ پیار میں بگڑی لڑکی تھی مگر پاکستان اور برطانیہ کی زندگی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہاں پھر بھی کچھ قدغنیں تھیں، یہاں تو آزادی ہی آزادی تھی۔ نہ ماں باپ کی طرف سے کوئی روک ٹوک، نہ ساس نندوں اور جیٹھ جیٹھانیوں کا جھنجٹ۔ شوہر تابعدار اور جاں نثار۔ پسماندہ ملکوں سے بہتر معاشی حالات کی خاطر برطانیہ آنے والی تارکینِ وطن کی عورتیں معاشی تگ و دو میں اپنے مردوں کا ہاتھ بٹا رہی تھیں مگر اسے رجب علی نے اس سے بھی بری الذمہ قرار رکھا تھا بلکہ جب اس نے دن بھر گھر میں رہنے کی بیزاری سے اکتا کر کسی فیکٹری میں کام کرنے کی خواہش ظاہر کی تو رجب علی نے کہا۔ ”تمہیں کیا ضرورت ہے کام کرنے کی۔ جتنے پیسے چاہئیں مجھ سے لو۔“

”بات پیسوں کی نہیں، میں گھر میں بیٹھے بیٹھے بور ہوجاتی ہوں۔ باہر بھی کتنا گھوموں پھروں۔ آس پاس کا سارا علاقہ دیکھ چکی ہوں۔“

”کچھ دن کی بات ہے، بوریت بھی دور ہوجائے گی۔“ رجب علی نے نشاط کو معنی خیز مسکراہٹ سے دیکھا۔

”وہ کیسے؟“ رجب علی کی بات کی تہ تک پہنچتے ہوئے

بھی نشاط انجان بن گئی۔

”وہ ایسے کہ اللہ نے چاہا تو تمہیں مام اور مجھے ڈیڈ کہنے والا بھی آجائے گا تمہاری بوریت دور کرنے کو۔“

”اور اگر کہنے والا کے بجائے کہنے والی ہوئی تو؟“

”تو کیا...... اماں کہتی ہیں، بیٹی اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔“

رجب علی جب بھی اپنے گھر کے کسی فرد کا ذکر کرتا، نشاط کی بھویں تن جاتیں۔ بہت کم وقت گزارا تھا اس نے رجب سے شادی کے بعد اس کے گھر والوں کے ساتھ اور ان گنے چنے دنوں میں ان میں سے کسی نے بھی اس کے ساتھ کبھی کچھ برا نہیں کیا تھا مگر پھر بھی وہ سسرال والوں سے چڑتی تھی۔ انہیں جاہل، غریب اور حقیر سمجھتی تھی۔ وہ صرف اور صرف رجب علی سے غرض رکھنا چاہتی تھی اور وہ بھی اس حد تک کہ وہ اس کا شوہر اور کفیل تھا ورنہ رجب علی کے ساتھ بھی اس کا رویہ کبھی کبھی اہانت آمیز ہوجاتا۔ اسے زعم تھا اپنی خوبروئی پر، تعلیم یافتہ ہونے پر اور رجب علی کے گھرانے کے مقابلے میں اپنے گھرانے کی بہتر معاشرتی اور معاشی حیثیت پر جس کا اظہار وہ رجب کے سامنے اور اس کی عدم موجودگی میں بھی اکبر علی اور اس کے گھر میں مقیم کرایہ داروں پر بھی اکثر و بیشتر کرتی رہتی تھی۔

رجب علی کو نشاط کا گھر کے دیگر کرایہ داروں سے جن میں سے ایک انگریز لڑکی کے سوا سبھی مرد تھے، بے تکلف بات چیت کرنا اچھا نہ لگتا تھا اور اس نے اس سلسلے میں نشاط کو بارہا ٹوکا بھی تھا مگر وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتی۔ ایک دو بار اس نے رجب علی کو اس کی گھٹیا سوچ کا طعنہ بھی دیا اور کہا وہ گھر کے مرد کرایہ داروں کو اپنا بھائی سمجھتی ہے جس پر رجب علی نے اسے سمجھایا کہ وہ اس پر خدانا خواستہ شک نہیں کر رہا تھا، اسے غیر مردوں سے میل جول سے باز رکھنا چاہتا تھا کیونکہ جس مذہب اور معاشرت کے وہ پیرو ہیں، اس کی تعلیم یہی ہے کہ عورت نامحرم مرد سے فاصلہ رکھے تاہم وہ نشاط کی ناراضگی کے خیال سے اس سے زیادہ تکرار نہ کرتا۔

نشاط کے اکیلے پن کے خیال سے رجب نے اسے آس پڑوس میں ایشیائی خاندانوں کی خواتین سے تعلق رکھنے کا مشورہ دیا تو وہ بولی۔ ”زیادہ تر تو کام پر جاتی ہیں اور جو گھر میں ہوتی ہیں، بڑی عمر کی اور بچوں والیاں۔ میری ان سے نہیں بنتی۔“

”فکر مت کرو، جب تم خود بچے والی ہوجاؤ گی تو بننے لگے گی۔“

☆☆☆

اکبر علی کے گھر میں پریتم سنگھ نامی کرایہ دار اور اسی گھر میں مقیم اینا کا معاشقہ شروع ہوگیا۔ دونوں اکثر اکٹھے باہر آتے جاتے دکھائی دینے لگے۔ ایک ویک اینڈ پر جب دونوں اکٹھے گھر سے باہر جانے والے تھے، رجب علی نے دونوں کو مسکراتے ہوئے وش کیا۔ پریتم نہ جانے کیا سمجھا، اس نے رجب علی کی طرف بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا اور غرایا۔ ”مائنڈ یور اون بزنس!“

رجب نے حیران ہوکر اُسے دیکھا۔ ”میں نے کیا کہا، وش ہی تو کیا ہے۔“

پریتم غصے سے بولا۔ ”میں سب سمجھتا ہوں، تو اس لیے مسکرایا کہ یہ گوری کے ساتھ جارہا ہے۔“

رجب علی نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو پریتم کی گرفت سے چھڑایا اور بولا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔“

پریتم نہ جانے کس موڈ میں تھا، غرایا۔ ”نکالوں تیری غلط فہمی۔“

رجب علی کو تاؤ آگیا۔ ”کیا لڑنے کا موڈ ہے تمہارا؟“

پریتم نے سینہ نکالا اور دونوں بازو رجب علی کی طرف پھیلا کر للکارنے والے انداز میں بولا۔ ”آجا۔“

ان کا شور سن کر گھر میں موجود تمام افراد ان کے اردگرد اکٹھے ہوگئے۔

پریتم سنگھ تقریباً ساڑھے چھ فٹ اونچا دیو نما شخص جبکہ رجب علی میانہ قدوقامت کا دبلا پتلا نوجوان...... دونوں ایک دوسرے کے روبرو...... اور انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھتے چند افراد۔ پریتم آگے بڑھا اور اس نے رجب علی کا کان دبوچ لیا۔ اس نے شاید یہ سمجھا ہو کہ رجب علی اس کے دیوقامت جثے سے مرعوب ہوکر معافی تلافی کرے گا مگر رجب علی کے جسم میں نہ جانے کہاں سے غیر مرئی توانائی اُمڈ آئی۔ اچھل کر اس نے پہلا مکا پریتم کے چہرے پر مارا۔ پریتم کے لیے یہ غیر متوقع تھا۔ وہ گالم گلوچ کرتا رجب علی پر پل پڑا۔ رجب علی بھی اچھل اچھل کر جوابی مکے برساتا رہا۔ بیچ بچاؤ کرانے والے بلند آہنگی سے دونوں کو منع کرتے اور لڑائی روکنے کی کوشش کررہے تھے۔ شور سن کر نشاط بھی اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔ اکبر علی یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ پریتم سنگھ کا ہونٹ پھٹنے سے خون نکل آیا تھا۔ رجب علی اپنے بازو کو پکڑے ہوئے تھا۔ بڑی مشکل سے دونوں میں بیچ بچاؤ کرایا گیا۔

پریتم نے اپنے ہونٹ سے رستا خون پونچھتے ہوئے اینا سے کہا۔ ”ولیٹس گو سویٹی!“

دونوں کے جانے کے بعد رجب علی سے اس لڑائی کا سبب پوچھا گیا۔ رجب علی کو سب جانتے تھے کہ بلا سبب لڑنے جھگڑنے والا نوجوان نہیں تھا۔ کشمیرا سنگھ نے رجب علی کی پُرزور حمایت کی اور پریتم کو اس بے وجہ فساد کا ذمے دار قرار دیا۔

جھگڑا رفع دفع ہونے اور بیچ بچاؤ کرانے والوں کے اپنے اپنے کمروں میں جانے کے بعد اکبر علی نے رجب سے علیحدگی میں کہا۔ ''میں پریتم کو رکھنے سے خوش نہیں ہوں۔ مجبوراً رکھا ہوا ہے مگر اب مجھے اسے اپنے گھر سے نکالنے کا موقع مل گیا ہے۔ وہ باہر سے آجائے، میں اسے نوٹس دے رہا ہوں لیکن صرف اس کو نوٹس دینے سے میرے خلاف سکھ مسلم تعصب کی ہوا چل سکتی ہے لہٰذا اس کے ساتھ میں تمہیں بھی کمرا خالی کرنے کا نوٹس دوں گا۔ بہتر ہے تم اپنا کہیں اور بندوبست کرلو۔ ویسے بھی میں اس مکان کو فروخت کر کے لندن شفٹ ہونے کا ارادہ کر رہا ہوں۔''

رجب علی کے پاس کچھ جمع پونجی اکٹھی تھی جو اس نے قسطوں پر گھر یا گاڑی خریدنے کی نیت سے جوڑ رکھی تھی۔ اب وہ پہلے کی طرح مجرّد نہ تھا کہ اکبر علی کے گھر سے نکلتا تو کسی بھی گھر میں جا پڑتا۔ نشاط اس کے ساتھ تھی اور اب امید سے بھی تھی۔ گھر خریدنا گاڑی خریدنے سے زیادہ ضروری تھا۔

''کیا قیمت لگاؤ گے تم اس گھر کی؟'' رجب علی نے اکبر علی سے پوچھا۔

اکبر علی نے پہلے اسے حیرانی سے دیکھا پھر بولا۔ ''بائیس سو پونڈز گھر کے اور تین سو پونڈز فرنیچر کے۔'' اکبر علی نے توقف کیا پھر پوچھا۔ ''کیوں پوچھ رہے ہو تم گھر کی قیمت؟''

''میرے پاس کُل دو ہزار پونڈز ہیں۔'' رجب علی نے جواباً کہا۔

سودا نہ ہوسکتا تھا۔ اکبر علی کے نوٹس پر رجب علی کو اس کا گھر چھوڑنا ضروری ٹھہرا۔

نشاط بعد میں رجب علی پر ہنستی تھی کہ پریتم سنگھ جیسے لحیم شحیم آدمی کو اس نے اس روز کس بری طرح پچھاڑا تھا۔

اکبر علی کا گھر چھوڑنے میں رجب علی کو ایک فائدہ یہ بھی نظر آیا کہ نشاط جو اکبر علی کے گھر میں مقیم مرد کرایہ داروں سے بے محابا بات چیت کرتی تھی، اس سے نجات مل جائے گی۔ رجب نے جس ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں، وہاں تو سوائے آپا کے کسی عورت کا غیر مرد سے بے تکلفی سے بات کرنے کا سوال ہی نہ تھا۔ آپا کو استثنیٰ اس لیے تھا کہ وہ بیچاری شوہر کے ہوتے ہوئے بھی تنہا مردانہ وار زندگی گزار رہی تھی۔

رجب علی کی سب سے بڑی خواہش ماں کو حج کرانا تھی۔ شادی نہ ہوئی ہوتی تو وہ جمع شدہ دو ہزار پونڈز سے سب سے پہلے ماں کو حج کرانے لے جاتا مگر وقت اور حالات نے اس کی ترجیح بدل دی تھی۔ اکبر علی کا گھر چھوڑ کر اپنے گھر میں شفٹ ہونا اس کی اولین ترجیح بن گئی تھی۔ نشاط کے ساتھ آخر کب تک وہ دوسروں کے گھر میں جہاں مرد کرایہ دار اکثریت میں ہوتے تھے، کرایہ کے کمرے میں پڑا رہتا۔ تاہم اپنا گھر خریدنا آئندہ حالات پر منحصر تھا۔

اکبر علی کی طرف سے گھر چھوڑنے کا نوٹس ملنے کے بعد اس نے اپنے ایک دوست سے مشورہ کرنے کے بعد سلاؤ شفٹ ہونے کے لیے وہاں جا کر مکانوں کی قیمت اور کام کی صورت حال کا اندازہ کرنا ضروری سمجھا۔

☆☆☆

سلاؤ لندن کے نزدیک ایک صنعتی و تجارتی ٹاؤن تھا۔ ''پی بی کو'' نامی پلاسٹک فیکٹری میں رجب علی کو فوری ملازمت مل جانے کی یقین دہانی ہوئی۔ سلاؤ میں ایشیائی کنبے بڑی تعداد میں آباد تھے۔ رجب علی کو سلاؤ شفٹ ہونے کا ایک مثبت پہلو یہ بھی محسوس ہوا کہ وہاں نشاط کو بڑی تعداد میں ایشیائی خواتین سے ملنے جلنے کا موقع ملے گا اور وہ اپنی خود پسندی اور بے باکی کی عادات سے چھٹکارا حاصل کر کے سادہ گھریلو عورتوں کی طرح رہنے کا ڈھنگ سیکھ سکے گی۔ رہائش کے لیے رجب علی نے ایک پاکستانی گھرانے میں ایک کمرا مع کچن اور باتھ روم کرایہ پر لینے کی بات بھی پکی کرلی۔

اکبر علی کے گھر سے رجب علی کے جانے پر کشمیرا سنگھ بہت ملول تھا۔ ''تجھے بہت مس کروں گا یار!'' اس نے رجب سے کہا۔

''زندگی رہی تو پھر کسی موڑ پر ملیں گے۔'' رجب علی بولا۔ اکبر علی کے گھر سے جانے پر خود رجب علی کو بھی بہت ملال تھا۔

سلاؤ شفٹ ہونے کے بعد رجب علی نے ''پی بی کو'' میں ملازمت شروع کردی۔ کشمیرا سنگھ اس سے رابطے میں رہا۔ کچھ عرصے بعد اس نے اپنے بال بچوں کو انڈیا سے برطانیہ بلالیا اور اسی گھر میں جہاں رجب علی مقیم تھا، اپنے بال بچوں کے ساتھ کرایہ دار ہوگیا۔

☆☆☆

پاکستان سے آپا اور ماں کے خطوط باقاعدگی سے آتے رہتے تھے۔ ماں کے خطوط میں وہی بھائی، بہنوں کے قصے، ان کے بچوں کے احوال، محلے داروں کی داستانیں...... فلاں کے ہاں چوتھی بیٹی ہوئی، فلاں کا فلاں سے جھگڑا ہوگیا، فلاں کی شادی ہوگئی، فلاں کا انتقال ہوگیا۔ بڑے بھائی کو بخار کے ساتھ کھانسی لگی ہوئی ہے، آپا کی وہی دن رات محنت مزدوری...... ریحانہ نے میٹرک پاس کرلیا ہے، اب کالج جائے گی، وغیرہ وغیرہ۔

نشاط خط پڑھتی اور پرزے پرزے کرکے ڈسٹ بن میں ڈال دیتی۔

''جاہل لوگ، خط لکھنے کی بھی تمیز نہیں انہیں۔'' وہ حقارت سے بڑبڑاتی۔

ماں کے دل کو حج کی آرزو بھی لگی تھی۔ اپنے ہر خط میں وہ رجب کو یہ لکھواتی کہ اب کی بار بھی وہ اسے حج پر لے جاسکے گا کہ نہیں۔

''بڑی بی کے دو بیٹے اور بھی ہیں، ان سے فرمائش کیوں نہیں کرتی حج پر لے جانے کی۔'' نشاط زیرِلب خود کلامی کرتی۔

ماں کے دل کو حج کی آرزو تھی اور رجب علی کو جلد سے جلد اپنا گھر خریدنے کی چاہ تھی۔ بی بی کو میں ملازمت کے علاوہ وہ ویک اینڈ پر بھی اِدھر اُدھر کام کرلیتا۔ کہیں پینٹ کا کام، کہیں پلمبرنگ تو کسی گھر میں درختوں اور پودوں کی کٹائی چھٹائی۔ آنے جانے میں وقت کی بچت کے پیشِ نظر اس نے ڈرائیونگ بھی سیکھ لی اور پہلی مرتبہ ہی ڈرائیونگ ٹیسٹ میں کامیاب ہوگیا۔

اپنا گھر خریدنے کی دھن میں رجب علی کو ماں کو خط لکھنے کی فرصت بھی نہ ملتی۔ ماں خط پہ خط بھیجے جاتی اور ان کے جواب کا انتظار کیے جاتی۔ دن چڑھتے ہی اس کے کان ڈاکیے کی آواز پر لگ جاتے۔ ڈاکیا روز آتا مگر ماں کے کسی خط کا جواب نہ لاتا۔

''اے بھائی! ہمارا کوئی خط ہے؟'' آپا ڈاکیے کی آواز سن کر دروازے سے نکل کر پوچھتی۔ ڈاکیا نفی میں سر ہلا دیتا۔

خط آتا بھی کیسے۔ رجب علی کو نہ تو ماں کا کوئی خط ملتا، نہ آپا کا۔ ویسے آپا تو کم ہی خط لکھواتی تھی اسے، البتہ ماں ہر تیسرے چوتھے دن ریحانہ کو خط لکھوانے کے لیے بٹھالیتی۔ ریحانہ کبھی کبھی بیزار بھی ہوجاتی۔ ''رجب جواب تو دیتا نہیں، خط کیوں لکھواتی ہو اسے۔'' وہ ماں سے کہتی۔

''ماں ہوں رجب کی...... فکر لگی رہتی ہے مجھے اس کی۔'' ماں کہتی۔

''اسے تو تمہاری فکر نہیں...... فکر ہوتی تو خط لکھتا نا۔''

''اری معروف ہوگا بیچارہ۔''

''بڑا آیا بیچارہ...... مجھے پڑھنا ہے اماں!''

''پہلے خط لکھ دے میری بچی!''

ماں کی منت پر ریحانہ بادلِ ناخواستہ خط لکھنے بیٹھ جاتی۔

''اماں! رجب بھول گیا ہے تمہیں۔''

''اللہ نہ کرے...... کیسی بدفال نکال رہی ہے تو منہ سے۔ بھول جاتا تو خرچے کے پیسے بھیجتا ہر مہینے مجھے؟'' دلیل تو معقول تھی۔

رجب علی نے سلاؤ میں ایک پرانے مکان کا سودا کرکے کچھ اپنی جمع پونجی سے اور کچھ قرضہ لی گئی رقم سے مالک مکان کو ادائیگی کردی۔ مورگیج کی ادائیگی میں آسانی کے لیے اس نے گھر میں چند کرایہ دار رکھ لیے۔ نشاط ''لینڈ لیڈی'' بن گئی۔ کرایہ داروں سے اس کا براہِ راست تعلق رہنے لگا، کرایہ دار سب کے سب مرد تھے۔ نشاط جس پر چاہتی، مہربان ہوجاتی، جس کی چاہتی ذرا سی بات پر بے عزتی کردیتی۔ ایک دو مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ کوئی کرایہ دار رات کو دیر سے گھر واپس لوٹا تو نشاط نے نہ صرف خود بلکہ کسی اور کو بھی دروازہ نہ کھولنے دیا اور دیر سے آنے والے کو رات گھر سے باہر بسر کرنا پڑی۔

رجب علی پیار سے نشاط کو سمجھاتا۔ ''کرایہ داروں کے ساتھ اتنی سختی نہ کیا کرو نشاط!''

''تو کیا ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوجاؤں ان کے سامنے۔''

''میرا یہ مطلب نہیں۔''

''تو پھر کیا مطلب ہے؟'' وہ رجب کو تیکھی نظر سے دیکھتی۔

''ہم خود بھی کرایہ دار رہے ہیں دوسروں کے گھروں میں۔''

''کرایہ دیا ہے ہم نے۔''

''کرایہ تو یہ بھی دیتے ہیں۔ ان کے ساتھ نرمی کا رویہ رکھا کرو۔ اللہ کو عاجزی پسند ہے۔''

''اللہ کو تو عاجزی پسند ہے مگر بندے عاجزی کو کمزوری سمجھتے ہیں۔ میں اگر سختی نہ کروں ان کرایہ داروں پر تو نہ یہ وقت پر کرایہ دیں، نہ صفائی کا خیال رکھیں۔ پرسوں میں نے اچانک باتھ رومز چیک کیے تو برے حالات تھے۔ میں نے وارننگ دی کہ اگر آئندہ باتھ رومز کی یہ حالت دیکھی میں نے تو سب کو نکال باہر کروں گی۔''

''سب کو تو نہ ڈانٹا کرو، جس کی غلطی ہو اسے ٹوکنا چاہیے۔''

"سب ایک دوسرے کو الزام دینے لگتے ہیں اس لیے سب کو ڈانٹنا ضروری ہوتا ہے۔"

رجب علی بحث میں ہار جاتا۔

"اچھا بھئی، جیسے تمہاری مرضی۔ ویسے بھی کرایہ دار میرا مسئلہ نہیں، لینڈ لیڈی تم ہو، تم ہی جانو۔"

"بائی دی وے آپ کون ہیں؟"

"تمہارا تابعدار۔"

"اور آپ کا مسئلہ؟"

"تمہارا بٹوا پیسوں سے بھرا رہے اور تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو۔"

"شکایت [illegible]"

"کیا؟" رجب علی [illegible]

"کام، کام، بس [illegible]"

"تمہیں آرام پہنچانے کے لیے۔" رجب علی نے بیوی کو محبت سے دیکھا۔

"اپنے گھر والے یاد آتے ہیں [illegible]؟" [illegible] نے نہایت چالاکی سے رجب کا دل ٹٹولنے کی کوشش کی۔

"جب سے تم ملی ہو، میں ساری دنیا کو بھول گیا [illegible]"

فیکٹری میں کام بہت سخت، پرمشقت اور انسانی صحت کے لیے کسی حد تک نقصان دہ بھی تھا مگر رجب علی کو پیسا کمانے سے مطلب تھا۔ اکثر ڈیوٹی کے مقررہ اوقات کے علاوہ اوورٹائم بھی لگا لیتا۔ چارج ہینڈ اس سے بہت خوش تھا۔ اکثر اسے تھپکی دیتا اور کہتا۔ "تم سچ مچ ایک محنتی آدمی ہو۔ میں تمہارا مداح ہوں۔"

فیکٹری کے قواعد کے مطابق رجب علی کو چار ہفتوں کی چھٹی مع تنخواہ ملی تو چارج ہینڈ نے کہا۔ "کام کے لیے دوبارہ تازہ دم ہونے کو آرام کرنا، گھومنا پھرنا اور اپنی دلچسپیوں سے لطف اندوز ہونا۔"

رجب علی نے چار ہفتوں کی چھٹی ٹیکسی چلا کر گزاری۔ گھر کی خریداری کے لیے لیا گیا قرض وہ جلد سے جلد ادا کر دینا چاہتا تھا۔ نشاط پاکستانی بیگمات کی طرح رہتی۔ اس کے بٹوے میں پونڈز بھرے ہوتے۔ بہت کم وقت میں رجب علی نے اسے گھر، آرام دہ فرنیچر اور گھریلو امور کو سہل بنا دینے والی وہ چیزیں فراہم کر دی تھیں جن کا وہ پاکستان میں کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود بھی تصور نہ کر سکتی تھی۔

☆☆☆

بیٹی کی پیدائش کے بعد رجب علی، نشاط کا پہلے سے زیادہ گرویدہ ہو گیا۔ اس نے ماں کو بہت عرصے بعد خط لکھ کر اسے اس خوشخبری سے آگاہ کیا۔ ماں کو پوتی کی پیدائش سے زیادہ رجب کا خط آنے کی خوشی ہوئی۔ حلوائی کی دکان سے موتی چور کے لڈو منگوا کر افرادِ کنبہ کی تعداد کے برابر لڈو بیٹوں اور بیٹیوں کو دیے اور آس پڑوس میں دو دو لڈو ہر گھر میں اس خوشخبری کے ساتھ بھجوائے کہ رجب کے ہاں بیٹی ہوئی ہے۔ نشاط کے گھر والوں کے لیے گلاب جامنیں بھجوائیں۔ وہ بھی عجیب متکبر لوگ تھے، نہ کوئی مبارک باد دینے آیا، نہ مٹھائی لے جانے والے سے مبارک باد کے دو بول بھجوائے۔

ماں اس سمدھیانے سے ویسے بھی کچھ خوش نہ تھی۔ بہت عرصے تک رجب کی طرف سے کوئی خط نہ آنے پر جب ماں نے منجھلے کو چمکار پچکار کر رجب کی سسرال سے کوئی خیر خبر لانے کو کہا تو ان لوگوں نے بیٹی کے جیٹھ کو گھر کے اندر بلا کر بٹھانا بھی گوارا نہ کیا۔ باہر سے باہر کہہ دیا...... "ہاں، سب خیریت ہے، ہماری بیٹی کے خط تو برابر آتے ہیں۔"

بیٹی کا باپ بن کر رجب علی بہت خوش تھا۔ گھر میں ہوتا تو اسے بازوؤں میں اٹھائے پھرتا، سینے سے لگاتا تو ان [illegible] راحت محسوس کرتا۔ وہ سو رہی ہوتی تو کبھی دھیرے سے اس کے [illegible] چھوتا، کبھی اس کا منا سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر [illegible] سے لگا لیتا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے پیروں کو نہایت [illegible] سے دیکھتا، سوتے میں اس کے کبھی مسکرانے اور کبھی منہ بسورنے کو [illegible] سے دیکھتا اور سوچتا اتنی ننھی سی جان کو مسکرانے اور منہ بسورنے سے کیا کام تھا۔

فیکٹری میں کام کے [illegible] بھی رجب کا دھیان بار بار نوزائیدہ بیٹی کی طرف جاتا [illegible] وہ بےخیالی میں مسکرانے لگتا۔ چارج ہینڈ نے ایک روز اسے [illegible] کیفیت میں دیکھ کر پوچھا۔ "ایسی کیا بات ہے رجب جو تمہیں کام کے دوران مسکرانے پر مجبور کر رہی ہے؟"

رجب علی چونکا، مسکرایا پھر بولا۔ "میری نومولود بیٹی نگار!"

چارج ہینڈ مسکرایا پھر بولا۔ "بچہ خداوند کی طرف سے انعام ہوتا ہے والدین کے لیے۔"

"آپ لوگ بھی بہت پیار کرتے ہو اپنے بچوں سے؟" رجب علی نے کہا۔

"قدرتی امر ہے۔" چارج ہینڈ نے شانے اچکائے۔ "مگر بہت سے بےپروا لوگ نہیں بھی کرتے، بالخصوص نوجوان لڑکے۔ وہ تو لڑکی کو بچے دے کر چلتے بنتے ہیں، بےچاری ماں اکیلی اسے پالتی پوستی ہے۔ کبھی بچے کی

نانی، دادی اس کا کچھ ساتھ دے دیتی ہے ورنہ سارا بوجھ اس کی ماں پر ہی ہوتا ہے۔"

رجب نے دیکھا تھا، نوجوان گوری مائیں تنہا کس پیار اور مشقت سے بچوں کو پرام میں اپنے ساتھ لیے پھرتیں۔

نگار کا ننھا سا وجود اسے ہر لمحہ اپنے دل کے بے حد قریب محسوس ہوتا۔ اس کا خیال رجب کو اپنی رگوں میں موجزن لہو کی روانی میں حلول کیا لگتا۔ عجیب تھا یہ تعلق۔

نشاط کی مصروفیت بڑھ گئی تھی۔ دن رات نگار کی دیکھ بھال میں لگی رہتی۔ اسے وقت پر دودھ پلانے کا خیال رکھتی اس کی نیند میں خلل نہ پڑنے دینے کی خاطر کمرے میں مکمل خاموشی رکھتی۔ اس کی ضرورت کی ہر چیز گھر میں میسر کر لی گئی تھی پھر بھی کبھی رجب، کبھی خود نشاط اور کبھی دونوں اس کے لیے کوئی نہ کوئی نئی چیز خرید لاتے۔ ننھی نگار ان دونوں کے لیے مرکزِ قلب و نگاہ اور محورِ حیات بن گئی تھی۔

ماں کی طرف سے پہلے بچی کی تصویر بھجوانے کی فرمائش آئی۔ نشاط نے حسبِ عادت اس خط کو پھاڑ کر ڈسٹ بن میں نہیں ڈالا...... شاید خود ماں بن کر اسے دوسرے کی ماں کے دلی جذبات کا لحاظ کرنا بھی آ گیا تھا۔

رجب علی نے پہلی فرصت میں بچی کی چند تصویریں کیمرے سے لیں اور دھلوا کر ماں کو ارسال کر دیں اور ساتھ ہی نشاط کے گھر والوں کو بھی۔

"ہو بہو تیری شکل ہے۔" ماں اور آپا کا مشترکہ خیال ریحانہ کے لکھے خط کے ذریعے رجب کو موصول ہوا۔

لیکن نشاط کو اس خیال سے اتفاق نہ ہو سکا۔ "یہ مجھ پر گئی ہے۔" اس نے کہا۔

"تمہاری بیٹی ہے، تم ہی پر جانا تھا اسے۔" رجب علی نے اختلاف میں پڑنے سے گریز کیا۔

☆☆☆

رجب نے نئی گاڑی خرید لی۔ نگار کی پیدائش کے بعد اچھی گاڑی ضرورت بن گئی تھی۔ مکان خریدنے کے لیے قرض لی گئی رقم کی اقساط میں ادائیگی ابھی جاری تھی، اخراجات بڑھ گئے تھے لیکن رجب خوش تھا کہ وہ بیوی اور بچی کی تمام ضروریات پوری کر سکتا تھا۔ بیوی اور بچی کے لیے محنت کر کے انہیں سہولیاتِ زندگی فراہم کرنا اس کی اوّلین ترجیح تھی۔

ماں فرمائش کر رہی تھی کہ وہ بچی کو ان سب کو دکھانے کے لیے پاکستان لے کر آئے۔ ویسے بھی اسے شادی کے بعد پاکستان سے آئے چوتھا برس تھا۔ ماں خود رجب کو دیکھنے کو بھی ترس رہی تھی۔

"آپ کی اماں تو انگلینڈ سے پاکستان جانا آنا مذاق سمجھتی ہیں۔" نشاط نے کہا۔

"یار! ماں ہیں...... اپنی محبت سے مجبور۔ میں کام پر ہوتا ہوں تو بھی میرا دل اپنی چھوٹی سی گڑیا میں اٹکا رہتا ہے۔"

"مگر اپنی گڑیا کی محبت میں آپ اپنا کام چھوڑ کر تو نہیں بیٹھ جاتے نا۔"

"ہاں، بیچاری اماں کو کیا معلوم کہ ہم کیسی مشینی زندگی گزار رہے ہیں۔ کیا کچھ دیکھنا پڑتا ہے ہمیں، مورگیج ہے، گھر کی مینٹی ننس ہے، دوسرے بے شمار اخراجات ہیں۔"

"انہیں بتائیں نا۔"

"کوئی فائدہ نہیں، بیچاری پریشان ہو جائیں گی۔ اماں کو اپنی اولاد کی تکلیف بہت غمگین کر دیتی ہے۔"

"ہر ماں کا یہی مسئلہ ہوتا ہے۔ اولاد کی خاطر ماں کو قربانی دینی پڑتی ہے۔ مجھے یہاں آئے چوتھا سال ہے، میرے ماں باپ کو بھی میری یاد ستاتی ہو گی...... کبھی کہتے ہیں مجھ سے کہ ملنے آ جاؤ...... ؟ انہیں احساس ہے کہ آنا جانا آسان نہیں، آپ کے گھر والوں کو بھی یہ بات سوچنی چاہیے۔"

"تم گڑیا کا بتاؤ، آج کیا کرتی رہی؟" رجب نے موضوع بدل دیا۔

"وہی جو محترمہ روز کرتی ہیں...... رونا...... کھانا...... سونا...... میں تو اس کی میڈ بن کر رہ گئی ہوں، ہر وقت الرٹ رہنا پڑتا ہے۔"

"اللہ تعالیٰ نے یونہی تو نہیں رکھ دی ماں کے پیروں تلے جنت۔"

"ہم تو اپنی جنت پاکستان میں چھوڑ آئے۔"

"میں بھی۔" رجب علی نے زیر لب کہا۔

دن تو مصروفیت میں گزر جاتا لیکن رات کو جب وہ تھکے بدن کے ساتھ بستر پر لیٹتا تو کسی کسی دن اسے ماں، آپا اور بستی میں اپنے یار دوست بہت یاد آتے۔ ہزاروں میل دور وہ انہیں بس یاد ہی کر سکتا تھا۔

☆☆☆

نشاط نے پہلے کی طرح رجب کی ماں اور آپا کی طرف سے آنے والے خطوط کو تلف کرنا ترک کر دیا تھا۔ اب اس کی ضرورت ہی نہ رہی تھی۔ بیٹی کی پیدائش کے بعد تو رجب چاروں شانے اسی کا ہو چکا تھا۔ بہتر سے بہتر کی جستجو اسے نجانے کہیں سے کہیں دوڑائے جا رہی تھی۔ وہ اب انگریزوں کے لہجے میں انگریزی بولتا، گو قواعد کی پوری

ورنگی کے ساتھ نہ سہی۔ وہ جو کبھی شرمیلا سا لڑکا ہوا کرتا تھا، اب پورے اعتماد سے لوگوں سے بات کرتا۔ وقت، حالات اور زندگی انسان کو کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں، بہت کچھ سکھا دیتے ہیں بشرطیکہ سیکھنے کی امنگ ہو۔ رجب میں یہ امنگ بدرجۂ اتم تھی۔

انسان اپنے قریبی لوگوں سے تو بہت کچھ سیکھتا ہی ہے، کبھی کبھی کوئی غیر، گھڑی دو گھڑی کو ملنے والا کوئی اجنبی، کوئی ہمسفر بھی گر کی بات سکھا جاتا ہے۔

برسوں پہلے کی بات تھی، ریلوے اسٹیشن پر ایشفورڈ سے لندن جانے والی ٹرین کا انتظار کرتے ہوئے ایک معمر شخص رجب کے پاس آ کر بیٹھا، ہیلو ہائے کی، پوچھا کہاں سے آئے ہو؟ جواب ملنے پر بولا۔ ''گزشتہ برسوں میں تم جیسے بے شمار نوجوان برطانیہ آئے ہیں مگر میرا خیال ہے ان میں سے بہت سوں کو اس بات کا ادراک نہیں کہ وقت سوکھی ریت کی طرح انسان کی مٹھی سے پھسلتا ہے اور جب انسان پیچھے پلٹ کر دیکھتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ عمر گزر گئی، ہاتھ کچھ نہیں آیا۔ ہوتا تو وہی ہے جو خدا چاہتا ہے مگر آدمی کے پاس زندگی کا کوئی پروگرام ہونا چاہیے۔ کیا کرنا ہے، کیا نہیں اور کب کرنا ہے۔ تمہاری عمر کے نوجوان کو چالیس سال کی عمر کو پہنچنے تک ویل سیٹ ہونا چاہیے اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب اسے معلوم ہو کہ کیا کرنا ہے اور کب کرنا ہے۔ ہمت وروں کی تقدیر خدا بدل دیتا ہے۔''

دنیا کے مختلف خطوں سے بڑی تعداد میں تارکینِ وطن کی برطانیہ آمد کے باعث مکانوں کے کرائے اور قیمتیں روز بروز بڑھ رہی تھیں۔ رجب علی چاہتا تھا موجودہ گھر کی مورگیج ادا ہوتے ہی وہ زیادہ بڑا اور بہتر گھر خرید لے۔ وقت گزرنے کے ساتھ مکانوں کی قیمتوں میں اور اضافہ ہو جانا یقینی تھا۔ یہ وقت تھا خود اپنے اور آئندہ نسل کے مستقبل کے لیے تگ و دو کرنے کا...... پھر تو ہاتھ پاؤں تھک جانے تھے، ہمت رفو چکر ہو جانی تھی اور بقول ایشفورڈ اسٹیشن پر ملنے والے معمر شخص کے، وقت سوکھی ریت کی طرح مٹھی سے پھسل جانا تھا۔ رجب علی پیچھے پلٹ کر دیکھنے پر سرخروئی کا احساس چاہتا تھا۔

☆☆☆

ماں کا خط آیا تھا۔ پھر وہی تقاضا، وہی اصرار...... ایک بار بچی کو مجھے دکھانے آجا۔ وقت کے ساتھ انسان کی خواہشات اور ترجیحات کتنی بدل جاتی ہیں۔ بعض دل کے سرد خانوں میں جا پڑتی ہیں، بعض کو انسان اپنی سانسوں میں گھول کر دل پر پتھر رکھ لیتا ہے۔ ماں نے اب کی بار رجب سے نہ جلدی واپسی کا وعدہ باندھ رکھا تھا، نہ اب وہ اسے حج پر لے جانے کا وعدہ یاد دلاتی تھی...... بس ایک ہی طلب تھی...... نگار کو دیکھنے کی۔

رجب نے ماں کے خط کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔ ماں کو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ اب وہ چھڑا چھانٹ نہیں تھا کہ سفری بیگ اٹھاتا اور چل پڑتا۔ بیوی تھی، بچی تھی، نوکری تھی، گھر بار تھا...... سیکڑوں کام تھے، اسے گھر بدلنا تھا، نیا فرنیچر اس گھر کے لیے خریدنا تھا، گاڑی ہوا سے تھوڑی چلتی تھی، اسے رواں رکھنے کے لیے اس کے پیٹ میں پیٹرول ڈلوانا پڑتا تھا۔ کرایہ داروں سے کرایہ بے شک نشاط کے پاس جاتا تھا مگر ان کے مسائل کا حل اسی کو نکالنا پڑتا تھا۔

پاکستان میں بیٹھی سادہ ماں کو کیا معلوم کہ پردیس میں نہ تو سڑکیں شیشے کی تھیں، نہ سڑکوں پر بقول یاران رجب پیسا بکھرا پڑا تھا۔ دن رات محنت کرنا پڑتی تھی، خونِ جگر جلانا پڑتا تھا، اپنا آرام اور نیند کا خمار پسِ پشت ڈالنا پڑتا تھا تب کہیں جا کر وہ اپنی بیوی اور بچی کو زندگی کی قدرے بہتر سہولیات فراہم کر پاتا تھا۔ خود اس کی اپنی ذات تو زندگی کی چکی کے دو پاٹوں کے بیچ پس کر کچھ سے کچھ ہو گئی تھی۔

رجب علی سمجھتا تھا دور بیٹھی ماں کو کچھ خبر نہیں مگر ماں کو سب خبر تھی۔ اس کا دل جو اس کے پردیسی بیٹے کے روز و شب کی مشقت سے جڑا تھا، وہ جانتی تھی رجب سڑکوں پر سے پیسا نہیں سمیٹ رہا تھا، محنت کر رہا تھا...... مشقت اٹھا رہا تھا۔

ماں نے اپنے خط میں ریحانہ سے جو کہ اب کالج میں پڑھ رہی تھی، لکھوایا۔ ''ماں صدقے! تو جو پیسے مجھے خرچے کے لیے بھیجتا ہے، میں بینک میں جمع کرا دیتی ہوں، کبھی خود جمع کرا آتی، کبھی کسی اور سے جمع کرا دیتی۔ ان پیسوں سے مجھے اپنی روٹی کا خرچ رکھتے بھی دل دکھتا ہے۔ پیسے کی خاطر ہی تو، تو مجھ سے دور چلا گیا...... تیری ماں کی طلب ہی کتنی ہے...... ایک روٹی صبح، ایک شام...... وہ اللہ دے رہا ہے۔'' اپنے اس خط میں ماں نے اس سے بچی کو دکھانے کے لیے پاکستان لے کر آنے کا تقاضا نہیں کیا تھا۔ شاید وہ سمجھ گئی تھی کہ رجب اس کی خواہش پوری نہیں کر سکتا۔

اس خط کے بعد ماں کی طرف سے کوئی خط نہیں آیا۔ وہ اس کا آخری خط تھا۔

آپا کا خط آیا جس میں انہوں نے رجب کو اطلاع دی تھی کہ ماں گزر گئی تھی۔ ایک شام جب ماں، ریحانہ سے

بات کر رہی تھی، اس نے ریحانہ سے کہا۔ ''اچھا بھلا رشتہ تھا، تو رونا پیٹنا نہ ڈالتی اور پڑھائی کا خبط نہ لیتی تو آج تین چار بچوں کی ماں ہوتی...... رجب کو بھی پیسا کمانے کی دھن نہ لگتی تو آج میرے گوڈے سے لگا بیٹھا ہوتا۔''

ماں کی بات پر ریحانہ نے کہا۔ ''دیکھ لو، ہم دونوں ہی کی زندگی بن گئی۔''

ماں نے کہا۔ ''میں دکھیاری ہوگئی۔'' بس اتنا کہہ کر ماں کو سانس چڑھ گئی...... لیٹ گئی اور زور زور سے ہائے ہائے کرنے لگی۔ اس کی آواز سن کر دوسرے کمروں سے بیٹے، بیٹیاں اور ان کے بچے ماں کے کمرے میں پہنچے تو اس کی آنکھوں کی پتلیاں چڑھ چکی تھیں اور منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ منجھلا بھاگ کر گیا اور نکڑ والے ڈاکٹر کو بلا لایا۔ ڈاکٹر نے [illegible] پر اپنا آلہ لگا کر دل کی دھڑکن سننا چاہی...... مگر ماں [illegible] ہو چکی تھی۔

رجب علی تا[illegible] آنسو بہاتا رہا۔

ماں چلی گئی تھی ہمیشہ کے لیے، دوبارہ کبھی نظر نہ آنے کے لیے۔ وہ اسے حج [illegible] نہیں لے جا سکا تھا...... وہ نگار کو اسے دکھانے نہیں لے جا سکا تھا...... زندگی کتنی ظالم ہے، انسان کو کبھی کبھی بلکہ اکثر ہی کتنا مجبور اور بے بس کر دیتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی تمناؤں اور آرزوؤں پر [illegible] بٹھا کر۔

روٹی جو کبھی رجب کو زندگی کی سب سے بڑی آسائش لگا کرتی تھی، اب اس کے کچن میں وافر موجود تھی بلکہ نوع بہ نوع بھی...... بریڈ، بن، فرنچ بریڈ، کروسون، کیک...... مگر وہ ہستی اب اس دنیا میں نہیں رہی تھی جو کبھی آپا اور کبھی منجھلی کے گھر سے بھجوائی گئی دو روٹیوں میں سے ایک بلکہ کبھی تو دونوں ہی اس کے لیے اٹھا رکھتی تھی...... آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے۔

نشاط چپ چاپ اسے اپنی اماں کی رحلت پر گریہ کناں دیکھتی رہی۔ اپنی کسی عزیز ہستی کی موت انسان کو کتنا رنجور اور دل کو پارہ پارہ کر دیتی ہے۔

☆☆☆

صدمہ کتنا ہی بڑا ہو، بالآخر انسان مفاہمت کر لیتا ہے۔ رجب علی کو بھی ماں کی موت کے صدمے سے مفاہمت کرنا پڑی مگر ماں کو حج پر نہ لے جا سکنے کی خلش پھانس کی طرح اس کے دل میں اٹک کر رہ گئی۔

ماں کے بعد آپا تھی جس سے رجب علی کا دل بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ جڑا ہوا تھا۔ آپا سے اس نے ایک بار کہا بھی تھا۔ ''مجھے لگتا ہے تم ہی میری ماں ہو۔''

آپا نے اس کا بہت خیال رکھا تھا، اس سے پیار بھی کیا تھا، تربیت بھی کی تھی، اچھا برا سمجھایا تھا، ضرورت محسوس کرنے پر اس کی ٹھکائی بھی کی تھی۔ تپلی کے ساتھ حیدرآباد جانے اور وہاں سے دوبارہ گھر واپس آنے پر آپا کے ہاتھوں دھنائی کا قصہ اس نے نشاط کو بھی سنایا تھا۔

برطانیہ آنے کے بعد جب وہ دوبارہ پاکستان گیا تو ایک روز اس نے آپا سے کہا تھا۔ ''تم نہ ہوتیں تو میں جواری، شرابی، چور، ڈاکو بن گیا ہوتا۔''

''کیوں؟'' آپا نے اسے تعجب سے دیکھا۔

''بستی کا ماحول ہی ایسا تھا آپا...... اوپر سے گھر میں ہر وقت بھائیوں کی طرف سے کبھی گالیاں پڑتیں، کبھی مار...... میں گھر سے نکل کر مارا مارا پھرتا تھا۔ تمہیں یاد ہے، تم نے مجھے ایک روز بالا کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر پکڑ لیا تھا اور گھر لا کر میرے کان مروڑے تھے۔ میں نے اس دن تمہیں آدھی بات بتائی تھی۔ وہ کہتا تھا میرے ساتھ مل جا، دونوں رات کو گھروں میں چوریاں کیا کریں گے۔ تو گھر کے باہر کھڑا رہ کر پہرا دینا، میں اندر جا کر گھر والوں کو بے ہوشی کی دوا سنگھا کر صفایا کیا کروں گا...... تین حصے میرے، ایک حصہ تیرا۔''

''اس کا جائے ستیاناس۔'' آپا بولی۔

''تم نے مجھے چور کا ساتھی بننے سے بچا لیا آپا!''

''اس نے بچایا۔'' آپا نے نہایت عاجزی سے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی۔

بیتے دنوں کی کیسی کیسی یادیں بسی تھیں رجب علی کے دل میں...... اور [illegible] کا دل نئی یادوں کا مسکن بنتا جا رہا تھا۔ نگار کی ایک ایک حرکت [illegible] اس کا بتدریج بڑا ہونا، غوں غاں سے ماما، ڈاڈا پر آنا [illegible] بیٹھنا، چلنا...... اٹک اٹک کر اپنا مفہوم بیان کرنا...... ادھورے، مبہم جملے، اس کی دل آویز مسکراہٹ، جلترنگ سی ہنسی...... چھوٹی چھوٹی شرارتیں، دروازے کے پیچھے چھپنا اور کہنا...... مجھے ڈھونڈ [illegible]!

نگار ڈھائی برس کی تھی جب طیب پیدا ہوا۔ بیٹے کا باپ بن کر رجب کے پاؤں زمین پر نہ تھے۔ ''نگار بڑی ہو کر اپنے دولہا کے گھر چلی جائے گی، یہ ہمارے ساتھ رہے گا۔'' وہ نشاط سے کہتا۔

وقت کو پر لگ گئے تھے۔ نشاط برطانیہ میں رہ کر ایسی مگن تھی کہ پاکستان جانے کا نام ہی نہ لیتی۔ پاکستان سے آنے والے خطوط میں بڑی خبر ریحانہ کا بی اے کر کے ایک

انگریزی اسکول میں ٹیچر بھرتی ہوجانا تھی۔ رجب علی نے اسے تہنیتی کارڈ ارسال کیا۔

انہی دنوں سلاؤ کی ایشیائی برادری میں ایک ایسا سانحہ ہوا جس نے لوگوں کو خوف کے ساتھ تجسس میں بھی مبتلا کردیا۔ کشمیرا سنگھ کا ایک ہندو دوست اشوک جو اسی علاقے میں اپنی جوان بیوی اور تین بچوں کے ساتھ مقیم تھا، اس نے ایک رات سوتے میں اپنی بیوی کو قتل کردیا اور آلۂ قتل کے ساتھ خود ہی پولیس اسٹیشن جا کر بیوی کے قتل کا اقبال جرم کرلیا۔ علاقے میں کہرام مچ گیا، ایشیائی عورتیں اپنے ہی شوہروں سے خوف محسوس کرنے لگیں۔ اخبارات نے اس واقعے کی خبر بڑی سرخیوں کے ساتھ لگائی۔ پولیس نے اشوک سے وجۂ قتل دریافت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ اگل کر نہ دیا۔ اشوک کا بھائی انڈیا سے برطانیہ پہنچا اور اس کے تینوں بچوں کو اس نے ضروری کارروائی کے بعد انڈیا میں اپنے گھر بھجوا دیا اور خود بھائی کے مقدمے کی پیروی کے لیے یہیں رک گیا۔

اس واقعے کے بعد نشاط بھی دنوں خوفزدہ رہی۔ ایک روز رجب سے بولی۔ ''مجھے بھی آپ سے ڈر لگنے لگا ہے۔''

''کیوں؟'' رجب نے چونک کر پوچھا۔

''کسی روز اشوک کی طرح مجھے بھی نہ مار دیں آپ۔''

''تمہیں مار کر میں زندہ رہ سکتا ہوں بھلا۔ تم تو میری جان ہو...... دیو اور طوطے کی کہانی تو سنی ہوگی تم نے۔ جس طرح دیو کی جان طوطے میں تھی، میری جان تم میں ہے۔''

''سمجھ میں نہیں آتا اس نے تین بچوں کی ماں کو مارا کیوں۔ اس کی فیملی سے قریبی تعلق رکھنے والی عورتیں بتاتی ہیں کہ اشوک اور اس کی بیوی میں بہت پیار تھا۔''

''اشوک نے قتل کی وجہ نہیں قبولی مگر تھی کوئی بڑی بات...... کوئی ایسی بات جس نے اشوک کو مشتعل کردیا۔''

''بہرحال بہت برا ہوا۔ گوریاں بھی ڈر گئی ہیں۔ یہ جو ہمارے ساتھ والے گھر میں مسز تھامپسن رہتی ہے، کل دیوار کے اوپر سے جھانک کر بولی...... تم نے انڈین لیڈی کے قتل کا تو سنا ہے نا، میری سمجھ میں نہیں آتا ایک عورت سے زندگی کے رشتے میں بندھا مرد اس عورت کو کیسے مار سکتا ہے۔ جس عورت نے اپنا وجود اس مرد کو سونپ دیا تھا، اسے قتل کرتے ہوئے کیا اس شخص کو خوف، ہمدردی، رحم کچھ محسوس نہ ہوا ہوگا، کیوں اتنے بے حس ہوجاتے ہیں مرد؟''

''تم نے اسے یاد دلایا ہوتا کہ فوکسٹن میں اپنے شوہر کو قتل کرکے اس کے پارچے بنانے والی لارا کوئی مرد نہیں، عورت تھی جس نے اپنے شوہر فرانسس کو دوسری عورت سے تعلق کے شبہے میں نہایت بے رحمی سے قتل کردیا تھا۔''

''خدا بچائے۔'' نشاط نے جھرجھری لی۔

☆☆☆

پلاسٹک فیکٹری میں رجب علی کی ملازمت ٹھیک ٹھاک چل رہی تھی۔ اسے فیکٹری سے ملنے والی اجرت اور گھر میں مقیم کرایہ داروں سے حاصل ہونے والی آمدن سے گھر میں خوشحالی تھی۔ اللہ ہر ضرورت پوری کررہا تھا مگر رجب علی کی طبیعت میں قناعت نہ تھی۔ وہ بہتر سے بہتر کی تلاش اور زیادہ سے زیادہ کی جستجو میں رہتا۔

''مارس'' چاکلیٹ بنانے والی ایک مشہور زمانہ فیکٹری تھی۔ اپنے کارکنوں کو اجرت بھی اچھی دیتی۔ رجب علی کا معمول تھا ویک اینڈ پر اخبار ضرور لیتا۔ اخبار پڑھنا تو اسے کیا آتا، انگریزی بول لیتا تھا۔ یہی بہت غنیمت تھا۔ نشاط اسے اخبار میں ملازمتوں کے اشتہارات پڑھ کر سناتی۔ مارس میں مختلف اسامیوں کے لیے اخبار میں اشتہار آیا تو رجب علی بھی قسمت آزمانے کو پہنچ گیا۔ انٹرویو لینے والے افسر نے اس سے پوچھا۔ ''تم انگریزی لکھ پڑھ لیتے ہو؟'' رجب علی نے نفی میں جواب دیا۔

افسر نے شانے اچکاتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''ہمیں تو ایسے لوگ چاہئیں جو انگریزی صرف بول نہ سکتے ہوں، پڑھنا لکھنا بھی جانتے ہوں۔''

رجب علی کو مایوسی ہوئی مگر چند ہفتوں بعد دوبارہ مارس میں کارکنوں کی ضرورت کا اشتہار آیا۔ رجب علی دوبارہ مارس جا پہنچا۔ پرسنل افسر وہی تھا جس نے پہلی بار رجب کا انٹرویو لیا تھا۔ اس نے رجب سے کہا۔ ''مجھے یاد پڑتا ہے تم پہلے بھی آئے تھے؟'' رجب علی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پرسنل افسر بولا۔ ''ہماری شرط تو اب بھی وہی ہے جو پہلے تھی۔''

رجب علی کو پھر ناکامی ہوئی۔

اس نے نشاط سے انگریزی پڑھنا لکھنا سیکھنے کی بات کی تو نشاط نے اس کی بات کو غیر سنجیدہ لیا۔

''فیس لوں گی۔'' نشاط نے مذاقاً کہا۔

رجب نے دونوں ہاتھ باندھ کر کہا۔ ''ڈبل فیس دوں گا استانی جی!'' نشاط ہنس دی۔

رجب انگریزی کا ابتدائی قاعدہ خرید لایا اور نشاط نے اسے انگریزی پڑھنا اور ساتھ ساتھ لکھنا بھی سکھانا

شروع کر دیا۔

کچھ عرصے بعد مارس میں کام کرنے والوں کی ضرورت کا اشتہار پھر آیا۔ رجب علی پھر قسمت آزمائی کو جا پہنچا۔ پرسنل افسر وہی تھا۔ رجب کو پہچان کر قدرے ناگواری سے بولا۔ ”جب تمہیں پڑھنا لکھنا نہیں آتا تو اپنے ساتھ میرا بھی وقت ضائع کرنے کیوں آ جاتے ہو بار بار۔“

رجب علی اعتماد سے بولا۔ ”آپ بھی تو بار بار اشتہار دیتے ہو۔ جب تک آپ کی فیکٹری کا اشتہار آتا رہے گا، میں بھی آتا رہوں گا۔ تھوڑی تھوڑی انگریزی پڑھنا لکھنا سیکھ لی ہے میں نے، مجھے امید ہے ایک دن میں آپ کے معیار کے مطابق انگریزی پڑھنے لکھنے کے لائق ہو جاؤں گا۔“

پرسنل افسر دھیرے سے مسکرایا اور بولا۔ ”ہماری فیکٹری میں ملازمت کے لیے انگریزی پڑھنا، لکھنا آنا شرط ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ [illegible] اپنے ہدف کو حاصل کرنے کا عزم مصمم پڑھنے لکھنے کی اہلیت سے زیادہ قابلِ قدر خوبی ہے۔ تم کل سے کام پر آ سکتے ہو۔“

☆☆☆

مارس میں رجب علی کی نوکری کا نشاط اور بچوں نے خوب مزہ اٹھایا۔ رجب علی رعایتی قیمت پر فیکٹری سے چاکلیٹ لے آتا، نشاط اور بچے مزے لے لے کر کھاتے۔ زیادہ چاکلیٹ کھانے سے نشاط کا جسم فربہ ہو گیا۔ رجب علی اسے چھیڑتا۔ ”مٹلو! چاکلیٹ کم کھایا کرو ورنہ بھدی ہو جاؤ گی۔“

نشاط اٹھلا کر کہتی۔ ”جہاں جاتی ہوں لوگ رشک سے دیکھتے ہیں مجھے۔“ واقعتاً ایسا ہی تھا۔

سلاؤ میں ایشیائی تارکینِ وطن کی بڑی تعداد آباد ہونے کے باعث ان گھرانوں کا بہانے بہانے آپس میں ملنا جلنا رہتا تھا۔ خوشی، غمی اور تہواروں پر میل جول اور ضیافتوں کا سلسلہ رہتا۔ دوستوں کے ہاں کوئی پارٹی ہوتی یا ایشیائی برادری کی کوئی اجتماعی تقریب...... نشاط جہاں جاتی، اپنی دلکشی، غیر معمولی دراز زلفوں اور غضب کی جامہ زیبی کے باعث مرکزِ نگاہ بن جاتی۔

ماں کی موت کے بعد رجب علی تو اپنے دیس کا راستہ جیسے بھول ہی گیا۔ ماں کے بعد بس ایک آپا ہی رہ گئی تھی جس سے اسے قربت اور انسیت محسوس ہوتی۔ انہیں اور ریحانہ کو وہ کبھی کبھار پیسے بھجوا دیتا۔

طیب بھاگنے دوڑنے لگا تو نشاط نے اپنے گھر والوں سے ملنے کے لیے پاکستان جانے کی خواہش ظاہر کی۔ رجب علی بچوں کو ایک دن کے لیے بھی اپنے سے دور نہ کرنا چاہتا تھا مگر وہ نشاط کی پاکستان جانے کی خواہش میں مزاحم نہ ہوا۔ شادی کے بعد برطانیہ آنے پر وہ یہیں کی ہو کر رہ گئی تھی۔ خاصا عرصہ ہو گیا تھا اسے اپنے گھر والوں سے دور آئے۔ ان سے ملنے کے لیے جانا اس کا حق بنتا تھا۔ دونوں بچوں کی سفری دستاویز بنوانے کے بعد اس نے جہاز پر بیوی اور بچوں کی نشستیں محفوظ کرائیں اور انہیں پاکستان جانے کے لیے روانہ کر دیا۔

نشاط گئی تھی آٹھ ہفتے پاکستان میں گزارنے کے ارادے سے مگر آب و ہوا اور پانی کی تبدیلی کے باعث دونوں بچے جاتے ہی بیمار پڑ گئے۔ دونوں کے پیٹ خراب، کھانسی اور بخار...... نشاط بیس بائیس دن پاکستان میں رہ کر واپس آ گئی۔

رجب کے بہن بھائی اس کے دونوں بچوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔ آپا نے خط میں لکھا۔ ”تیری بیٹی شہزادی ہے اور بیٹا شہزادہ۔ سارا محلہ تیرے بچوں کو دیکھنے امڈ آیا۔“

نشاط اور بچوں کی جلد واپسی سے رجب علی بہت خوش ہوا۔ اس کی دنیا، اس کی زندگی گویا نشاط اور دونوں بچوں کے دم سے تھی۔ وہ اپنی زندگی کے موجودہ روپ سے بہت مطمئن اور مسرور تھا۔ بیوی اور بچوں کے لیے حتی المقدور آسائشات ان کے قدموں میں ڈھیر کر دینا چاہتا تھا۔ اس کا گھر اس کے لیے جنت تھا اور اس جنت میں سکون ہی سکون تھا۔ وہ اکثر ہی دل میں سوچتا کہ ایسی آسودہ زندگی کا تو اس نے پاکستان میں بستی کی گلیوں میں رلتے ہوئے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔

بستی میں اس کے اور اس کے گھر والوں کے جو مسائل تھے، سو تھے، بہت سے لوگ برے برے حالات میں زندگی گزارتے تھے۔ عجیب بات تھی کہ برے سے برے حال میں رہنے والا بستی کا مکین بھی زندگی سے پیار کرتا، اسے محبوب رکھتا مگر کبھی مذاق ہی مذاق میں کوئی زندگی ہار بھی جاتا۔ اس حوالے سے نور احمد اسے اکثر یاد آتا تھا۔

نور احمد بستی کے بچوں کو قرآن مجید کی تعلیم دینے والی استانی جی کا اکلوتا بیٹا تھا۔ پستہ قد کا دبلا پتلا جوان تھا۔ مگر بہ مشکل بائیس تئیس سال ہو گی کہ استانی جی نے اس کی شادی کر دی۔ بہو دبلی پتلی نو عمر لڑکی تھی۔ شادی کا پہلا ہی سال تھا اور نور احمد کی بیوی امید سے تھی۔ نور احمد جو بازار میں چھابڑی لگایا کرتا تھا، شام کو اکثر تگن کی دکان کے سامنے

سرکاری گٹر کے ڈھکنے پر جمی لڑکوں کی چوکڑی میں اپنا دل بہلانے کو آبیٹھتا تھا۔ سادہ طبیعت کا نوجوان تھا، بے سرا تھا مگر چوکڑی کے تھپکی دینے پر کبھی رفیع، کبھی مکیش کا گایا ہوا گیت گانے لگتا۔ لڑکے اس کی بے سری آواز پر منہ چھپا چھپا کر ہنستے مگر بظاہر واہ واہ کرتے۔ نور محمد اس واہ واہ کو سچ سمجھتا۔ ایک روز شرط لگی کہ اگر چوکڑی میں بیٹھا کوئی جوان بکن کی دکان کے تختے پر دھری دو من دس سیر آٹے کی بوری کو [illegible] کا سہارا لیے بغیر اکیلا اپنی پیٹھ پر اٹھا لے تو باقی سب [illegible] اسے سیر بھر دودھ میں بھیگی ایک پاؤ جلیبیاں [illegible] کسی نے مذاقاً کہا۔ ''نور احمد ہمت کر، بھابی خوش ہو جائے گی جب تو سیر بھر دودھ میں بھیگی جلیبی گھر لے جائے گا۔'' [illegible] اس نے دکان کے تختے پر آگے ہی دھری آٹے کی [illegible] دو بوریوں میں سے ایک بنا کسی کی مدد کے اپنی پیٹھ پر [illegible] بوری پیٹھ پر اٹھاتے ہی اس کا منہ کھلا اور وہ دھڑ [illegible] گیا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکلا اور وہ گرنے کے بعد اٹھ نہیں [illegible] اس کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں...... جیسے وہ اپنے [illegible] جانے والوں سے پوچھتا ہو...... یہ کیسی شرط لگائی تھی [illegible]

کبھی کبھی کتنی چھوٹی چھوٹی شرطوں پر لوگ زندگی [illegible] انمول نعمت ہار جاتے ہیں۔

نور احمد کی طرح سیوا سنگھ بھی رجب علی کو اکثر یاد آتا تھا۔ بیچلرز میں کام کیا کرتا تھا، پختہ عمر کا آدمی تھا، انتہائی شریف النفس۔ رجب علی سے بہت پہلے برطانیہ آیا تھا۔ جب رجب علی نے بیچلرز میں نوکری شروع کی تو سیوا سنگھ اپنا گھر خرید چکا تھا۔ اس نے انڈیا سے اپنی بیوی اور بچوں کو برطانیہ بلایا۔ جن دنوں رجب علی سلاؤ منتقل ہونے کی تیاری کر رہا تھا، سیوا سنگھ اپنا گھر فروخت کر کے بال بچوں سمیت کارڈف چلا گیا۔ یار دوستوں سے اس کی خبریں ملتی رہیں...... پھر ایک روز پتا چلا اولاد کی غلط حرکات سے تنگ آ کر سیوا سنگھ نے خودکشی کر لی۔

☆☆☆

مارس فیکٹری میں ایک سکھ آپریٹر چرن سنگھ کی عادت تھی کہ مسلمان کارکنان کو ان کے نام کے بجائے ''اوئے مصلی'' کہہ کر مخاطب کرتا۔ رجب علی نے اسے ایک بار ٹوکا کہ وہ نہ صرف اسے بلکہ دوسرے مسلمان کارکنوں کو بھی اس طرح مخاطب نہ کیا کرے۔ ٹوکنے پر بجائے باز آنے کے، چرن سنگھ پہلے سے زیادہ استہزائیہ لہجے میں رجب کو ''اوئے مصلی'' کہہ کر مخاطب کرنے لگا۔

ایک روز جب اس نے رجب علی کو اسی طرح مخاطب کیا تو رجب اس پر پل پڑا۔ اس کے چہرے، سینے اور بازوؤں پر اتنے گھونسے مارے کہ چرن سنگھ کا ہونٹ پھٹ گیا، ناک سے خون جاری ہو گیا اور سینے پر بھی شدید ضرب لگی۔ دوسرے لوگوں نے رجب علی کو بہ مشکل قابو کیا۔ چرن سنگھ کو فیکٹری کے میڈیکل روم میں لے گئے اور رجب علی کو افسران کے روبرو پیش کر دیا گیا۔ پوچھ گچھ ہوئی۔ رجب علی سے اس قدر طیش میں آنے کی وجہ دریافت کی گئی جو اس نے بتا دی۔

پرسنل افسر جس نے رجب علی کو انگریزی پڑھنے لکھنے کی صلاحیت نہ ہونے کے باعث دو مرتبہ ملازمت دینے سے انکار کیا تھا اور اس کے عزم کو دیکھتے ہوئے تیسری بار اسے ملازمت دے دی تھی، رجب علی سے بولا۔ ''تم نے اتنی مشکل سے یہ ملازمت حاصل کی اور ذرا سی دیر میں اسے کھو دینے کا موقع فراہم کر دیا۔ تم اس ملک میں کام کرنے کے لیے آئے ہو یا دوسروں سے جھگڑنے کے لیے؟''

''کام کرنے۔'' رجب علی سر جھکا کر بولا۔

''تو پھر کام سے کام رکھو۔'' پرسنل افسر نے درشت لہجے میں کہا۔

''آپریٹر ہم مسلمانوں کو مصلی بولتا ہے۔'' رجب علی [illegible]

[illegible] افسر بھبکا۔ ''یہاں تو کوئی تمہیں کالا ہونے کا طعنہ دے گا، کوئی پاکی کہے گا...... کس کس سے لڑو گے، کس کس کو مارو گے؟''

''آفیسر!'' رجب علی دھیمے لہجے میں گویا ہوا۔ ''یہ عزت نفس کا نہیں، احترام [illegible] کا معاملہ ہے۔ میں مسلمان ہوں، جب ہم مسلمان کسی دوسرے مذہب والے کا مذاق نہیں اڑاتے تو دوسرے کو بھی یہ اجازت نہیں [illegible] ہمارے مذہب کے حوالے سے طنز یا حقارت کا نشانہ بنائے۔''

پرسنل افسر نے رجب علی کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے شانے اچکائے اور بولا۔ ''بہرحال تم نے کام کے سلسلے میں ہمیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ فی الحال تو افسرانِ بالا نے تمہیں فوری طور پر ملازمت سے فارغ کر دینے کا حکم دیا ہے مگر میں تمہارے لیے ایک اور موقع کی سفارش کروں گا۔ اگلے چھ ماہ کے دوران اگر تمہارا فیکٹری سے باہر بھی کسی سے لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا تو تم آنا، میں تمہیں دوبارہ ملازمت دے دوں گا۔''

''شکریہ۔'' رجب علی اپنا دایاں ہاتھ سیلوٹ کرنے

والے انداز میں پیشانی تک لے گیا اور بولا۔ ''آپ آپریٹر کو بھی سمجھا دیں کہ وہ کسی مسلمان کی تضحیک سے باز رہے ورنہ آج اس کے منہ اور ناک سے خون بہا ہے، کل اس کا چہرہ بھی نہیں پہچانا جائے گا۔ ہم مسلمان اپنے مذہب سے اپنی جان سے بڑھ کر پیار کرتے ہیں۔''

''مارس'' سے نکلنے کے بعد رجب علی نے دوبارہ اس فیکٹری کا راستہ نہیں دیکھا۔ خدا کی زمین بہت بڑی تھی اور رجب علی کا پاؤں ''پائے لنگ'' نہیں تھا۔ وہ محنتی تھا اور اپنا کام ایمانداری سے انجام دینے والا بھی۔ مارس چھوڑنے کے بعد اس نے ایک ریڈیو کنٹرول کار کمپنی میں بطور کار ڈرائیور ملازمت کرلی۔

ٹیکسی ڈرائیونگ دلچسپ کام تھا۔ ہر روز نئے راستوں پر جانا، سفر کبھی مختصر، کبھی طویل...... بھانت بھانت کے انسانوں سے رابطہ، [illegible] خاموشی سے، کبھی مسافر کی سنتے اور اپنی سناتے...... دنیا کے حالات سے آگہی، فہم و بصیرت میں مسلسل اضافہ۔ کمپنی کے طے کردہ مشاہرے کے علاوہ مسافروں کی طرف سے ٹپ یعنی بخشش بھی مل جاتی۔

رجب علی مسافروں سے اکثر خود ہی آغاز گفتگو کرتا، کبھی مزاج پوچھ کر، کبھی اس کی خوش لباسی کی تعریف کرکے، کبھی موسم کے تیوروں کے بہانے، کبھی برطانیہ کے سیاسی حالات کا موضوع چھیڑ کر، کبھی شاہی خاندان کے بارے میں کسی خبر پر مسافر کا مطمح نظر جاننے کے لیے۔ سفر مختصر ہوتا یا طویل، رجب علی نہ خود اکتاتا نہ مسافر پر اکتاہٹ طاری ہونے دیتا۔ کبھی کوئی بیزار دنیا مسافر بھی ٹکرا جاتا جو نہ خود زیادہ بولتا، نہ اس کی سننا گوارا کرتا لیکن اکثر ہلکی پھلکی بات چیت میں ہی مسافر کی منزل مقصود آجاتی اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رجب علی کو ٹپ دے جاتا۔ زیادہ آمدن کی خاطر رجب علی کمپنی کے لیے اوورٹائم کو بھی تیار رہتا۔

☆☆☆

طیب کے بعد نجف پیدا ہوا، نجف ابھی سال بھر کا تھا کہ درشہوار دنیا میں آگئی۔ بچوں کی تعداد بڑھنے پر رجب علی کو موجودہ گھر سے بہتر اور بڑا گھر لینے کی تحریک ہوئی۔ بڑے ہوتے بچوں کے لیے علیحدہ بیڈ روم ضروری تھا۔ نیا گھر خریدنے کے لیے موجودہ گھر کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم کے علاوہ کچھ رقم نشاط نے کرایہ داروں سے وصول شدہ کرایہ سے جمع کر رکھی تھی۔ کچھ بچت رجب علی کی آمدن سے تھی۔ مزید رقم کی ضرورت بھی پڑسکتی تھی...... اللہ مسبب الاسباب!

''مجھے ایسا گھر چاہیے۔'' نشاط نے اسے اتوار کے اخبار کے ساتھ ملنے والے سپلیمنٹ میں برائے فروخت ایک مکان کے اشتہار کے ساتھ چھپی مکان کی فرنٹ ویو شبیہ رجب علی کو دکھاتے ہوئے کہا۔

مکان ریڈنگ میں تھا، دومنزلہ...... چھ بیڈرومز پر مشتمل ولا، تین بیڈرومز اوپر، تین نیچے۔ قیمت رجب علی کے بجٹ سے زائد تھی۔

''یہی، کیوں نہیں۔'' اس نے نشاط کا دل رکھنے کو کہا۔

''سچ!'' وہ خوش ہوگئی۔ ''کرلیں بات۔''

رجب علی شش و پنج میں پڑ گیا۔

''سوچنے کیا لگے؟''

''ریڈنگ میں ہے۔''

''تو کیا ہوا، ریڈنگ کون سا کوئی کوسوں دور ہے، آدھ پون گھنٹے کا سفر ہے...... ولا ہے ولا...... بات کریں۔''

''کرلوں گا...... فون نمبر تو دیا ہوا ہے۔''

''پہلے جا کر دیکھ لیتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔''

رجب علی نے پہلے دیے گئے فون نمبر پر رابطہ کیا پھر نشاط کو ساتھ لے کر مکان دیکھنے گیا۔ نشاط تو ریجھ گئی۔

نشاط کوئی خواہش کرتی اور رجب اس کی خواہش پوری کرنے کی کوشش نہ کرتا، یہ کیسے ممکن تھا۔ مکان کی قیمت میں کچھ تخفیف کرا کے اس نے سودا کرلیا۔ وکیل کے توسط سے ٹوکن منی کی ادائیگی کرکے اس نے بقیہ رقم کی ادائیگی دو ماہ بعد ہونی تھی۔ ہنسلاؤ میں اپنا موجودہ مکان ایجنٹ کے ذریعے فروخت کے لیے لگا دیا۔ مورگیج سے وہ ممکنہ حد تک گریز چاہتا تھا۔

مکان بک گیا، [illegible] نئے مکان کی ادائیگی کا وقت سر پر تھا۔ ڈیڑھ ہزار پاؤنڈز کی مزید ضرورت تھی۔ رجب علی کسی سے قرضہ لینے کی فکر میں تھا کہ ایک روز اسے ریڈیو کنٹرول پر بیٹھی آپریٹر برنڈا نے ایک سواری کو ہنسلاؤ سے ایشفورڈ لے جانے کی جاب دی۔ وہ برنڈا کے بتائے گئے مقام پر سواری کو اٹھانے پہنچا تو پریتم سنگھ اس کے ساتھ آبیٹھا۔ رجب علی کو اپنی رگوں میں خون گرم ہوتا محسوس ہوا، اسی شخص کی وجہ سے تو اکبر علی نے اسے اپنے گھر سے نکالا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، رجب علی نے ناگواری سے اور پریتم نے ناخوشی سے۔ رجب علی کی مجبوری تھی کہ نوکری کا معاملہ تھا اور نہ وہ پریتم کو گاڑی میں بٹھاتا ہی نہ۔

چند لمحے خاموش گزرے پھر پریتم گویا ہوا۔ ''کیسے ہو؟''

رجب نے جواب نہیں دیا۔

''سوری یار! غلطی میری تھی، عورت کا نشہ برا ہوتا ہے، ذلیل کرا کے چھوڑتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تجھے بھی بھابی کے ساتھ اکبر علی کے گھر سے نکلنا پڑا۔''

رجب علی کے لبوں کو حرکت ہوئی۔ ''اس بہانے میرا اپنا گھر بن گیا۔''

پریتم نے اپنی طرز نشست ترچھی کر کے رجب علی کو دیکھا۔ ''... ہیں ہر شر میں کوئی خیر بھی ہوتی ہے۔ بہت اچھا ہوا ... اپنا گھر بنا لیا...... یارا! اپنا گھر بڑی نعمت ہے...... اور سنا بھابی کیسی ہے...... بچے شچے؟''

رجب علی نے بتایا ''... بچے ہیں، دو بیٹے، دو بیٹیاں۔''

پریتم بولا۔ ''... !''

رجب علی کی رگوں میں ... کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔

''الحمدللہ!'' اس نے خوش ہو کر ...

دونوں کی ایک دوسرے ... تو بے تکلفانہ باتیں ہونے لگیں۔ پریتم نے ... میں رہنے والے دو تین ساتھیوں کا جن سے وہ اب ... میں تھا، احوال سنایا۔ اکبر علی کے بارے میں بتایا کہ وہ مکان فروخت کر کے ویلز چلا گیا تھا، اس کا بھائی بھی ... تھا۔ ویلز میں دونوں بھائیوں نے ایک ہی گھرانے کی دو بہنوں سے شادی کر لی تھی، اس کے بعد کی کوئی خیر خبر نہ تھی۔

گئے دنوں اور آنے والے وقت کی باتیں ہوتی رہیں۔ ایشفورڈ پہنچنے سے قبل پریتم نے کہا۔ ''اپنا ایڈریس دو، دوبارہ سلاؤ آنا ہوا تو تم سے ملنے آؤں گا۔''

رجب علی نے اسے بتایا کہ جس گھر میں وہ ان دنوں رہ رہا تھا، اس کا سودا ہو چکا تھا۔ وہ ریڈنگ شفٹ ہونے جا رہا تھا جہاں وہ ایک مکان کا سودا کر چکا تھا۔ مکان کی پوری قیمت ادا کرنے میں بس کچھ رقم کی کسر رہ گئی تھی۔ ادائیگی کرتے ہی وہ ریڈنگ منتقل ہو جائے گا۔

''کتنی رقم اور چاہیے؟'' پریتم نے پوچھا۔

''ڈیڑھ ہزار پونڈز۔'' رجب علی نے بتایا۔

گاڑی ٹاؤن سینٹر پر رکوانے کے بعد پریتم نے اپنی جیب سے بٹوا نکال کر کرایہ ادا کرنا چاہا۔

''رہنے دے۔'' رجب علی بولا۔

''ٹیکسی کمپنی تیری ہوتی تو میں رہنے دیتا۔'' پریتم مسکرایا۔ کرایہ ادا کرنے کے بعد اس نے بٹوے میں موجود رقم میں سے کچھ رقم گن کر نکالی اور رجب علی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ رکھ لے۔''

رجب نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ ''کس لیے؟''

پریتم نے رقم اس کی مٹھی میں دبانے کی کوشش کی۔ ''ڈیڑھ ہزار پونڈز ہی کم ہیں نا تیرے پاس مکان کی پیمنٹ کرنے کو۔''

رجب علی دم بخود رہ گیا۔ ''نہیں پریتم! میں نے تمہیں اس لیے تھوڑی بتایا تھا۔''

پریتم نے اپنا ہاتھ رجب کے کندھے پر رکھ دیا۔ ''میری خوشی ہے یارا! تو نے نہ لیے یہ پیسے تو میں سمجھوں گا تو مجھ سے اب تک ناراض ہے۔''

رجب علی ناقابلِ بیان کیفیت میں تھا۔ اس نے رقم لینے میں بہت تامل کیا مگر پریتم کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔ اسے پریتم کا احسان لینا پڑا۔ گاڑی واپس موڑنے سے پہلے اس نے پریتم سے اس کا پتا لینا ضروری سمجھا۔

واپس جاتے ہوئے رجب علی گومگو کیفیت میں تھا۔ پریتم کے اصرار پر اس سے بادلِ ناخواستہ رقم لینے پر اسے شرمندگی بھی ہو رہی تھی اور اپنے آپ پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ کیوں اس نے پریتم کو ڈیڑھ ہزار پونڈز کم ہونے کا بتایا۔ پریتم کا خیال حریف اور دشمن نہیں، دوست اور سجن کے طور پر ... کے دل میں اپنی جگہ بنا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پریتم کا قرضہ اتارنا اس کی اولین ترجیح ہوگی مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ پریتم کا احسان وہ کبھی نہیں اتار پائے گا۔

☆☆☆

ریڈنگ ... نئے گھر کی خریداری تکمیل کو پہنچی۔ نشاط بہت خوش تھی، گھر ... آنا شروع ہو گئے۔ رجب علی کو جلد سے جلد پریتم کی ... رقم واپس کرنے کی فکر تھی۔

پریتم کے احسان نے اسے اس حقیقت سے آگہی دی تھی کہ کسی کے خلاف ہمیشہ کے لیے رنجش دل میں ... کر اس سے دشمنی باندھ لینا کوئی اچھی بات نہیں ہوتی۔ سلاؤ میں اس کے کتنے دوست تھے جن سے اس نے مکان کے لیے قرضہ لینے کی بات کی تھی۔ سب کی سب کسی نہ کسی بہانے کنی کترا گئے ... اور جس شخص کو وہ اپنے دل میں دشمن کی جگہ دیے ہوئے ... وہ دوست ثابت ہوا تھا۔ زندگی بھی کیا کیا رنگ دکھاتی ہے۔

پریتم کا قرض اتارنے کے لیے اس نے دو ماہ کے اندر اندر رقم جمع کر لی اور ایک روز ایشفورڈ جا کر نہایت احسان مندی کے اظہار کے ساتھ اس کا دیا ہوا قرض ادا کر آیا۔

قرضہ اتارنے کے بعد وہ نئے گھر کی تزئین و آرائش

پر متوجہ ہوا۔ کام سے گھر واپس آتا تو گھر کی آرائش میں لگ جاتا۔ کبھی نئی، کبھی استعمال شدہ چیزیں خرید کر لاتا اور ان سے گھر کی آرائش کرتا۔ گھر کے ہر حصے میں اس نے خود ہی دبیز قالین اور غالیچے بچھائے، مضبوط اور آرام دہ نیا فرنیچر ڈالا، دیدہ زیب آرائشی اشیا سے گھر کا چپا چپا سجا دیا۔

نشاط اسے گھر کی تزئین میں دیوانہ وار مصروف دیکھ کر بار بار ٹوکتی۔ ''بس کریں، تھکے ہوئے گھر آتے ہیں اور کام میں لگ جاتے ہیں۔''

''کیوں بس کروں...... تھکنا تو میں نے سیکھا ہی نہیں۔'' رجب علی کہتا۔

''بہت سجالیا آپ نے تاج محل، اب بس بھی کریں۔'' ایک روز نشاط نے اسے کام کے دوران چائے کا مگ تھماتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔'' رجب علی اسے والہانہ محبت سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنی ممتاز محل کے لیے تاج محل ہی تو سجا رہا ہوں۔''

نشاط قہقہہ بار ہوئی پھر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

''جان کی امان چاہتی ہوں عالم پناہ!''

''آپ تو ہماری جان ہیں...... جان شاہ جہاں!'' رجب نے فلمی انداز میں کہا۔ ''ایک دن ہم آپ کے ساتھ محبت کی یادگار تاج محل دیکھنے ضرور جائیں گے۔''

نشاط پھر ہنسی۔ ''بہت سر پھرے ہیں آپ...... جب کام کی دھن سوار ہو جائے، بس ہو جاتی ہے۔''

''میرا بس چلے تو میں دنیا کی ہر نعمت تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں۔''

''اب بھی کیا کمی ہے، بہت خوش قسمت ہوں میں جو آپ سے میری شادی ہوئی ورنہ......!'' نشاط نے اپنی بات نامکمل چھوڑ دی۔

''ورنہ......؟'' رجب نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

نشاط کچھ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''جب صدیقی انکل اور آنٹی نے امی، ابو سے میرے لیے آپ کے رشتے کی بات کی تو امی بہت ناراض ہوئیں کہ کہاں میری بیٹی اور کہاں وہ بستی کا لڑکا...... انگلینڈ چلا گیا ہے تو کیا، ہمارا اور اس کے گھرانے کا کوئی جوڑ نہیں۔ صدیقی انکل نے کہا...... میں لڑکے کی شرافت کی پوری ضمانت لیتا ہوں۔ آپ کی بیٹی، میری بیٹی ہے۔ میں اپنی بیٹی کے لیے آپ کو کوئی غلط رشتہ کیسے بتا سکتا ہوں...... آج میں سوچتی ہوں صدیقی انکل کتنے صحیح تھے...... آپ سے میری شادی نہ ہوئی ہوتی تو میں سخت نقصان میں رہتی۔''

''اور اگر تم سے میری شادی نہ ہوئی ہوتی تو میں تم سے بھی زیادہ نقصان میں رہتا۔''

☆☆☆

رجب ایک روز کام سے واپس آیا تو نشاط نے بتایا، گیزر میں کچھ خرابی ہوگئی ہے۔ کسی مرمت کار کو بلانے سے پہلے رجب نے خود ہی گیزر کا نقص پکڑنے کو گیزر کھولا۔ نگار اس کے پاس آ کھڑی ہوئی اور بار بار اس کی پتلون کا پائنچہ پکڑ کر کہتی۔ ''ڈیڈ! پہلے میری بات سنیں۔''

رجب جو کام سے تھکا ہوا آیا تھا اور گھر آتے ہی کام میں لگ گیا تھا، پہلے تو نگار کو نظر انداز کرتا رہا پھر جھنجلا کر اسے پرے دھکیلتے ہوئے بولا۔ ''کام کرنے دو۔'' وقت کی بات تھی، ہلکے ہاتھ سے دھکیلنے پر نگار اوندھے منہ جا گری اور بلک بلک کر رونے لگی۔ رجب علی نے پلٹ کر دیکھا تو اس کے ہونٹوں سے خون نکلتے پایا۔ گیزر کو کھلا چھوڑ کر وہ نگار کی طرف لپکا۔ اس کا اپنا دانت ہونٹ میں کھب جانے سے ہونٹ زخمی ہوگیا تھا تاہم زخم زیادہ گہرا نہ تھا کہ اسپتال لے جانے کی ضرورت ہوتی۔ رجب علی نے اس کا ہونٹ پونچھ کر گھر میں موجود گلیسرین لگادی اور اسے بہلانے کو پوچھا۔ ''میری بیٹی کو کچھ چاہیے؟'' نگار نے اثبات میں سر ہلایا اور بولنے والی گڑیا کی فرمائش کی۔

رجب علی اسی وقت نگار کو ساتھ لے کر شاپنگ سینٹر گیا اور اسے ٹاکنگ ڈول دلوا کر واپس لوٹا۔

نشاط ہنس کر بولی۔ ''ایک دھکا دے کر مجھے بھی گرا دیں اور میری فرمائش بھی پوری کر دیں۔''

رجب علی نے قدرے خجالت سے کہا۔ ''اتفاق کی بات ہے، نگی کر گئی...... میں نے اسے دھکا تھوڑی دیا تھا، ہٹانے کی کوشش کی تھی...... تم میرے دل کی ملکہ ہو...... بولو، کیا چاہیے؟''

''مسز پانڈے بتا رہی تھیں سلائی کی نئی مشین پچ اینڈ سیو آئی ہے جو خوبصورت ڈیزائن بھی بناتی ہے۔ مشین دلوا دیں تو میں باہر سے اپنے اور بچوں کے کپڑے سلوانے کے بجائے خود ہی سی لیا کروں گی۔''

اگلے دن جب رجب کام سے واپس آیا تو نشاط کی فرمائش کردہ سلائی مشین لے آیا تھا۔ نشاط بہت خوش ہوئی، اترا کر بولی۔ ''اسی لیے تو میں کہتی ہوں کہ میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے آپ جیسا شوہر ملا ہے۔''

انہی دنوں نشاط کی ایک سہیلی انعم برطانیہ آئے اپنے ایک کزن سے شادی کے بعد پاکستان سے برطانیہ آئی اور

ناٹنگھم میں مقیم ہوئی۔ نشاط نے رجب سے صلاح کر کے ایک روز انعم اور اس کے شوہر کو اپنے گھر مدعو کیا۔

انعم اور اس کا شوہر نشاط کے ٹھاٹ باٹ اور گھر کی وسعت اور آرائش و تزئین سے بہت مرعوب ہوئے۔

''نشاط! تم تو مہارانیوں کی طرح رہ رہی ہو۔'' انعم نے رشک سے کہا۔

''رجب کی محنت اور محبت کی بدولت۔'' نشاط نے کہا۔

کوئی کہہ سکتا تھا کہ پاکستان کی ایک پسماندہ بستی میں گاؤں اور میلے حلیے میں پھرنے والا رجب علی اپنی بیوی اور بچوں کو ایسی پُرآسائش طرز زندگی فراہم کر سکے گا؟ پاکستان میں بیٹھے اس کے دونوں بھائی تو آج بھی ''ہینڈ ٹو ماؤتھ'' تھے البتہ آپا نے تعلیم حاصل کر کے اور آپا نے تعلیم کی اہمیت کو سمجھ کر اپنے بچوں کو تعلیم دلواتے ہوئے زندگی کے نقش و نگار کچھ بہتر سنوارنے کی کوشش کی تھی۔

آج رجب علی جب اپنے گھر کے کچن میں رکھے جہازی سائز فریج کو کھولتا تو اسے نوع بنوع اشیائے خورونوش سے بھرا دیکھ کر اس کے دل میں ہوک سی اٹھتی۔ ایک وقت تھا کہ وہ روٹی کی طلب میں رہا کرتا تھا۔ ماں اس کے لیے روٹی یوں بچا اور چھپا کر رکھتی جیسے روٹی نایاب شے تھی۔ ماں زندہ رہی ہوتی تو وہ اسے ایک مرتبہ تو اپنے ساتھ برطانیہ لا کر انہیں اپنا گھر اور کھانے پینے کی چیزوں سے بھرا فریج تو کھول کر ضرور دکھاتا...... ماں کو یہ اطمینان دلانے کے لیے کہ اس کے پیٹ کی کھرچن کا برا وقت گزر گیا تھا، زندگی ایسی حسین ڈگر پر آ گئی تھی جس کا اس نے تصور تو کجا، کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک آرام دہ گھر، پرکشش اور دلربا بیوی اور چار خوبصورت بچے۔ وہ اٹھتے، بیٹھتے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتا۔ نماز کے لیے کھڑا ہوتا تو اس کا پیشانی سے نہیں، آنکھوں سے سجدہ ریز ہونے کو جی چاہتا۔ خدا نے اسے اتنا نواز دیا تھا کہ اب اسے اور کی طلب نہیں تھی۔

اسے معلوم نہ تھا کہ آنے والا وقت اپنے دامن میں اس کے لیے کیسی آزمائش لا رہا تھا۔

☆☆☆

رجب علی کے نئے گھر میں مقیم کرایہ داروں میں مسلمان، ہندو، سکھ اور عیسائی، چاروں مذاہب کے پیروکار شامل تھے۔ رجب علی کی یوں تو ان سب سے ہی ہیلو ہائے رہتی مگر ہم مذہب ہونے کی وجہ سے غیاث الدین اور نبیل رؤف سے اسے زیادہ قربت اور ہم آہنگی محسوس ہوئی۔ غیاث الدین اور رجب ویک اینڈ کے دنوں میں باجماعت نماز کی ادائیگی کے لیے اکثر اکٹھے ہی قریبی مسجد جاتے۔ غیاث الدین اپنی عمر رسیدگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نبیل کو بھی بشرط گھر میں اس کی موجودگی، نماز کے لیے ہمراہ لے لیتے۔

غیاث الدین پچاس پچپن کے پیٹے میں تھے۔ بے شمار تارکین وطن کی طرح وہ بھی معاش کی خاطر پردیس میں تھے۔ بیوی لاہور کے ایک سرکاری اسکول میں ٹیچر تھیں، تین بیٹیاں تھیں۔ انہیں ان کے گھر بار کا کرنے کے لیے سرمایہ درکار تھا، سو غیاث الدین پردیس چلے آئے تھے اور ایک فیکٹری میں ملازمت کر رہے تھے۔ ایک بیٹی کی شادی کر دی تھی۔

نبیل رؤف جوان تھا، راولپنڈی سے آیا تھا۔ اس کے بہت سے رشتے دار بھی معاش کے سلسلے میں برطانیہ آ چکے تھے۔ نبیل ایک ریسٹورنٹ میں کام کرتا تھا۔ گوروں کے ساتھ بہت دوستی رکھتا، بود و باش میں انہی کی نقالی میں رہتا۔ دین سے اسے کچھ خاص لگاؤ نہ تھا۔ غیاث الدین کی ترغیب پر کبھی کبھی شرما حضوری نماز کے لیے ساتھ چلا جاتا ورنہ اکثر بہانے سے اِدھر اُدھر ہی کھسک جاتا۔

رجب کی غیاث الدین سے بصورتِ فرصت اچھی گپ شپ رہتی۔ وہ اپنی سناتے، رجب اپنی کہتا۔ غیاث الدین کی دینی معلومات سے رجب پورا استفادہ کرتا۔ معاشی مصروفیت کے علاوہ غیاث الدین کا بیشتر وقت قرآن حکیم کا ترجمہ و تفسیر یا دینی کتب پڑھنے میں گزرتا۔ باریش تھے اور نہایت نیک طبع۔

اپنی برطانیہ آمد کا قصہ ایک روز انہوں نے رجب کو کچھ یوں سنایا کہ لاہور میں وہ ایک سرکاری ادارے میں بابو تھے۔ ادارے کا افسر بھی نہایت بدتمیز اور راشی تھا، ماتحتوں کے ساتھ اکثر گالم گلوچ سے پیش آتا۔ غیاث الدین اسے سخت ناپسند کرتے اور اللہ سے دعا کرتے کہ اس بدتہذیب افسر سے نجات دے کر انہیں کسی بہتر جگہ پر پہنچائے۔ ان کے ایک ساتھی نے برطانیہ جانے کی کارروائی ڈالی تو وہ بھی اس کے ہم رکاب ہو گئے۔ ایسی آسانی ہوئی کہ ملازمت سے چند ماہ کی رخصت لے کر برطانیہ آئے اور یہاں نوکری کر لی۔ پاکستان میں اپنی ملازمت سے فراغت لے لی۔

رجب علی کچھ دنوں سے نشاط کو الجھا الجھا دیکھ رہا تھا۔ ذرا سی بات پر وہ غصے میں آ جاتی، اکثر بچوں پر بھی چیخنے چلانے لگتی بلکہ کبھی ہاتھ بھی جڑ دیتی۔

ایک روز جب وہ سو رہا تھا، اس نے طیب کے پھوٹ پھوٹ کر رونے کی آواز سنی۔ وہ جاگ گیا اور بیڈ روم سے

نکل کر لیونگ روم میں پہنچا۔ طیب رو رہا تھا اور نشاط صوفے پر بیٹھی اسے گھور رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" رجب نے پوچھا۔

"میں نے مارا ہے۔" طیب کے کچھ بولنے سے پہلے ہی نشاط نے کہا۔

"کیوں؟"

"میری مرضی۔" نشاط ناگواری سے بولی۔

"کوئی وجہ تو ہوگی؟ بچوں کو بلاوجہ تو نہیں مارا جاتا۔"

"ماں ہوں اس کی، بلاوجہ بھی مار سکتی ہوں۔"

"ابھی تو چھوٹے ہیں، بڑے ہوجائیں گے اور بلاوجہ کیا، کسی وجہ سے بھی مارو گی تو معلوم ہے نا یہاں کیا ہوتا ہے؟"

"...... کریں گے...... پولیس کو بلالیں گے...... اور مجھے بچوں پر تشدد کا مجرم ٹھہرایا جائے گا...... یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ؟" نشاط ... بولی۔ اسے غصے میں دیکھ کر طیب رونا بھول گیا۔

"کیا ہوگیا ہے تمہیں؟" رجب نے طیب کا ہاتھ پکڑا اور نشاط کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

"پاگل ہوگئی ہوں۔" نشاط بھڑک کر بولی۔

"آرام سے...... بچہ تمہیں غصے میں دیکھ کر ڈر رہا ہے۔" رجب نے اپنا بازو نشاط کے کاندھوں پر دراز کرتے ہوئے کہا۔

نشاط نے اس کا بازو جھٹک دیا اور اس کے پاس سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ رجب نے اسے قدرے تعجب سے دیکھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر پھر اپنے پاس بٹھالیا۔ "میں دیکھ رہا ہوں تم کچھ عرصے سے ذرا ذرا سی بات پر غصے میں آنے لگی ہو۔ کیا بات ہے، گھر والے یاد آرہے ہیں؟"

"کوئی یاد آئے، آپ کو کیا۔" وہ تنکی سے بولی۔

"ایسا تو نہیں۔ مجھے تمہاری اور بچوں کی ذرا ذرا سی بات کی فکر رہتی ہے۔"

"ہونہہ!" نشاط نے اپنا سر جھٹکا اور اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "صبح سے شام تک آپ کے گھر اور بچوں کی دیکھ بھال میں لگی رہتی ہوں، کبھی توفیق ہوئی ہے آپ کو میرا حال پوچھنے کی؟"

"میں دل سے پیار کرتا ہوں تمہیں، تمہاری عزت کرتا ہوں...... میرے بچوں کی ماں ہو تم۔"

"بچوں کی ماں کو تعریف کی ضرورت بھی ہوتی ہے، کہیں جانا ہو، تیار ہوکر آپ کے سامنے آؤں...... کبھی تعریف نہیں کرتے...... حالانکہ ساری دنیا مجھے سراہتی ہے۔"

"میں تمہارا شوہر ہوں، تم تیار نہ بھی ہو تو بھی مجھے اپنے ہر روپ میں اچھی لگتی ہو۔"

"عورت تعریف بھی چاہتی ہے۔"

"مجھے اب شاعری سیکھنی پڑے گی اپنی پیاری بیوی کے قصیدے پڑھنے کے لیے۔" رجب مسکرایا۔

"بہت دیر ہوچکی۔" نشاط ناگواری سے بولی۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب کو چھوڑیں، اپنی غلطی مانیں۔ آپ نے مجھے ہمیشہ جاہل پاکستانی عورت سمجھا جس کا کام گھر کی دیکھ بھال، بچے پیدا کرنا اور انہیں پالنا پوسنا ہوتا ہے بس...... مجھے کبھی اتنی مہلت ہی نہیں دی آپ نے کہ میں اپنے بارے میں کچھ سوچ سکوں۔"

"کیسی باتیں کررہی ہو تم؟"

"حقیقت بیان کررہی ہوں...... کیا ملا مجھے آپ سے شادی کرکے؟"

رجب علی صدمے میں رہ گیا۔ "کیا نہیں دیا میں نے تمہیں......؟ لوگ یہاں بیویوں کو لاتے ہی کام پر لگادیتے ہیں، میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں پریکٹیکل آدمی ہوں، تمہارے قصیدے پڑھتا رہتا...... یہ سب آرام اور عزت نہ دی ہوتی تو؟"

"نہیں چاہیے مجھے ایسی عزت اور ایسا آرام۔"

"میرا خیال ہے تمہاری طبیعت کچھ گڑبڑ ہے۔ شاید آج بچوں نے کچھ زیادہ ہی پریشان کیا...... یا شاید آج کام کرکے ... ہو۔"

"باتیں نہ بنائیں...... مجھے کچھ نہیں ہوا۔ بہت دیر بعد مجھے اپنے گھر والوں کی بیوقوفی کا احساس ہوا ہے۔ صدیقی انکل اور ان کی ... چکنی چپڑی باتوں میں آکر انہیں آپ سے میری شادی نہیں کرنا چاہیے تھی۔ میں پڑھی لکھی تھی اور آپ انگوٹھا ٹیک۔"

رجب علی سناٹے میں تھا اور یہ سمجھنے سے قاصر کہ نشاط کو کیا ہوگیا تھا جو وہ اتنی جلی کٹی باتیں کررہی تھی۔ نشاط کمرے سے چلی گئی۔ رجب علی تادیر دل گرفتہ بیٹھا رہا۔ اس کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ نشاط اس سے کبھی اتنی تلخی اور تضحیک سے بات کرے گی۔ اس کا ذہن الجھ رہا تھا۔ کیا اس کی کسی سہیلی نے اسے ورغلا دیا تھا...... کیا اس کے گھر والوں نے اپنے خط میں کوئی ایسی ویسی بات لکھ دی تھی...... یا...... اس کے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہوگیا تھا جس کا مداوا ہونا ضروری تھا۔

رجب علی مخمصے میں تھا۔
انسانی فطرت کہ اسے آنسو بہانے کے لیے کوئی کندھا اور دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے کوئی ہمدرد درکار ہوتا ہے۔
بات صرف اتنی ہی ہوتی تو رجب علی پی جاتا لیکن نشاط نے تو اس دن کے بعد اس سے بات کرنا ہی چھوڑ دی۔ رجب بات کرنا چاہتا تو وہ منہ موڑ کر چلی جاتی، ہاتھ پکڑتا تو ہاتھ جھٹک دیتی۔ اپنے کمرے میں سونے کے بجائے وہ دوسرے کمرے میں بچوں کے ساتھ سونے لگی۔
نشاط بلاوجہ کیا روٹھی، رجب علی کو ساری دنیا ہی خود سے روٹھی لگنے لگی۔ کام پر جاتا تو بھی اس کا دھیان اسی الجھن میں بھٹکتا رہتا کہ نشاط کو آخر ہو کیا گیا تھا۔
پردیس میں اپنا کوئی تھا نہیں جس سے رجب علی اپنی پریشانی کا تذکرہ کرتا۔ نشاط روز بروز اس سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ نتیجتاً اس کی پریشانی میں بھی دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کام کی نوعیت ایسی تھی کہ حاضر دماغ رہنا پڑتا، ذرا سی غائب دماغی اور نظر کی چوک حادثہ کا کسی حادثے کا سبب بن سکتی تھی۔
اس نے ایک روز نماز کے بعد مسجد میں غیاث الدین سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا۔ غیاث الدین نے اس کی بات سنی پھر کہا۔ ”برا مت مانیے گا رجب صاحب! کیا آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کے گھر میں کیا ہو رہا ہے؟“
”کیا ہو رہا ہے؟“ رجب علی چونکا۔
”جب آپ جاب پر ہوتے ہیں، نبیل آپ کے گھر میں ہوتا ہے۔“ غیاث الدین حد درجہ محتاط لہجے میں بولے۔
”کیا کہنا چاہتے ہیں غیاث صاحب؟“
”مجھے جو کہنا نہیں چاہیے تھا، کہہ چکا۔ اب آپ اپنے گھر پر نظر رکھیں، نبیل کا تو آپ کو معلوم ہی ہے کس قماش کا آدمی ہے۔“
”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے غیاث صاحب! نبیل میرے بچوں سے کھیلنے جاتا ہوگا۔“
”اللہ کرے ایسا ہی ہو..... مگر ایسا ہے نہیں رجب علی صاحب! میرا بھی زندگی کا طویل تجربہ ہے۔ آپ شریف آدمی ہیں، مجھ سے اپنی پریشانی کا تذکرہ کیا تو میں نے بھی بتانا ضروری سمجھا ورنہ میں دوسروں کی ذاتیات سے سو کوس پرے رہنے والا آدمی ہوں۔ آپ کی اہلیہ کو نبیل کے ساتھ باہر بھی جاتے دیکھا گیا ہے۔“
رجب علی کو اپنی رگوں میں دوڑتے لہو کی حدت، برودت میں تبدیل ہوتی لگی۔ اسے اپنا جسم بے جان محسوس ہو رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ فرشِ مسجد سے کبھی نہ اٹھ سکے گا۔ ہارے ہوئے جواری کی طرح اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔
غیاث الدین نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا اور ہمدردانہ لہجے میں بولے۔ ”فی الحال تو کرایہ داروں میں ہی چہ میگوئیاں ہیں۔ نبیل ایسا کمینہ آدمی ہے کہ اس نے ساتھیوں میں خود یہ چرچا عام کر دیا ہے۔ اس سے پہلے کہ بات گھر سے باہر جائے، آپ اپنے گھر میں بات کیجیے...... اہلیہ کو سمجھائیے۔“
رجب علی کافی دیر گنگ بیٹھا رہا پھر دونوں گھٹنے پکڑ کر کچھ اس طرح اٹھا جیسے لمحوں نے اسے صدیوں بوڑھا کر دیا ہو۔
گھر پہنچا تو نشاط کی طرف سے اسی غیریت کا سامنا ہوا۔ اس سے بات کرنا چاہی تو وہ منہ پھیر کر چل دی مگر رجب نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ نشاط کو شاید اس کی امید نہ تھی، اسے دیکھنے لگی۔ ”کیا ہے؟“
”یہ سوال تو مجھے کرنا چاہیے۔ میری غیر موجودگی میں نبیل کا ہمارے پورشن میں آنے کا قصہ کیا ہے۔“
”ہاں، ہے۔“ وہ بے خوفی سے بولی۔
”کیوں آتا ہے وہ؟“
”جب آپ کو یہ معلوم ہے کہ وہ یہاں آتا ہے تو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ کیوں آتا ہے۔“
رجب علی نے اس کا شانہ پوری قوت سے اپنی گرفت میں جکڑ لیا۔
”مجھے طلاق چاہیے۔“ وہ بے باکی سے بولی۔
رجب کا ہاتھ اٹھا اور پوری شدت سے اس کے چہرے پر پڑا۔
”عورت پر ہاتھ اٹھانے کا انجام معلوم ہے آپ کو؟“
”شرم کرو۔“
”روک نہیں سکتے مجھے۔“
”بچوں کا بھی خیال نہیں تمہیں؟“
”آپ کے ہیں...... رکھیں اپنے پاس۔“
رجب علی کا خون کھولنے لگا۔
”میں آپ کا گھر چھوڑ رہی ہوں۔“
رجب علی نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”کہاں جاؤ گی؟“
”آپ کو اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے۔“
”میں طلاق نہیں دوں گا...... رلتی پھرو گی۔“

''آپ کی بھول ہے۔''
ہنستی بستی زندگی ایسے بھی پلٹا کھا سکتی ہے، رجب علی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔
اس کا سر گھوم رہا تھا، لہو ابل رہا تھا۔ نیچے جا کر نبیل اور نشاط سے کچھ پوچھ گچھ کرنا اور بدنامی کا باعث بنتا۔ نشاط دوسروں سے ہاتھا پائی پولیس کو دعوت دے سکتی تھی۔ وہ گھر سے نکلا اور دور جا کر ایک خاموش اور ویران جگہ بیٹھ گیا۔ ماں اسے ٹوٹ کر یاد آئی۔ آپا سے دوری بھی ستا رہی تھی۔ وہ نزدیک ہوتی تو شاید اسے کوئی راہ سجھا پاتی...... شاید دلاسا دیتی...... شاید اس کے دلاسا دینے سے اس کے دل کو کچھ قرار آ جاتا...... شاید وہ نشاط کو بھی اپنے پاس بٹھا کر اپنی زندگی کے تجربات کی روشنی میں اس کے انجام سے ڈراتی۔
رجب کے دل کی جو حالت تھی، ذہن ماؤف تھا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس وقت اسے غصہ زیادہ تھا یا صدمہ۔
وہ بہت دیر اپنی سوچوں میں الجھا رہا۔ کبھی جی چاہتا اٹھے اور گھر جا کر نبیل اگر گھر میں موجود ہو تو اس کا گریبان پکڑ لے، اس کا منہ توڑ دے، اسے گالیاں دے، اس پر گھونسوں اور لاتوں کی بارش کر دے...... اس کو پرتھو کے، اسے مار مار کر ادھ موا کر دے...... پھر جو ہو، دیکھا جائے۔ کبھی اس کا جی چاہتا گھر جائے اور نشاط کو خوب مارے۔ اس کا سر دیوار سے ٹکرا دے...... یا...... رات کو جب وہ سو جائے تو چھری اس کے گلے پر پھیر دے...... اگر وہ اس کی نہیں رہی تھی...... اس سے بے وفائی کی مرتکب تھی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ کسی اور کی ہو کر جیئے۔
لیکن اپنی اس اضطراری کیفیت میں اسے کشمیرا سنگھ کے دوست اشوک کا خیال آیا۔ اس نے بھی تو اپنی بیوی کو قتل کر دیا تھا۔ شاید اس کی بیوی بھی نشاط کی طرح شوہر سے بے وفائی کی مرتکب ہوئی ہو اور شوہر نے اس کی بے وفائی کی سزا دینے کے لیے اسے قتل کر دیا ہو۔ قتل کے بعد اشوک جیل پہنچ گیا تھا۔ اس کے بچے رل گئے تھے۔
نگار، طیب، نجف اور درِ شہوار اس کی اضطراری سوچوں میں اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ ''نہیں ڈیڈ! ایسا مت کرنا۔ ہم بھی اشوک کے بچوں کی طرح رل جائیں گے۔''
اشوک کے بچوں کو ہندوستان بھیجنے اور بھائی پر قتل کے مقدمے کی پیروی کرنے کے لیے تو اشوک کا بھائی ہندوستان سے برطانیہ آ گیا تھا۔ رجب تو تیموں بھائی ... بھائیوں کے مرنے کے بعد کوئی بھی اس کے بچوں کو رلنے سے بچانے اور اس کے مقدمے کی پیروی کے لیے پاکستان سے برطانیہ نہ آسکے گا۔ اول تو ان کے پاس یہاں آنے کے وسائل ہی نہ تھے، دوسرے ان کی سادہ لوحی اور ان پڑھ ہونا آڑے آ جائیں گے۔ اشوک کا بھائی تو پڑھا لکھا اور سمجھ دار آدمی تھا۔ اس کے بھائی تو اس کی فاتحہ پڑھ کر بیٹھے رہیں گے۔
رجب کو بڑی کٹھن منزل کا سامنا تھا۔ پاکستان میں ہوتا تو وہ بیوی کو ایک بار تو خوب اچھی طرح دھنک کر اپنے دل کی آگ کچھ ٹھنڈی کر ہی لیتا مگر یہاں تو عورت کو مارنا جرم تھا۔ عورت کو اختیار تھا کہ وہ خود اپنے لیے جو بہتر سمجھے، کرے۔ عورت کو اس ملک میں مرد کی برابری حاصل تھی...... مکمل آزادی تھی...... مرد کو اکثر اس سے دبک کر ہی رہنا پڑتا تھا۔
نشاط کے اعتراف کے بعد رجب کو قیامت کا سامنا تھا۔ خواب بکھر گئے تھے۔ بہت دیر تک اسی جگہ بیٹھے رہنے کے بعد وہ اٹھا اور شکستہ قدموں سے گھر پہنچ گیا۔ بچے اکیلے تھے، نشاط کا گھر میں پتا نہ تھا، الماری سے نکلی اور بیڈ پر بکھری ہوئی چیزیں زبانِ حال سے بتا رہی تھیں کہ نشاط چلی گئی تھی۔
وہ دیوانہ وار کرایہ داروں کے فلور پر پہنچا۔ اسے نبیل کی تلاش تھی۔ پتا چلا وہ اپنا سامان اٹھا کر چلا گیا تھا...... کہاں؟ کسی کو معلوم نہ تھا۔
نگار اور طیب ہراساں تھے۔ نجف نے ماں کی پکار لگا رکھی تھی اور مسلسل رو رہا تھا۔ شام ہو رہی تھی...... ایسی اداس اور سوگوار تو وہ بھی نہ تھی جس روز اسے ماں کے مرنے کی خبر ملی تھی۔
نگار اور طیب بار بار پوچھ رہے تھے...... ''مام کہاں گئی ہے...... مام کب آئے گی...... مام کیوں نہیں آ رہی؟''
ان کے سوال رجب کا دل چیرے دے رہے تھے۔ اسے خود معلوم نہ تھا کہ ان کی ماں کہاں چلی گئی تھی، کب آئے گی؟ آئے گی بھی کہ نہیں۔ درِ شہوار ماں کی آغوش میں جانے کو تڑپ رہی تھی مگر ماں نہ تھی۔ رجب کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ نشاط کو تلاش کرنے کہاں جائے، کس سے اس کا اتا پتا پوچھے۔ اس کی دو تین سہیلیوں کے نام تو معلوم تھے مگر ان سے کیا کہتا، کیا پوچھنے کے لیے حوصلہ کہاں سے لائے۔ اس کی دوستوں کے فون نمبر اسے معلوم تھے مگر ان سے کیا کہتا، کیا بتاتا انہیں...... واقف کاروں میں خبر پھیل جاتی تھی۔
رات سخت بے چینی میں گزری۔ وہ تمام رات جاگتا رہا...... بیٹھا رہا۔ صبح ویسی ہی مغموم تھی جیسی کسی قریبی اور عزیز ہستی کے مر جانے کے بعد پہلی صبح ہوا کرتی ہے۔ اس نے برنڈا کو فون کر دیا کہ وہ کام پر نہ آ سکے گا۔

برنڈا نے پوچھا۔ ''سب خیریت؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ہاں...... کچھ کام ہے گھر پر۔''

وہ بچوں کو بہلانے اور کھلانے پلانے میں مصروف تھا کہ نشاط کی سہیلی انعم کا فون آ گیا۔ علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔ ''رجب بھائی! نشاط ہمارے گھر ہے۔ کل رات جب وہ یہاں پہنچی تو خاصا وقت ہو چکا تھا۔ ہم نے آپ کو اس وقت فون کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ نشاط سے بھی اکیلے آنے کی وجہ نہیں پوچھی۔ اس نے خود ہی بتایا...... میں نے آپ کو اطلاع دینا ضروری سمجھا۔''

''شکریہ بہن......! مجھے اپنا پتا دیں گی آپ...... میں اسے لینے آتا ہوں۔''

''[illegible] مگر میرا خیال ہے آپ کے آنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ نشاط فیصلے پر پہنچی ہوئی ہے بلکہ ڈٹی ہوئی ہے۔ وہ آپ سے طلاق لینا چاہتی ہے۔''

''اسے سمجھائیں انعم بہن [illegible] جب اس نے آپ کو بتا ہی دیا ہے تو آپ سے کیا چھپانا [illegible]''

''بہت سمجھایا مگر اس کی ایک [illegible] ہے۔ وہ آپ کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔''

''بچوں کے ساتھ تو رہے...... میں کہیں اور رہ لوں گا۔''

''وہ بچوں کو بھی ساتھ نہیں رکھنا چاہتی۔''

''آپ دونوں سمجھائیں اسے۔''

''میں نے کہا نا وہ اپنے فیصلے پر ڈٹی ہوئی ہے۔''

''مجھے اپنا پتا تو بتائیں۔''

انعم نے اپنے گھر کا پتا بتا دیا۔

رجب علی نے چاروں بچوں کو ساتھ لیا اور انعم کے گھر جانے کو روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچا تو نشاط نے خود کو کمرے میں بند کر لیا۔

''میں نے اسے آپ کے آنے کا بتایا نہیں تھا کہ کہیں وہ ناراض نہ ہو کہ میں نے آپ کو اس کے یہاں آنے کی خبر کیوں دی۔ مجھے ڈر ہے وہ مجھ پر سخت خفا ہو گی۔ آپ کو دیکھ کر اس نے خود کو کمرے میں بند کر لیا ہے۔''

رجب علی بند کمرے کا دروازہ کھٹکھٹاتا رہا، بچے اسے پکارتے رہے مگر اس نے دروازہ نہیں کھولا۔

''میں بچوں کو چھوڑ کر کچھ دیر کو ادھر ادھر جا رہا ہوں، شاید اسے بچوں پر رحم آ جائے اور وہ کمرے سے نکل آئے۔''

''نہیں آئے گا رحم رجب صاحب!'' انعم کے شوہر نے پورے یقین سے کہا۔

''ماں ہے...... کیوں نہیں آئے گا؟'' رجب بولا۔

انعم کا شوہر مسکرایا۔ ''میری والدہ کہا کرتی ہیں...... عورت اور گھوڑا ران تلے...... جب تک قابو میں ہیں، اپنے ہیں۔''

''نشاط بتا رہی تھی کسی نجومی نے اس کا ہاتھ دیکھ کر بتایا کہ اس کی زندگی میں بڑا انقلاب آئے گا جو نو برس تک اسے اپنے زیر اثر رکھے گا۔'' انعم نے بتایا۔

''بکواس۔'' رجب علی بولا۔ ''نجومیوں کو اپنا حال تو پتا نہیں ہوتا۔''

''مگر دوسروں پر تو اپنا داؤ چلا دیتے ہیں۔'' انعم کے شوہر نے کہا۔

''میں چلتا ہوں۔'' رجب علی نے اٹھنے کا ارادہ کیا۔

''بچے!'' انعم گھبرا کر بولی۔

''تھوڑی دیر تکلیف اٹھا لیں بہن...... دروازہ بجا کر اسے بتا دیں کہ رجب چلا گیا ہے۔ بچوں کی خاطر وہ ضرور باہر نکل آئے گی۔''

''مگر آپ رابطے میں رہیے گا۔'' انعم کے لہجے میں بے تابی تھی۔

''جی...... جی...... آپ فکر نہ کریں، میں آس پاس ہی ہوں۔''

رجب علی بچوں کو وہیں چھوڑ کر انعم کے گھر سے نکل گیا۔ کافی دیر وہ بے مقصد ادھر ادھر گھومتا رہا پھر اس نے انعم کو فون کیا۔

''رجب بھائی! آپ کے جانے کے بعد وہ بھی چلی گئی۔''

''کہاں؟'' وہ ہڑبڑا کر بولا۔

''[illegible] بتایا۔''

''اور بچے؟''

''وہ یہیں ہیں [illegible] پریشان ہیں...... رو رہے ہیں۔ نشاط نے تو ان کو دیکھا [illegible]۔ سوری رجب بھائی! مجھے بچوں کی دیکھ بھال اور انہیں [illegible] کوئی تجربہ نہیں۔ آپ ذرا جلدی آ جائیں تو اچھا ہے۔'' انعم بیزاری سے بولی۔

رجب علی دوبارہ انعم کے گھر پہنچا، بچوں کو ساتھ لیا اور واپسی کا ارادہ کیا۔ انعم اور اس کا شوہر دروازے [illegible] باہر تک آئے۔

''رجب بھائی! آپ بے خبر کیوں رہے؟ آپ [illegible] کیوں نہیں چلا؟'' انعم نے محتاط لہجے میں کہا۔

رجب علی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی انعم کا شوہر بولا۔ ''میری والدہ کہا کرتی ہیں...... عورت کے بھٹکنے کی اس کے شوہر کو سب سے آخر میں خبر ہوتی ہے۔''

رجب علی کو یوں لگا جیسے وہ ساری دنیا کے لیے تماشا

بن گیا تھا۔ بچوں کو گاڑی میں بٹھانے کے بعد جب رجب علی خود گاڑی میں بیٹھنے لگا تو انعم کے شوہر نے کہا۔ ''رجب صاحب! میری والدہ کہا کرتی ہیں...... مرد کو چاہیے کہ عورت کو وقت سے پہلے ہی سب کچھ نہ دے بلکہ دھیرے دھیرے بلکہ کبھی ترسا کر بھی...... آپ سے شاید یہی غلطی ہوئی کہ آپ نے اپنی بیگم کو وقت سے پہلے ہی سب کچھ دے دیا۔''

آنسو رجب علی کی آنکھوں سے بہنے کے بجائے دل میں گر رہے تھے۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' اس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

گھر پہنچ کر ریڈنگ تک اس نے کتنی مرتبہ اپنی آنکھیں پونچھیں وہ شمار نہ کرسکا۔

اسے نشاط کے اس بے رخی سے بدل جانے کا جو صدمہ، جو دکھ تھا، سو تھا مگر بچے یہ نشان بنے اس صدمے کو اور شدید اور اس دکھ کو اور گہرا کر رہے تھے۔

اس نے کمپنی کی ریڈیو آپریٹر برنڈا کو فون کیا کہ وہ دو چار دن کام پر نہ آسکے گا۔ برنڈا جو جانتی تھی کہ زیادہ پیسے کمانے کی خاطر وہ تو اضافی وقت بھی لگانے کو تیار رہتا تھا، قدرے تشویش سے بولی۔ ''سب ٹھیک تو ہے نا؟''

''ہاں...... ہاں...... سب ٹھیک ہے۔ بس کچھ ذاتی کام ہے۔'' رجب نے اپنی آواز سے برنڈا پر اپنی پریشانی عیاں نہ ہونے دی۔

''ٹھیک ہے، تم اطمینان سے اپنا کام نمٹاؤ۔'' برنڈا نے کہا۔

نشاط کے رویّے سے مایوس ہونے کے بعد رجب علی نے بچوں کو اجرت پر بچوں کی دیکھ بھال کرنے والی ایک عورت کے پاس چھوڑا اور نبیل کی جائے ملازمت معلوم کرکے وہاں پہنچا۔ نبیل ڈیوٹی پر ملا۔ رجب نے اس سے نشاط کے بارے میں پوچھا تو وہ شانے اُچکا کر بولا۔ ''مجھے نہیں معلوم۔''

''تمہیں معلوم ہے۔'' رجب نے غصے سے کہا۔

''تمہاری بیوی ہے، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کہاں ہے۔''

''بکواس مت کرو...... سیدھی طرح بتاؤ وہ کہاں ہے؟''

''اگر نہ بتاؤں تو؟''

رجب نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ ''تو میں تمہیں قتل کردوں گا۔''

''ہمت ہے؟''

رجب نے ایک ہاتھ سے پوری قوت سے اس کی کلائی مروڑتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کا گریبان پکڑ لیا۔

نبیل نے گالی دی۔ دونوں میں ہاتھا پائی شروع ہوگئی۔ رجب علی کو جنون چڑھا ہوا تھا۔ جس گھر کی اس نے شبانہ روز انتھک محنت سے آبیاری کی تھی، بیوی بچوں کی نہایت محبت سے کفالت کی تھی...... بیوی کو ہر طرح کا آرام اور آسائش بہم پہنچا کر ملکہ کی طرح گھر میں رکھا تھا، بچوں کو امیرانہ ٹھاٹ کے ساتھ رکھا تھا...... اس کی جنت کا شیرازہ بکھیر دینے والا شخص اس کے سامنے تھا۔ رجب علی کا بس نہ تھا کہ اس کا گلا گھونٹ دیتا۔

ان کی ہاتھا پائی دیکھنے والے چند افراد نے بہ مشکل بیچ بچاؤ کرایا اور اس لڑائی کی وجہ جاننا چاہی۔

''یہ کمینہ انسان ہے۔'' رجب علی کو وجہِ عناد بتانا گوارا ہوا نہ آسان۔

''تو اس عورت کے لائق تھا ہی نہیں۔'' نبیل بولا۔

''شیطان! تو نے آگ لگائی میری جنت میں۔''

پوچھنے والوں کو وجہِ عناد سمجھ میں آگئی۔

''کہاں ہے وہ؟'' بات کھل جانے کے بعد رجب علی نے موقع پر موجود لوگوں سے پردہ داری برتتے بنا کہا۔

''ڈھونڈ سکتا ہے تو ڈھونڈ لے۔''

''میں تیرا خون پی جاؤں گا۔'' رجب علی دوبارہ نبیل پر جھپٹا۔ بیچ بچاؤ کرانے والے پھر درمیان میں آگئے۔

''بیوی اس کی گئی ہے گھر سے اور یہ گریبان میرا پکڑ رہا ہے۔'' نبیل نے رجب علی کی تضحیک کی۔

''تو ذمے دار ہے۔'' رجب علی نے نبیل پر آنکھیں نکالیں۔

''ارے جا...... جا...... کتنے ذمے دار ہوں گے...... جا کر سب کو ڈھونڈ۔''

''تو اس کی انسلٹ کر رہا ہے؟''

''انسلٹ!'' نبیل قہقہہ مار کر ہنسا۔ ''کبھی سن لے تو کہ وہ تیری انسلٹ میں کیا کچھ بولتی ہے تو اس کے لیے تیری محبت ہرن ہوجائے...... جا اپنی حسرتوں پہ آنسو بہا کے سوجا...... بے غیرت انسان!''

''وہ میرے چار بچوں کی ماں ہے۔''

''دس کی بھی ہو تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''نپٹوں گا تجھ سے۔'' رجب علی نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''پہلے اس سے نمٹ جو تجھے چھوڑ گئی ہے۔''

''کتا......!'' رجب علی پھر جارحانہ اس کی طرف بڑھا مگر بیچ بچاؤ کرانے والوں نے پھر اسے روک لیا۔

''سمجھاؤ اسے...... بیوی اس کی چلی گئی ہے اسے چھوڑ کر اور یہ مجھے تاؤ دکھا رہا ہے۔''

''جاؤ بھائی...... ایسے معاملات یوں نہیں اچھالے جاتے...... اپنی ذلت ہوتی ہے۔'' موقع پر موجود ایک شخص نے رجب علی کو دلسوزی سے سمجھایا۔

رجب علی نے نبیل کو گھورتے ہوئے زمین پر تھوکا اور واپس جانے کو پلٹ گیا۔

تھوکا اس نے نبیل کو دیکھتے ہوئے تھا مگر اسے اپنی بھی ذلت محسوس ہو رہی تھی۔ کتنے لوگ تھے جو نبیل سے اس کی ذلت کا تماشا دیکھ رہے تھے...... اور اس کمینے نبیل کی طنزیہ مسکراہٹ...... اس کا تضحیک سے ہنسنا اور اس کے چبھتے ہوئے فقرے...... اسے شدید کوفت کا سامنا تھا۔ سرِعام تذلیل کے احساس سے اس کا رواں رواں سلگ رہا تھا۔

اکیلے میں تو مرد بھی رو دیتا ہے، وہ بھی رو دیا...... اپنے سامنے لگے گاڑی کے آئینے میں اپنی بھیگی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اسے اپنا چہرہ بھی دھندلا دکھائی دیا۔

''نشاط...... ! میں نے تو تجھے تخت پہ بٹھایا تھا...... تو نے مجھے خاک میں کیوں رول دیا؟'' وہ بڑبڑایا۔

☆☆☆

شب بھر وہ جاگتا رہا...... کبھی بیٹھتا، کبھی بے چین ہو کر اٹھتا اور ٹہلنے لگتا۔ نشاط کے ساتھ گزرے اچھے وقت کی یادیں اور برے وقت کی کسک باہم دست و گریباں رہیں۔

عورت ایسے بھی بدل سکتی ہے، وہ سوچتا رہا...... نبیل کی طنزیہ مسکراہٹ، تضحیک سے ہنسنا اور چبھتے ہوئے فقرے اسے ناقابلِ بیان کوفت سے دوچار کیے رہے۔ وہ شدید صدمے میں تھا۔

اگلی صبح جب وہ نماز کی ادائیگی کے لیے وضو کرنے کھڑا ہوا تو واش بیسن سے اونچائی پر لگے آئینے میں اسے اپنا چہرہ بالکل مختلف لگا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے قرمزی حلقے تھے جیسے رگوں میں دوڑتا لہو اس کی آنکھوں تلے آ کر اکٹھا ہو گیا تھا۔ اسے اپنا چہرہ صدیوں پرانے کسی انسان کا چہرہ لگا جسے صدیوں کی مسافت نے تکان سے چور کر دیا تھا۔

عورت کتنی سخت جان ہوتی ہے، مرد کی بے وفائی سہہ جاتی ہے...... لیکن عورت کی بے وفائی مرد کو مار دیتی ہے...... نشاط کی بے وفائی نے رجب علی کو بھی مار دیا تھا۔

دو دن بعد رجب علی کو نشاط کا فون آ گیا۔ وہ پبلک ٹیلی فون بوتھ سے فون کر رہی تھی۔ وہ طلاق کا مطالبہ دہرا رہی تھی۔

''تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے نشاط...... ! لیکن بچوں کی خاطر میں تمہیں گھر میں واپس لینے کو تیار ہوں۔'' رجب علی نے کہا۔

''مجھے طلاق چاہیے۔'' وہ اکڑ کر بولی۔

ہفتہ عشرہ حالات جوں کے توں رہے۔ رجب علی کو کام پر جانا بھی ضروری تھا۔ صبح کو وہ بچوں کو بے بی سٹر کے پاس چھوڑ کر کام پر چلا جاتا، کام سے واپسی پر انہیں لیتا۔

ایک روز نگار نے بتایا نجف اور درشہوار کے رونے پر بے بی سٹر انہیں مارتی بھی تھی۔ بہت سوچ بچار کے بعد رجب علی کو ایک ہی راستہ دکھائی دیا۔

رنج و صدمے میں ڈوبی ایک صبح وہ چاروں بچوں کے ساتھ اچانک پاکستان پہنچا تو گھر میں اس کی اچانک آمد پر کھلبلی مچ گئی۔ گھر والوں کو برطانیہ میں اس کے اور نشاط کے معاملات کی خبر نہ تھی۔ بچوں اور اس کے ہمراہ نشاط کو نہ دیکھ کر نشاط کے بارے میں پوچھا گیا۔

''وہ چلی گئی۔'' اس نے دلگرفتگی سے کہا۔

''کہاں؟'' آپا نے ہول کر پوچھا۔

''مر گئی؟'' سادہ لوح منجھلی رنج میں ڈوبی آواز میں بولی۔

''ہاں...... مر ہی گئی۔'' رجب علی بولا۔

''کیا مطلب؟'' بڑے بھائی نے سوال کیا۔

''چھوڑ گئی مجھے...... کسی اور کے ساتھ چلی گئی۔''

منجھلی نے سہم کر اپنا ہاتھ سینے پر رکھ لیا۔

''کس کے ساتھ؟''

''[illegible]۔'' رجب علی نے نجف کو آپا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

بچے نئے اور مختلف ماحول میں نئے لوگوں کو دیکھ کر خوفزدہ تھے، سہمے ہوئے تھے۔

''ڈیڈی! گھر چلیں۔'' نگار روہانسی ہو رہی تھی۔

''اب یہی گھر ہے۔'' رجب علی نے اسے سمجھایا۔

''نہیں...... یہ گھر نہیں ہے...... اپنے گھر جانا ہے...... مام کے پاس۔''

''تمہاری مام مر گئی بیٹا!''

''ڈیڈ! مجھے بھی مام کے پاس جانا ہے۔'' طیب ٹھنکا۔

''مام نہیں ہے طبی!''

''ہے...... ہے...... !'' طیب بضد ہوا۔ ''وہ اپنے گھر میں ہے۔''

''مجھے گندی بو آ رہی ہے...... یہ سب لوگ گندے ہیں۔'' نگار منمنائی۔

غنیمت تھا کہ بچے یہ ساری باتیں انگریزی میں کر رہے تھے۔
"بری بات۔" رجب علی نے ٹوکا۔
نجف اپنی چھوٹی چھوٹی حیران آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔
رجب علی کو گھر والوں کو نشاط کے جانے کی وجہ بتانا پڑی۔ سب یوں منہ لٹکا کر بیٹھ گئے جیسے نشاط واقعتاً مر گئی تھی۔
"تجھے یاد ہو یا نہ ہو...... مجھے یاد ہے رجب......! تو مجھے اور اماں کو لڑکی والوں کے گھر لے گیا تھا اور ہم وہاں سے واپس آ رہے تھے اور تو نے اماں سے ان کی رائے پوچھی تھی...... انہیں لڑکی کی بے باکی اچھی نہیں لگی تھی...... اور میں نے بھی تجھ سے کہا تھا...... شادی اپنے جیسوں میں کرنی چاہیے تھی، اونچے گھروں کی لاڈ پیار میں پلی لڑکیاں ہوتی ہیں، ان کے دماغوں میں ہوا بھری ہوتی ہے۔" آپا نے رجب علی کو یاد دلایا۔ "اور پھر ولیمے والے دن اس نے اپنے گھر والوں کی غلطی ماننے کے بجائے زیور اتار پھینکا تھا اور تو نے بجائے اپنے گھر والوں کی حمایت کرنے کے، اس کی حمایت لی تھی۔ میں اسی دن سمجھ گئی تھی کہ وہ تیرے سر پہ چڑھ کے رہے گی...... بیوی کو شہ نہیں دینی ہوتی، سدھانا پڑتا ہے۔"
رجب علی چپ رہا۔
بچے آب و ہوا اور کھانے پینے میں تبدیلی کی وجہ سے آتے ہی بیمار پڑ گئے۔ ایک کو ڈاکٹر کو دکھا کر لاتے تو دوسرا قے دست میں مبتلا ہوتا۔ آپا اور ریحانہ دونوں نے اس مشکل وقت میں رجب علی کا ساتھ دیا۔ نشاط کے گھر والے آئے اور غیروں کی طرح بچوں سے مل کر چلے گئے۔
بچے قدرے سنبھلے تو رجب علی نے آپا سے کہا۔ "مجھے مشورہ دو...... کیا کروں؟"
"کس بارے میں؟"
"نشاط طلاق پہ اڑی ہوئی ہے۔"
"سیانوں کی مثل ہے...... عورت رہے تو آپ سے اور نہ رہے تو اپنے باپ سے۔"
"لیکن بچے میری مجبوری بنے ہوئے ہیں۔"
"تجھے چاہیے تو یہ کہ بچے اسی کے حوالے کرے...... عورت کا بچوں کو اکیلے سنبھالنا آسان نہیں۔"
"آپا......! بیٹیاں بھی ہیں میری...... مجھ سے طلاق لینے کے بعد اگر وہ اس شخص سے نکاح کر لیتی ہے تو میں ایک غیر آدمی کے گھر میں اپنی بیٹیوں کو کس طرح چھوڑ سکتا ہوں...... انہیں بڑا بھی ہونا ہے۔"
"تیری بات بالکل ٹھیک ہے...... مگر انسان کی فطرت ہے، جس طرف جانے سے منع کرو، اسی طرف جاتا ہے...... جو چیز پاس ہوتی ہے، اس کی قدر کم کرتا ہے...... جو دور ہوتی ہے، اس کی طرف بھاگتا ہے۔ تو اگر ان کی ماں کو طلاق دے دیتا ہے تو بڑے ہو کر یہ اسی کی طرف جائیں گے۔"
"یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ غلط تھی؟"
"بعض رشتے اندھے بہرے ہوتے ہیں رجب......! تو، تو بچہ تھا مگر اتنا بچہ بھی نہیں کہ تجھے یاد نہ ہو۔ بنارس والی کی بیٹی نے جب عین نکاح کے وقت انکار کر دیا تو بنارس والی اپنے ہوتے ہوتے رہ جانے والے داماد سے خود نکاح کر کے اس کے گھر چلی گئی تھی...... محلے والوں نے اس کے جوان بیٹوں کو خوب طعنے دیے، خوب شرم دلائی...... پتا ہے انہوں نے جواب میں کیا کہا؟"
"کیا کہا؟"
"انہوں نے کہا...... جیسی بھی سہی، ہماری ماں ہے...... تیرے بچے بھی کل کو یہی کہیں گے۔"
"لیکن اس وقت یہ سمجھ دار تو ہوں گے...... اپنا اچھا برا سمجھتے ہوں گے...... مجھے بھی یہ پچھتاوا نہیں ہوگا کہ باپ ہو کر میں نے انہیں تحفظ نہیں دیا۔"
"میرا کام تھا تجھے تجربے کی بات بتانا...... آگے تیری مرضی...... تو بھی ٹھیک سوچ رہا ہے۔"
"میں بچوں کو اگر تم اپنے پاس رکھ سکتی ہو تو ٹھیک کیونکہ تمہارے سوا مجھے کسی پر بھروسا نہیں...... ورنہ میں انہیں اپنے ساتھ واپس لے جاتا ہوں۔"
آپا جسے خود اپنے بچوں کے پالنے پوسنے اور تعلیم و تربیت سے ہی فرصت نہ تھی، مخمصے میں پڑ گئی۔ رجب کے چار بچوں کی ذمے داری لینا معمولی بات نہ تھی...... لیکن رجب سے اپنی اولاد کی طرح پیار کرنے اور زندگی کا تنہا مردانہ وار مقابلہ کرتی آپا نے یہ ذمے داری اپنے سر لے لی۔
☆☆☆
اپنے جگر گوشوں کو پاکستان میں چھوڑ کر جانا رجب علی کے لیے دلخراش تھا۔ برطانیہ واپسی کے سفر میں وہ تمام وقت انہی کے بارے میں سوچتا رہا۔ ناز و نعم میں پلے بچوں کو وہ ان کی عادات سے بالکل مختلف حالات میں چھوڑ کر جا رہا تھا۔ نشاط پر اسے غصہ بھی تھا اور اس کی بے رحمی پر حیرت بھی۔ اس سے اپنے رشتے کا نہ سہی، بچوں سے اپنے رشتے کا تو خیال کیا ہوتا اس نے۔ رجب کی اپنی ماں تو اپنے حصے

کی روٹی بھی اس کے لیے بچا کر رکھ لیا کرتی تھی...... نشاط کیسی ماں تھی...... خود غرض اور بے درد، جسے اپنے معصوم بچوں پر رحم نہ آیا تھا۔

برطانیہ پہنچنے پر رجب علی ائرپورٹ سے اپنے گھر پہنچا تو گھر کی ویرانی سے اس کا دل پھٹنے لگا۔ بچوں کے کپڑے، جوتے اور کھلونے دیکھ دیکھ کر وہ مرد ہونے کے باوجود سسک سسک کر روتا رہا۔ بچوں کی آوازوں کی بازگشت اس کے دل کو رہ رہ کر تڑپا رہی تھی۔ کبھی طیب کے چلّانے کی بازگشت۔ "ڈیڈ! نگی مجھے مار رہی ہے۔"

"طیبی جھوٹ بولتا ہے ڈیڈ!" نگار کا اپنا دفاع کرنا۔

کبھی نجف کی پکار سنائی دیتی۔ "مام! دودھ چاہیے۔"

کبھی نگار کی کھلکھلاہٹ۔

کبھی طیب کی سائیکل کی گھنٹی کی آواز۔

اور کبھی بچوں کی آوازوں کی بازگشت میں اسے نشاط کی آواز کی بازگشت بھی سنائی دیتی۔ "آپ کے بچے سارا دن مجھے دوڑا کر رکھتے ہیں...... تھک جاتی ہوں میں۔"

"آپ کے بچے، کیا مطلب...... ہمارے بچے ہیں۔"

"بڑے ہوں گے تو کہیں گے...... آپ نے کیا کیا ہے...... جو کیا ہے ہمارے لیے، ہمارے باپ نے کیا ہے۔"

"میں ان بدمعاشوں سے کہا کروں گا...... تمہارے باپ کے لیے بھی جو کیا ہے، تمہاری ماں نے کیا ہے۔"

نشاط اسے بڑے مان سے دیکھتی اور وہ نشاط کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیتا۔ کتنے خوش اور مطمئن تھے وہ دونوں اپنے بچوں کے ساتھ اپنے گھر میں۔ اس جنت میں شیطان نے کیوں نقب لگا دی تھی۔

گھر کی ایک دیوار پر اپنی اور نشاط کی شادی کی تصویر دیکھ کر رجب بے ساختہ ٹھنڈی سانس بھرنے پر مجبور ہو جاتا۔ اس عورت سے اس نے دل سے سچی محبت کی تھی۔ وہ اسے اپنے ہر روپ میں اچھی لگتی تھی۔ بچوں کی دیکھ بھال اور گھر کے کاموں میں مصروف نشاط کو وہ اپنی بانہوں میں لے کر اس کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑ کر دیکھنے لگتا تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟" وہ پوچھتی۔

"گھر اور بچے تھکا دیتے ہیں تمہیں۔"

"ہاں...... مگر کرنا تو ہے۔"

کہیں جانا ہوتا اور وہ تیار ہو کر سامنے آتی تو پوچھتی۔ "کیسی لگ رہی ہوں؟"

"میری بیوی اور میرے بچوں کی پیاری ماں!"

"کبھی تعریف مت کیجیے گا میری۔"

"یار! مجھے لفاظی نہیں آتی...... تم سے محبت کرتا ہوں...... تمہاری عزت کرتا ہوں...... کیا یہ کافی نہیں؟"

"نہیں ہے کافی...... عورت اپنے شوہر سے اپنی تعریف بھی سننا چاہتی ہے۔ آپ تو کبھی جھوٹے منہ بھی میری تعریف نہیں کرتے۔"

"یار! پہلے بھی کہا ہے...... میں خالی خولی باتیں بنانے والا آدمی نہیں۔ زیرو سے سفر شروع کر کے اب اس مقام پر ہوں کہ تمہیں اور بچوں کو کسی چیز کی کمی نہیں۔ خالی ہاتھ آیا تھا اس ملک میں...... الحمد للہ! اب میرے پاس سب کچھ ہے...... بہت مطمئن ہوں میں اپنی زندگی سے۔"

"مجھے تو آپ نے میری مرضی کبھی نہیں کرنے دی۔"

"کیا مطلب؟"

"پاکستانی عورتیں یہاں لانگ فراک، میکسیز اور انگلش ڈریس بھی پہنتی ہیں۔ آپ نے مجھے کبھی اجازت نہیں دی...... کیسینو کا نام ہی سنا ہے میں نے...... کبھی لے کر گئے مجھے آپ کیسینو؟"

"مجھے تم اسی ڈریس میں اچھی لگتی ہو...... فراک، میکسی، کیسینو، کلب، یہ سب پسند ہوتا مجھے تو میں کسی گوری سے شادی نہ کر لیتا۔"

"بہت پرانے خیالات کے آدمی ہیں آپ۔"

"جیسا بھی ہوں...... تمہیں برداشت تو کرنا ہے۔"

"مجبوری ہی ہے۔"

"تمہاری یہ مجبوری مجھے کتنا سکون دیتی ہے، مجھ سے پوچھو۔"

نگار اور طیب لڑنے لگتے تو وہ اکثر طیب کے کان ہی کھینچتا۔ "بدمعاش...... تیری بڑی بہن ہے...... کیوں لڑتا ہے اس سے...... میں تو اپنی بڑی بہن کی مار بھی کھا لیتا تھا۔"

"وہ مجھے مارتی ہے۔" طیب منمناتا۔

"اچھا کرتی ہے...... تم اس کی چیزیں جو چھین لیتے ہو...... بگاڑ دیتے ہو۔ اس کی گڑیا کے سارے بال نوچ کر اسے گنجا کر دیا تم نے۔"

"کیوں میرے بیٹے کو ڈانٹ رہے ہیں۔ آپ کی لاڈلی بھی کچھ کم نہیں ہے۔ چپکے سے واردات کر کے معصوم بن جاتی ہے۔" نشاط بیٹے کی وکالت کرتی۔

"تم اس کی زیادہ حمایت مت لو۔ میں جانتا ہوں یہ کتنا بدمعاش ہے۔"

"اچھا اچھا...... بس کریں۔ بیچارہ میرا معصوم بیٹا اتنی دیر سے سر جھکائے کھڑا ہے۔"

"دو منٹ بعد دیکھ لینا کس تیزی سے سر گھما رہا

ہوگا۔“

طیب تھا بھی بہت شریر اور چلبلا۔ نگار کو ایسے دبوچ لیتا کہ وہ چلانے لگتی۔ ”مام...... ڈیڈا طیبی کو دیکھیں...... مجھے مار رہا ہے۔“

سلاؤ سے ریڈنگ منتقل ہوئے انہیں کچھ ہی دن ہوئے تھے۔ رجب علی کو اس کا ایک دوست اسماعیل بھٹی اپنی فیملی کے ساتھ نئے گھر کی مبارک باد دینے آیا۔ بھٹی کے تینوں بچے اور رجب علی کے بچے کھیلنے لگے۔ طیب نے کسی بات پر نگار کو زور سے دھکا دیا تو وہ منہ کے بل گری اور زور زور سے رونے لگی۔ رجب جو مہمان میاں بیوی کے ساتھ بیٹھا تھا، نگار کے رونے کی آواز سن کر اٹھا اور صورت حال کے علم میں آتے ہی اس نے طیب کو ہاتھ جڑا تو وہ دیوار سے ٹکرایا اور اس کی ناک سے خون نکلنے لگا۔ مہمان بچے ہراساں ہو کر ماں باپ سے لپٹ گئے۔

رجب علی، طیب کی ناک صاف کرنے اور طیب کے ساتھ نگار کو بھی ہلکی سی ڈانٹ کے بعد دوبارہ مہمانوں کے ساتھ آ کر بیٹھا تو اسماعیل بھٹی نے اپنے گاؤں کی ایک عورت کا قصہ سنایا جس کے دو کمسن بیٹے تھے۔ انہوں نے ایک روز باپ کو گھر میں بکری ذبح کرتے دیکھا۔ ایک روز کھیل میں بڑے بچے نے چھوٹے بھائی کو لٹایا اور اس کی گردن پر چھری پھیر دی۔ ماں صحن میں تھی، اندر آئی اور اس نے یہ منظر دیکھا تو اوسان کھو بیٹھی۔ اس نے صدمے کی کیفیت میں بڑے بیٹے کو جو کم عمر ہی تھا، پیٹ پر اتنی زور سے لات ماری کہ وہ موقع پر ہی ڈھیر ہو گیا۔

یہ قصہ سنا کر اسماعیل بھٹی نے رجب علی کو سمجھایا۔ ”رجب بھائی! ایک نقصان کو دوسرے کی بنیاد کبھی مت بناؤ۔ بہن بھائی کھیلتے ہیں تو آپس میں لڑتے جھگڑتے بھی ہیں۔ کبھی ایک کو تو کبھی دوسرے کو چوٹ بھی لگ جاتی ہے۔ بیٹے طیب کو کسی ایسی جگہ چوٹ لگ جاتی کہ تمہیں اسے اسپتال لے جانا پڑ جاتا تو؟“

”بھائی جی! طیب بہت لڑتا ہے بہن سے۔“ نشاط نے رجب کو شرمندگی سے بچانے کی کوشش کی۔

”بھابی جی! ہمارے بچے بھی ایسے ہی لڑتے ہیں آپس میں۔ بچے سارے ایسے ہی ہوتے ہیں۔“ بھٹی کی مسز نے کہا۔

بات چھپی نہ رہی تھی...... رجب علی اور نشاط کے تمام جاننے والوں کو پتا چل گیا تھا کہ نشاط اپنے کسی کرایہ دار کے ساتھ تعلقات ہو جانے کے بعد گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی اور رجب علی سے طلاق کے مطالبے پر اٹکی ہوئی تھی۔ عورت کا مرد کو یوں چھوڑ کر جانا مرد کے لیے کتنی رسوائی اور شرمندگی کا باعث بنتا ہے، یہ کوئی ان دنوں رجب علی سے پوچھتا۔ وہ سر جھکا کر گھر سے باہر جاتا اور سر جھکائے واپس لوٹتا۔ اسے اپنے گھر میں مقیم کرایہ داروں سے نظریں ملاتے بھی شرم آتی۔ گھر سے باہر کوئی ملنے جلنے والا مل جاتا تو وہ اس ناخوشگوار واقعے کے بارے میں اس کی طرف سے کسی استفسار سے قبل ہی کنی کترانے کی کوشش کرتا۔

نشاط کو اس کے گھر والوں کی طرف سے رجب کے پاکستان جانے اور بچوں کو وہیں چھوڑ آنے کی خبر مل چکی تھی۔ اس کے گھر والوں نے اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی مگر اس کے دل و دماغ پر تو رجب سے طلاق کی چڑھی ہوئی تھی۔ اس کے بعد جو ہونا تھا، وہ عیاں تھا۔ پاکستان سے رجب کے واپس آنے کے بعد بھی وہ پبلک فون بوتھس سے بار بار فون کر کے طلاق کا مطالبہ کر رہی تھی۔

غیاث الدین نے ایک روز دبی زبان سے رجب علی کو سمجھایا۔ ”رجب علی صاحب! خاتون کو واپس آنا ہوتا تو آ چکی ہوتیں...... انہیں تو بچوں کو پاکستان لے جائے جانے کی خبر سنتے ہی پیچھے لپکنا چاہیے تھا۔ جب تک وہ آپ کے نکاح میں ہیں، ان کے ہر اچھے برے فعل کا وبال آپ پر ہے گا۔ جب کوئی خاتون اپنے بچوں کی پروا کیے بغیر بار بار طلاق کا مطالبہ کرتی رہے تو اس کا مطلب ہے اس نے شوہر اور بچوں کی محبت اپنے دل سے نکال پھینکا ہے اور اپنی بربادی چاہتی ہے...... بہتر تو یہی ہے کہ آپ انہیں فارغ کر دیں۔“

رجب علی نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے غیاث الدین کو ایک نظر دیکھا اور سر جھکا لیا۔ نشاط سے اپنا رشتہ ختم کر دینے کا خیال ہی درد انگیز تھا اس کے لیے...... مگر نشاط اڑی ہوئی تھی۔

گورے ہمسایوں حتیٰ کہ رجب علی کے گھر میں مقیم گورے کرایہ دار جوئی کو بھی نشاط اور اس کے تنازع کے بارے میں اپنی ناک گھسانے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اپنے کام سے کام رکھنے کے اصول پر کاربند تھے لیکن رجب اور نشاط کے حلقۂ احباب میں ایشائی برادری نے استفسارات پر کمر باندھ رکھی تھی۔ کبھی آنکھوں سے سوال، کبھی زبان سے۔

”رجب علی صاحب! سنا ہے کہ آپ کی مسز اور آپ کے درمیان کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے؟“

"رجب بھائی! سننے میں آیا ہے بھابی جی ناراض ہوکر آپ کے گھر سے چلی گئی ہیں۔"

ایک روز سپر مارکیٹ سے نکلتے ہوئے اس نے اپنے ایک شناسا کو اپنی بیوی سے کہتے سنا۔ "یہ ہے رجب علی جس کی بیوی اسے چھوڑ کر دوسرے آدمی کے ساتھ چلی گئی ہے۔"

کوئی پوچھتا۔ "پاکستان گئے تھے؟"

"اچانک کیوں؟" تجاہلِ عارفانہ کا مظاہرہ کیا جاتا۔

"بچوں کو پاکستان چھوڑ آئے...... خوار ہوجائیں گے بچارے۔"

ایک دوست نے کہا۔ "یار! تم نے اپنی مسز کو اس کی مرضی کر[illegible]...... ہم اپنی عورتوں کو یہاں لائے ہیں تو انہیں گوریوں کی طرح آزادی تو دینی پڑے گی۔"

رجب علی [illegible] والوں کی سنے جاتا، کبھی شرمندہ ہوتا، کبھی بولنے والے پر دل ہی دل میں تاؤ کھاتا...... جو زبان سے نہ بولتے ان کی نگاہوں میں استہزا ہوتا۔

اس نے نشاط کو طلاق دے [illegible] ریڈنگ سے کہیں اور جا بسنے کا فیصلہ کرلیا مگر نشاط تھی کہاں؟

ریڈنگ میں شناساؤں کا حلقہ ہونے کا [illegible] فائدہ بھی ہوا کہ رجب کو نشاط اور نبیل کے بارے میں [illegible] نشاط کی ایک سہیلی صاعقہ کے ذریعے پتا چل گیا کہ دونوں [illegible] میں رہ رہے تھے۔ نبیل پاکستان میں پنجاب کے ایک دور افتادہ گاؤں سے برطانیہ آیا تھا۔ اس کی شہرت اچھی نہ تھی۔

نشاط کو اپنے چکر میں لینے کے بعد بقول صاعقہ، نبیل کی نظریں اس مکان پر تھیں جسے رجب علی نے بڑی محبت سے نشاط اور اپنے بچوں کے لیے خریدا اور سجایا تھا۔ وہ بچوں کو سرکار کی طرف سے حاصل مالی اعانت میں نشاط کے ذریعے حصہ بٹانے کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔

نبیل کی بدنیتی پر پانی پھیرنے کے لیے رجب علی نے صاعقہ کے ذریعے نشاط کو رازداری سے پیغام بھجوایا کہ وہ اسے طلاق دے دے گا، بچوں کو وہ فی الحال پاکستان چھوڑ آیا ہے لیکن انہیں واپس لائے گا مگر کسی قیمت پر بچوں کو نبیل کی موجودگی میں اس کے حوالے نہیں کرے گا کیونکہ نگار بڑی ہو رہی تھی اور نبیل اس کے لیے غیر اور نامحرم تھا۔ نیز بچوں کی خاطر ہی وہ ریڈنگ چھوڑ کر کسی اور شہر یا ٹاؤن میں رہنا چاہتا ہے لہٰذا وہ ریڈنگ میں اپنا مکان فروخت کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ نشاط اس سلسلے میں کوئی رکاوٹ بننے کی کوشش نہ کرے۔

رجب علی نے اپنے گھر میں مقیم کرایہ داروں کو کہیں اور اپنی رہائش کا بندوبست کرنے کا نوٹس دے کر مکان برائے فروخت لگا دیا۔ گو اس امر کے لیے اسے اپنے دل پر پتھر رکھنا پڑا مگر جب مکین ہی اجڑ گئے تو مکان کو سجائے رکھنے سے فائدہ کیا تھا۔

خریدار آتے، گھوم پھر کر گھر دیکھتے، ان کی نگاہوں سے پسندیدگی جھلکتی۔ رجب علی دل ہی دل میں ٹوٹتا، سلگتا کہ یہ گھر اس نے بیچنے کے لیے تھوڑی بنایا تھا۔ شداد کی جنت تو اس کے تکبر کی وجہ سے اجڑی تھی۔ وہ تو نہایت عاجز اور مسکین سا آدمی تھا۔ اپنے بیوی بچوں کے لیے چھوٹی سی جنت اس نے خلوص ومحبت سے آراستہ کی تھی۔ افسوس کہ اس عورت نے جو اس کی شریکِ زندگی، اس کی محبت تھی، اپنی عاقبت نااندیشی سے اس جنت کو اپنے ہی ہاتھوں اجاڑ دیا تھا۔

ایجنٹ کے ذریعے مکان کا سودا ہوگیا۔ نشاط دستخط کرنے آ گئی۔ اسے دیکھ کر رجب علی کو یوں لگا جیسے اس کا دل ساکت ہوگیا ہو۔ یہ وہ عورت تھی جو کبھی اس کی ہوا کرتی تھی مگر اب نہیں رہی تھی۔ نئے زنانہ انگریزی لباس اور قطع و برید ہوئی زلفوں کے ساتھ وہ اس کی نشاط سے یکسر مختلف عورت نظر آتی تھی۔

مکان فروخت ہوگیا۔

اس گھر سے نکلتے وقت رجب علی کی جو حالت تھی، رب ہی جانتا تھا، اچھے دنوں میں اس نے کبھی بھولے سے بھی نہ سوچا تھا کہ ایک روز نشاط اس کی زندگی سے نکل چکی [illegible]...... راستے جدا ہوجائیں گے...... بچے اس سے ہزاروں میل دور ہوں گے اور وہ اپنے ہی گھر سے شکست خوردگی کا احساس [illegible] لیے نکلے گا۔

جب وہ کام پر جانے کے لیے گھر سے نکلنے لگتا تھا تو نشاط بچوں کے ساتھ ٹیرس پر کھڑی ہوکر اپنا ہاتھ ہلا کر اسے خدا حافظ کہتی تھی۔ نگار کے ساتھ طیب بھی بآواز بلند کہتا۔

"بائے ڈیڈی...... بائے ڈیڈ!"

گھر کی فروختگی کے بعد نئے مالک مکان کو گھر کی چابیاں دے کر وہ ٹوٹے قدموں سے باہر نکلا تو اس نے ٹیرس کی طرف دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا...... کوئی بھی نہیں۔

"بائے ڈیڈی...... بائے ڈیڈ!" نگار اور طیب کی آوازوں کی بازگشت آنسوؤں کی صورت اس کی آنکھوں دھندلا کر گئی۔

خوشحال زندگی کی چاہ میں بیرون ملک جانے والے نوجوان کی مسافرت کا احوال آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے